ایلاف

پی کے سنگ
PKSUNG

کیپٹن ڈاکٹر محمد اویس افضل

Marfat.com

Marfat.com

ایلاف

پی کے سنگ
PKSUNG

مصنف

کیپٹن ڈاکٹر محمد اویس افضل

○

پی کے سنگ پبلی کیشنز ○ لاہور

المعارف ○ گنج بخش روڈ ○ لاہور

Marfat.com

87
159712

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ © ۲۰۱۵ء

نام کتاب	:	ایلاف پی کے سنگ PKSUNG
مصنف	:	کیپٹن ڈاکٹر محمد اویس افضل
ناشر	:	پی کے سنگ پبلی کیشنز، لاہور
طابع	:	ارشد سلمان وہاب پرنٹرز، لاہور
سال اشاعت	:	۱۴۳۶ھ ـــــ ۲۰۱۵ء
قیمت	:	۱۵۰۰/- روپے
تعداد	:	ایک ہزار

تقسیم کار:- "المعارف" ○ گنج بخش روڈ ○ لاہور
فون: ۳۷۲۱۴۶۶۲

Marfat.com

اع وذ ب ال ل ہ م ن ال ش ی ط ان ال ر ج ی م ب س م ال ل ہ ا

ل ر ح م ان ال ر ح ی م ا س ت ا ذ ی ح اف ظ م ح م د اق ب ال

پی کے سنگ

پیا۔ کے۔ سنگ

- 'پی' کے نام سے ابتدا کر رہا ہوں
- ہمیشہ 'پی کے سنگ' رہنے کی،

  چاہت کرنے والوں کے نام
- پی کے سنگ رہنے کی طلب، جب تڑپ میں بدل جائے، تو منطقی نتیجہ "پی کے سنگ۔PKSung" ہی ہونا چاہیے۔

۱۳ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ

Marfat.com

- پی کے (PK)، سنگ (Sung) تین (۳) دہائیوں پر محیط ہے۔
- PK، پاکستان کا مخفف ہونے کے علاوہ پاکیزگی کی علامت بھی لیا جا سکتا ہے۔ Sung، وہ راگ ہوتے ہیں جو گائے جا چکے ہوں۔
- پاکستان کے شہر لاہور کے علاقہ باغبان پورہ میں ان کی بازگشت، دو گنبدوں والے دربار سے منسلک ہو چکی ہے۔
- حافظ سائیں محمد اقبالؒ نے جو، اَن بِدھے موتی کائنات میں بکھیرے، ان میں سے تریسٹھ (۶۳) کی مالا بنانے کی سعی ایلاف 'پی کے سنگ' کے روپ میں پیش ہے۔

پی کے سنگ

پیا۔ کے۔ سنگ

- حافظ سائیںؒ کا ساتھ بیسویں (۲۰) اور اکیسویں (۲۱) صدی کے سنگم پر خاص عنایتِ الٰہی رہی ہے، جس کے شکرانہ کی صورت میں وجود کی اتھاہ گہرائی سے، عطا کیے گیے علم کی خاموش جھیل (Silent lake of knowledge) کا یہ ایک ادنیٰ اظہار ہے۔

Marfat.com

حافظ سائیں محمد اقبالؒ

Marfat.com

Marfat.com

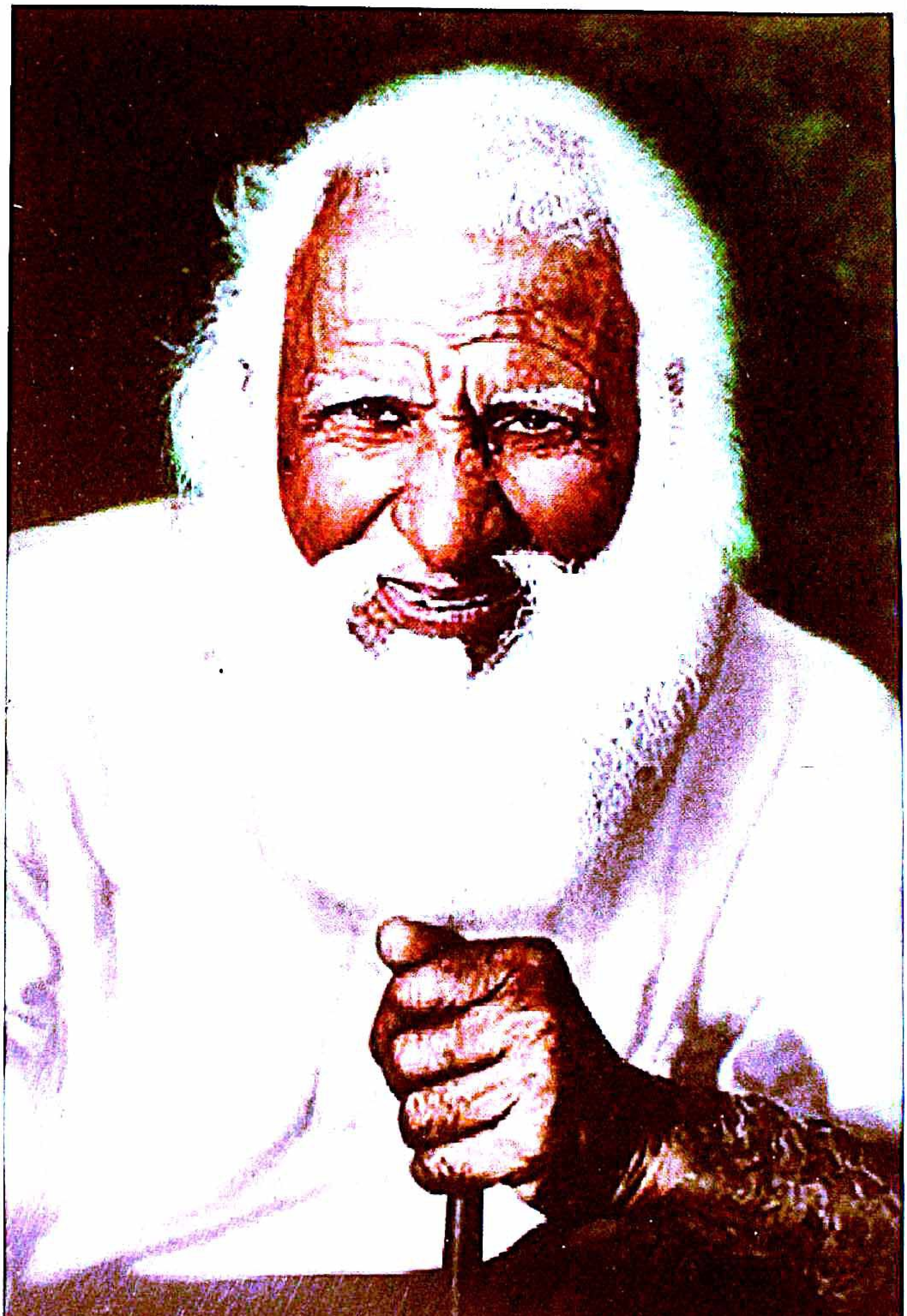

بابا سائیں حسن الدینؒ

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۰۔	پیش لفظ	۷	۱۷۔	عبد	۹۸
۱۔	علم	۹	۱۸۔	رَجُل۔ رجال	۱۰۲
۲۔	چاہت / مشیّت	۹	۱۹۔	ابلیس	۱۰۸
۳۔	ارادہ	۹	۲۰۔	شیطان / شیاطین	۱۱۹
۴۔	قضا	۹	۲۱۔	الدّین	۱۲۸
۵۔	قدر	۱۰	۲۲۔	اَلقاء	۱۴۹
۶۔	اجل	۱۵	۲۳۔	کشف	۱۵۴
۷۔	اذن	۱۵	۲۴۔	اِلہام	۱۵۶
۸۔	ازل	۱۹	۲۵۔	میثاقُ الانبیاء	۱۵۸
۹۔	توحید	۲۵	۲۶۔	خلیفۃُ اللہ	۱۷۲
۱۰۔	اوّل	۲۵	۲۷۔	معرفت	۱۷۶
۱۱۔	رسالت / رسول	۲۹	۲۸۔	عبادت	۱۸۲
۱۲۔	عقل	۳۴	۲۹۔	محبت / مودّۃ	۱۹۰
۱۳۔	وحی	۳۹	۳۰۔	دُعا	۱۹۶
۱۴۔	آدم	۴۵	۳۱۔	تقدیر، توکل اور دعا	۲۰۲
۱۵۔	الانسان	۵۷	۳۲۔	طبعی عناصر	۲۰۴
۱۶۔	بشر	۹۰	۳۳۔	تخلیق بشر و ذکرِ عالین	۲۳۲

Marfat.com

۳۴۔	داستانِ حرم	۲۳۷	۴۹۔	مظلومین کے لیے رونا	۳۴۷
۳۵۔	امام النّاس	۲۴۲	۵۰۔	اللہ کا ملک	۳۵۰
۳۶۔	اوّل بیت	۲۴۵	۵۱۔	دین۔ ضابطۂ حیات	۳۵۶
۳۷۔	الحمدُللہ	۲۴۹	۵۲۔	انونٹری (Inventory)	۳۶۲
۳۸۔	ملاقات	۲۶۰	۵۳۔	نوتِ حیات	۳۶۹
۳۹۔	رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور رحمت	۲۹۹	۵۴۔	محاسبۂ ذات	۳۷۳
۴۰۔	رسولِ عزیز و حریص	۳۰۳	۵۵۔	تعیّنِ منزل	۳۷۵
۴۱۔	معراج	۳۰۸	۵۶۔	کاملاں رارا ہنما	۳۷۷
۴۲۔	مرکز	۳۱٦	۵۷۔	احادیثِ قُدسی	۳۸۰
۴۳۔	بحرین	۳۲۰	۵۸۔	شب برات	۳۸۳
۴۴۔	شکر	۳۲۳	۵۹۔	درجاتِ متّقین	۳۸۷
۴۵۔	ولیٔ امین	۳۲٦	٦۰۔	الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی	۴۰۴
۴٦۔	ضربُ المثل	۳۳۰	٦۱۔	عقل و فکر کا تفاوت	۴۱۳
۴۷۔	حُسن، حَسین، حُسین	۳۳۵	٦۲۔	سجدہ	۴۱٦
۴۸۔	کرب، نجات اور کربلا	۳۳۸	٦۳۔	فی سَبِیْلِ اللّٰہِ	۴۱۹

Marfat.com

پیش لفظ

’’مجھ میں میرا کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ ہے سب ’پی‘ کا ہے‘‘۔ اصولاً اس کے سوا لکھنے کی ضرورت نہیں ہونا چاہیے تھی، مگر اوّل ادارہ ’’المعارف‘‘ کے نصر اقبال قریشی صاحب کا اصرار اور دوئم متقدمین کی سنت نے مجبور کیا کہ تعارف کروانے میں مذائقہ نہیں۔ سینٹرل ماڈل سکول، لوئر مال لاہور سے ۱۹۷۱ میں میٹرک کیا۔ ۱۹۷۳ میں گورنمنٹ کالج (یونیورسٹی) سے انٹر کا امتحان دے کر فارغ ہو چکا تھا، جب ’اتفاقیہ‘ حافظ محمد اقبالؒ سے ملاقات کا سبب بنا، جو باقاعدہ نسبت کا پیش لفظ ثابت ہوا۔ علم، عمر اور تجربہ کی ناپختگی کے باوجود حافظ جی نے نو چالیس کی ٹکٹ تو نہ دی، مگر اپنی ذاتی مصروفیات کی بنا پر مجھے شخصی طور پر حاجی وزیر علیؒ (نقشبندی، چشتی، نظامی) کی خدمت میں چھوڑنے آئے، تاکہ تحصیل علم قرآن کی ابتدا ہو سکے۔

اس دوران علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کر کے پاک فوج میں بحیثیت کیپٹن نوکری کا موقع ملا۔ ۱۹۸۳ میں گلگت سے لاہور تبادلہ اور بیٹی رابعہ کی پیدائش کے بعد سے لے کر نومبر ۲۰۰۱ تک پھر حافظ سائیں سے مسلسل ساتھ کی گنجائش بنی رہی، کیونکہ ۱۹۸۵ میں فوج سے فارغ ہو کر سوشل سیکیورٹی میں ملازمت کی اور مستقل لاہور ہی میں رہا۔ اس دوران پچھلی رات کی گہری ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں، مگر میری درخواست پر، پہلے منگل اور بعد میں بدھ کے روز باقاعدہ مجلس کا انعقاد بھی جاری رہا، جس میں نہایت محترم احباب شریک ہوا کرتے تھے۔ ان مجالس کی وجہ سے ہمیں فلسفۂ قرآن سے بتدریج آگہی ملتی رہی۔ استاد جی سے سنی ہوئی اکثر باتیں لکھنے کا شوق ہمیشہ معمول رہا اور کبھی کبھی ان سے اصلاح لینے کی گنجائش بھی بن جایا کرتی تھی۔

Marfat.com

باباسائیں حسن الدینؒ جو ہمارے حافظ سائیںؒ کے مربّی ہیں، تقسیم پاک وہند کے بعد نیر وبی سے پاکستان آکر پہلے گجرات میں ٹھہرے، چند سالوں بعد لاہور تشریف لائے اور باغبانپورہ میں اس جگہ مستقل سکونت اختیار کی، جہاں آج ان کا اور حافظ جی کا ابدی نشان موجود ہے۔

حافظ سائیں پر قضائے الٰہی وارد ہونے کے بعد سے آج تک، اُنہی خطوط پر، افکارِ قرآن میں عرق ریزی کرنے اور چاہ رکھنے والوں کو سنانے کا عمل جاری رہا ہے۔ نئے مضامین بھی احاطۂ تحریر میں آتے رہے۔ آخرکار ۲۰۱۴ میں اس لکھے مواد کو کتابی شکل دینے کا فیصلہ ہوا، جو کئی مراحل سے گزرتا ہوا، سلسلۂ ایلاف، پی کے سنگ (PKSUNG) بن کر آپ کے سامنے ہے۔

زندگی کی چھ دہائیاں (ساٹھ سال)، چھ ساعتوں کی طرح گزر گئی ہیں، مگر اس دوران 'اپنی آپ کتاب کو پڑھنا ایسی اور تلاوت ناہیں' کے پسند کئے گئے اصول پر کاربند رہنا میسر آتا رہا ہے۔ اس عمل میں صرف کی گئی توجہ اور لگن کی وجہ سے عزیز واقارب اور دوست احباب سے شخصی ملاقاتیں ممکن نہ ہوسکیں، اس کے لئے معذرت خواہ ہوں، مگر ان کی محبتوں کے نقوش میرے دل میں ہر وقت تر وتازہ ہیں۔

محمود حسین، محمد اسامہ، سجاد الحسن اور فلک شیر خصوصی شکریہ کے حقدار ہیں، بیٹی سحر کی معاونت قابلِ ستائش ہے، گھر والی کی مہربانی ہے کہ اس نے کتاب کی ترتیب کے دوران پابندیاں کم لگائیں، جب کہ طاہر اور نزمین نے بھی عملی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔ باؤ ریاض، بشارت احمد، شیخ شہزاد فیصل اور شیخ افضل کی مہربانیاں اس کاوش میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔

والسلام

محمد اویس افضل

0321-4767168

eelafehi@gmail.com

Marfat.com

۱۔ علم

عین ذاتِ الٰہی ہے۔

۲۔ چاہت (مشّیت)

علم کا اوّل اظہار ہے۔

۳۔ ارادہ

چاہت کے اظہار کی علّت ہے۔

۴۔ قضا

ارادہ کے تعیّن حدود اور فیصلہ کا نام ہے۔

Marfat.com

۵۔ قدر

قضا کی عملی شکل ہے۔

جاننا چاہیئے کہ پہلے علم ہوتا ہے، علم کے بعد مشّیت ہوتی ہے، مشّیت کے بعد ارادہ ہوتا ہے، ارادہ کے بعد قضا ہوتی ہے اور قضا کے بعد ہوتی ہے قدر!

فرض کریں کسی کے نہایت عزیز دوست کا شہر سے باہر ایکسیڈنٹ (Accident) ہو جاتا ہے۔ یہ خبر جونہی اس تک پہنچے گی، وہ لمحہ آگہی، علم کی مانند ہوگا۔ جتنی کامل اور مصدق خبر ہوگی، اتنی ہی زیادہ دوست کی چاہت دل میں موجزن ہوگی۔ چاہت، خبر کے ملتے ہی امنڈ آئے گی، اس کے لئے وقت درکار نہیں ہوگا۔ جوں ہی چاہت ظاہر ہوتی ہے، اسی لمحہ دوست تک پہنچنے کا ارادہ جنم لیتا ہے۔ یہ بھی وقت کی قید سے آزاد ہے اور فوری طور پر جوں کا توں ابھرتا ہے۔ مختصر یہ کہ کامل علم کے ہوتے ہی صادق چاہت ہوتی ہے اور چاہت کے ہوتے ہی مصمّم ارادہ رونما ہوتا ہے۔ پختہ ارادہ، سچی چاہت اور کامل علم، تینوں غیر محسوس (Intangible) ہیں، اور قلب و نظر سے متعلق ہیں۔ ان میں سوچ بچار کے پہلو کا شائبہ نہیں ہوتا، اور نہ ہی ان کے ہونے میں وقت کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے۔ معلوم ہوا جب علم کامل ہو تو فوری طور پر مشّیت یعنی چاہ ہوتی ہے۔ جب چاہ ہوتی ہے تو اسی لمحہ چاہتا ہے کہ اس کا ارادہ کرے۔ یہ سب جوں کا توں ہو جاتا ہے، اس میں وقت کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جب ارادہ ہوا، تو ارادہ میں تعیّن ہوتا ہے اور اسی تعیّن اور فیصلہ کو قضا کہتے ہیں۔ قضا کے معنی لازماً موت ہی کے نہیں ہیں، یہ قضا فیصلہ کے معنی میں ہے، جس سے لفظ قاضی بنتا ہے۔ قضا یعنی فیصلہ و تعین کرنا، موت کا بھی اور زندگی کا بھی۔ اسے حدود کا تقرر کہا جا سکتا ہے کہ یہ یونہی بنے گی۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو پھر اس کو قدر میں لایا جاتا ہے، یعنی اب اس کو عملی شکل دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے قدر دراصل قضا کی عملی شکل ہے۔

Marfat.com

سورۃ القمر آیت ۴۹ میں ہے: اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ: یعنی بے شک ہم نے ہر شے کو اندازہ سے بنایا ہے۔ یہ اس کا عمومی ترجمہ ہے حالانکہ قدر کا معنی، کسی طرح اندازہ نہیں ہے۔ اس کا مناسب مفہوم یہ ہونا چاہیئے کہ بے شک ہم نے ہر شے کو قدر کے ساتھ بنایا ہے۔ مراد یہ ہوئی کہ ہر شے جو خلق کی گئی، وہ قدر کے ساتھ مخلوق ہوئی۔ اگر قدر کو سمجھ لیا جائے تو خلق کرنے کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ اور اسی طرح اگر اسکی تخلیق کی ہوئی 'خلق' سمجھ آجائے تو قدر بھی بہتر سمجھ آسکتی ہے۔ اگر قدر کو پہچانا اور سمجھا جائے گا تو حضورؐ کی پہچان بھی ممکن ہو سکے گی۔

ذاتِ باری کے باب میں سوئے ادب ہے کہ کہا جائے اس نے اندازے سے پیدا کیا۔ لفظ اندازہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب یقین نہ ہو، اس میں شک کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ عام زندگی میں طول و عرض یا وزن کے بیان میں، اکثر لفظ اندازاً بولا جاتا ہے اور یہ مشکوک مقدار ظاہر کرتا ہے، جس کا تعین بر بنیادِ ظن ہوتا ہے۔ ظن کا اردو میں مطلب گمان ہوتا ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ گمان کیا جا رہا ہے اللہ نے ہر شے مشکوک اندازہ سے بنائی ہے، یقین و حکمت کے ساتھ نہیں۔ قرآن کی سورۃ یونس آیت ۳۶ کا فیصلہ ہے: اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا: یعنی گمان کبھی حق کے معنی میں تسلی نہیں کرا سکتا۔ جب ظن تسلی نہیں کروا سکتا اور گمان سے حق حاصل نہیں ہو سکتا، تو ظن و گمان بھی غلط ہوا اور اندازہ بھی غلط۔ پھر اندازہ کا لفظ اللہ کے متعلق استعمال ہو؟ واقعی سوئے ادب ہوگا۔ وہ ہر چیز کا عالم ہے۔ چونکہ خالق کُل ہے اس لیے ہر شے کا عالم کُل بھی ہے۔ تو پھر اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس نے اندازہ سے بنایا، قطعاً غلط ہے۔ حقیقت ہے کہ آئمہ طاہرینؑ نے یہ بتا کر، ہم پر عظیم احسان کیا کہ اللہ نے مخلوقات کو اندازہ سے نہیں، بلکہ علم سے بنایا ہے۔ یہ نہایت خوبصورت وضاحت ہے اور اللہ کی شان کے عین مترادف بھی۔

Marfat.com

ہر شے پہلے علم میں آتی ہے۔ جب تک علم خدا میں ہو سب کے لیے غیب ہوتی ہے۔ اور جب علم سے مشیّت میں آئی تو وہ جو اس کی مشیّت سے بنے ان کے علم میں لائی گئی۔ پھر جن پر اس کا ارادہ نازل ہوتا ہے انہیں معلوم ہوئی۔ جب ان کا فیصلہ ہو گیا تو ان کی زبان سے قضا کی طرح ادا ہوئی اور جب قدر میں آئی تو ان ہی کے ہاتھوں سے بنی! قدر میں وہ شے آتی ہے جو قضا میں متعین ہو جائے، قضا میں وہ شے آتی ہے جس کا ارادہ ہو، ارادہ، مشیّت سے منسلک ہے اور مشیّت اس کے علم سے وابستہ ہے۔ اردو اور عربی لغت میں اس لفظ قدر کا مناسب بدل تلاش کے باوجود نہیں ملا۔ مترجم حضرات نے شاید اسی لیے اندازہ ترجمہ کیا کہ انہیں بھی کوئی اور مناسب لفظ نہیں ملا۔ اگر ایسا ترجمہ نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ قدر کا ترجمہ قدر ہی کر دیتے، جیسے الٓمّٓ کا ترجمہ الف، لام، میم کرتے ہیں۔ دراصل ایسا ترجمہ اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ مفہوم مکمل طور پر نہیں سمجھ پائے۔ پھر یہ کہنا کہ کتاب اللہ ہمارے لئے کافی ہے، کیسے درست ہو سکتا ہے؟

اللہ ہر چیز کو بنانے سے قبل اسکی غرض مقرر کرتا ہے۔ اور پھر اس کے مطابق اس کو اہلیت عطا کرتا ہے، جو اس کی قدر کہلاتی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ اور عسقلانیؒ نے روایت کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے باب میں ایسا گمان رکھنا کفر ہے کہ وہ کام کر کے بعد میں سوچے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا کیا فائدہ ہے؟ اللہ جہاں خالقِ کُل ہے وہاں خالقُ العقل بھی تو ہے، اس لئے وہ فہم کے ساتھ خلق کرے گا۔ سورۂ المومنون آیت ۱۱۵ میں ہے: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا: یعنی کیا تم گمان رکھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے مقصد و فضول تخلیق کیا ہے؟ بنی آدم کی جزوی عقلیں اس کی حکمت اور مصلحتوں کو سمجھنے سے قاصر ہو سکتی ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ خدا کا کوئی کام قدر اور مقصد کے بغیر ہو۔ خدا کہتے ہی اسے ہیں جو، جب خلق کرے تو مخلوق کی غرض کو ملحوظِ خاطر رکھے اور اسے تمام ضروری صلاحیت، قابلیت اور اہلیت عطا کرے۔ پھر اس کے بعد ہی اسے تخلیق کا روپ دے۔ اصل میں اللہ کی بنائی 'قدر' یہ ہے کہ حیوان، حیوان رہے، پرند، پرند رہے، آدم، آدم رہے اور انسان، انسان۔

Marfat.com

اللہ سے منسوب ہر فعل، خواہ خلق ہو، رزق ہو، نعمت ہو، کرم ہو، برکت ہو، رحمت ہو، وہ کبھی عبث نہ ہو گا، اسکی ہمیشہ واضح غرض ہو گی۔ اس لیے اللہ کے بنائے میں عیب نہیں ہو سکتا۔ علامہ نصیر الدین طوسیؒ نے تجرید میں اور علامہ حلیؒ نے شرح تجرید میں لکھا ہے، خدا کی ذات، خود اپنی ذات کے لحاظ سے مستغنی ہے، اسے کسی کی احتیاج نہیں۔ لیکن جس کائنات اور مخلوقات کو اس نے پیدا کیا وہ ہر لمحہ حاجت مند ہے۔ ان کی حاجت روائی کے لئے اسباب بھی اس نے خود ہی تخلیق فرمائے ہیں، اور یہ سب قدر کے ساتھ معین کیا گیا ہے۔ بہر حال اللہ جس کو بناتا ہے وہ جانتا ہے کیوں بنارہا ہے، اور جب بناتا ہے تو غرض خلقت کو ملحوظ رکھ کر اس میں وہ صلاحیتیں اور قابلیتیں جمع کر دیتا ہے جس سے وہ اپنی غرض مکمل کر سکے۔ اللہ نے پینے کے لیے پانی بنایا ہے، اور اس کی قدر ایسی نرم مرتب کی کہ کسی کے حلق میں نہ پھنسے۔ پھولوں میں مختلف رنگ بھر کر جاذبِ نظر تو بنایا ہی تھا، ہر ایک میں جداگانہ خوشبو دماغوں کو معطر کرنے کا سامان مہیا کرتی ہے۔ ہر پھل کی بھی اپنی تاثیر اور خوبی ہے۔ ان میں من حیث الکُل حفظانِ صحت کی گنجائش رکھ دی گئی ہے ۔ گندم، چاول، اور سبزیوں کے مخصوص فوائد مقرر کر دیے گئے ہیں۔ جو در اصل ان سب کی قدر ہی ہے۔ جانور بنا کر، اس کی قدر میں خواہش تو دی، مگر قوتِ تمیز نہ دی۔ جانور جب غلطی کرتا ہے تو وہ عین تقاضائے فطرت کے تحت ہوتی ہے، اسے تو تمیز ہی نہیں۔ اسے غلط کار نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ اپنی فطرت پر عامل ہوتا ہے۔ لہلہاتا سبزہ چند لمحوں میں بغیر اس امتیاز کے اجاڑ دیتا ہے کہ اس کھیت کا مالک کون ہے؟ اس سے کسی کا کیا نقصان ہو گا؟ تمیز نہ کر سکنے کے باعث جانور پر زراعت، کھیتی باڑی، لوہار اور ترکھان کے کام کی پابندی نہیں۔ حتّٰی کہ ان کی روزی کی بھی ذمہ داری، مالک کائنات نے اپنے ذمۂ کرم پر لے رکھی ہے۔ فرشتوں کو قوت عاصمہ سے بے عیب بنایا، اس لئے کہ ان کی قدر میں قوت شہوانیہ ہے ہی نہیں۔ بنی آدم میں دونوں قوتیں یعنی قوت شہوانیہ بھی ہے اور قوت عاصمہ بھی۔

Marfat.com

اب اگر بنی آدم مسلسل ارتکابِ گناہ کرتا رہے تو بمصداق: اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ: جانور سے بھی بدتر گردانا جائے گا اور اگر قوتِ شہوانیہ کو قابو کرلے اور قوتِ قُدسیہ کی طرف راغب ہو تو وہ مسجودِ ملائکہ ہونے کے ناطے فرشتوں کا بھی سردار ہوگا۔

بنی نوعِ آدم کو ہل بنانے کا طریق القاء کیا، پھر زمین جوتنے اور ہل چلانے کا اختیار و قوت عطا کی، اور پسند کیا کہ تمہاری غذا ہم تیار نہ کرسکیں گے۔ تم خود ہل چلاؤ، دانہ ڈالو، پانی لگاؤ، اور پھر اس کے بعد ہمارے کرم کے امیدوار ہو جاؤ۔ ہم خود ہی دانہ میں شگاف ڈال کر کونپل پیدا کریں گے۔ لیکن دیکھو تم صرف وہی کام کرو جو تمہارے ذمہ ہے۔ اگر وہ کام جو ہمارے ذمہ ہے وہ تم خود کرنا شروع کردو، یعنی ناخن سے دانہ میں شگاف کردو، تو وہ فاسد ہو جائیگا۔ دانہ ہرگز ثمر بار نہ ہوگا، اور تم اپنی قدر سے اسراف کے مرتکب ہو کر اپنا نقصان کروگے۔ یہ آدم و بنی آدم کی قدر کا تذکرہ ہے کہ اس کے لئے ملائکہ بھی سربسجود ہوسکتے ہیں حالانکہ وہ 'کُن' سے ہونے والی مخلوق ہے۔ کوئی اس مخلوق کی قدر کا کیا اندازہ کرسکتا ہے، جو مشیّت و ارادۂ الٰہی سے معرضِ وجود میں آئے۔ ان کی قدروں کو جزوی عقل کے حامل بنی آدم سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ حکم کُن سے ہونے والی مخلوق، اللہ کے ساتھ، ان کے ناموں کا کلمہ پڑھنے کی پابند ہے۔ کیونکہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا پرچار اور اس کی صحیح تفہیم کروانے کی ذمہ داری قدرت نے ان کی قدروں میں رکھ دی ہے۔ یہ اپنے اپنے ادوار میں احسن طریق سے یہ فریضہ نبھاتے رہے ہیں۔ حتّٰی کہ دورِ ختم المرسلینؐ کے بعد آج لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ، تو ہے مگر ابراہیمؑ خلیلُ اللہ، موسیٰؑ کلیمُ اللہ اور عیسیٰؑ روحُ اللہ نہیں ہے بلکہ صرف محمدؐ رسولُ اللہ ہے اور قیامت کے بعد تک رہے گا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ساتھ محمدؐ رسول اللہ بھی چلتا رہے گا۔ یہی وہ عظیمُ المرتبت ہستیؐ ہے جس کی قدر کو یہ شرف عطا ہوا کہ مالکِ کائنات نے اس کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملا کر ہم پر واجب کردیا ہے کہ ہم اُسؐ کی اطاعت اسی طرح کریں جیسے اللہ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ ثابت ہوا کہ ہم ناسوتی مخلوقات کی قدریں اور ہیں، مگر مشیّت و ارادہ سے بننے والوں کی قدر بالکل مختلف ہے! اُن کی تخلیق کی غرض و نوعیت ہی الگ

Marfat.com

مقرر کی گئی ہے۔ سورۃ الملک آیت ۳ میں خدا کہہ رہا ہے: مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ : یعنی تم رحمان کی تخلیق میں کوئی نقص نہ دیکھو گے۔ جس کو وہ خود بنائے اس میں عیب ہرگز نہیں ہو سکتا۔ عیب تو تب ہو کہ بنانے والا مکمل طور پر جانتا نہ ہو یا خدانخواستہ اس میں علم کی کمی ہو۔ وہ خالق و مالک کُل عَلِیْمٌ تو ہے ہی عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُحِیْطٌ بھی ہے۔

یہاں لنگڑے، لولے، اندھے، کانے وغیرہ کی تخلیق کا ذکر ضروری ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ خدا نے انہیں کارِ ہدایت و نصیحت کے لیے ایسا کیا ہے۔ ان کی قدر کو دوسری مخلوقات سے اس لئے جداگانہ بنا گیا ہے تاکہ باقی لوگ عبرت پکڑیں اور شکر ادا کریں کہ وہ ایسے نہ بنائے گئے۔ ویسے تخلیق میں اوندھے لوگوں کی جزا، ان سے بہت زیادہ ہے جو بظاہر تخلیق میں کامل ہیں۔ اسی طرح ان کے لئے سزا کی مقدار بھی بہت کم رکھی گئی ہے۔

۶۔ اجل

عملی شکل میں وارد ہونے کے بعد، رہنے کی مدت کا تعین، اجل کہلاتا ہے۔

۷۔ اِذن

عملی شکل میں رہنے کی اجازت اور توفیق اذن ہے۔

خدا کے پاس کامل و اکمل علم ہے، جسے عین علم کہتے ہیں۔ پھر اس کی مشیت ہے، پھر اسکا ارادہ ہے۔ جب ارادہ کی حدیں مقرر ہوں تو قضا کہلاتی ہے یعنی فیصلہ ہوتا ہے۔ پھر شے خارجی وجود یعنی عالم شہود میں آتی ہے اور ایسا قدر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس قدر کی وجہ سے اس کا امتیاز ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے سوا سے ممتاز ہو جاتی ہے تو پھر اللہ اس کے لیے اجل مقرر کرتا ہے کہ یہ کب تک اس حالت

Marfat.com

میں رہے گی۔ اجل کے بعد اگلا مرحلہ ہے اِذن کا۔ اِذن کے معنی اجازت اور توفیق کے ہیں۔ جس کا مفہوم یوں ہے کہ جب اجل مقرر ہو جائے اور تعیّن ہو کہ یہ کب تک اسی حالت میں رہے گی تو اس شے کو متحرک ہونے اور قضا و قدر کے مطابق اپنا مسلسل اظہار کرنے کی اجازت اور توفیق دی جاتی ہے۔ عام الیکٹرونک آلات میں اسے سٹارٹ (Start) کے بٹن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جونہی بٹن دبایا جاتا ہے، وہ آلہ جس مقصد کے لئے بنایا گیا ہوتا ہے، اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ یہی اذن ہے۔ ایک دفعہ کا اذن، فطری تقاضوں کے تحت، اجل کی انتہا تک خود بخود جاری رہتا ہے۔

i: سورۃ نُور آیت ۳۶ میں ہے: فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ : یعنی ان گھروں میں جنہیں اللہ کا اذن (حاصل) ہے کہ وہ ارفع رہیں۔ ان کو نہ تو پست کیا جا سکتا اور نہ ہی ان کے لئے پست ہونا مقرر کیا گیا ہے۔ اسی اجازت و اختیار کو خدا نے اِذن سے تعبیر کیا ہے۔

ii: سورۃ آل عمران آیت ۹۶/۹۷ میں ہے: اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۚ فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰہِیۡمَ ۬ۚ وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا: یعنی ہم نے مکہ مکرمہ میں لوگوں کے لئے اوّل بیت وضع کیا، جو عالمین کے لئے برکات اور ہدایت ہے۔ اس میں واضح نشانیوں کے ساتھ مقام ابراہیمؑ بھی ہے۔ جو اُس میں داخل ہو گیا امن میں آ گیا۔ یہ بیت بھی انہی بیوت میں شامل ہے جن کو ازل سے اذن عطا ہو چکا ہے۔ قرآن میں، جیسے قریہ سے مراد بستیاں نہیں ہوتیں بلکہ اُن میں بسنے والے لوگ یعنی اہلِ قریہ ہوتے ہیں، اسی طرح بیوت سے بھی مراد عام اینٹ پتھر کے بنے گھر نہیں، بلکہ 'اہل بیت' ہیں۔ امام جعفر صادقؑ کو کسی نے کہا کہ یہاں بیت سے مراد خانۂ کعبہ ہے، تو آپ نے پوچھا۔ عبداللہ بن زبیرؓ کہاں قتل ہوئے اور ان کے ساتھیوں کو کہاں تہ تیغ کیا گیا؟ اُس شخص نے کہا کعبۂ معظمہ میں۔ آپؑ نے پھر استفسار کیا کہ قرآن پر تیر کہاں برسائے گئے؟ مجبوراً کہنے لگا کعبۂ مکرمہ میں۔ پھر سوال فرمایا، کیا کعبہ کی عمارت کو زنبیق سے منہدم نہ کیا گیا تھا؟ کیا اُسکے پردوں کو سوچی سمجھی سازش کے تحت آگ نہ لگائی گئی تھی؟ اُس شخص نے لاچار ہو کر پھر ہاں میں

Marfat.com

جواب دیا تو امام مسکرا کر فرمانے لگے، اوہ بھلے مانس! ذرا سوچ تو سہی کیا اب بھی وہاں امن کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ اللہ علیم، اینٹ گارے کے گھر کو امن کا گہوارہ نہیں فرما رہا، جو بننے میں بھی کسی کا محتاج ہو اور جسے جب چاہو منہدم بھی کر دو۔ بیت سے مراد 'اہل بیت' ہی ہیں۔ اہل بیت کی نسبت ہی امن و شانتی کی علت ہے، اور اس کی بنیاد وہ اذن ہے جو اہل بیت کو عطا کیا جا چکا ہے۔ ایسی 'بیت' سے نسبت رکھنے والے کو قیامت میں بھی کوئی خوف نہیں ہو گا۔

iii: سورۃ الاحزاب آیت ۴۶ میں وارد ہے: وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ : یعنی اللہ کی طرف، اسی کے اذن سے دعوت دینے والا۔ داعیاً، قرآن کے عمومی تراجم میں بلانے والے کے مفہوم میں لیا گیا ہے، یعنی 'اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والا' ۔ حالانکہ داعی بلانے والا نہیں، بلکہ دعوت دینے والا ہوتا ہے۔ اور عام بول چال کے انداز میں بھی اور لغوی طور پر بھی داعی الی الخیر اسی کو کہتے ہیں جو خیر کی دعوت دینے والا ہو۔ بلانے کا تعلق صرف آواز و اشارہ سے ہوتا ہے، جس میں لازم نہیں کہ اپنائیت کی طرف رغبت ہو۔ مثلاً آپ کسی نوکر و ملازم کو آواز دیکر بلائیں، اور اس کی شدید سرزنش کر دیں، تو اس میں اپنائیت نہیں ہے۔ جبکہ کسی کو دعوت دیں، تو محض آواز و اشارہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ دعوت نامہ ہوتا ہے۔ اور اس سے مراد گھر بلا کر، اپنائیت اور محبت و خلوص کی فضاء میں کسی اچھی بات میں شرکت کی ترغیب ہوتا ہے۔ مذکورہ آیت میں رسولؐ ایسی ہی دعوت دینے والے فرمائے گئے ہیں۔ مگر ایک اضافت بھی ہے، کہ حضورؐ، اللہ کے اذن سے دعوت دیتے ہیں۔ جس کی واضح مراد یہ ہے کہ وہ دعوت دیکر جس بھی گھر میں بلائیں گے، وہ گھر اللہ کے اذن سے مقرر ہو گا۔ اور اللہ کے اذن سے، اللہ کے گھر کے علاوہ اور کہاں دعوت دیکر مدعو کیا جا سکتا ہے؟

iv: سورۃ النساء آیت ۶۴ میں ہے۔: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ : یعنی ہمارا رسولوں کو ارسال کرنا اس لئے ہوتا ہے کہ ان کی اطاعت ہو، اللہ کے اذن کے ساتھ۔ یہاں واضح کر دیا گیا کہ مرسلین کی اطاعت بھی فقط اذن الٰہی کی مرہون منت ہے۔ مراد یہ ہے کہ رسولؐ کی اطاعت، جو بمنزلہ اللہ کی اطاعت ہوتی ہے، اس کی اجازت و توفیق اللہ کے اذن سے منسوب ہے۔ اس کی چاہت یہی ہے کہ مرسلین کی اطاعت ہو، انہیں بھیجنے کا کوئی اور مقصد ہی بیان نہیں کیا جا رہا، مگر اس کے

Marfat.com

باوجود اطاعت کو اذن کے تابع کر کے، اذن اپنی ذات کی طرف رکھ لیا۔ ذات ارادہ کرے تو کسی کو اطاعت کی توفیق بخش دے، وگرنہ کائنات بھر میں کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اطاعتِ رسولؐ وہ اپنی ہمّت یا مرضی سے کر رہا ہے۔ کبھی کسی رسول نے بھی ایسا احساس نہیں دیا کہ سرزد ہونے والا فعل وہ اپنی طرف سے کر رہے ہیں۔

۷: سورۃ آل عمران آیت ۴۹ میں عیسیٰؑ کی مثال اس ضمن میں مدلّل ہے، جب وہ کہتے ہیں: اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَکُمۡ مِّنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ فَاَنۡفُخُ فِیۡہِ فَیَکُوۡنُ طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ : یعنی میں تمہارے لیے تخلیق کرتا ہوں قسم پرندہ کی پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ اُڑنے لگتا ہے اذن الٰہی سے۔ اس آیت کے مصداق حضرت عیسیٰؑ بھی خالق ثابت ہوتے ہیں مگر خالق ہیں شے سے شے کے۔ انہیں شے بنانے کے لئے کسی سبب یا شے کی ضرورت ہے، اور ایسا ہونا بھی اذنِ الٰہی پر موقوف ہے۔ جبکہ اللہ کے خالق ہونے میں نہ کوئی محتاجی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی کے اذن کی ضرورت ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو معجزات ان سے سرزد ہو رہے ہیں وہ تمام اللہ کے اذن کے تابع ہیں۔ ایسا نہیں کہ عیسیٰؑ مٹی کا پرندہ بنا کر، اس میں کچھ پھونک کر، خود اپنی طرف سے اسے اُڑنے کا حکم دے رہے ہیں، یا مادر زاد اندھے اور کوڑی کو اپنی طرف سے شفایاب کر رہے ہیں، یا مردہ دلوں میں نئی زندگی کا سبب اپنی قوت سے کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ واشگاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ کے اذن کے ساتھ ممکن ہو رہا ہے۔ اگر توفیقِ ایزدی ان کے شاملِ حال نہ ہوتی تو ان کے ہاتھوں کسی بھی معجزہ کا اظہار نہ ہو سکتا۔ عیسیٰؑ روح اللہ جب اذنِ الٰہی کے پابند نکلے تو امتّیوں کی کیا مجال کہ وہ اذن کے بغیر پلک بھی جھپک سکیں۔ رسول کا معجزہ مٹی کے پرندہ میں جان ڈالنا، اندھوں اور کوڑیوں کو شفا دینا اور مردہ قلوب کو زندہ کرنا ہے، تو امتّی کی انتہا اس رسول کی اطاعت ہو گی۔ جب رسول معجزہ کے لئے اللہ کے اذن کا محتاج ہو تو امتّی کیونکر بِلا اذن حاملِ معجزہ کی اطاعت کر سکتا ہے۔ عموماً رسول کا کوئی معجزہ ایک ہی دفعہ ہوتا ہے اور اس کے لئے اسے اذن کی ضرورت بھی ایک ہی دفعہ پڑتی ہے۔ مگر اطاعت کی توفیق کا اذن ایک دفعہ میّسر آجائے تو عمر بھر کا انعام بن جاتا ہے۔ تمام مخلوقات اذن ہی کی

Marfat.com

گردش میں ہیں۔ یہ اذن ہر کسی کی ازل سے لیکر ابد تک اسے مصروفِ کار رکھتا ہے۔ اور اجل کے وارد ہونے پر ماند پڑ جاتا ہے۔

۸۔ ازل

شہود اور خلق کے جہان کی ابتدا یعنی دوئی کی ابتداء ازل ہے۔ دوئی کی ابتداء ہی فطرت کا دوسرا نام بھی ہے۔ کسی بھی شکل میں اور کسی بھی جگہ دو ہونے کا نام، اس شے کی ازل ہے۔ حالانکہ دو ہونا غیریت ہوتا ہے مگر پھر بھی یہ ہمارے لیے بہت متبرک ہے۔ یہ غیریت نہ ہو تو ہمارا ازل بھی نہ ہو اور ہم بھی نہ ہوں۔ ایک کا دوسرے سے جدا ہونا اس کی ضد کہلاتا ہے اور یہ ضد ہی دوئی ہے۔ خالق کائنات نے جب اپنی دوئی خلق کی تو اس مخلوق کا وہ ازل تھا۔ ازل، دوئی سے، وقت کی شکل میں جدا ہوا۔ ایک خالق، دوسری اس کی دوئی یعنی مخلوق اور تیسرا وقت۔ وہ تیسری شے ازل ہے، جو ہمیشہ ضد اور دوئی سے منسلک ہوتی ہے۔ لیکن ابد، جس کی کسی کو خبر نہیں، اس تیسری شے، وقت، کی انتہاء ہے۔

جب تک ہم اپنے باپ کے صلب میں تھے، دوئی کا نام ونشان نہ تھا۔ نہ ہی ہماری ازل تھی اور نہ ہی ہماری فطرت کا تعین۔ ہم اپنے کُل کے ساتھ پیوستہ و منسلک و ہم آہنگ تھے۔ یعنی اصل میں، ہم تھے ہی نہیں، فقط وہی (تو) تھا۔ لیکن جب بھی کبھی، جن بھی حالات میں، ہم رحم مادر میں منتقل ہوئے تو ماں کے پیٹ میں وہ آمد، ہماری ازل ہوئی۔ یہیں سے ہماری فطرت شروع بھی ہوئی اور رواں بھی ہوئی۔ یاد رہے ہر فطرت سے قبل اس فطرت کو تخلیق کرنے والا فاطر، موجود ہوتا ہے۔ جو خالق فطرت ہوتا ہے۔ ازل کی ازل سے بھی قبل خالق فطرت نے جو خلق کی، چونکہ اس دوئی میں سے تیسری شے 'وقت' نے جنم نہیں لیا، اس لیے اسے ازل سے قیاس کرنا عبث ہوگا۔ مراد یہ ہے کہ وہ ضد اور دوئی جو شہود میں آئے، یعنی محسوس ہو، وہی ازل ہو سکتی ہے۔ جب کبھی بھی، جہاں کہیں بھی، جس طرح

Marfat.com

بھی اور جوں ہی خالق و مالکِ کُل کائنات (ذاتِ باری تعالیٰ) کو چاہت ہوئی، توں ہی اس کا سایہ بمنزلہ رسالت ہوا، اور جوں ہی سایہ یا عکس رونما ہوا، توں ہی وہ میڈیم آشکار ہو گیا جس پر سایہ یا عکس بنا۔

اگرچہ ہم ہیں، لیکن اپنے ہونے سے بے خبر ہیں، اپنی شناخت و پہچان سے معذور ہیں۔ ان معنوں میں ہمارا ہونا، نہ ہونے کے برابر ہو گا۔ اسی طرح ہم باپ کی صلب میں تھے، مگر چونکہ ہمیں ہمارے ہونے کی خبر نہ تھی، ہمیں اپنی شناخت کا احساس نہ تھا، اس لیے وہاں ہمارا ہونا، ہمارے لیے، نہ ہونے کے برابر ہی تھا۔ اور جوں ہی بشکلِ دوئی اور ضد ہم اپنے باپ کے صلب سے جدا ہوئے، تو اس پہلی تحریک نے ہمارا ازل قائم کر دیا اور اس دوئی کی بنیاد پر ہم منظرِ شہود پر آ گئے۔ ذاتِ باری تعالیٰ بھی اس وقت تک غیب الغیوب یا مخفی خزانہ ہی تھی، جب تک خود اسے اپنے آپ کو پہچاننے کی چاہت نہ تھی۔ لیکن جب اسے یہ خواہش ہوئی تو اپنی خبر و شناخت اسے اپنے ہی سایہ یا عکس میں ہوئی۔ عکس کو دیکھ کر اسے اپنے ہونے، اور پھر اپنی خوبصورتی اور تمام خواص و صفات کی خبر ہوئی۔ یہ عکس وہی تو ہے جس کے متعلق سورۃ النجم آیات ۴،۳ میں ہے: وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی: یعنی میرے عکس اور سایہ کی تمام حرکات و سکنات میری حرکت و سکون سے وابستہ ہیں۔ حتیٰ کہ وہ نطق بھی اپنی مرضی اور خواہش سے نہیں کرتا بلکہ یہ لب کشائی بھی ہماری اقتدا میں ہے۔ سایہ خود کوئی فعل سرانجام نہیں دے سکتا۔ پھر سورۃ الانفال آیت ۱۷ میں فرمایا: فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمۡ ۪ وَمَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی: یعنی آپؐ نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا اور پتھر تو آپ پھینک ہی نہیں سکتے۔ اصل پتھر پھینکنے کا عمل کرے گا تو اس کا عکس وہ حرکات کرتا ہوا نظر آئے گا۔ سورۃ الفتح آیت ۱۰ میں ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡهِمۡ: یعنی جو لوگ آپؐ کی بیعت کر رہے ہیں وہ دراصل اللہ ہی کی بیعت کر رہے ہیں۔ (تو اضع سے کہا جا رہا ہے کہ) اس پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

Marfat.com

عکس بننے کے لیے آئینہ کی شکل میں وسیلہ اور ذریعہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے، جس کو میڈیم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جب تک عکس آشکار نہیں ہوتا، وہ میڈیم بھی غیر معروف رہتا ہے۔ عکس جب اس پر نمایاں ہوتا ہے تو میڈیم ظاہر بھی ہو جاتا ہے اور اس کی اہمیت بھی اجاگر ہو جاتی ہے۔ مگر یہ سارا عمل، یعنی اصل کا عکس بننا اور میڈیم کا ظاہر ہونا، جوں کے توں ہی ہو جاتے ہیں، ان کے درمیان وقت کی کوئی قید نہیں۔ جوں ہی اصل ہوا، توں ہی عکس ہو گیا اور جوں ہی عکس نمایاں ہوا توں ہی میڈیم آشکار ہو گیا۔ اس کی بنیاد ہم آہنگی و یک جہتی ہے۔ اصل، عکس اور میڈیم، دراصل، ایک جیسے فاصلوں اور برابر زاویوں کی ایسی دُوری پر ہیں۔ جہاں ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنا واقعی ناممکن حد تک مشکل ہے۔ یہ ایسی مثلث ہیں جسے ایکووی ڈیسٹنٹ اور ایکووی اینگلڈ (Equidistant , equiangled) کہتے ہیں۔

حافظ سائیںؒ فرمایا کرتے۔ عکس، بمنزلہ رسالت کے ہے، اور میڈیم، ولائیت و امامت کی مانند ہے۔ ولائیت و امامت، جب الوہیت کو اپنے آئینے میں عکس کی طرح آشکار کرتی ہے، تو وہ رسالت بن جاتی ہے۔ دراصل صرف پہچان کے لئے تین نام رکھ دیے گئے ہیں، وگرنہ بادی النظر میں دیکھیں تو تینوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور چونکہ یہ تینوں ایک دوسرے کا غیر نہیں ہیں، اس لئے ان میں نہ تو کوئی ضد ہے اور نہ ہی دوئی کا شائبہ موجود ہے۔ لہذا جب، جہاں اور جیسے یہ تینوں آشکار ہوئے، وہاں ازل نہیں ہوئی۔ کیونکہ ازل دوئی اور ضد کی ابتدا کا نام ہے، اور وقت اسی سے منسلک ہے۔ قرآن کی رُو سے آدم / بشر کی ازل وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِیْ ہے۔ جب اسے دوئی اور ضد بننا آیا، وہیں اس نے اپنی شناخت پائی اور وہیں سے اس کا وقت شروع ہوا۔ تاریخی واقعات اور الہامی کتب کی تصدیقات کی روشنی میں، پہلا آدم قریب ایک ہزار برس زندہ رہا۔ اس کے بعد بنی آدم کی زندگیوں کا تعین بھی چونکہ صرف وقت کی بنیاد پر ہو سکتا تھا، اس لئے وقت جب دوئی یا ضد سے ازل کی شکل میں جدا ہوا، تو اس کی بھی گنتی شروع ہو گئی۔ باقی تمام مخلوقات کی بھی اسی طرح اپنی اپنی ازل ہے، اور جہاں تک قیاس ہے یہ تمام آدم / بشر سے پہلے اس کی معاونت کے لئے موجود تھیں۔ ظاہر ہے موجود تھیں تو ان

Marfat.com

کا ازل بھی موجود تھا۔ اس طرح ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آدم کے ہونے سے قبل کائنات میں ازل موجود تھی اور لامحالہ وقت بھی موجود تھا۔ اگر آدم وقت کو گننے اور ماپنے کے لئے خود نہ تھا، تو ضرور کوئی ایسا ہوگا جو ازل کو تخلیق کرنے والا ہوگا۔ اور آدم کے ہونے تک وقت کو گننے اور ماپنے کا کام کر رہا ہوگا۔ وہی فاطر کہلائے گا۔ کیونکہ ازل ہی فطرت کی ابتدا ہے اور فطرت کا خالق، فاطر کہلاتا ہے۔ یہ نکتہ ضرور مدِ نظر رہنا چاہیے کہ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي کا عمل ذاتِ باری تعالیٰ سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ وہ ذات واجب الوجود عامل نہیں ہے کہ فعلِ نفخ اس سے سرزد ہو۔ اس طرح لازم آئے گا کہ وہ ذات اور آدم ایک دوسرے کی ضد، اور غیر ہوں۔ جب کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا کچھ بھی غیر نہیں۔ اگر کچھ اس کا غیر ثابت ہوگا، تو شرک ثابت ہو جائے گا، جو کفر ہے۔

سورۂ یٰسین آیت ۸۲ میں ہے: اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ: یعنی جب اس کا امر ارادہ کرتا ہے کہ شے ہو جائے تو قبل اس کے کہ وہ کہے ہو جا، ہو چکا ہوتا ہے۔ متذکرہ بالا آیت کے مصداق یہ معلوم ہوا کہ شے کے ہونے سے پہلے ارادہ اور امر موجود ہیں، جو شے نہیں ہیں۔ اگر امر و ارادہ بشکلِ شے (جنس) موجود ہوتے، تو قرآن شے کے ہونے کی تخصیص اس طرح بیان نہ کرتا۔ یقیناً یہ موجود ہیں، مگر شے بھی نہیں اور شے سے بنے بھی نہیں۔ لیکن ہر شے اسی امر و ارادہ سے ہوئی۔ اس امر کے ارادہ نے کُن کہنا چاہا ہی تھا کہ فیکُون ہو گیا۔ یہ ارادہ کی قوت بساط، اور قدرت کا بھی اظہار ہے۔ یہی امر اور یہی ارادہ، اوّل ہے مگر شے نہ ہونے کی وجہ سے ان کا قیاس باقی مخلوقاتِ مادی پر نہ ہوگا۔ یہی فاطر ہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ کُل اسباب کی خالق ہے۔ مگر شے کی شکل کی 'کُل' مخلوقات فطرت کے ذریعے فاطر کے ہاتھوں میں ہونگی۔ بلاشک یہ سمجھ آجائے تو واقعتاً کُل سمجھ آجائے۔ قرآن میں جو عالین کا اشارہ موجود ہے، وہ دوئی اور ضد کی نشاندہی نہیں۔ محمدؐ اوّل مخلوق ضرور ہیں، مگر نہ تو شے ہیں اور نہ ہی شے میں سے ہیں۔ وہ تو محض اللہ کا امر ہیں، جو روحِ کُلی کہلائیں گے۔ اسی طرح اس کا ارادہ ہے جو بمنزلہ ولائیت و امامتِ الٰہی ہے، جسے نفسِ کُلی کہیں گے۔ ان کے ہونے سے ازل نہیں ہوا، کیونکہ ان میں ضد اور دوئی نہیں۔ یہ تو جوں کے توں ہوئے ہیں۔

۱۵۹۷۱۲

Marfat.com

کُل کائنات میں جب سے ازل ہوئی تب سے ہی ضدین موجود ہیں۔ یعنی جوں ہی ضدین ہوئیں ازل شروع ہوا۔ اب وہی ضدین فطرت کے عوامل سے بڑھتی چلی جارہی ہیں اور مزید ضدین جنم لے رہی ہیں۔ یہ لامتناہی سلسلہ ازل سے جاری ہے۔ جب یہ ضدین ختم ہو جائیں گی، تو، ابد کی شروعات ہو گی۔ یعنی ضد کی ابتداء ازل ہے اور ضد کی انتہاء ابد۔ ہم جب سے ہوئے ہیں، ضدین میں گرفتار ہیں اور دو جہانوں کے قائل ہیں۔ ایک خلق کا جہان، یعنی یہ دنیا اور اس سے متعلق تمام مادی سیّارہ جات وستارے واجرام فلکی وغیرہ، تحتُ الثریٰ کی پستی تک ہیں، اور دوسرا وہ، جسے ہم امر کا جہان گردانتے ہیں۔ اس سے مراد آسمانِ اوّل سے اوپر کا جہان ہوتا ہے جہاں جنّت، دوزخ، برزخ، سدرۃُ المنتہیٰ، اعراف اور عرش معلّیٰ تک کی بلندی ہے۔ اپنے شعور کی بنیاد پر ہم یہی دو جہان مانتے ہیں۔ حالانکہ اس کی واضح تصدیق نہیں ملتی کہ آیا یہ فی الواقع ایسا ہی ہے؟ ایک بات بہر طور عیاں ہے کہ خلق کا جہان مادۂ محسوسہ سے بنا ہے، یعنی اس میں جو کچھ ہے وہ دیکھا، سنا، چکھا، سونگھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ امر کا جہان، محسوسات سے وراء ہے۔ وہ نہ تو دیکھا جاسکتا ہے، نہ اس کی آواز سنائی دیتی ہے اور نہ ہی محسوس ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے فی الحال ایمان بالغیب مقرر ہے۔

جب میرا شعور کچھ پختہ ہوا۔ مَیں (محمد اویس افضل) نے غور و فکر اور تجسّس شروع کیا تو معلوم ہوا کہ جہانِ امر، جہاں سے مَیں آیا ہوں اور جہاں کُل لوٹ کر مجھے جانا ہے، وہ تو مجھ سے اربوں کھربوں میل کی مسافت پر ہے اور میرا ایسا غیر اور ایسی ضد ہے، جسے مَیں کبھی پانے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ مزید غور و فکر کے نتیجہ میں ایک راہ سجھائی دی۔ معلوم ہوا کہ جہان دو ہی ہیں، دونوں ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں لیکن ان کے درمیان فاصلہ کم ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر انہیں جہانِ وجود اور جہانِ شہود کی شکل جانوں۔ یہ پہچان ہو جانے پر وہ دونوں جہان، قریب ایک ہاتھ کے فاصلہ پر آگئے۔ شہود کا جہان بمنزلہ خلق کے جہان کے اور وجود کا جہان بمنزلہ امر کے جہان کے۔ اُس امر

Marfat.com

کے جہان کے تمام نشانات یعنی بہشت، دوزخ اور میدانِ عرصات اِس وجود کے جہان میں موجود ہیں۔ سو غور و فکر کا ایک فائدہ ہوا کہ مَیں اپنی دوئی، گمُ تو نہ کر سکا اور اپنی غیریت سے چھٹکارا تو حاصل نہ کر سکا مگر ضدین کے درمیانی فاصلہ کو اس حد تک کم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ بظاہر میری پہنچ میں ہو گئیں۔ حدِ آسمان سے وراء جانا میرے لیے ناممکن تھا اب باطن کا جہان کم از کم قابل رسائی تو ہو گیا۔ یہ علی الہجویریؒ کا احسان ہے کہ ایک سادہ نکتہ سمجھا کر میری ضدین کے اربوں کھربوں میل کے فاصلہ کو سمیٹ کر مُٹھی میں دے دیا۔ یہ بنی نوعِ آدم پر بھی عظیم احسان ہے۔ ابھی ہم کشف المحجوب کو اسی حد تک سمجھ پائے ہوں گے، اس لیے ایسا لکھ رہے ہیں ورگرنہ مکشوفِ وقت، سائیں حافظ اقبالؒ نے اس سے اگلی راہ کی بھی شناخت کروادی۔ فرمانے لگے ڈاکٹر صاحب اپنے غور و فکر اور کشف المحجوب کی روشنی میں تم نے اتنی راہ پالی ہے، اگر میری تحقیق سمجھنے کی کوشش کرو تو امید ہے مزید راہیں ہموار ہوں گی اور نئے افق سجھائی دیں گے۔

یقیناً میرا شعور ناپختہ تھا اس لئے غور و فکر میں کمی رہنے کا امکان موجود تھا۔ انؒ کا شعور کرم یافتہ اور انعام یافتہ ہے۔ اسی عنایت کے صدقہ میں فرمایا جو کچھ کہ تیری ذات کا 'کُل' ہے بلحاظ مماثلت کُل کائنات کا امکانی مظہر (Miniature representation) ہے۔ تیرے کُل میں، مالک و خالق کی کُل کائنات سمٹی ہوئی ہے۔ اس مالک کے دونوں جہانوں کے نشانات، سمٹ کر، تیرے اپنے ظاہر و باطن کی شکل میں موجود ہیں۔ جو ایک ہاتھ کا درمیانی فاصلہ، وجود اور شہود میں محسوس ہوتا تھا، مزید کم ہو گیا۔ اب جہان تو دو ہی موجود ہیں مگر دونوں کے درمیان مسافت باقی نہیں رہی۔ اس طرح دونوں جہانوں کی بلا مسافت سیر ممکن ہو گئی۔ غور و فکر اور تحقیق ہی سے اپنے کُل وجود یعنی کہ دونوں جہانوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ میرے کُل میں آگ، ہوا، پانی اور مٹی خلق کے جہان کے اور روح، نفس اور جسم امر کے جہان کے نشانات ہیں۔ وہ بچہ جو مُردہ پیدا ہوتا ہے، اس میں خلق کے جہان کے تمام نشانات ہوتے ہیں مگر امر کے جہان کے نشانات نہ ہونے کی وجہ سے، نہ تو اس کا کوئی نام رکھا جاتا ہے، نہ جنازہ پڑھا جاتا ہے۔ معلوم ہوا ذاتی شناخت اور پہچان امر کے جہان سے وابستہ ہے۔ اس جگہ ایک

Marfat.com

لطیفہ ہے۔ دوئی ابھی بر قرار تو ہے، ضدین محسوس ہو تو رہی ہیں مگر اس مقام پر آگئی ہیں، جہاں سے ازل شروع ہوا تھا۔ کیا یہاں سے اپنی اصل ایک قدم کا فاصلہ نہیں؟ ہم شروع میں لکھ آئے ہیں دوئی کے ساتھ ہی ازل شروع ہو گیا تھا، حالانکہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ نہایت کم تھا۔ ازاں بعد ملٹی پلیکیشن (Multiplication) سے، دوئی اور ازل کے درمیان کا فاصلہ، بے حد و بے شمار ہو چکا ہے۔ حافظ سائیںؒ کی عطا نے مجھے اسی منزل و مقام پر لا کھڑا کیا، جہاں سے میرا ازل شروع ہوا تھا۔ فخر محسوس کرنے کے علاوہ مَیں اپنے آپ کو خوش قسمت بھی سمجھ رہا تھا۔ مگر مزید وقت گزرنے پر ایک نیا مخمصہ اٹھ کھڑا ہوا کہ اپنے کُل وجود میں کس کو کس کا غیر کہوں؟ کون کس کی ضد ہے؟

حال ہمیشہ محل میں ہوتا ہے۔ حال کے بغیر محل بے کار اور محل کے بغیر حال بے معنی ہوتا ہے۔ اگر مَیں خلق کے جہان کو محل جانوں تو امر کا جہان اس کا حال ہو گا۔ اگر امر کے جہان کی شناخت و پہچان ممکن ہو سکے تو یقیناً ضد نمایاں ہو سکے گی۔ تب حال اور محل جدا کیے جا سکتے ہیں۔

'جب تک امر کے جہان کا نشان نمایاں نہ ہو گا ازل کا نشان نہ ملے گا'۔

۹۔ توحید

حدِ وسعت تک تیرے پھیلاؤ کو توحید کہتے ہیں۔

۱۰۔ اوّل

حضور اکرمؐ کا قول ہے: اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ: یعنی اللہ نے سب سے اوّل میرا نور خلق فرمایا۔ آپؐ نے ایسا اس لیے فرمایا کہ آپ شے سے شے نہیں بنے۔ دنیا میں جتنے بھی نبی، رہبر اور ہادی ہوئے ہیں کسی نے آج تک یہ دعوٰی نہیں کیا۔ حتیٰ کہ جھوٹی نبوت کے کچھ دعویدار تو ہوئے، مگر اوّل ہونے کا دعوٰی کبھی کسی نے نہ کیا، کیونکہ ہر کوئی جانتا ہے اگر وہ اوّل ہونے کا دعوٰی کرے تو اس سے پوچھا

Marfat.com

جائے گا۔ عرش کیسے بنا؟ جبرائیلِ امین کیسے بنے؟ ارض و سماوات کی تخلیق کیسے ہوئی؟ جنّت و دوزخ کیسے معرضِ وجود میں آئی؟ لا محالہ وہ ان سوالات کے جوابات کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ لیکن جو اوّل خلق ہوئے، ان میں سے ایک کوفہ کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھ کر حاضر نمازیوں کو دعوت دیتا ہے کہ: 'پوچھو پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے۔ میں زمینوں اور آسمانوں کے رازوں کا واقف ہوں۔ مجھ سے کائنات میں جس چیز کا چاہو، پوچھ لو'۔

سرکار دو عالمؐ کے اوّل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت سورۃُ الانبیاء آیت ۱۰۷ میں ہے: وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ: یعنی ہم نے آپؐ کو دو جہانوں کی رحمت بنا کر ارسال کیا ہے۔ رحمت ہمیشہ غضب کی ضد ہوتی ہے۔ غضب فنائے اشیاء کا موجب ہے، جبکہ رحمت صرف بقا کی طرف مائل ہو کر ہر شے کا وجود برقرار رکھنے کا باعث ہوتی ہے ۔ حضورؐ کو رحمت اللعالمین فرمانے میں یہی حکمت ہے کہ کُل کائنات یہ جان لے کہ وجودِ عالمین آپؐ ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر انبیاء سابقہ بھی اوّلین ہوتے تو سورۃُ آلِ عمران آیت ۸۱ کے مطابق ہرگز ان سے عہد نہ لیا جاتا۔ ظاہر ہے جس کے لئے عہد لیا جا رہا تھا وہی اوّل ہے۔ عہد تو ہوتا ہی خاص الخاص کے لیے ہے۔ 'خاص الخاص' اوّل بھی ہیں اور بنائے لَااِلٰہ بھی ہیں۔ اس عہد میں جب فرمایا گیا کہ وہ تمہاری کتابوں اور ان کی حکمتوں کی، جو ہم نے تمہیں عطا کی ہونگی، تصدیق کرنے والے ہونگے۔ تو یقیناً تصدیق تو وہی کر سکتا ہے جس کے سامنے واقعہ ہوا ہو۔ سو لازم آتا ہے کہ حضورؐ اس وقت بھی حاضر و ناظر تھے، جب انبیاء کو دیے جانے والے عِلۡمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ آپؐ کے سامنے اور آپؐ کی موجودگی میں ہوا۔ اس صورت میں واضح ہو جاتا ہے کہ ختم المرسلینؐ اوّل ہیں۔

حقیقی اعتقاد کے مطابق خدا، ہمیشہ سے موجود بالذآت ہے۔ اس کی ذات کسی کی محتاج نہیں ہے اور نہ مستعار لی ہوئی کسی صفت سے متصف ہے۔ یعنی جہاں وہ مستغنی بالذآت ہے، وہاں واجب الوجود بھی

Marfat.com

ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے ایک دفعہ کسی شخص نے پوچھا: مَا الدَّلِیْلُ عَلٰی وُجُوْدِاللّٰہِ: یعنی اللہ کے وجود کی کیا دلیل ہے؟ آپؑ نے فرمایا: اَنْتَ الدَّلِیْلُ یعنی تو خود ہی دلیل ہے۔ اس نے سوال کیا، کیسے؟ آپ نے محبت بھرے لہجہ میں فرمایا۔ کیا تو اپنے اختیار سے خود پیدا ہوا تھا، یا تیری پیدائش کا سبب کسی دوسرے کا مرہونِ منّت ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ میں خود پیدا ہوا ہوں، تو پوچھا جا سکتا ہے کہ جیسا ہے ایسا کیوں بنا۔ کسی اور طرح کیوں نہ بن سکا۔ اس شخص نے اعتراف کیا میں نے اپنے آپ کو خود پیدا نہیں کیا۔ امام مسکرا کر فرمانے لگے تو ثابت ہوا کہ تیرے وجود میں آنے کے لئے تیرے سوا، کسی دوسرے کا ہاتھ ہے۔ اس نے پھر تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ آپ نے ایک اشارہ اور دیا کہ جس نے تجھے پیدا کیا تھا، کیا وہ بھی اپنے سوا کسی دوسرے سے پیدا ہوا ہو گا یا اس نے اپنی تخلیق کا سامان خود کیا ہو گا؟ حتّٰی کہ بات ابتدا تک نکل گئی کہ اوّل کہاں سے ہوا، اور کیا اس اوّل کو بھی کسی غیر نے بنایا؟ اگر غیر کسی اوّل کو بنائے تو وہ اوّل، اوّل نہ ہو گا بلکہ وہ غیر اوّل ہو گا جو اس اوّل کے وجود کا سبّب بنے! اس مقام پر آپ نے اسے تخلیقِ کائنات کی بنیاد سمجھاتے ہوئے حدیثِ قدسی بیان فرمائی: کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ: یعنی ذاتِ باری رحمتوں، برکتوں، جُود و کرم اور سخاوتوں کا ایک مخفی خزانہ تھا۔ اسے چاہت ہوئی کہ جو بھی اس کی معرفت کے حصول میں کامیاب و کامران ہو، یہ خزانے ان میں تقسیم کر دیے جائیں ۔ اس مقصد کے لیے اس نے عملِ تخلیق کی ابتداء کی اور سب سے اوّل نُورِ محمدؐ کو پیدا فرمایا گیا۔ یہ سن کر پھر اس شخص نے سوال کیا۔ اَسْئَلُ عَنِ الْکَائِنِ الْاَوَّلِ یعنی اوّل کون بنا؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ھُوَ نُوْرِ جَدِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ یعنی میرے نانا پاک، رسولِ خدا کا نُور، اوّل ہے۔ اس نے پھر استفسار کیا۔ مِنْ اَیِّ شَیْئٍ الْخَلْقُ یعنی وہ کس شے سے خلق ہوا؟ آپؑ نے فرمایا۔ اوّل بھی مان چکے ہو اور پھر بھی کہتے ہو کس شے سے خلق ہوا؟ اوّل تو شے سے خلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں شے اوّل ہو جائے گی۔ اوّل بنتا ہے لَاشَیْءٍ سے۔ اس نے مخمصہ کی حالت میں کہا، شے اور لَاشَیْءٍ میں کیا فرق ہے؟ آپؑ نے ارشاد کیا کہ شے کی تخلیق لَاشَیْءٍ سے ہو سکتی ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ لَاشَیْءٍ کسی شے سے وجود میں آئے۔ اسی لئے جو اوّل بنایا

Marfat.com

وہ لَاشَیْءِ سے خلق ہوا۔ لَاشَیْءِ سے بنایا گیا وہ اوّل نُور، اپنی ازل کے وقت پر شے کا روپ دھار گیا۔ ازاں بعد اُسی 'شے' سے کائنات کی کُل مخلوقات اور اشیاء تخلیق ہوئیں۔ مگر اوّل بہر طور لَاشَیْءِ سے بنا۔ اسی لئے اُس کا قیاس کائنات پر نہ ہو گا۔

حضورؐ فرماتے ہیں اللہ نے اوّل ہمارا نُور بنایا۔ پھر روح کو ساکن کیا۔ روح کی یہ سکونت نُور میں تھی۔ اس عمل کے ہوتے ہی ہم عالم اور ناطق بن گئے۔ علم ہمارے اجزاء میں شامل ہے اور معرفت ہماری روح و نُور کے مل جانے کا نتیجہ ہے۔ اس نتیجہ میں جو پہلا نطق اُس اوّل سے ظہور پذیر ہوا، وہ تھا: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ : یہ تمام حروف اسی کی مخلوق ہیں۔ اُس اوّل نُور کے نطق کی وجہ سے حروف ہوئے، ان کی ترکیب ہوئی اور یہ مراکب ہو کر الفاظ بنے۔ الفاظ کے مجموعہ سے آیات بنیں، آیات سے سورتیں بنیں اور سورتوں کا یہی حاصل، ناطق قرآن کہلاتا ہے! علی الہجویریؒ فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الْاَسْمَاءَ وَالصِّفَاتَ بِالْحُرُوْفِ وَالْحُرُوْفِ بِالْاَصْوَاتِ : یعنی اللہ نے اسماء کو تخلیق فرمایا، پھر صفات کو حروف سے بنایا اور حروف کو صوت یا نطق سے کیا۔ جبکہ نطق، نُورِ اوّل کے اظہار کو کہتے ہیں۔ اگر ناطقِ اوّل نہ ہوتے تو یقیناً قرآن بھی نہ ہو سکتا۔ قرآن دراصل اوّل ُالخلق کی قرأت ہی سے بنا ہے۔ یہ اُن واقعات و مشاہدات و افکار کا اظہار ہے، جو سینۂ رسولؐ میں محفوظ تھا۔ سورۃُ الواقعہ آیات ۷۷ تا ۷۹ میں ہے: اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ : یعنی تحقیق وہ قرآنِ کریم ہے، جو ایک چھپی ہوئی کتاب میں محفوظ ہے، جس کو صرف وہی چھو سکتا ہے، جو مطہر ہو۔ یہ حضورؐ کے سینۂ اطہر کی طرف اشارہ ہے، جہاں سے عملِ قرأت ممکن ہو رہا ہے۔ جبکہ ان مطہر ہستیوں کی شان میں سورۃُ الاحزاب آیت ۳۳ اس طرح رطب اللسان ہے: اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا : یعنی اللہ نے ارادہ کر لیا ہے کہ نجس و ناپاک 'اَهْلَ الْبَيْتِ' سے دور

Marfat.com

رہے اور انہیں طہارت کی انتہائی حد تک پاکیزہ کیا جائے۔ مطہر ذوات جو کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ کو مَس کر سکتی ہیں، فقط اہل بیت ہی ہیں۔

ان ذوات سے جب پوچھا گیا کہ اگر آپ اوّل ہیں تو کیا آپ ہی خالق کائنات ہیں؟ اور کیا آپ ہی کے لیے احدیّت کا اسم روا رکھا جائے؟ تو انہوں نے جواباً فرمایا، ہرگز ایسا نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ذاتِ احدیّت کے ازلی عارف ہیں، مگر ہم اس کی مشیّت و ارادہ اور اذن ہیں اور اس کی قضا و قدر کے وارث ہیں۔ اس ذات احدیّت، واجب الوجود کے لیے، وجود کا ثابت کرنا کفر ہے۔ کسی بھی فعل کا اس سے سرزرد ہونا بعید ہے۔ اس کے تمام افعال کے فاعل اور صفات کے موصوف ہم ہیں۔

۱۱۔ رسالت

پھیلے ہوئے کُل نظام کو چلانے کا طریق، رسالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب سے آدم و حوا ہوئے اور بعد ازاں ان کی نسل افزائش پذیر ہوئی اور اولادِ آدم اپنے ماحول سے مانوس ہو کر روز مرہ کے اسباب کی متلاشی ہوئی، تو اس نے خالق کائنات کے مظاہر کو دیکھنا اور پرکھنا شروع کیا۔ یقیناً اپنی ذات کو نامکمل محسوس کرتے ہونگے، اس لیے اپنے سطحی مشاہدہ اور قلیل تجربہ کی بنیاد پر شہود کے اس جہان میں، کچھ مخلوقات کو اپنے سے بہتر سمجھنے لگے، حتیٰ کہ حاجت روا ماننے لگے۔ اغلب امکان ہے کہ شروع میں بنی آدم، بلندی و رفعت کو مد نظر رکھتے ہوئے پہاڑوں کا مطیع ہوا ہو گا، کیونکہ تب یہ اس کے لئے بظاہر ناقابلِ تسخیر تھے۔ پھر آسمانی بجلی، کڑک اور صاعقہ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا ہو گا، ان کی گرج اور شدید چمک اسے خوف زدہ کرنے کے لئے بہت کافی تھی۔ مگر یہ جان کر کہ پہاڑ جامد قسم کی مخلوق ہے، اور آسمانی بجلی جز وقتی خطرہ ہے، جلد، شد و مد سے رواں دواں دریاؤں اور سمندروں کے پانی کو اپنا دیوتا مان بیٹھا ہو گا، ان کا ہر وقت لبالب رہنا ہے اور سیلاب کی صورت میں اپنا زور دکھانا، ایک ممکنہ وجہ ہو گی۔ مگر جو فطری فوائد پانی سے مخلوقات کو مسلسل حاصل

Marfat.com

ہوتے ہیں یقیناً وہ اس کی سب سے بڑی وجہ ہو گی۔ اس دوران ہواؤں کی تندی و تیزی اس کے آڑے آئی ہو گی کہ جب اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رہی ہو گی، تب اس سے عاجز آ گیا ہو گا۔ اور آخر کار آگ کی مخصوص خصوصیات نے بھی اسے مرعوب کیا ہو گا۔ تاپنے، سینکنے اور پکانے کے علاوہ روشنی کی شکل میں چھپی اس کی خصوصیات اہم بھی تھیں اور حاوی بھی۔ تبھی وہ ان مظاہرِ فطرت کو اپنا دیوتا مان کر ان کی پوجا کرنے لگا ہو گا۔ آگ کے پجاری آج تک سورج کو دیوتا مان رہے ہیں۔ چند مخصوص خوبیوں کی وجہ سے برگ، اک اور پیپل کے درختوں نے بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی ہو گی۔ ہندو جوگ میں برگ، پیپل کی اہمیت آج تک مستند ہے۔ چاہے منطقی وجہ کچھ بھی ہو، بنیادی نکتہ یہی ہے کہ بنی آدم نے تب تک انہیں اپنے سے بہتر جانا اور ان میں اپنے لیے حاجت روائی کے آثار بھی پائے۔

وقت کے ساتھ، بنی آدم تجربہ میں پختگی اور مشاہدہ میں استحکام کی وجہ سے تہذیب یافتہ ہوتا چلا گیا۔ جانوروں کی سی جنگلی زندگی چھوڑ کر معاشرتی ماحول کی طرف راغب ہوا۔ جب ان مظاہرِ فطرت کی تباہ کاریوں اور شدتوں سے محفوظ ہونا سیکھ گیا، تو اس کے دل سے ان مخلوقات کی دیوتائی حیثیت محو ہوتی گئی۔ جب ان مخلوقات کو مسخر کرنے کے قابل ہوا، اور اپنی مرضی کے مطابق ان سے فائدہ حاصل کرنے لگا، تو باقی بطلان بھی ٹوٹ گیا۔ تب بنی آدم فطرت کے ظاہرہ خطروں سے فارغ ہو کر اپنے باطن میں جھانکنے اور من کے روگ محسوس کرنے کے قابل ہوا ہو گا۔ حتٰی کہ ان میں ایک گروہ پیدا ہوا، جسے خالق کو پہچاننے کی تڑپ اور فکر لگی۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ کون اس کائنات کا ناظم و مالک اور مشکل کشا و حاجت روا ہے؟ ہر دور اور ہر وقت میں ہر طرح کے لوگ موجود رہے ہیں۔ تاریخ (History) کے جتنے حوالہ جات بھی آج کے بنی نوع آدم کو میّسر ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فکر اور تڑپ رکھنے والے لوگ بھی ہر دَور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ضرور رہے ہیں۔ گو ان کی تعداد ہمیشہ اقلیت کی مانند رہی اور ان کو مسلسل سختیوں، تکالیف اور آزمائشوں نے گھیرے رکھا، مگر وہ حق شناسی پر قائم رہے اور حاجت روا کی تلاش میں اپنے مشن کو مسلسل بڑھاتے رہے۔ یہ الگ حقیقت

Marfat.com

ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کو حق پرستی کے لئے زیادہ آمادہ نہ کر پائے، بلکہ بہت قلیل تعداد ان کی ہم خیال بن سکی۔ انبیاء و مرسلین اسی گروہ کے بنی نوع آدم کہلا سکتے ہیں۔ ان کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ منجانبِ الٰہی مقرر ہوتے تھے۔ ان کا عمومی طرزِ زندگی اور اندازِ فکر اوائل عمری سے فطری طور پر انہی خطوط پر ہوتا تھا، جن پر آئندہ چل کر اور 'ہدایت یافتہ' نبی اور رسول بن کر، بنی نوعِ آدم کو ہدایت مہیا کرنا ہوتی تھی، تاکہ وہ بھی جان سکیں کہ ان کا 'پروردگار' کون ہے اور ان کی حاجت روائی کیسے ہوتی ہے۔

آدم صفی اللہ سے لیکر نوحؑ تک تمام سابقہ انبیاء و مرسلین مختلف ادوار اور حالات میں، حسب استطاعت، یہ عمل کرتے رہے۔ تاریخی حقائق کی روشنی میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی، حتیٰ کہ ابراہیمؑ مبعوث ہوئے۔ فکری تڑپ نے انہیں تحقیق کے میدان میں بہت دور تک سوچنے اور بہت کچھ دریافت کرنے کی توفیق بخشی، مگر جد الانبیاء اور خلیل اللہ ہونے کے باوجود وہ خرد کی تمام گتھیاں نہ سلجھا سکے۔ ان کا پیغام اتنا بلیغ نہ ہو سکا کہ ان کی قوم اور بنی نوعِ آدم قلبی اطمینان اور من کے ازلی روگ کا مداوا پا لیتے۔ لیکن چونکہ دردِ دل کے حامل تھے اور سچی تمنا رکھتے تھے کہ ایسا ہو جائے، اس لیے انہوں نے خشوع و خضوع کے ساتھ یہ دعا فرمائی، جسے مالکِ کائنات نے سورۃ البقرہ آیت ۱۲۹ میں زینتِ قرآن بنانا فخر سمجھا: رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ: یعنی اے ہمارے رب ان میں (اپنا وہ) رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات تلاوت کر کے سنائے، اور کتاب و حکمت انہیں تعلیم کرے اور ان کا تزکیہ کرے۔ اس آیت کی تفسیر ہماری مراد نہیں۔ مگر بالآخر، ابراہیمی دعا کے مظہر، رسول آخر الزمان، مبعوث ہوئے۔ رسول وہ ہوتا ہے، جسے مالک کائنات باضابطہ شریعت کے ساتھ مبعوث فرما کر رسالات سے سرفراز فرمائے۔ اس کے متعلق قرآن میں چند واضح احکامات موجود ہیں۔ مثلاً

i: سورۃ الاحزاب آیات ۳۸، ۳۹ میں وارد ہے: وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ۙ الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسٰلٰتِ

Marfat.com

اللہِ: یعنی اللہ کے 'امر' اہلیت کی بنیاد پر یہ استطاعت رکھتے ہیں کہ اس کی رسالات کی تبلیغ کرتے ہیں۔

ii: سورۃُ الانعام آیت ۱۲۴ میں ہے: اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ: یعنی اللہ ہی کے علم میں ہے کہ وہ اپنی رسالات کو کیسے اور کہاں مقرر کرے۔

iii: سورۃُ الاعراف آیات ۶۲ اور ۶۸ میں بالترتیب نوحؑ اور ہودؑ فرمارہے ہیں: اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ: یعنی ہم تمہیں اپنے رب کی رسالات پہنچا رہے ہیں۔

iv: سورۃُ الاعراف آیت ۱۴۴ میں آتا ہے: یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِکَلَامِیْ: یعنی اے موسیٰؑ ہم نے آپ کو لوگوں میں سے چن کر اپنی رسالات اور کلام سے سرفراز فرمایا۔

v: حضورؐ کی شان میں سورۃُ الجِنّ آیت ۲۳ میں ہے: اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِسٰلٰتِہٖ: یعنی آپؐ کے ذمہ کرم پر رسالاتِ الٰہی کا پہنچانا ہے۔

یہ تمام حوالہ جات ثابت کر رہے ہیں کہ رسالت اور رسول مختلف ہوتے ہیں۔ رسالت، توحید کی طرف سے ایک پیغام اور منشور ہے جبکہ اس کا حامل، رسول ہوتا ہے۔ توحید اپنے تعارف اور عرفان کے لیے جو وسیلہ مقرر کرتی ہے وہ رسول ہوتا ہے اور اس مقصد کے لئے جو منشور اسے ملتا ہے وہ رسالات کہلاتا ہے۔ گویا رسالات دراصل جزوِ توحید ہے۔ مختلف ادوار میں، اللہ کو اپنی توحید کا تعارف جس طرح کروانا مقصود ہوا، ویسی رسالات عطا فرما کر، بنی نوع آدم کو اس سے ہدایت بھی عطا فرمائی اور اپنا تعارف بھی کروایا۔ خاتم المرسلینؐ کی وساطت سے، بنی نوع آدم کے لیے توحید کو واشگاف بیان کرنا مقصود تھا، تاکہ صدیوں کی تڑپ کو ٹھنڈک میسر آئے اور مَن کے روگ کا شافی علاج ہو سکے۔ چونکہ رسالات کا ثمر یہاں مکمل ہونا تھا، اس لیے مکمل توحید کا اظہار، اس آخری رسالت کی بنیاد بن گیا۔ گویا آخری رسالت جزوِ توحید نہیں، بلکہ بصورتِ توحید تشریف لائی اور جس ہستی کے حصہ میں

Marfat.com

آئی وہ محمدؐ ابن عبد اللہ ہیں۔ محمدؐ، اس رسالاتِ الٰہی کی وجہ سے، جو ان کو تفویض ہوئی، اللہ کے رسول ہیں۔ آپؐ جسم ہیں، رسالات ان کی روح ہے اور سراپا توحید ہے۔ حضورؐ حامل رسالاتِ خداوندی ہونے کے ناطے خود مجسم توحید ہوئے۔ رسالات، جزوِ توحید ہونے کے ناطے ذات باری سے مختلف نہیں ہے۔ اس طرح رَسُوْلُ اللّٰہِؐ بھی دراصل توحید ہی کا حصہ ہیں۔ توحید کے کُل میں سے اس کا اصل، بشکلِ سبحانہ، ایک دوسرے قالب میں ڈھل گیا۔ خالق و مالک کُل کائنات کی توحید کے لیے زمان، مکان اور وقت کی قید نہیں۔ وہ اپنی ذات میں محدود بھی نہیں اور نہ ہی ایسا جسم رکھتا ہے کہ اس میں مقید سمجھا جائے۔ اسکی سمت و جہت بھی مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اپنے تعارف کے لیے اس نے اَوّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ کا عمل کیا، جب اس خلق کو متشکل کیا، تو وہ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ بن گیا، جسے رسول آخر الزمان ہونا تھا۔ مبعوث ہونے پر آپؐ نے دعائے ابراہیمی کی عملی تفسیر بن کر دکھایا۔ اور خود کو کائنات کے لئے نمونہ بن کر پیش کیا، تاکہ منشائے ایزدی کی تکمیل بھی ہو جائے اور آدمیت کے من کے روگ بھی مٹ جائیں۔

حافظ سائیںؒ یہ بیان بہت شوق اور ولولہ سے فرمایا کرتے کہ علیؑ جزوِ رسالت ہیں۔ بی بی سیدہ پاکؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ بھی اسی طرح جزوِ رسالت ہیں۔ یہ بھی نورِ محمدؐ ہی سے ہیں۔ مشہور ہے کہ جب علیؑ کی پیدائش ہوئی، تو انہوں نے نہ آنکھ کھولی اور نہ ہی اپنی والدہ محترمہ کا دودھ پیا، بلکہ رسالتمآبؐ کی تشریف آوری تک اسی حالت میں رہے۔ اس نومولود نے آنکھیں کھول کر اس کائنات میں جس مطہر و کریم وجہُ اللہ کی زیارت فرمائی، وہ آپؐ ہی تھے۔ حضورؐ نے شفقت کے طور پر اپنی زبان، علیؑ کے منہ میں دے دی۔ علیؑ کتنی دیر تک اسے چوستے رہے۔ ازاں بعد اپنی والدہ کا دودھ پیا۔ حضور پر نورؐ کے لعابِ دہن کی تاثیر سے ہفت اقلیم کا علم مولا علیؑ کے سینے میں منتقل ہو گیا۔ اور وہ ایسے ہو گئے، کہ مسجد کوفہ میں بیٹھ کر فرماتے ہیں، کہ میں زمینوں سے زیادہ آسمانوں کے راز کا واقف ہوں۔ سَلُوْنِیْ سَلُوْنِیْ یعنی سوال کرو مجھ سے، قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ یعنی قبل اس سے کہ میں تم میں نہ رہوں۔ کیا کوئی عام شخص

Marfat.com

مسجد کے منبر پر بیٹھ کر ہزاروں اصحاب کے سامنے ایسا دعویٰ کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے جس میں ایسی صفت نہ ہو، وہ یہ جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ چونکہ علیؑ کے علاوہ کائنات میں اور کسی نے ایسی بات نہیں فرمائی، اس لئے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ سچے رازدانِ محمدؐ، وصیِ رسولؐ اور اسرار و رموزِ احدیّت کے واقف ہیں۔ ان کے سینہ میں وہ سب محفوظ ہے، جو حضورؐ کے سینۂ اطہر میں تھا، یعنی الکتاب، جو، لَا رَیْبَ ہے۔ رسالتِ کُلی، پانچ اجزاء کا مجموعہ ہے جن کا پہلا جزو، علیؑ الولی اللہ ہے۔ گویا ولائیتِ کُلی، رسالتِ کُلی یا توحیدِ کُلی کا ہی جزو ہے۔ بالفاظ دیگر، رسالت، توحید کا مظہر ہے اور ولائیت، رسالت کی بنیادی اساس ہے۔ رسالتِ کُلی، توحیدِ کُلی ہے اور ولائیتِ کُلی، رسالتِ کُلی ہے۔ کل تک محمدؐ الرسول اللہ، رسالتِ کُل کے حامل ہیں اور آج علیؑ الولی اللہ ولائیت کُلی کے سرتاج ہیں۔ توحید الٰہی کی تمام شان، اب تا قیامت، ولائیت علیؑ میں ملے گی۔

رسالات کا بنیادی مقصد جن آیات کا مشاہدہ کروانا ہے، وہ یہی پانچ اجزاءِ رسالت ہیں۔ جنہیں خالق کائنات اپنی نشانیاں فرما رہا ہے۔ اس خالق کی تعریف محمدؐ ہیں۔ فطرت، فاطمہؑ بنت رسول اللہ ہیں۔ پہچان اور عرفان، علیؑ الولی اللہ ہیں۔ اس کا حُسن، امام حَسنؑ ہیں۔ اور اس توحید الٰہی کی تحسین، امام حُسینؑ ہیں۔ جو شخص توحیدِ خداوندی کی تعریف، فطرت، عرفان، حسن اور تحسین کا واقف ہو جائے گا، رسولِ آخر الزمانؐ اسکا تزکیہ نفس فرمائیں گے اور اسے علمُ الکتاب اور علمُ الحکمۃ عطا فرمائیں گے۔

۱۲۔ عقل

کُل نظام کو چلانے والی قوت، عقل ہے۔

عقل کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس کے بنیادی معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں۔ کسی فعل کو ہوتا دیکھ کر سمجھنا، غور و فکر کرکے صحیح نتیجہ نکالنا اور غلط کرنے سے رکنا یا منع رہنا عقل ہی کی وجہ سے ہے۔ لغو اور بیہودہ باتوں سے منع رکھنے کا آلہ یا سبب عقل ہی ہوتا ہے۔ حامل عقل مخلوقات کے لئے

Marfat.com

یہ بہت بڑا انعام اور احسان ہے۔ کسی مردِ قلندر کا قول ہے۔: اَلْعَقْلُ الْحُجَّة :یعنی عقل ہی حجت ہے۔ حجت دلیل کی ایک قسم ہے ، جس میں کسی چیز تک راہنمائی اور اس کی وضاحت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ عقل جب مدِ مقابل پر اس طرح حاوی ہو جائے کہ فریق اول فتح یاب ہو تو اسے بالخصوص حجۃ کہتے ہیں۔ اس قول کے مطابق عقل وہ ذریعۂ معلوم ہے جو مکمل پہچان تک راہنمائی کرنے کا باعث بنے۔ اس کی مندرجہ چار اقسام عمومی طور پر مشہور ہیں۔

i: عقل حلولیہ۔ چھوٹے بچے کی عقل کو کہتے ہیں، جس میں وہ رشتوں وغیرہ کی کوئی پہچان نہیں رکھتا۔

ii: عقل بالملکہ۔ کم سن کی عقل کا معیار ہے، جس میں رشتوں کی پہچان ممکن ہوتی ہے، مگر یہ پہچان تحقیق کے بنا ہوتی ہے اور حامل عقل صرف رشتوں کو نام کی حد تک جانتا ہے، ان کی حقیقت نہیں سمجھتا۔

iii: عقل بالعمل۔ باعمل ہو کر اور سیکھنے کے قابل ہو کر میسر آتی ہے۔ اس میں رشتوں اور اشیاء کی اصل حقیقت معلوم ہوتی ہے۔

iv: عقل قدسیہ۔ یہ عطائے مالک ذوالجلال والاکرام ہے اور بالخصوص ارواحِ قدس کا حصہ ہے۔

ہر پیدا ہونے والا بچہ فطری عقل کا مالک ہوتا ہے۔ یہی فطری عقل اس بچہ کی راہنمائی کرتی ہے تو وہ اپنی بھوک مٹانے کے لئے دودھ کے پستانوں کی طرف لپکتا ہے۔ وہاں سے خوراک حاصل کرنے کا طریق بھی اسے اس کی ماں نہیں سکھاتی ، یہ اسی عقل فطری کے تحت میں آتا ہے۔ کسی تکلیف کی صورت میں رو کر اس کی نشاندہی کرنا بھی عقل فطری ہی اس بچہ کو سکھاتی ہے۔ وقت اور تجربہ کے ساتھ شعور کی منازل طے کرتے ہوئے ، بلوغت کے مقام پر پہنچنے تک ، فطری عقل ماند ہو کر شخصی مکر جزوی عقل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں عقل فطری ، مخلوق کے لئے بمنزلہ صحبت باطنی ہے ، جو کسی بھی اول شریعت سے بھی قبل عطا کی گئی ہے۔ صحبت باطنی دراصل وہ عقل ہے ، جو براہ راست اللہ کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس صحبت باطنی کو پائیدار اور مستحکم کرنے کے لیے انبیاء کرام

Marfat.com

تشریف لائے اور پیغاماتِ خداوندی کے تحت اسی عقل کی ترویج کرتے رہے۔ پھر اولیاء اللہ نے بھی مرسلین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے یہی کام کیا۔ معاذ اللہ نبی اور ولی، عقل کے برخلاف تو بنی آدم کی تربیت نہیں فرماتے رہے، وہ تو محض عقل کے تقاضوں کی مدد، نصرت و تشریحات کے لیے تشریف لائے۔ اسی لیے شریعت و عقل میں کبھی تضاد نہیں ہو سکتا۔ وصیِ رسول علیؑ کا ارشاد ہے: كُلَّمَا حُكْمَ بِهِ الْعَقْلِ حَكَمَ بِهِ الشَّرْعُ وَ كُلَّمَا حُكْمَ بِهِ الشَّرْعَ حَكَمَ بِهِ الْعَقْلُ لَوْ اَطَّلَعَ عَلَيْهِ: یعنی عقل کا ہر فیصلہ شریعت کے مطابق اور شریعت کا ہر فیصلہ عقل کے مترادف ہوتا ہے۔ اگر عقل کو شریعت کی مصلحت کی اطلاع ہو تو عقل وہی کہے گی جو شریعت میں موجود ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے عقل کو اطلاع نہ ہو سکے تو نبیِ زماں یا امامِ وقت اس کی اطلاع دینے کا بندوبست کرے گا۔ عقل و شریعت کے فیصلہ میں اختلاف ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن بار بار کہتا ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ، اَفَلَا تَشْعُرُوْنَ، عقل سے یہاں مراد، عقلِ فطری ہے، عقلِ شخصی ہرگز نہیں۔

عقل فطری کیا ہے؟ کسی بھی مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندو یا مجوسی سے اگر سوال کیا جائے کہ ظلم و ستم، جبر و تشدد اور ناانصافی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے، تو فوراً کہے گا یہ بہت برے افعال ہیں۔ جبکہ عدل و انصاف کو بہترین صفت بتائے گا۔ سچ اور جھوٹ میں سے جھوٹ کو برا کہے گا اور سچائی کی تعریف کرے گا۔ اب تقاضائے عدل و انصاف یہی ہے کہ جو ظالم نظر آئے تو اس کی برائی ہو اور عادل کی تعریف کی جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اچھائی اور برائی عقل سے ثابت نہیں ہوتی ہے، بلکہ یہ فرق صرف شریعت کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ شریعت جس کام کو اچھا کہے اس کو اچھا مانو اور اگر برا فعل کہے تو اس کو برا جانو، چاہے عقل اس کے خلاف ہی کیوں نہ کہے۔ یہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ علیؑ فرماتے ہیں اچھائی اور برائی میں فرق صرف عقل ثابت کر سکتی ہے، شریعت اس فرق کی تشریح کرتی ہے۔ شریعتیں پہلے بھی موجود رہی ہیں لیکن صرف عقل ہی حجّت سے ثابت کرتی ہے کہ اسلام کی شریعت افضل و اکمل ہے اور دینِ اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہونے کی وجہ سے ہی پسندیدہ

Marfat.com

الٰہی ہے۔ اللہ کے تمام فیصلوں کو اگر پرکھا جائے تو وہ عین عقل کے مطابق ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ ممکن ہوتا کہ وہ کسی نبی کو جہنم میں ڈال دیتا اور فرعون و نمرود یا ہامان و شدّاد جیسے زندیقوں کو جنتی بنا دیتا۔ اللہ سے ایسا سرزد ہونا کبھی تصور بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اپنی شان کے لحاظ سے وہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ عادل بھی ہے۔ اور عدل کرنے کے لیے عقل کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اس لئے یہ دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ عقل کو حجّت تسلیم نہ کریں تو دنیا میں کھلبلی مچ جائیگی۔

حافظ سائیںؒ فرمایا کرتے، جو عقل و آگہی تمہیں میّسر آتی ہے اب وہی تمہارے لئے رسول کی مانند ہے۔ یعنی اگر عدل و رسالت باطن میں ہو تو عین عقل ہو گی اور اگر عقل مجسم و متشکل ہو تو وہ عین رسول ہو گا۔ عقل کا فیصلہ رسول کی شریعت کے خلاف نہیں ہوتا اور شریعتِ نبی کا کوئی فیصلہ عقل کے برخلاف نہیں ہو سکتا۔ نفوس میں جو عقلیں ہیں، وہی راہ نما و راہبر ہیں۔ عقلیں اس معاملہ میں شاق ہوتی ہیں کہ تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ یہ ہر قدم اور ہر لحظہ راہنمائی کرتی رہتی ہیں کہ ایسے افعال نہ کرو جن سے خفگی اور نقصان اٹھانا پڑے۔ یہ حریص بھی ہیں جو بمعنی لالچ نہیں، بلکہ ازداد کے معنوں میں ہے۔ عقلیں چاہتی ہیں کہ تمہیں مزید آگہی میسّر آئے، مزید منزلیں طے ہوں اور مشاہدات میں مزید ترقی آئے، حتیٰ کہ تم ذات احدیت کے عارف بن سکو۔ اور اگر کوئی اس پر ایمان لے آئے تو یہی فراست رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ بن جاتی ہے۔ اس سے منہ موڑنے اور ماننے سے انکار کرنے والا اپنا ہی خسارہ کرتا ہے۔ جب سے علمائے ظاہر نے دین سے عقل کو بے دخل کیا ہے، اور اس باطنی رہنما کی بے قدری کی ہے، سادہ لوح لوگوں کے لئے کئی مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور دین اسلام کو سمجھنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ علیؑ فرماتے ہیں، 'رسول وہ عقل ہے جو ظاہر میں تبلیغ کرتا ہے اور عقل وہ رسول ہے جو باطن سے راہنمائی کرتی ہے'۔ یعنی راہنما سامنے ہو تو رسول ہوتا ہے اور پردہ میں ہو تو عقل ہوتی ہے۔ معرفت کے لیے پہلی منزل ہی عقل ہے کیونکہ غیب پر ایمان صرف عقل کی راہنمائی سے ممکن ہو گا۔

Marfat.com

وہ غیب الغیوب ہستی کبھی دیکھی نہیں جاسکتی۔ اگر غیب پر ایمان نہ ہو تو کوئی اس ذات کی کیا معرفت کرے گا جو نہ کھلی آنکھوں سے نظر آئے اور نہ خواب میں دکھائی دے۔ اگر کوئی خواب میں اسے دیکھنے کا دعویدار ہو، تو بھی اس نے اللہ کو نہیں دیکھا۔

توحید کے بعد رسالت بھی آنکھوں سے دیکھ کر نہیں مانی گئی۔ جن صحابہؓ کو دورِ مصطفویؐ میسر آیا، ان کے بخت نصیب میں رسولؐ کے روئے مبارک، زلفِ مبارک اور دندانِ مبارک وغیرہ کی زیارت تو تھی، رسالت ان کے سامنے نہ تھی، کہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے۔ جبکہ ایمان رسالت پر لایا جاتا ہے، روئے مبارک اور گیسوئے مبارک پر نہیں۔ وحی، جبرائیلؑ اور رسالت کبھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ یہ سب کچھ تو رسولؐ کی زبان و فرمان پر اعتماد کے تحت مانا گیا۔ آنکھوں سے دیکھ کر منوانا ذات باری کا مقصود ہوتا، تو اعلانِ رسالت کے لئے چالیس برس انتظار کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ وقفہ زبان کا اعتبار قائم کرنے کے لیے تھا، کہ عوام النّاس عقلی طور پر صادق و امین تسلیم کر لیں۔ ازاں بعد حقانیتِ رسالت پر ایمان ان کے لئے آسان ہوا۔ قیامت بھی دیکھنے میں نہیں آتی، آنکھوں سے دیکھنے کو ملے تو واقعتاً قیامت ہو جائے۔ قیامت کے علاوہ صراط، میزان، نامۂ اعمال، بہشت اور دوزخ کو بھی بن دیکھے، رسول اللہؐ کے کہنے پر مانا جاتا ہے۔ جس مصدّق رسولؐ کے کہنے سے اس سب پر ایمان لائے اگر اسی کو نہ مانا تو ایمان باطل ہو گا۔ رسولِ ظاہرؐ کے پردہ فرمانے کے بعد اگر رسولِ باطن یعنی عقل کو نہ مانا جائے تو غیب کو ماننے کا کوئی اور ذریعہ باقی نہیں بچتا۔ اگر عقل کی اہمیت نہ ہوتی، جیسا کہ کم فہمی کی وجہ سے اکثر سمجھا جاتا ہے، تو مافوق العقل تکلفِ شرعی سے بری نہ ہوتے۔ عقل دراصل سرمایۂ معرفت ہے۔ اسی لئے بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں: لَا دِینَ لِمَن لَّا عَقلَ لَہٗ۔ یعنی بے عقل کو دین میں حصہ نہیں۔

غلط، بے ربط یا قبیح کام سرزد ہونے کی بنیاد جو ممکنہ وجوہات ہو سکتی ہیں وہ لاعلمی، احتیاج اور مجبوری ہیں۔ علم توحید کی رُو سے، خدا کے لیے یہ تینوں باتیں کسی قیمت پر روا نہیں۔ پھر بھی اس کے متعلق کہنا

Marfat.com

کہ اس نے کُل کائنات اور مخلوقات ایک اندازہ سے بنائیں، ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ چونکہ اللہ عالم بھی ہے اور عادل بھی، اس لیے وہ جس کے بارے میں عدل، حکمت اور قدر کی بنیاد پر فیصلہ دیگا کہ اُس کا کام، میرا کام، اُس کا فعل، میرا فعل، اُس کی اطاعت، میری اطاعت، اُس کی بیعت، میری بیعت، اُس کی محبت، میری محبت، اُس کی مخالفت، میری مخالفت، تو یہ فیصلہ عین عقل و شریعت کے مطابق ہو گا اور ہمیں لازماً تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ 'معصوم' ہے۔ اُس سے بھی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ جابر ابن حیانؒ، جو امام جعفر صادقؑ کے شاگرد تھے، کہتے ہیں کہ تمام انواع و اجناس خواہ لاہوتی ہوں، جبروتی ہوں، ملکوتی ہوں یا ناسوتی ہوں، ان کی حدیں مقرر ہیں۔ ایک کا قیاس دوسرے پر کرنا زیادتی ہو گا۔ نوع جانور کو آدم جیسا نہ جانو، تمام آدمیت کو خاص انسان کے مطابق نہ سمجھو۔ امتی کو نبی کے برابر نہ مانو اور نبی کو امت کے مترادف نہ کہو۔ اس معاملہ میں بھی عقل ہی راہنمائی کر رہی ہے۔ جن لوگوں نے قرآن کے علاوہ سب کچھ چھوڑنے کا اعلان کیا تھا، انہوں نے عقل کی بھی نفی کر دی۔ حالانکہ جس قرآن کو کافی کہا گیا تھا اس میں بار بار عقل، فہم، شعور سے کام لینے کی ترغیب موجود ہے۔

۱۳۔ وحی

وحی وہ احکاماتِ خداوندی ہیں جو بنی نوعِ آدم کی اصلاح و راہنمائی کے لئے انبیاء و مرسلین کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔

اصطلاحاً عربی زبان میں 'و' قسم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس میں یقین اور التزام پایا جاتا ہے۔ 'حی' زندہ یا زندگی کو کہتے ہیں۔ اس لئے ان دونوں الفاظ کے مجموعہ میں شرطیہ حیات نو یا حیات جاوداں کا تصور پایا جاتا ہے۔ کائنات میں پہلے سے رونما ہو چکے کسی اور واقعہ سے اس کی مماثلت اور اشتراک نہیں ہوتا۔ یہ جب بھی ہوتی ہے اس میں اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ جس پر وحی ہوتی ہے اس نے کبھی

Marfat.com

گمان بھی نہیں کیا ہوتا کہ ویسی حالت وارد ہو سکتی ہے۔ اس کے متعلق کہیں ذہن کے کسی گوشہ میں ایک تصوراتی نقشہ بھی نہیں بنایا جاسکتا، کہ کوئی کہنے والا کبھی دعویٰ کر سکے کہ شاید آنے والے وقت میں اس کے ساتھ وہ کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ وحی کا ایک اچھوتا اور منفرد اعزاز ہے۔

وحی بھیجنے والا، ہمیشہ مالک و خالق کُل کائنات ہو گا۔ وحی جس کی طرف بھیجی جائیگی، وہ لازماً اس ذات لم یزل کا منتخب اور مقرر شدہ پیغمبر ہو گا اور وحی لانے والا ہر حال میں جبرائیلؑ امین ہو گا۔ اب اگر کچھ بھیجا گیا ہو، بھیجنے والا حق تعالیٰ خود نہ ہو' مگر بھیجا رسول ہی کی طرف جارہا ہو اور لانے والا امین ہی کیوں نہ ہو۔۔ یہ وحی نہ ہو گی۔ اسی طرح بھیجنے والا اللہ تعالیٰ ہو' لانے والا امین ہو مگر جس کی طرف بھیجی جارہی ہو' وہ رسولِ مقرر نہ ہو۔۔ تو بھی یہ وحی نہ کہلا سکے گی۔ اور اگر بھیجنے والا خدا تعالیٰ ہو، رسولِ منتخب کی طرف بھیج رہا ہو' مگر لانے والا جبرائیل امین نہ ہو۔۔ تو بھی اسے وحی کہنا غلطی ہو گا۔ مختصر یہ کہ جب ان تینوں (۳) باتوں کی تخصیص ثابت ہو جائے تو لازم آئے گا کہ وحی ہے، بصورتِ دیگر کسی بھی طرح اس کا اطلاق ناممکن ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کر دے کہ میں نے کسی امین کے ہاتھ اپنے دوست کو پیغام بھیجا ہے اور پھر اسے وحی کے نام سے تعبیر کرے تو یہ مضحکہ ہو گا۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ بھیجنے والی ذات 'ذاتِ الٰہی ہے' جس کی طرف بھیجی گئی وہ رسولؐ ہے اور جو لیکر آیا وہ جبرائیل امینؑ ہے، اسے وحی کا نام دینا عبث ہوتا ہے۔ اس کے مترادف، جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، جس وقت، جہاں اور جیسے ہی یہ باور ہو جائے کہ ذاتِ الوہیت نے، مقرب جبرائیل امینؑ کے ہاتھ اپنے منتخب شدہ پیغمبر کو پیغام بھیجا ہے تو یہ بلاشک وحی کہلائے گی۔ یہ تحریری الفاظ کی شکل میں بھی وارد ہوتی رہی ہے اور صوتی الفاظ کی شکل میں بھی اس کی تنزیل ممکن ہے۔ موسیٰ کو جو چالیس (40) الواح بشکل وحی میسر آئیں وہ تحریری الفاظ میں وحی کی مثال تھی۔ اغلباً داؤدؑ کو عطا کی گئی زبور اور صحائفِ ابراہیمیؑ بھی تحریری الفاظ میں ارسال کی گئیں تھیں۔ لیکن عیسیٰؑ پر نازل کی گئی انجیل اور محمدؐ کے لئے آشکار کیا گیا لازوال اور معجزاتی قرآن صوتی الفاظ کی شکل میں منتقل کیا گیا۔

Marfat.com

وحی، جب صاحب وحی تک پہنچادی جاتی ہے تو وہ نبی رسول اس میں موجود تمام حقائق کا خود بخود عارف ہو جاتا ہے۔ عام آدمی کی طرح طبعی دنیا میں دریافت کے لیے اسے جستجو اور کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ سادہ الفاظ میں یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ وحی میں جو فرمان یا احکامات موجود ہوتے ہیں 'وہ آشکار کر کے پیغمبر کو اس طرح مشاہدہ کروا دیے جاتے ہیں کہ شک و شبہ کا پہلو مفقود ہو جاتا ہے۔ ایک اور عطیہ حصولِ وحی میں یہ بھی ہے کہ جب یہ ایک مرتبہ یسر آجاتی ہے تو ازاں بعد قیامت تک اس کے محو ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح جو حقائق وحی کی وساطت سے مرسلین کو باور کروائے جاتے ہیں، عقلِ آدم کے لیے اس تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ لغوی طور پر لفظ وحی کے کچھ اور ممکنہ مطالب بھی ہیں۔ جیسے حکم کرنا، کتابت کرنا، لکھنا، تیزی سے اشارہ کرنا، کسی دو کا علیحدگی میں خفیہ گفتگو کرنا اور ایلچی بنا کر بھیجنا۔ پیچھے کی گئی بحث میں یہ تمام مطالب بھی مضمر ہیں۔ چونکہ قرآن پاک میں تیس (۳۰) پاروں، ایک سو چودہ (۱۱۴) سورتوں اور چھ ہزار (۶۰۰۰) سے زائد آیات کی شکل میں جو کچھ نازل فرمایا گیا 'اب زمانہ میں تا قیامت 'وحی کی فقط وہی اصل حالت ہے، جسے تحریر کر کے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں تخریب و تحریف اس لیے ممکن نہیں کہ نازل کرنے والے نے اس تکمیل شدہ آخری وحی کو خود اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے۔ اس وحی کا اول اظہار صوتِ نطق کے ذریعہ سے کیا گیا۔ سننے والوں میں بھی تائید ایزدی سے یہ خوبی پیدا ہو گئی کہ ایک مرتبہ سن کر انہیں حفظ ہو جاتی اور پھر اسے لکھ لیا جاتا، حتیٰ کہ آخر کار کُل وحی، ایک مکمل قرآن الکریم کی شکل میں کتابت شدہ موجود ہو گئی، جو ہمیشہ کی راہنمائی اور ہدایت ابدی کا پیغام ہے۔

قرآن میں 'وحی' کا لفظ کئی مختلف انداز سے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً انبیاء و مرسلین کے ضمن میں ہے:۔

Marfat.com

i: سورۃ النجم آیت ۱۰ :فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَاۤ اَوْحٰی: یعنی اپنے بندہ کی طرف وحی کی گئی جو وحی کہ کی جانی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وحی بھیجنے والا کسی پابندی کے تحت یہ عمل نہیں کرتا۔ جو، جب اور جیسے اس کی ازلی منشاء میں ہوتا ہے اسی منشور پر عملدر آمد کرتے ہوئے اسے جاری رکھتا ہے۔

ii: سورۃ النساء آیت ۱۶۳ :اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ: یعنی ہم نے آپؐ کی طرف وحی کی جیسی پہلے نوحؑ اور ان کے بعد کے انبیاء پر وحی کی۔ اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ پر ہم ہی نے وحی کی۔

iii: سورۃ الاعراف آیت ۱۱۷:وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰی: یعنی ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی۔

مگر قرآن میں وحی کا لفظ بظاہر حضراتِ انبیاءؑ کے علاوہ بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے:۔

i: سورۃ القصص آیت ۷ میں موسیٰ کی والدہ محترمہ کے لیے: وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوْسٰی: یعنی ہم نے موسیٰ کی والدہ کو وحی فرمائی۔

ii: سورۃ آل عمران آیت ۴۲ میں عیسیٰؑ کی والدہ محترمہ کے لیے: وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ: یعنی جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریمؑ تحقیق اللہ نے آپ کو چُن لیا ہے اور پاک کر دیا ہے۔

iii: سورۃ المائدہ آیت ۱۱۱ میں عیسیٰؑ کے حواریوں کے لیے: وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ: یعنی جب حواریوں کی طرف وحی کی گئی۔

Marfat.com

ان تمام اور اس جیسے دوسرے مقامات پر وحی کے لغوی مطالب کو قریب رکھا گیا ہے۔ انبیاء کی ماؤں کو وحی یا تو نبی کی وساطت سے ہوتی ہے یا پھر لازما نبی کی موجودگی میں ہے۔ مریمؑ کو جب وحی کی گئی تو عیسیؑ اس وقت رحم مادر میں تھے۔ اسی طرح حواریوں کو وحی بھی عیسیؑ کی معرفت ہو رہی ہے۔ ان کی رفعت کے بعد ان کے حواریوں میں سے کسی سے وحی کا تعلق برقرار نہیں رکھا گیا۔

iv: سورۃ النحل آیت ۶۸ میں شہد کی مکھی کے لیے: وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ: یعنی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔ وحی کا یہ انداز قابلِ غور ہے۔ شہد کی مکھی کی نہ تو کسی نبی سے نسبت ہے اور نہ ہی وہ خود درجۂ نبوت پر فائز ہے۔ مگر پھر بھی نص قرآن کے مطابق اس کو وحی کی گئی ہے۔ فلسفہ قرآن میں غور و فکر کرنے والے ایک طالب علم کی حیثیت سے کچھ گذارشات پیش ہیں۔

iv(i)۔ ممکن ہے شہد کی مکھیوں کے عالم (جہان) میں قدرت کاملہ نے ان کی راہنمائی کے لیے، ان کی ضرورت اور فہم کے مطابق کوئی "سلسلۂ نبوت" کیا ہو۔ یا فقط ایک ہی نبی، شہد کی مکھیوں کے جہان میں بھیجا ہو اور اس سے بذریعہ وحی جو کچھ مراسل ہوا، اس میں سے ایک آیت کو قرآن کی زینت بنا کر اس ایک بہت بڑی حقیقت کو مسلمہ کر دیا گیا ہو۔

iv(ii)۔ بنی آدم کے انبیاء میں سے کسی نبیؑ کو یہ اعزاز بخشا گیا ہو، کہ وہ شہد کی مکھیوں کے جہان سے رابطہ کر سکتا ہو۔ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ وہ ان کی زبان سمجھتا ہو۔ اس نبیؑ نے انہیں منشاء ایزدی سے جو کچھ تربیت فرمایا ہو، اسکا کچھ حصہ قرآن میں شامل کر دیا گیا ہو، تاکہ یہ حقیقت آشکار ہو سکے کہ اس جہان میں کچھ بھی عبث نہیں۔ سورۃ النمل کے مطابق نہایت چھوٹی اور حقیر مخلوق کیڑیاں (نمل) آپس میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان کی سردار نے اپنے قبیلے کی باقی کیڑیوں کو جب حکم صادر کیا، تو اس کی آواز کو وقت کے نبی سلیمانؑ نے بھی سنا اور مسکرائے۔ ظاہر ہے سن کر سمجھا

Marfat.com

ہو گا، تبھی چہرے پر مسکراہٹ جیسا تغیر آیا ہو گا۔ وگرنہ نہ سمجھی جانے والی آوازوں پر عموماً حیرت کا اظہار ہوتا ہے، مسکراہٹ کا نہیں۔ اگر کیڑی (نمل) گفتگو کر سکتی ہے اور اس کی زبان وقت کے نبیؑ سمجھ سکتے ہیں، تو شہد کی مکھی (نحل) کی قوم کو حضور کریمؐ کی وساطت سے پیغامِ وحی بھیجا جانا عبث نہیں۔

(iii)iv۔ نحل، شہد کی مکھی کی بجائے، اس سے متعلق خاصیتوں کا حامل ایک مستند کردار ہو۔ بندگان الٰہی میں سے وہ اصحاب جو محنتِ شاقہ سے 'بکھرے ہوئے 'رزقِ خداوندی' تک پہنچتے ہیں اور نہایت خوبی سے اس میں سے اپنا ضروری حصّہ اس طرح اخذ کرتے ہیں کہ باقی ماندہ لوگوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ بہت سی مختلف جگہوں سے اسی انداز سے سیر ہوتے ہوئے، آخر کار ان مختلف اجزاء کو باہم ایک ایسا مرکب بنا دیتے ہیں جو شِفَآءٌ لِلنَّاسِ کی خاصیت رکھتا ہے۔ یہ لوگ گلی گلی، کوچہ کوچہ، بستی بستی، نگری نگری اس نرمی سے طے کرتے ہیں کہ آہٹ بھی نہیں ہوتی۔ اپنی ضرورت کے خوشنما پھولوں تک رسائی کرتے ہیں، ان کے حاصل تک اس خاص طریقے سے پہنچتے ہیں کہ کوئی نشان بھی نہیں چھوڑتے۔ کچھ رس اس پھول سے، کچھ خوشبو اُس ٹہنی سے اور کچھ انعامات اس شجر سے پالینے کے بعد، سب کو اس طرح قوام کر دیتے ہیں کہ ایک نئی مرکب شکل بن جاتی ہے۔ وہ جب اس مرکب کو کائناتِ شہود میں ظاہر کر دیتے ہیں تو وہ خاص و عام کے لیے فائدہ و برکات کا باعث ہو جاتی ہے۔ علی الہجویریؒ کی کشف المحجوب کے علاوہ ایسی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ کیا وہ 'نحل' اللہ کے ہاں اتنا رتبہ نہیں رکھتے ہونگے کہ پیغمبر آخر الزماںؐ کے صدقے ان کو بھی وحی کر دی جائے؟ حالانکہ کہا جاتا ہے وحیٔ قرآن میں 'ابو جہل کا ذکر ہے، ابو لہب کو خطاب ہے، کفار و مشرکین و منافقین کے لئے وعید ہیں!

Marfat.com

۱۴۔ آدم

i: آدم اور بنی آدم کا ذکر قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اغلب خیال ہے کہ آدم یا آدمؑ وہ اوّل نبی یا تہذیب یافتہ مخلوق (species) ہیں، جن سے خالق و مالکِ کُل کائنات نے اپنی نسبت بنائی، اور روئے زمین کی تمام تر رنگینیوں کا آغاز ان ہی کی بدولت فرمایا گیا۔ بلکہ زمین میں اُسی آدم کو 'اپنا' خلیفہ نامزد کرنے کا اعلانِ برملا بھی قرآن میں ملتا ہے۔ لغوی طور پر اَدَم کے معنی گندمی رنگ کے لیے جاتے ہیں۔ ویسے اس مصدر میں مل جُل کر رہنے کا، اور آپس میں باہمی روابط رکھنے کا مفہوم بھی نمایاں ہے۔ اسی بنیاد پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدم کوئی مخصوص شخصیت نہیں، بلکہ کل آدمیت کو، کردارِ آدم کے رنگ میں بیان کیا جاتا ہے۔ یقیناً کردارِ آدم کی کوئی ابتدا تو ہو گی، یہ کہیں سے تو رواں ہوا ہو گا۔ اُس ابتدائی کو آدم یا آدمؑ کہہ بھی لیا جائے تو بظاہر کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر آدم سے مراد کُل آدمیت بھی لی جائے تو غلط نہیں، اس میں ہر آدم متصور ہو گا۔ اور کوئی بھی آدم یا خود آدمؑ اس میں خود بخود شامل ہو جائیں گے۔

ii: ویسے دیکھنے میں یہ اسم دو حرفوں کا مجموعہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی آ (آنے کا مفہوم) اور دَم (سانس۔ خون۔ زندگی وغیرہ)۔ اس طرح بھی اس لفظ میں کسی ایسی مخلوق کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے جس میں سانس اور خون وغیرہ آموجود ہوئے ہیں اور یہی اس کی زندگی کا باعث بھی بن گئے ہیں۔ یہ مفہوم قرآن میں اس فصاحت سے موجود نہیں اس لیے یہاں اس کا اشارہ ہی کافی ہے۔ ویسے آ اور دم کا امتزاج یہ اشارہ بھی کرتا ہے کہ اوّل یہ موت کی حالت میں تھا، پھر اس میں دم، آموجود ہوا، جس کی بنیاد پر اسے زندگی سے ہمکنار کیا گیا۔ جب قضاۃ کا حکم دیا جائے گا تو یہ دم پھر سے نکل جائے گا اور دوبارہ موت وارد ہو گی۔ اس دوسری موت کو آخرکار، دوسری دفعہ زندگی عطا کر کے قیامت کے بعد میدانِ حشر میں حساب کتاب کا عمل ہو گا اور پھر ابدی زندگی سے ہمکنار کیا جائے گا۔

Marfat.com

(i)ii: سورۃ البقرہ آیت ۲۸ اس کی تصدیق ہے: كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: یعنی کیونکر انکار کرسکتے ہو حالانکہ تم حالتِ موت میں تھے، تمہیں زندگی دی گئی، پھر تم موت سے دوچار کیے جاؤ گے اور آخر کار پھر سے زندہ ہو کر اس کی طرف رجوع کرو گے۔ عام طور پر تسلیم کی جانے والی تین مدراج والی حالت کہ ہم زندہ ہیں، مر جائیں گے تو آخر کار دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، کی بجائے چار مدارج کا ذکر ہے۔ اس نصِ قرآن سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ آدم، بحیثیت مخلوق موجود ہونے سے قبل، حالتِ موت میں، کسی 'صُلب' میں تھا۔

(ii)ii: سورۃ النساء آیت ۲۳ میں آتا ہے: اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ: یعنی تمہارے وہ بیٹے جو تمہاری پیٹھ (صلب) سے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ آدم اس جہان میں آموجود ہونے سے قبل، جب کہ وہ حاملِ شعوری زندگی ہو سکے، کسی صلب میں موجود تھا، اور اول الذکر آیت کے مصداق، موت کی حالت میں تھا۔

iii: بالا توضیحات میں ایک نقطہ نمایاں ہوتا ہے کہ آدم زندگی سے وابستہ ہے اور آدم کی زندگی (دَم) اس کے خالق کی نگاہ میں قابلِ تعظیم ہے۔ باقی ماندہ تمام مخلوقات (species) بھی حاملِ زندگی ہیں مگر ان کے دَم' چیزے دیگر است'۔ محسوس ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات نے زندگی کو بہترین طریق سے جس مخلوق میں سمویا ہے وہ آدم ہی ہے۔ دراصل حیات و ممات کا تصور کائنات میں آدم ہی کی وجہ سے ہے۔ باقی تمام چھوٹی بڑی مخلوقات، آمدن، نشستن، برخاستن (recycle bin) کا حصہ معلوم دیتی ہیں۔ جب کہ بنی آدم کی صرف ہاتھوں کی انگلیوں کے نشانات (finger prints) اس احتیاط سے وضع کیے گئے ہیں کہ آج سائنسی تحقیق یہ ماننے پر مجبور ہے کہ آٹھ نسلوں (generations) کے بعد کسی دو آدم زاد کے یہ نشانات ایک دوسرے سے منطبق ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ آنکھوں کی

Marfat.com

اندرونی پتلی (retina) کی بناوٹ، ہاتھوں کے نشانات سے بھی زیادہ مخصوص ہے۔ آجکل مہذب ملکوں میں شناخت کا یہ اچھوتا طریق استعمال ہو رہا ہے کہ آنکھ کی پتلی (retina) کا عکس (scan) لیا جاتا ہے۔

اس آدم کی ظاہرہ بناوٹ ہی ناقابل یقین حد تک اچھوتی ہے اور اگر نہ نظر آنے والے (invisible) اندرونی اعضاء پر غور و فکر کیا جائے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ اب قابل عمل ہے، بہت باریک خوردبینی مشین (microscope) سے ایسے حقائق دریافت کئے گئے ہیں، جن کی بنیاد پر DNA کی بناوٹ بھی کسی کی شناخت کا سبب بن سکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم کی تخلیق خالق نے بالقدر (planned) اور بامقصد (purposefully) کی ہے۔ وہ مخلوق کیوں بامقصد اور مخصوص نہ ہوگی جس کو سنوارنے میں اتنی احتیاط کی گئی ہو اور اتنے اہم نکات مد نظر رکھے گئے ہوں۔ جو تخلیق آدم کے صدیوں بعد تحقیقات کی بنیاد پر آہستہ آہستہ واضح ہو رہے ہوں اور ان کے فوائد اور مقاصد سمجھ آ رہے ہیں۔

(i)iii: سورۃ البقرہ آیت ۳۱ میں ہے: وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا: یعنی آدم کو کل اسماء کا علم عطا کیا گیا۔ زیور علم سے آراستہ کر کے آدم کو باقی مخلوقات، حتیٰ کہ ملائکہ سے بھی ممتاز کیا گیا۔ ملائکہ نے تو مناظرہ کے بعد گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

(ii)iii: سورۃ البقرہ آیت ۳۷ میں ہے: فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ: یعنی آدم کو اس کے رب کی طرف سے کلمات القاء ہوئے۔

(iii)iii: سورۃ البقرہ آیت ۳۵ کے مصداق: وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ: یعنی ہم نے کہا کہ آدم تو اور تیری زوج جنت کو مسکن بناؤ۔ اور سورۃ البقرہ آیت ۳۶ کے مطابق: وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ

Marfat.com

مُسْتَقَرٌّ: یعنی تمہارے لئے زمین میں کچھ مدت ٹھہرنا ہے۔ یہ دونوں آیات ثابت کرتی ہیں کہ آدم کا ٹھکانا جنت بھی ہے اور آدم زمین میں بھی معین وقت کے لیے ٹھہرتا ہے۔ قرآن کی رُو سے کسی اور مخلوق کے لیے رہنے کی کوئی خاص جگہ مخصوص نہیں کی گئی۔

(iv)iii: علاوہ ازیں سورۃُ الاعراف آیت ۲۶ کے مطابق آدم کے لباس کا ذکر تک کیا گیا ہے: قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ: یعنی ہم نے تمہاری ستر پوشی کے لئے لباس نازل کیا۔ مگر تقویٰ کا لباس بہر طور بہتر ہے۔ حتیٰ کہ اُس لباس کے نزول کو بھی اپنی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور اغلباً ایسے لباس کو اختیار کر چکنے والے آدم ہی کو آدمؑ کہا گیا ہو گا۔ جبکہ باقی تمام مخلوقات کے متعلق ایسی کوئی بات نصِ قرآن نہیں۔

iv: سورۃ آلِ عمران آیت ۳۳ میں فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ: یعنی اللہ نے آدمؑ کو صفتِ اصطفاء سے نوازا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس جہانِ شہود میں شانِ مصطفائی سب سے اوّل آدمؑ کے حصہ میں آئی، اور امکانات میں غالب لگتا ہے کہ اس کی وجہ اُس لباس کی تعظیم و حرمت ہوئی ہو گی، جو پسند کر کے اُس مالک و خالق نے صرف اِسی ایک مخلوق کے لیے نازل فرمایا۔ یہ اعزاز کسی اور مخلوق (species) کے لیے مقرر نہ کیا گیا۔ آیت کے اگلے حصہ میں: ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ: اس بات کی نشاندہی ہے کہ وہ شانِ مصطفائی اولادِ آدم میں ہی مخصوص کی گئی ہے، لیکن صرف اس کے لیے جو آدمؑ کی طرح آخر کار لباسِ تقویٰ اختیار کر لیتا ہے۔

(i)iv: فضیلتِ آدم کے لیے سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷۰ کہتی ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا: یعنی تحقیق ہم نے اولادِ آدم کو تکریم دی اور کثرت مخلوقات سے ان کو فضیلت میں اولیت دی۔ اِسی تکریم اور فضیلت

Marfat.com

کی بنیاد پر قرآن فرما رہا ہے کہ انبیاء و مرسلین بھی آدم کی اولاد میں ہوئے اور ان ہی کی رہنمائی کے لیے معبوث کیے گئے ہیں۔

(ii)iv: سورۃ الاعراف آیت ۳۵ میں ہے: یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ: یعنی اے اولادِ آدم تمہارے پاس تم میں سے ہی رسول آتے ہیں۔

(iii)iv: اور سورۃ مریم آیت ۵۸ میں ہے: اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنۡ ذُرِّیَّۃِ اٰدَمَ: یعنی تحقیق وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا، اولادِ آدم کے انبیاء میں سے۔

(iv)iv: سورۃ طٰہٰ آیات ۱۲۱۔ ۱۲۲ میں آتا ہے: وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی ثُمَّ اجۡتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیۡہِ وَہَدٰی: یعنی جب آدم سے اپنے رب کے باب میں معصیت ہوگئی اور گمراہی کا شائبہ نمایاں ہونے لگا تو اس مقام پر آدم کو شانِ مجتبائی سے سرفراز کیا، توبہ قبول فرمائی اور سچی ہدایت سے مالا مال کیا۔ یہ اور پچھلی چند مثالیں اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مالک کی نگاہ میں آدم اور بنی آدم کی فضلیت مستند ہے۔ ربِ کریم آدم سے ہمیشہ مہربانی اور شفقت کا سلوک رکھتے رہے ہیں۔

v: یہ مخلوقاتِ جہانِ خلق کا تذکرہ تھا۔ جہانِ امر کی نمایاں ترین مخلوق یعنی ملائکہ بھی آدم کے لیے سجدہ زیر ہے۔ قصۂ آدم میں متعدد بار اس بات کی تکرار قرآن سے ثابت ہے کہ ملائکہ کو حکم دیا گیا کہ جب ہم اس مخلوق کو اچھی طرح سنوار چکیں، تو تم سب پر لازم ہوگا کہ اسے سجدۂ شکرانہ و تہنیت پیش کرو۔ مثلاً:۔

(i)v: سورۃ البقرہ آیت ۳۴، سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۶، سورۃ بنی اسرائیل آیت ۶۱ اور سورۃ الکھف آیت ۵۰: وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ: یعنی جب ہم نے ملائکہ سے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

Marfat.com

v(ii): سورۃُ الاعراف آیت ۱۱ میں بیان ہوا ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ: یعنی تحقیق ہم نے تمہیں تخلیق کیا، پھر تمہیں صورتیں عطا کیں، پھر ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ یہ تمام حوالہ جات ملائکہ پر آدم کی فضلیت کے باب ہی میں ہیں۔ آدمؑ کو مسجودِ ملائکہ ہونے کا شرف ہے، تو ظاہر ہوا کہ ملائکہ، آدم اور بنی آدم کی رعایا کی طرح ہیں۔

آدمؑ اور بنی آدم کا شیطان الرجیم سے خصوصی ناطہ بھی قرآن میں مذکور ہے۔ مثلاً:۔

v(iii): سورۃُ الاعراف آیت ۲۰: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ: یعنی شیطان نے ان دونوں کے لئے وسوسہ پیدا کر دیا۔

v(iv): سورۃُ الاعراف آیت ۲۷: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ: یعنی اے بنی آدم تم شیطان کے دھوکہ میں نہ ہرگز آنا۔

v(v): اور سورۃُ یٰسین آیت ۶۰: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ: یعنی اے اولادِ آدم شیطان کا کہا کبھی نہ ماننا۔

vi: ان تنبیہات کے ساتھ ساتھ آدم سے عہد لینے کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔ گو ایک یا زیادہ عہد جو مختلف مقامات پر موجود ہیں، یہ محل ان کی تفصیل کے بیان کا نہیں، مگر عہد لینے کے عمل میں، عہد لینے والے اور جس سے عہد لیا جا رہا ہے، اس کے تعلق کی ایک خصوصی شکل پائی جاتی ہے۔

vi(i): سورۃُ الاعراف آیت ۱۷۲ میں ہے: وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚۛ شَهِدْنَا: یعنی جب ربِّ کریم نے اولادِ آدم سے عہد لیتے ہوئے پوچھا، کہو تمہارا رب کون ہے تو وہ بیک زبان بولے آپ کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے اور اس کی شہادت بھی دی۔

Marfat.com

(ii)vi: اسی طرح سورۂ طٰہٰ آیت ۱۱۵ میں وارد ہے: وَلَقَدْ عَہِدْنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا: اور تحقیق اس سے قبل ہم نے خود آدم سے بھی ایک عہد لیا تھا جسے وہ بھول گیا، اور اس میں عہد کے لیے کوئی عزم بھی نظر نہ آتا تھا۔

(iii)vi: اسی طرح سورۂ یٰسین آیت ۶۰ میں بھی ایک عہد کی نشاندہی ہے: اَلَمْ اَعْہَدْ اِلَیْکُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ: یعنی کیا بنی آدم سے عہد نہ لیا گیا تھا کہ شیطان کی پیروی سے باز رہو۔

vii: موضوع آدم میں، سورۃ آلِ عمران کی آیت ۵۹ بالخصوص انفرادی حیثیت کی مالک ہے جس میں کہا گیا ہے: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ: یعنی اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال، مثلِ آدمؑ ہے۔ اس کو تراب سے تخلیق کیا گیا اور پھر کہا گیا کہ ہو جا اور وہ ہو چکا تھا۔ گو اس آیت میں یہ اخذ کرنا مشکل ہے کہ خَلَقَہٗ (اُس کو تخلیق کیا)، عیسیٰؑ یا آدمؑ میں سے کس کی طرف اشارہ ہے۔؟ بہر طور دونوں صورتوں میں ایک نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ آدمؑ و عیسیٰؑ دونوں کی تخلیق ایک مخصوص مادہ، تراب، سے ہوئی۔ اور یہ تخلیق ابھی مکمل نہ تھی، کیونکہ اُس کے لیے کُن کا حکم دینا ابھی باقی تھا کہ وہ فَیَکُوْنُ ہو جاتا۔ اِس لحاظ سے یہ سارے قرآن میں تخلیق آدم کی اکلوتی آیت ممکن ہو سکے گی۔ ورنہ اِس کے علاوہ قرآن میں کہیں تخلیق آدم کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ سورۃ البقرہ آیت ۳۰: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً: یعنی میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں، میں کسی بھی طرح تخلیق آدم کی بات نہیں ہو رہی، بلکہ تقرر آدم بحیثیت خلیفہ کا بیان ہے۔ تقرر ہمیشہ اس کا ہوتا ہے جو پہلے سے موجود ہو۔ یعنی عمل تخلیق بہر طور، عمل تقرر سے قبل ہو گا۔ اس کی مثال اس طرح پیش کی جا سکتی ہے کہ فلاں سینئر وکیل کو ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ یہ تقرری صرف اس بنیاد پر ہوئی کہ وہ فلاں پہلے سے موجود بھی تھا اور پھر وکالت کی تعلیم مکمل

Marfat.com

کرکے وکیل بھی بن چکا تھا اور کئی برس کے تجربہ کے بعد اس قابل بھی ہو چکا تھا کہ قانونی طور پر جج مقرر ہو سکتا تھا۔ بصورت دیگر جج کے طور پر اس تقرّری کا جواز ہی نہیں بن سکتا۔ اسی طرح اگر آدم کو زمین میں خلیفہ مقرر کرنے کی طرف اشارہ ملتا ہے تو یہ واضح ہونا چاہیے کہ اس تقرّری سے قبل آدم موجود بھی تھا، یعنی تخلیق ہو چکا تھا، اور اس قابل بھی ہو چکا تھا (to qualify) کہ بحثیت خلیفہ مقرر ہو سکے۔ حالانکہ جہانِ امر کی مخلوق نے اس تقرّری پر اعتراضات بھی اٹھائے، لیکن تقرّر کرنے والے نے ان اعتراضات کے کچھ جوابات دے کر فرمایا، وقت ثابت کرے گا کہ میرا انتخاب برائے تقرّریٔ خلیفہ نہایت موزوں ہے۔ اور یہ بھی باور کروایا کہ اس ذمّہ داری کی بجا آوری کے لیے جو کچھ یہ آدم جانتا ہے وہ تم ملائکہ نہیں جانتے، بلکہ دونوں کا مکالمہ کروا کر یہ امر مستند بھی کر دیا۔

viii: لیکن اسی مضمون کا ایک اچھوتا رنگ اور بھی ہے جسے ذیل میں کچھ تفصیل اور مزید قرآنی حوالہ جات سے بیان کیا جا رہا ہے۔

viii(i): سورۃُ الاعراف آیت ۱۹ میں ہے: وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ: یعنی آدمؑ اور ان کی زوج (زوجہ) کو جنت میں مسکن کے لیے فرمایا گیا۔ اور وہ دونوں اُس جنت میں یقیناً بہت پُر سکون اور خوبصورت زندگی گزار رہے ہوں گے۔

viii(ii): جبکہ سورۃُ الاعراف آیت ۲۰ کے مطابق: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ: یعنی شیطان نے ان دونوں کو وسوسہ میں ڈال دیا۔ وسوسہ دراصل ایک ایسا خیال ہوتا ہے جس پر آدمی کا ذہن یا عقل غور و فکر شروع کرتے ہوئے، اس کا پیچھا کرتا ہے، اور اُس میں محو ہو جاتا ہے (To consider and follow)۔ بالآخر اس سے مرعوب ہو کر اس خیال کے مطابق کر گزرتا ہے۔ کشف المحجوب میں علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ خیالِ اوّل کی پیروی جود کہلاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ (سچّا) خیال جو، جو نہی آئے، تو

Marfat.com

ہی اُس پر عمل درآمد ہو، اُس کے متعلق عقل استعمال نہ کی جائے اور عمل دخل اور غور و فکر وغیرہ کرنے نہ بیٹھے کہ ایسا کیوں اور ویسا کیوں نہیں؟ یعنی خیالِ اوّل منجانب الٰہی ہوتا ہے اور ہمیشہ تقاضائے حکمت و منشاءِ ایزدی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں آدم کی جزوی عقل کو چون و چرا کی مجال نہیں ہو سکتی۔ لیکن خیال نما وہ صفت جس پر عقل غور و فکر کرکے اور مختلف تانے بانے جوڑ کر اس میں آدمی کو محو کر دیتی ہے اور بالآخر بے عقلی میں وہ آدمی اُس ' خیال ' کے مطابق کر گزرتا ہے تو اُسے وسوسہ کہتے ہیں۔ جیسے خیالِ اوّل منجانب الٰہی ہے، ویسے ہی وسوسہ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے (یا خنّاس کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے)۔ ایسا ہی خیال شیطان نے آدم اور اسکی زوج (زوجہ) کے ذہن میں ڈالا۔

ix: قصہ' آدم کی ' رنگینی کا سہرا اسی شیطان کے سر ہے جس نے آدم کو جنت سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ ایک وسوسہ ' ہمیشگی سے بہک کر آدم نے ٹھہراؤ چھوڑ کر بہاؤ کا راستہ اختیار کر لیا، اور یہی جنت الخلد سے اخراج کا سبب ہوا۔ اسی لیے ازاں بعد اولادِ آدم کو تنبیہہ کی گئی، کہ نہ تو شیطان کے فتنہ میں مبتلا ہو اور نہ ہی اس کی عبادت کرو کہ یہ آدم کی اولاد کی رسوائی و پشمانی کا باعث ہے۔ اشرف المخلوق اسی عمل میں اپنی فضیلت و تکریم اپنے ہاتھوں کھو بیٹھتا ہے اور: أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ : سورۃ الاعراف آیت ۱۷۹ کے مصداق فقط چرندہ رہ جاتا ہے یا درندہ بن جاتا ہے۔

ix(i): سورۃ طٰہٰ آیت ۱۲۰ میں آتا ہے: قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ: یعنی اے آدم کیا تمہیں ہیشگی کے شجر کی بابت خبر دوں کہ وہ کبھی نہ مُرجھائے۔ اور اس پر تمہاری ملکیت کبھی ختم نہ ہو۔ آدم اور اس کی زوج کے لیے یہ ایک نیا رنگ اور انداز تھا۔ انہوں نے اس سے قبل نہ تو اس کے متعلق کبھی سنا تھا اور نہ ہی کبھی غور و فکر کیا تھا۔ کہنے والے کے اِس کہنے نے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ غور و فکر میں مبتلا ہوئے اور بالآخر اس میں کشش اور جاذبیت محسوس ہوئی۔

Marfat.com

ix(ii): سورۃ الاعراف آیت ۱۹ میں جنت عطا کرنے والے نے واضح طور پر فرمایا تھا: وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ: یعنی تم دونوں اس شجر کے قرب میں کبھی نہ جانا۔ وگرنہ باقی تمام جنت اور مافیہا تمہارے لیے ہی وا ہے۔

x: بالا بحث میں ایک اہم نکتہ میّسر آتا ہے۔ جنت عطا کرنے والے مالک و خالقِ کُل کائنات کو بہر طور علم ہے کہ 'شَجَرَةِ الۡخُلۡدِ' کیا ہے۔ اور سوچ سمجھ کر اور حکمت کے تحت ہی آدم اور اس کی زوج کو اُس شجر کے قُرب میں نہ جانے کا حکم دیا تھا۔ شیطان الرجیم کو یہ خبر کیسے اور کہاں ملی؟ وہ عالم کیسے ہو گیا۔ خبر علمِ الٰہی کی ہو اور حامل اس کا شیطان ہو۔ بظاہر بعید از قیاس لگتا ہے! اس کے لیے قرآن کے کم از کم ۲ مقامات کی سیر ضروری ہے، تاکہ کوئی تشفی آمیز جواب میّسر آسکے۔

x(i): سورۃ الحجر آیات ۱۶ تا ۱۸: وَلَقَدۡ جَعَلۡنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيۡنَ ۙ وَ حَفِظۡنٰهَا مِنۡ كُلِّ شَيۡطٰنٍ رَّجِيۡمٍ ۙ اِلَّا مَنِ اسۡتَرَقَ السَّمۡعَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيۡنٌ : تحقیق ہم نے آسمان میں بروج کیے ہیں اور انہیں دیکھنے والوں کے لیے آراستہ کیا ہے۔ اور اسے ہر مردود شیطان سے حفاظت میں رکھا ہے۔ لیکن اگر کوئی چوری سننے کی کوشش کرے تو اس کو روشن شعلہ مارا جاتا ہے۔

x(ii): سورۃ الصّٰفّٰت آیت ۶ تا ۱۰: اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِزِيۡنَةِ ۨالۡكَوَاكِبِ ۙ وَ حِفۡظًا مِّنۡ كُلِّ شَيۡطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ لَا يَسَّمَّعُوۡنَ اِلَى الۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰى وَ يُقۡذَفُوۡنَ مِنۡ كُلِّ جَانِبٍ ۖ دُحُوۡرًا وَّ لَهُمۡ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَةَ فَاَتۡبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ: یعنی تحقیق ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں سے زینت دی ہے اور اس کی تمام سرکش شیاطین سے حفاظت کی ہے۔ (وہ) عالم بالا (کی بات) نہیں سُن سکتے۔ اور ہر طرف سے دور رکھے جاتے ہیں۔ اور دردناک عذاب سے انہیں دھکیلا جاتا ہے مگر جو کچھ اُچک لے تو بھڑکتا شعلہ اس کو مارا جاتا ہے۔

Marfat.com

ان دونوں مقامات پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ عالمِ بالا، آسمان اور آسمانِ دنیا جو کچھ بھی ہیں ان کی سرکش و مردود شیاطین سے حفاظت کی جاتی ہے۔ مگر بین السطور انہی آیات میں اشارہ ملتا ہے کہ کچھ شیاطین آسمان سے ورا، خبر لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں اور کچھ نہ کچھ چرانے میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ اُچک ہی لیتے ہیں۔ تب اُن کی دفع کرنے کے لیے شِھَابٌ مُّبِیْنٌ و ثَاقِبٌ استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ نکتہ ہماری سمجھ میں آجائے کہ حکمتِ الٰہی میں یہ گنجائش خود ہی رکھ دی گئی ہے کہ جو فیصلے آسمان سے ورا، الْمَلَاِ الْاَعْلٰی میں کئے جاتے ہیں، مردود و سرکش شیطان اسے چُرانے میں کامیاب ہو سکتا ہے، تو پھر یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو جائے گا کہ کیونکر کوئی شیطان علمِ الٰہی کی خبر کا حامل ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی کسی شیطان نے الْمَلَاِ الْاَعْلٰی میں، جب شَجَرَۃِ الْخُلْدِ کا تذکرہ ہو رہا ہو گا، اس کو سُن لیا ہو گا اور اس کی قسمت یا حکمتِ الٰہی کے تحت شِھَابٌ مُّبِیْنٌ و ثَاقِبٌ کے باوجود بچ گیا ہو گا۔ تب اُس نے آدم کو بشکل وسوسہ وہ خبر دی۔ آدم کو اس میں فائدہ نظر آیا، تبھی اُس نے اُس خبر پر غور و فکر شروع کیا اور اتنا محو ہو گیا کہ آخر کار اُس پر عمل درآمد کرنے پر اتر آیا۔ اگر یہی خیال، بشکل القاء، مالک کائنات کی طرف سے عطا ہوتا تو اپنے اندر خیر کی تاثیر رکھنے کی وجہ سے کبھی اس آدم کے لئے رسوائی کا باعث نہ ہوتا۔ لیکن چونکہ یہ شیطان الرجیم والمارد کی طرف سے وسوسہ کی طرح اسے ملا تھا، اس لئے شر کی آمیزش آدم کو عریاں کر گئی۔ حالانکہ اس نے جنّت کے پتّوں سے اپنی شرمگاہ کو ڈھانپنے کی کوشش کی مگر ٹھہراؤ کی اس جُزوقتی تبدیلی بہاؤ میں، 'خلف' کا ایک بیج نمودار ہو گیا۔

xi: یہ سارا عمل حکمتِ الٰہی کے تابع تھا۔ اس لئے مالک نے اظہارِ حکمت کے لئے اپنے کُل ملائکہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ خلف کا بیج ہم زمین میں رکھ رہے ہیں: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً: اس وقت آدم جنت میں موجود تھا۔ وسوسۂ شیطانی کے نتیجہ میں جو تخم (بیج) بہاؤ میں نمودار ہوا، اسے زمین کے اندر رکھ دیا گیا۔ خلف کا یہ بیج تدریج کے قدرتی اصولوں کے مطابق ایک چھوٹے سے آدم کی شکل

Marfat.com

میں ظاہر ہوا۔ جب یہ ننھا آدم پروان چڑھ کر خود پھل اور پھول کی منزل پر آیا تو وہی ابتدائی تخم (بیج) اس میں بھی نمودار ہوا۔ تب اس کو بھی مقررہ قدرتی طریق پر زمین کے اندر رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے بھی ایک ننھے آدم کی شکل میں زمین سے جنم لیا۔ حتیٰ کہ یہ عمل تسلسل سے چلتا رہا اور جلد ہی نوعِ آدم کی صورت میں زمین کے اطراف میں پھیل گیا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس سے قبل نباتات وحیوانات بھی قریب اسی طریق سے زمین پر پھیلائے گئے تھے۔

xii: جب سے اولادِ آدم نے اپنے آپ کو سمجھنے کے علاوہ مظاہر فطرت پر غور وخوض شروع کیا تو یہ حقیقت اس پر آشکار ہوئی کہ اگر اسے چاہت ہو کہ اس جیسا ایک آدم (یعنی اولاد) اور ہو، تو وہ بہاؤ کی شکل میں خلف کا ایک بیج (تخم) زمینِ رحم مادر کے اندر رکھ دیتا ہے۔ اگر رحم مادر کی اس زمین کی مناسب دیکھ بھال ہو جائے تو ایک فطری اور قدرتی عمل کے بعد آخر کار ایک ننھا آدم اس زمینِ (رحم مادر) سے نمودار ہو جاتا ہے۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک تن آور اور مکمل آدم بن جاتا ہے۔ یہی آدم جب ثمر بار ہو جاتا ہے۔ (Attains puberty)، تو خود اسی عمل کو دوہرانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ ہمیشگی جس کی طرف شیطان نے آدم کو جنّت میں ورغلایا تھا اور خبرِ الٰہی، بشکلِ وسوسہ آدم کو دی تھی، اس خلف کے بیج کی شکل میں اس آدم کو میّسر آگئی۔

چونکہ مخلوقات میں آدم تمام دوسری مخلوقات سے زیادہ مکمل اور دانا (Sensible) تھا اس لئے جب اس کی نسل زمین پر پھیلی تو جلد ہی دوسری تمام پھیلی ہوئی حیوانی اور نباتاتی مخلوقات کا حاکم ہو گیا۔ اور آج برحق مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى کی تفسیر ہے۔

Marfat.com

۱۵۔ الانسان

اس قرآنی اصطلاح کا لغوی مخرج ' انس' ہے۔ جس کے معنی چاہت، لگاؤ، گھل مل جانا اور مانوس ہونا ہیں۔ اس مادہ میں ظاہر ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور یہ یقینی امر ہے کہ چاہت اور انس اسی سے ممکن ہے جو عیاں ہوتا ہے۔ پوشیدہ اور چھپے ہوئے سے گھلنے ملنے اور لگاؤ کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو کچھ کہ ظاہر ہوگا وہ دیکھا بھی جا سکے گا اور محسوسات میں بھی آ سکے گا، اس لحاظ سے اس مصدر میں یہ معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ انس کے مصدر میں تعظیم کا پہلو اور اس بنیاد پر ایک امتیازی حیثیت بھی موجود ہے۔ انسان کی تخلیق کا ذکر قرآن میں کئی مرتبہ کیا گیا ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے وہ مقامات درج ذیل ہیں۔

i: سورۃ النساء آیت ۲۸ : وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا: یعنی انسان کو ضعیف تخلیق کیا گیا۔

ii: سورۃ الحجر آیت ۲۶: خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ: انسان کو حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کی صلصال سے میں خلق کیا ہے۔

iii: سورۃ النحل آیت ۴ : خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ: یعنی انسان کو نطفہ سے تخلیق کیا، پس وہ واضح خصیم ہے۔

iv: سورۃ الانبیاء آیت ۳۷: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ: یعنی انسان کو عجل میں سے تخلیق کیا گیا۔

v: سورۃ المومنون آیت ۱۲: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ: یعنی ہم نے انسان کو طین کے سلالہ میں سے خلق کیا۔

Marfat.com

vi: سورۃ السجدہ آیت ۷: وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ: یعنی انسان کی تخلیق کی ابتدا طین سے کی۔

vii: سورۃ یٰسین آیت ۷۷: اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ: یعنی کیا انسان کو نہیں دیکھتا، تحقیق ہم نے اسے نطفہ میں سے تخلیق کیا، پس وہ واضح طور پر خصیم ہو گیا۔

viii: سورۃ ق آیت ۱۶: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ:

ix: سورۃ الرحمان آیات ۱ تا ۴: اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۙ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ: یعنی الرحمان وہ ہے جس نے تعلیم قرآن دیکر انسان تخلیق کیا (پھر) اس کو بیان کرنا سکھایا۔

x: سورۃ الرحمان آیت ۱۴: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ: یعنی تخلیق کیا انسان کو قابلِ فخر صلصال میں سے۔

xi: سورۃ المعارج آیت ۱۹: اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا: یعنی تحقیق انسان تخلیق کیا گیا حالتِ اضطرار میں۔

xii: سورۃ الدھر آیت ۲: اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ: یعنی ہم نے تخلیق کیا انسان کو ملے ہوئے مخلوط نطفہ میں سے۔

xiii: سورۃ الطارق آیات ۵۔۶: فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ: یعنی انسان اچھلتے ہوئے پانی میں سے خلق ہوا۔

xiv: سورۃ البلد آیت ۴: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ: یعنی تحقیق ہم نے انسان کو شدّت و قوت میں (کے ساتھ) تخلیق کیا۔

xv: سورۃ التین آیت ۴: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ: یعنی ہم نے انسان کو عدل و توازن کی بہترین حالت میں تخلیق کیا۔

Marfat.com

xvi: سورۃ العلق آیت ۲: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ: یعنی انسان کو علق (وابستگی، محبت) میں سے تخلیق کیا گیا۔

ان مقامات میں تیسرا (iii) اور ساتواں (vii) مقام الفاظ کی ترتیب کے لحاظ سے ہم معنی اور ایک جیسا ہے۔ یعنی ہم نے انسان کو نطفہ سے تخلیق کیا اور دونوں ہی مقامات پر خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ بھی کہا گیا ہے۔ اگر ان دونوں مقامات کو مشترک مان لیا جائے، تو تخلیق انسان کے کُل چودہ (۱۴) مقامات قرآن میں سے میسر آتے ہیں۔ محققین کے فرمان کے مطابق الانسان ایک کردار ہے مگر چودہ (۱۴) معصومینؑ کی شکل میں اس کردار کی چودہ (۱۴) جہتیں ہیں۔ اور قرآن میں ان تمام کا فرداً فرداً ذکر فرما کر، اس کردار کی ہر شخصیت کی ہمہ گیر اور آفاقی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آٹھواں (viii) مقام الگ سے مفصل بیان کیا جائے گا۔

المختصر مالکِ کائنات نے اپنی چاہت اور انس سے جو کچھ تخلیق فرمایا، وہ صرف کردارِ انسان ہے۔ یہ کردار خالق کو اس قدر محبوب ہے کہ اس کی چاہت میں اس نے اس کی چودہ صورتیں مقرر فرمائیں، اور یَشَاءَ اللّٰہ میں سے ہونے کی وجہ سے وہ تمام معصوم ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ تمام الانسان خلق میں اوّل بھی ہیں۔ یہی وہ ہیں جن کے متعلق سورۃ البقرہ آیت ۱۲۹ میں قرآن فرما رہا ہے: رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ: یعنی ہمارے رب ان میں سے رسول مبعوث فرما۔ ثابت ہوا فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ کی تفسیر یہی ہیں۔

غور طلب ہے کہ آدمؑ، صفی اللہ ہیں، ابراہیمؑ، خلیل اللہ کہلائے، کلیم اللہ کا درجہ موسیٰؑ کا ہے، خلیفۃ اللہ ہونا داؤدؑ کا نصیب ہوا، اور عیسیٰؑ مقام روح اللہ پر فائز ہوئے۔ بلاشک ہر نبی پیغمبر کا ایک اچھوتا اور منفرد مقام ہے مگر ان میں سے کسی مرسل کو رسول اللہ نہیں فرمایا گیا۔ یہ اعزاز فقط محمد مصطفیٰؐ کو عطا

Marfat.com

ہوا۔ ثابت ہوا کہ اللہ کی نگاہ میں کردارِ صفی اللہ کے حامل آدمؑ ہیں، مقامِ خلّت ابراہیمؑ کو بخشا، کلیم اللہ، موسیٰؑ کے علاوہ کوئی اور نہ ہو سکا، جب کہ روح کے مقام تک رسائی عیسیٰؑ کا نصیب ہوئی۔ بعینہٖ رسالت، صرف مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے لئے مختص ہے۔ محمدؐ، صرف اللہ کے رسول ہیں اور بس! یہ عقیدہ غلط ہے کہ ہمارے رسول محمدؐ ہیں۔ ہر کلمہ گو اس بات کا اقرار بھی کر رہا ہے کہ محمدؐ صرف اللہ کے رسول ہیں، مگر پھر بھی اپنے تئیں ان سے نسبت کا کوئی جھوٹا دعویٰ بنا کر بیٹھا ہے۔ اللہ کے رسول کو ''اپنا'' رسول ثابت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ یہ صریح گمراہی ہے۔

کردارِ الانسان خود مالک و خالقِ کُل کائنات کی طرف منسوب ہے۔ اس نے اپنی چاہت اور ارادہ کے ساتھ، مادۂ انس سے اس کردار کی چودہ صورتیں بنائیں۔ جنہیں ازاں بعد معصومین کہلانا تھا۔ یہ معصومین سورۃُ الاحزاب آیت ۳۳ کے مطابق: یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا: کی شان رکھتے ہیں۔ یہ طہارت و پاکیزگی کی انتہائی منزل پر اپنے ازل سے فائز ہیں۔ کسی نجس اور ناپاک کو ان سے کوئی واسطہ نہیں اور انہیں خبر ہی نہیں کہ ضلالت و گمراہی کیا ہوتی ہے۔ یہ تمام معصومین حقّ کی عملی تفسیر ہیں، بلکہ خود حق ہیں۔ صالحینِ سلف اور محققین کے نزدیک مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ، عترتِ رسولِ کریمؐ اور بارہ امامین کریمینؑ، وہ چودہ معصومین ہیں جو کردارِ الانسان کے حامل ہیں۔ قرآن میں، ہر ایک کی تخلیق کا انداز الگ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی وہ چودہ مقامات ہیں جو مضمون کی ابتداء میں مذکور ہوئے ہیں۔

انسان کی تخلیق کے جتنے عناصر کا قرآن میں مذکور ہے، مثلاً صلصال، حماءٍ مسنون، نطفہ، طین، سلالۃٍ من طین، نطفۃٍ امشاج، ماءٍ دافق، علق اور علم قرآن، یہ تمام لَا شَیْئٌ ہیں۔ ان میں کوئی بھی شے (Thing/material) نہیں ہے۔ یہ سب خلق کے اس مادی جہان میں لاپید و مفقود ہیں۔ اگر ان

Marfat.com

سب کو عناصر گردانا جا سکتا ہے تو یہ جہانِ امر کے عناصر ہیں اور بنیادی طور پر لَا شَیئِ ہیں اور کُلیتِ ذاتِ لم یزل کا حصہ ہیں۔ وہ ذات واجب الوجود جو لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ کی شان کی حامل ہے، اس کے عناصر علم، یشاء (چاہت)، ارادہ، اذن، علق (عشق و محبت)، طین (طینت)، نطف (بہاؤ، ٹپکاؤ) وغیرہ سب کے سب شے کا غیر ہیں۔ ان عناصر میں سے ہر عنصر سے ایک الانسان خلق ہوا۔ اور علیٰ حالہ اس کی، اسی طرح خصوصیت مقرر ہو گئی۔ اور وہ الانسان اسی شانِ ایزدی کا مظہر ہو گیا۔ سورۃ النحل اور سورۃ یٰسین میں تخلیق کا مادہ نطفہ قرار پایا ہے، جبکہ سورۃ الدھر میں نطفۂ امشاج کو مادۂ تخلیق کہا گیا ہے۔ یہ نطفہ سے اگلی کسی حالت (Stage) کی طرف اشارہ ہے۔ سورۃ سجدہ میں طین کا ذکر ہے تو سورۃ المومنون میں سلالۃِ من طین کا عندیہ ہے۔ سورۃ الرحمان میں صلصالٍ کالفخار کو مادۂ تخلیق کہا گیا ہے تو سورۃ الحجر میں صلصالٍ من حماٍ مسنون بتایا جا رہا ہے۔ سورۃ العلق میں علق مادہ نظر آ رہا ہے تو سورۃ الرحمان میں علم القرآن خود اس مادہ کی حیثیت سے ظاہر کیا جا رہا ہے۔ گو بلا شک تمام انسان احسن خلق ہوئے مگر کسی ایک کے لئے بالخصوص فرمایا گیا کہ اسے احسن تقویم سے خلق کیا گیا۔ یہ اشارہ سورۃ التین میں ملتا ہے۔ سورۃ الانبیاء کے مطابق ایک انسان کو عجل میں تخلیق کیا گیا اور سورۃ البلد کی روشنی میں ایک انسان کی تخلیق 'فی کبد' ہو رہی ہے۔ اسی طرح سورۃ الطارق کے مطابق ایک انسان کی تخلیق ماءٍ دافق سے کرنے کی بابت ذکر موجود ہے تو سورۃ المعارج میں ھلوعا یعنی حالتِ اضطرار کو مادہ اور وجۂ تخلیق بتایا جا رہا ہے۔ نکتۂ بالا کی مزید تصریح سے قبل مناسب ہو گا کہ ہم الانسان کے بارے میں قرآن میں جو کچھ مزید کہا گیا ہے اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ چونکہ وہ تمام مقامات اپنی اپنی جگہ، سیاق و سباق کے ہمراہ ہی اصل مطالب واضح کر سکتے ہیں اس لئے ان سب کا ذکر نمبر شمار کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ان نکات کی ترتیب خود مرتب شدہ ہے، مگر اس کے لئے قریب تمام قرآن کی سیر کرنا ہو گی۔ سفر لمبا ہونے کے باوجود توقع ہے کہ انجام کار، انشاء اللہ، ضرور سیر حاصل ہو گا۔

Marfat.com

i: سورۃ الدھر آیت ا: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا: یعنی کیا دھر میں انسان پر وہ وقت نہیں آیا جب وہ شے کی طرح مذکور نہیں تھا (مگر تھا)۔ اس نکتہ کا اظہار ہو چکا ہے کہ الانسان کی تخلیق شے (Material) سے نہیں کی گئی بلکہ اسے لاشیء (Matter) سے تخلیق کیا گیا ہے۔ علم، چاہت، ارادہ، اذن، خوشی، غمی اور غصہ وغیرہ موجود تو ہیں مگر شے نہیں ہیں۔ یہ شے سے ورا 'لاشیء' کہلا سکتی ہیں۔ ان کے ہونے کے لئے جہانِ خلق کے عناصر کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے کہ لاشیء کیسے معرضِ وجود میں آئی۔ مگر یہی وہ صنف ہے جس سے کردارِ انسان کی تمام تر چودہ صورتیں بنائی گئیں۔

ii: اس مضمون کو سورۃ مریم آیت ۶۷ میں بھی ذرا مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔: اَوَ لَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا: یعنی کیا ذکر انسان ایسا نہیں کہ ہم نے اسے اس سے قبل تخلیق فرمایا مگر (تخلیق ہو چکنے کے باوجود) وہ شے نہ تھا۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ وہ دراصل لَا شَيْئٍ سے خلق ہوا ہے۔ شے کا لبادہ تو اسے ایک خاص مقصد کے لئے پہنایا گیا اور پھر جہانِ خلق میں بھیجا گیا۔ اس حکمتِ خداوندی کو سمجھنا عقلِ آدم اور دیگر مخلوقات کے لئے بہت مشکل ہے۔

iii: سورۃ القیٰمۃ آیت ۳۶: اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى: یعنی کیا انسان کے متعلق گمان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک حالت (یعنی تانا) پر ترک کر دیا جاتا ہے۔ انسان کی تخلیق کا مادہ لَا شَيْئٍ ہے، مگر وہ ایک تانا کی مانند ہے۔ یہاں یہ اشارہ دیا جا رہا ہے کہ انسان کو صرف اسی حالت پر ہی نہیں چھوڑ دیا جاتا، بلکہ شے کے امتزاج سے اسے وہ بانا بھی میسر آتا ہے جو اس جہانِ خلق میں اس کی جزوی اور طبعی زندگی کا باعث ہوتا ہے۔ کائنات میں ایک خاص دور میں تمام الانسان، یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوئے۔ ان کی ظاہرہ بناوٹ، بانا، آدم کی مانند تھا، جس سے کم فہم لوگوں کو اشکال پیدا ہوا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ معاذ اللہ وہ ان کی مانند و مثل ہیں۔

Marfat.com

۱۷: یہی مفہوم سورۃ القیمۃ آیت ۳ میں بھی ملتا ہے جہاں کہا گیا ہے: اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ: یعنی کیا انسان کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ اسے ہڈیوں کے ساتھ قرارِ ظاہری نہ دیا جائے گا۔ (ہاں دیا جائے گا بلکہ دیا گیا ہے)۔ اور جس دن اس انسان کو جہانِ خلق میں موجود ہونے کے لئے ہڈی اور گوشت کا لباس پہنا دیا جاتا ہے، تو سورۃ القیمۃ آیت ۱۳ کے مطابق: یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَ اَخَّرَ: اسے اس دن تمام تر خبر دے دی جاتی ہے کہ اس جہانِ خلق کا اوّل و آخر کیا ہے یا اس کا اپنا قدم و انجام کیا ہے، کہ وہ اس جہان سے کب اور کیسے لوٹے گا۔ بلکہ اس عارضی زندگی اور بانا کی ملاوٹ کے دوران سورۃ القیمۃ آیت ۱۴ کے مطابق: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ: یعنی الانسان، نفسِ کُلی کو ہمیشہ مدِ نظر رکھتا اور دیکھتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ نفس کائنات پر ہر دم نگاہ رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر سوئے ادب نہ ہو تو اس میں یہ مفہوم بھی مضمر ہے کہ الانسان، نفس مالک و خالقِ کُل کائنات کی نگہداشت کرتا ہے۔ اور یہ اسی کی بصیرت سے کارفرما ہے۔

۱۸: سورۃ ابراہیم آیت ۳۴: وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ: یعنی دیا تمہیں جو کچھ کہ تم مانگتے ہو۔ اور اگر نعمت خداوندی شمار کرنا چاہو تو احاطہ نہ کر سکو گے۔ تحقیق انسان (یہاں) ظلم کرنے والا اور نہ ماننے والا ہے۔ اس آیت کے مصداق جو کچھ عنایات خداوندی، مخلوقات کو میسر آ رہی ہیں اور آتی رہیں گی، وہ الانسان کے قدموں کی خیرات ہیں۔ مخلوقات جو کچھ طلب کرتی ہیں انہیں دیا جاتا ہے اور یہ عطا اتنی فیاضی سے ہوتی رہتی ہے کہ اس کے شمار کو ناممکن قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود الانسان، مادۂ انس و محبت میں سے ہونے کی وجہ سے، اس سچے خالق و مالک سے ہمیشہ اس بات پر شاکی رہتا ہے کہ مخلوق کو مزید دیا جائے۔ حالانکہ خود اپنے لئے انسان کبھی کچھ طلب ہی نہیں کرتا۔ اس کی شان سورۃ التوبہ آیت ۱۲۸ میں اس طرح بیان ہوئی

Marfat.com

ہے: عَزِیزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِینَ رَءُوفٌ رَّحِیمٌ: یعنی ان کے لئے یہ بات بہت ناگوار ہے کہ تم لوگ کسی مشقت و تکلیف میں مبتلا ہو۔ وہ تمہاری خیر خواہی کی چاہت ہر دم کرتے رہتے ہیں۔ اور بالخصوص مومنین کی بلائیں دفع کرنے والے اور انہیں رحمت عطا کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو اپنے لئے کچھ بھی طلب نہ کرے اور مخلوقات کے لئے حکمتِ الٰہی اور مقدرات کے مطابق جو کچھ انہیں عطا ہو رہا ہے، اسے تھوڑا جان کر، ان کے لئے مزید کی درخواست کرتا رہے، وہ لَظَلُومٌ کَفَّارٌ کی صف ہی میں ہو گا۔ مگر غور کریں اس کے پیچھے مقصدیت کتنی عظیم ہے۔ خود اپنے لئے ایسے القابات قبول کر کے انسان نے مخلوقات کی خاطر اپنے سچے مالک سے ہمیشہ معارضہ جاری رکھا ہے۔

vi: سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۱ کا مقام بھی غور کے قابل ہے۔: وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا: یعنی (کبھی کبھی) انسان (باقی مخلوقات کو) شر اور سختی سے پکارتا ہے (بلاتا ہے)، حالانکہ وہ خیر کا عمل یعنی دعا ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ الانسان عجلت پسند ہے (کہ مخلوقات کو جلدی جلدی سب کچھ مل جائے)۔ یقیناً یہ جلدی اور عجلت پسندی انسان کی اپنی ذات کے نفع کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جلدی اور اس اندازِ جلدی کی تھوڑی سی تلخی، بمنزلہ شر کے محسوس ضرور ہو سکتی ہے، لیکن در حقیقت وہ انجام کار خیر کی دعوت ہوتی ہے۔

vii: سورۃ بنی اسرائیل آیت ۶۷ میں ہے: وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا: یعنی جب سمندر میں (مخلوقات کو) مشکل پیش آتی ہے تو جس جس کو پکارا جائے وہ گم ہو جاتا ہے مگر اس ذات کے سوا۔ پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی پر اتارا جاتا ہے تو اعراض برتنے لگتے ہیں۔ (اور اگر مالک اس حالت میں ان کے لئے سزا مرتب کرنا چاہے تو آڑے آکر) وہ انسان (ایسا ہونے کو) نہیں مانتا، بلکہ مالک کو مجبور کرتا ہے کہ درگزر کرے۔

Marfat.com

viii: سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۰ میں ہے: قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا: یعنی آپ فرمادیں کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے، تب بھی ہرگز اس میں سے خرچ نہ کرتے مگر وہ انسان صرف اپنی ضرورت کے لئے رکھ لیتا ہے (اور باقی سب کچھ خرچ کر دیتا ہے)۔ اس لحاظ سے یہ بخل کی قسم کی کسی برائی کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ قَتُوْر (گزر بسر کے قابل دولت) الانسان کی فضیلت اور بڑائی ہے۔

ix: سورۃ الکہف آیت ۵۴: وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا: چونکہ جَدَل کا بنیادی مفہوم بٹنا (رسّی کا بٹنا) اور اس طرح بٹ کر مزید استحکام کا باعث بنتا ہے۔ یعنی الانسان ہی شے سے بننے والی کثرت اشیاء کے بننے اور علیٰ حالہ قائم رہنے کا باعث ہے۔

x: سورۃ الاحزاب آیت ۷۲: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا: یعنی تحقیق ہم نے امانت پیش کی آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر۔ پس انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے۔ مگر الانسان نے (اس امانت کو) اٹھالیا۔ تحقیق وہ (انسان) ظالم اور جاہل ہے۔ آیت متذکرہ کے مطابق کُل کائنات کا مالک اپنی مخلوقات یعنی آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو ایک امانت سپرد کرنا چاہتا تھا۔ بلاشک بادشاہ کی ملکیت بہت قیمتی ہوتی ہے اور سچا بادشاہ تو مسبب الاسباب مانا جاتا ہے، اس کی امانت یقیناً بہت بیش قیمت اور نادر ہوگی۔ اوّل تو ویسے ہی بدقسمتی ہے کہ مخلوق ہو کر کوئی امانت لینے سے انکار کر دے، دوسرے یہ سچے مالک کی براہِ راست توہین بھی گردانی جائے گی کہ اس کی حکم عدولی ہو۔ جب باقی قابلِ ذکر مخلوقات نے انکار کر دیا تو الانسان نے دعوت دیے بغیر ہی اس امانت کو اپنے ذمہ لے لیا۔ سچے مالک کے اس بیش قیمت تحفہ وامانت کو لینا ایک طرف خوش قسمتی اور مالک کی قدر کا حق ادا کرنا ہے، مگر عین اسی وقت یہ ہمیشہ کی ایک بڑی ذمہ داری کی بجا آوری کا بوجھ بھی ہو گیا۔ امین کو اپنی

Marfat.com

فکر بھول جاتی ہے۔ وہ اپنا اور اپنی ذاتی املاک کا کوئی غم نہیں رکھتا، لیکن ہر وقت امانت کی حفاظت میں اس طرح مشغول و مستغرق ہو جاتا ہے کہ دوسری کسی نعمت ہائے دنیوی کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں جاتا۔ ان معنوں میں یہ الانسان کا واقعتاً اپنے اوپر ظلم ہی تو ہے کہ نمائندۂ مالک ہونے کے باوجود اس جہان میں فقط چوکیدار (حافظ) کی ڈیوٹی نبھا رہا ہے۔ اور اس فرض کی ادائیگی میں اس قدر منہمک ہے کہ اپنے اردگرد کے جہانِ خلق کی رونقوں اور رنگینیوں سے کامل جاہل اور بے بہرہ ہے۔ اس لحاظ سے ظَلُوْمًا جَهُوْلًا بھی اصل میں انسان کے خواص کا اظہار ہے۔

xi: سورۃ الانشقاق آیت ٦: يَاۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ: یعنی اے مخاطب انسان تحقیق تو اپنے رب کی طرف سعی اور کوشش کرنے والا ہے اور یہی سعی تیری اس سے ملاقات کا باعث بھی ہے۔ لفظ كَادِحٌ سارے قرآن میں صرف ایک ہی دفعہ استعمال ہوا ہے اور وہ بھی الانسان کے بارے میں۔ اس کا اصل مفہوم اس کا خالق اور مفعول ہی جانتے ہوں گے۔ ممکن ہے یہ سعی اور کوشش جیسی ہی کوئی چیز ہو، مگر اس کی وسعت کا احاطہ عقلِ آدم سے باہر ہے۔ اپنے رب کی ہر دم ملاقات میں انسان کا تمام تر جہد، كَدْحًا کہلاتا ہے۔ یہ بھی الانسان ہی کی خصوصیت ہے، کسی اور مخلوق کے لئے اس خاصہ کو استعمال ہی نہیں کیا گیا۔

xii: سورۃ العادیات آیت ٦: اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ: بلاشک الانسان (پر وہ وقت آتا ہے جب وہ) اپنے رب سے بھی کٹ جاتا ہے (اور اس کی مدد بھی نہیں چاہتا)۔ عمومی طور پر کنود کا معنی ناشکرا اور ناقدرا کیا جاتا ہے۔ سیاق و سباق کی روشنی میں، اور اس نکتہ کے پیشِ نظر کہ یہ لفظ بھی تمام قرآن میں فقط ایک ہی مرتبہ، اور پھر الانسان ہی کے لئے استعمال ہوا ہے، اس کے کوئی عامیانہ معنی مراد نہیں لئے جا سکتے۔ چونکہ اس مصدر میں کٹ جانے کا مفہوم مضمر ہے، اس لئے واضح محسوس ہوتا ہے کہ

Marfat.com

الانسان پر جب کبھی اور جہاں کہیں، اس جہانِ خلق میں، ایسی کڑی آزمائش اور گھڑی آئی جب عام دنیوی اعتبار سے اس کی زندگی تک کو خطرہ لاحق ہو، تو اس وقت وہ اپنے پروردگار کی مشیت کے تابع ہو کر قوانینِ ربوبیت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اور خود کو مالک کی حکمت کے سپرد کر دیتا ہے۔ ابراہیم کے لئے ایک بہت بڑی آگ جلائی گئی اور وہ آگ کی طرف پھینک دیے گئے، تو جبرائیلؑ، حکم خداوندی سے مدد کے لئے آئے، مگر ابراہیمؑ اس وقت لَكَنُوْدٌ کی تفسیر بن گئے اور جواباً فرمایا کہ مجھے تجھ سے کوئی حاجت نہیں، میرے لئے یہ ہی کافی ہے کہ میرا مالک میرے حال سے واقف ہے۔ اس امر کی تصدیق تیرے آنے سے بھی ہوگئی ہے۔ حالانکہ اس دم ظاہرہ موت سامنے تھی۔ اسی طرح جب امام حسینؑ کو مخالف افواج نے گھیرا میں لے لیا اور وہ اچھی طرح سمجھ چکے کہ ظالموں کے عزائم ناپاک و خطرناک ہیں، تو حالانکہ اپنی اور کم سن علی اصغرؑ کی شہادت سامنے نظر آ رہی تھی، انہوں نے نہ ناناپاکؐ کو پکارا، نہ باباجانؑ کو ندا دی اور نہ والدۂ محترمہ کی طرف التفات فرمایا۔ بلکہ رضائے الٰہی کے تحت راضی ہو کر، محض مقصدیت کو مرکوز رکھ کر، سب کچھ سے کٹ گئے۔ یہ ہے دراصل لَكَنُوْدٌ کی عملی شکل!

xiii: سورۃُ العصر آیت ۲: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ: یعنی تحقیق انسان کی، نقصان اور گھاٹے میں ہے۔ چونکہ ایک مخصوص انسان کے لئے خُسْرٍ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے پہلی شکل تو یہ ہے کہ اگر الانسان، جہانِ امر میں اپنے مالک کے جلو اور قرب میں رہتا تو ہر قسم کی مشکلات دنیوی سے محفوظ رہتا۔ اس جہانِ خلق میں مخلوقات کے درمیان اس کا آنا، اس کے اصل مقام میں خسارہ ہی تو ہے۔ دوسری شکل میں خسر بمعنی 'سُسر' لیا جائے تو اس صورت میں اپنی کُلی محبت، اس رشتہ کی بنیاد پر، اپنے داماد کے سپرد کر کے اس نے خود اپنا خسارہ کیا۔ اور تیسری جہت یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ الانسان کُل مخلوقات کے لئے حَرِیْصٌ کی صفت کا حامل ہے، اس لئے اگر تمام مخلوقات اعمال صالح کی بجا آوری کریں، ایمان سے تمسک رکھیں اور حق اور صبر کا دامن تھامے رکھیں تو قدرتی طور پر انسان کا دل

Marfat.com

شادمان ہو گا۔ اور اگر اَلَّذِیۡنَ ان سے گریز کریں تو لا محالہ الانسان کا دل گھٹے گا اور وہ اسے نقصان گردانے گا۔ یہی مفہوم اس خُسۡرٍ میں موجود بھی ہے۔

xiv: سورۃ ھود آیت ۹: وَلَئِنۡ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَةً ثُمَّ نَزَعۡنٰهَا مِنۡهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـــُٔوۡسٌ كَفُوۡرٌ: یعنی اگر ہم انسان کو اپنی رحمت چکھا کر اس سے چھین لیں تو تحقیق وہ مایوسی اور کفر کی حالت میں چلا جائے گا۔ چونکہ الانسان کی تخلیق ہی مادۂ انس سے ہوئی ہے اور انس کی بقا کے لئے فقط رحمت کی غذا ہی درکار ہے، اس لئے آیت بالا کا مفہوم اس طرح واضح ہو سکتا ہے کہ وہ رحمت جو الانسان کی نمود اور بقا کے لئے لازم و ملزوم ہے، اسے اگر اس سے چھین لیا جائے تو بحیثیت الانسان وہ ایک بے معنی کردار رہ جائے گا۔ مراد یہ کہ رحمت، الانسان کا اس طرح جزو ہے جس طرح بنی آدم کا خون ہے۔ کسی شخص کے وجود سے خون نکال لیا جائے تو اس کی زندگی سے مایوسی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح انسان کی کلیت سے رحمت منقطع کر دی جائے یا اس سے رحمت چھین لی جائے تو وہ ایک مایوس اور کچھ نہ سمجھ سکنے کے قابل مخلوق ہو گی۔ اس آیت میں ایک محبت بھرا لطیف اشارہ موجود ہے۔ جیسا کہ سورۃ الحاقہ آیات ۴۵۔۴۶ میں وارد ہے: لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡيَمِيۡنِ ۙ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ الۡوَتِيۡنَ: یعنی اگر ہم آپؐ کو بدلہ لینے کے لئے قدرت و قوت سے پکڑ لیتے اور آپؐ کی شہ رگ کاٹ دیتے ۔(تو آپؐ کو اس سے بچانے والا کوئی نہ ہوتا)۔ چونکہ حضورؐ کی زندگی میں ایسا کوئی واقعہ پیش ہی نہیں آیا کہ شہ رگ کو کاٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی، اس لئے ثابت ہوا کہ آپؐ نے ایسی کوئی خطا ہی نہیں کی کہ جس کی یہ سزا مرتب ہو سکتی۔ لہذا ایسا کہہ دینے میں ایک خصوصی لگاؤ کا پہلو نظر آتا ہے۔ چونکہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا اس لئے اتنی ہی شدّت سے کہہ دیا گیا۔ بالکل اسی طرح آیت متذکرہ بالا میں، مالک جانتا تھا کہ نہ کبھی رحمت الانسان سے چھینی جائے گی اور نہ ہی کبھی وہ مایوس اور کفور ہو گا، اس لئے لگاؤ، محبت اور چاہت کے جذبہ کے تحت ایسا فرما دیا گیا۔ جتنی شدت سے فرمایا گیا ہے نفی کی شدت بھی اتنی ہی معلوم ہوتی ہے۔

Marfat.com

xv: سورۃ الشوریٰ آیت ۴۸ میں بیان ہوا ہے:۔ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ: یعنی جب الانسان ہماری رحمت پاتا ہے تو فرحت محسوس کرتا ہے۔ اور اگر (باقی مخلوقات کو) ان کے کیے پر مصیبت میں مبتلا دیکھتا ہے تو الانسان (اس تقدیر پر شاکی ہو کر) نا ماننے والا ہو جاتا ہے۔ الانسان کے قلب میں یہ جذبۂ انکار، بر بنیادِ رقت پیدا ہوتا ہے۔ جو صفت حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ کی مد میں عود کر آتا ہے اور پسندیدۂ الٰہی ہے۔

xvi: وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ: سورۃ لقمان آیت ۱۴، اور: وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا: سورۃ الاحقاف آیت ۱۵۔ قرآن میں موجود یہ مقامات قریب ایک ہی جیسا مفہوم رکھتے ہیں اس لئے انہیں مشترک انداز میں یہاں بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کا ترجمہ اس طرح بنتا ہے کہ ہم نے الانسان کو یہ وصیت فرمائی کہ اپنے والدین سے حسنِ سلوک کرے۔ اس مشترکہ مفہوم کے متعلق کچھ لکھنے سے قبل ضروری ہے کہ وصیت اور وراثت کے فرق کو غور کر کے سمجھا جائے۔

وراثت	وصیت
مال دولت، جائیداد، مویشی وغیرہ کے لئے مقرر ہے۔	علم و فضل سے متعلق ہے۔
احکام، وحی کے ذریعہ اٹل طور پر مقرر کئے گئے	اختیار دیا گیا ہے کہ جسے چاہے وصیت کرے۔
کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔	شہادت کا باقاعدہ طریقہ وضع کیا گیا۔
نسبی رشتہ میں بغیر کسی محنت اور کاوش کے حاصل ہوتی ہے۔ کسی اہلیت کا تعین نہیں کیا جاتا۔	نسبی رشتہ لازم نہیں۔ جس کے حق میں وصیت ہوتی ہے اس کی اہلیت کو بہر طور مد نظر رکھا جاتا ہے۔
حصول وراثت کے بعد، وارث پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ حاصل شدہ مال کا وہ کلی اور با اختیار مالک ہوتا ہے۔ اور اپنی مرضی سے تصرف میں لا سکتا ہے۔	وصیت کے طور پر جو کچھ میسر آتا ہے وہ قابل مواخذہ ہوتا ہے۔ با اختیار ہونے کے باوجود، وصی اپنی خواہش سے اس میں تصرف نہیں کرتا، بلکہ اذن کا انتظار کرتا ہے۔
وارث، وراثت ملنے پر پھولا نہیں سماتا بلکہ عام مشاہدہ ہے بالکثرت بے قدری کرتا ہے۔	وصی، وصیت کے بعد، کمر خمیدہ ہو جاتا ہے۔ اس بوجھ کی باطنی پابندی کو وہ صرف خود ہی جانتا ہے۔

Marfat.com

اگر درج بالا چند نکات کے مفہوم کو من حیث الکُل مدِ نظر رکھیں تو یہ حقیقت حیران کُن ہو گی کہ تمام قرآن میں مصدر وَرَثَ کی کسی حالت کا بھی الانسان سے کوئی تعلق ظاہر نہیں کیا گیا۔ قرآن کے مطابق انبیاء و عباد اللہ کی شان میں وراثت کا ذکر کیا گیا ہے مگر انسان کے باب میں صرف وصیت کا مقام درج ہے۔ گو وصیت انبیاء و مرسلین کے لئے بھی مقرر ہے مگر الانسان کا وراثت سے دور کا واسطہ بھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ جن مذکورہ بالا آیات میں انسان کو وصیت کی جا رہی ہے، اس میں عمومی زور والدین سے احسان کا سلوک روا رکھنے کی طرف ہے۔ احسان، دراصل توازن بر قرار رکھنے اور ممکنہ کمی پوری کر دینے کا نام ہے۔ تکڑی کے ایک پلڑے میں باٹ ہوں، دوسرے پلڑے میں جنس ڈالی جائے، تو وزن برابر کرنے کے لئے آخر میں جو تھوڑے سے دانے ڈالے جاتے ہیں، اور جن کی وجہ سے دونوں پلڑے متوازی ہو جاتے ہیں، انہیں احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بالا آیات کا مفہوم یہ بنے گا کہ الانسان کو اختیاری طور پر وصیت کی گئی ہے کہ وہ اپنے والدین یعنی آباء و اجداد کے چھوڑے ہوئے وقار اور ساکھ کا توازن بھی بر قرار رکھیں اور یہ کوشش بھی کریں کہ بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات کے تحت، ان اقدار کے توازن میں مزید نکھار بھی پیدا کریں۔ یہ وصیت والدین کی طرف سے انسان کو نہیں ہو رہی، بلکہ مالک و خالقِ کُل کائنات کی طرف سے ہے، کیونکہ وہی صحیح معنوں میں انسان کی قدر و اہلیت کا واقف ہے۔ قرآن کی رُو سے، انسان پر سب سے بھاری بوجھ اسی وصیت کی وجہ سے وارد ہوا ہے۔ کیونکہ احسان حق سے کم لینا اور ذمہ سے زیادہ دینا ہے۔

xvii: سورۃ حم سجدہ آیت ۵۱ : وَإِذَآ أَنۡعَمۡنَا عَلَى ٱلۡإِنسَٰنِ أَعۡرَضَ وَنَـَٔا بِجَانِبِهِۦ وَإِذَا مَسَّهُ ٱلشَّرُّ فَذُو دُعَآءٍ عَرِيضٍ: یعنی جب ہم انسان پر دنیوی نعمت (کا بوجھ) ڈالتے ہیں، تو اعراض بھی کرتا ہے اور پہلو تہی بھی۔ اور جب اس کو تکلیف اور برائی مَس کرتی ہے تو ہماری جناب میں اس کی دعائیں عرض کی طرح ہوتی ہیں (حق شفع کی طرح نہیں)۔ اس آیت کے مصداق واضح ہوتا ہے کہ الانسان حصولِ

Marfat.com

نعمتِ دنیوی سے کبھی خوش نہیں ہوا بلکہ اسے اپنے لئے غیریت کا بوجھ سمجھتا ہے۔ اگر جہانِ اسباب میں اسے کچھ مل جاتا ہے تو اوّل اس سے اعراض کرتا ہے اور اپنا دامن اس سے بچا کر رکھتا ہے، وگرنا جلد از جلد اسے تقسیم کر کے فارغ ہو جاتا ہے۔ حبشہ سے ایک دفعہ چار کلو مشک، حضورؐ کی خدمت میں بھیجی گئی۔ آج کل اچھی مشک کی قیمت ساٹھ سے ستر ہزار روپے فی تولہ ہے۔ چار کلو کا مول دو کروڑ روپے کے لگ بھگ بنتا ہے۔ اتنی بڑی مالیت کی اس نعمت کو آقاؐ نے ایک ہی دفعہ پانی میں ملا کر سب اصحاب کے اجسام پر ملنے کا حکم دیا اور اس حکم پر عملدرآمد بھی کیا گیا۔ فتح خیبر کے وقت علیؓ کو اس قدر مالِ غنیمت عطا ہوا کہ بانٹنے میں تین روز صرف ہوئے، مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک سوئی بھی مدینہ منورہ لے کر نہیں آئے۔ حتّٰی کہ جب گھر تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ گزشتہ سات دنوں سے چولہا نہیں جلایا جا سکا۔ شاید گھر والے منتظر تھے کہ مالِ غنیمت آنے والا ہے کیونکہ مالِ غنیمت کی خبر شہر مدینہ میں پھیل چکی تھی۔ کشف المحجوب میں علی الہجویریؒ راقم ہیں کہ امام حسنؑ نے گالیاں دینے والے اعرابی کو درہموں کی تھیلی عنایت فرمائی۔ اسی طرح امام حسینؑ نے پانچ ہزار دینار ایک ہی دفعہ میں ضرورت مند سوالی کو عطا کر دیے، اور کچھ دیر انتظار کروانے کی اس سے معذرت بھی کی۔ امام زین العابدینؑ نے فرزوق شاعر کے لئے بارہ ہزار درہم بھیجے۔ یہ سب اسی لئے ہے کہ الانسان جب کسی کو مشکل اور تکلیف میں دیکھتا ہے تو حتی المقدور، بلکہ حد سے زیادہ اس کے لئے عملی دعا کرتا ہے، فقط ہاتھ اٹھا کر اور منہ سے الفاظ ادا نہیں کرتا۔ عملی دعا سے مراد، مشکل کشائی کی عملی معاونت ہے جو دُعَاءٍ عَرِيضٍ کہلاتی ہے۔

xviii: سورۃ النجم آیات ۳۹۔۴۰: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى: یعنی انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو وہ سعی کرتا ہے۔ اور یقیناً اس کی سعی عنقریب (کُل کائنات میں) دیکھی جائے گی۔ الانسان کی تمام تر سعی، کُل مخلوقاتِ کائنات کی فلاح اور بہتری کے لئے ہے۔ اس نے

Marfat.com

کائنات میں اپنا حصہ اٹھا رکھا ہے اور قُوَّتِ لَا یَمُوْتُ پر بھروسہ کرتا ہے۔ آیت میں وحی کے ذریعہ اس بات کا اعلان کیا جا رہا ہے کہ انسان کی سعی آخر کار رنگ لائے گی۔ اور ایک دن کُل کائنات خود اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ کرے گی۔ گو عموماً یہی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ نظارہ قیامت کے بعد ممکن ہو گا مگر وحی کا اتنا زبردست دعویٰ اس جہانِ خلق میں پہلے سچ ہو گا۔ جہانِ ابد میں یہ منظر دوبارہ دیکھنے کو ملے گا۔

xix: سورۃ النجم آیت ۲۴ میں ہے۔: اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی: یعنی انسان تمنّا رکھتا ہے اور عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ جانتا ہے کہ اس کی تمنّا اور آرزو کیا ہے؟ وہی جو اوپر لکھی جا چکی ہے۔ بس یہ لازم نہیں کہ انسان کی طبعی زندگی میں اس کی تمنّا لازماً پوری ہو، لیکن ایسا ضرور ہو گا کہ عنقریب کائنات اس کی سعی کی تعبیر اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کرے گی۔

xx: سورۃ النازعات آیت ۳۵ کے مصداق: یَوْمَ یَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى : یعنی ایک دن انسان کی سعی کو یقیناً یاد کیا جائے گا۔ اور وہ وہی دن ہو گا جس کا متذکرہ بالا آیت میں سَوْفَ یُرٰى کی طرف اشارہ ہے۔ کُل مخلوقات مشکور ہو کر انسان کی سعی کو یاد بھی کرے گی اور اس کا شکرانہ بھی بجالائے گی۔

xxi: سورۃ الفجر آیت ۲۳ میں بیان ہوا ہے: وَجِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ یَوْمَىٕذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى : یعنی اس دن جہنم لائی جائے گی، جس دن الانسان کا تذکرہ ہو گا اور وہ تو صرف اس کا ذکر ہو گا (وہ خود نہ ہو گا)۔ انسان کے لئے یہاں بھی خصوصی محبت اور تکریم کا پہلو نظر آتا ہے۔ انجام کار یقیناً ایک دن ایسا آنا ہے جب میدانِ حشر میں نامۂ اعمال کھلے گا۔ جب ہلکے اعمال والوں کو جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا، یا پھر جہنم کو ان کے قریب کیا جائے گا۔ تو جہنم کی دہشت سے ان لوگوں کو الانسان یاد آئے گا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی میں انسان نے جو تعلیمات، بنی نوعِ آدم کی بھلائی کے لئے اسے دی تھیں، تب اس کا مفہوم ان پر واضح ہو گا، یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

Marfat.com

اس آس امید پر انسان کو یاد کرے گا کہ وہی رحمت و کرم کا پیکر ہے۔ اس جہنم سے اگر کوئی رہائی دلوا سکتا ہے تو وہ الانسان ہی ہے۔ چونکہ الانسان کا جہنم سے دور کا بھی واسطہ نہیں اس لئے فقط تذکرہ کی حد تک اس کا ذکر ہوگا، اور وہ تذکرہ جہنمی لوگ، معافی کی امید پر کر رہے ہونگے۔

xxii: سورۃ عبس آیت ۲۴ میں ہے: فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ: یعنی انسان کو چاہیے کہ اپنے سامانِ بود و باش پر نظر رکھے۔ عموماً طعم سے مراد سامانِ خورد و نوش لیا جاتا ہے، جس سے وجود کی قوت حاصل ہوتی ہے، اور اسی قوت کے طفیل کاروبارِ زندگی رواں دواں رہتے ہیں۔ لیکن اس میں بود و باش کے سامان بھی شامل ہو جایا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ استطاعت و قدرت بھی طعام کے معنوں میں شامل ہے۔ سو الانسان کو خصوصی اشارہ دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے سامانِ خورد و نوش و بود و باش پر ہر دم گہری نگاہ رکھے۔ اور اس بات کو لازم بنائے کہ غیر ضروری اور لا حاصل، یا محنت کے بغیر حاصل کئے گئے اسباب سے اجتناب کرے۔ اور ہر حال میں فقط ان اشیاء کو اپنے استعمال میں لائے جس میں اس کی سعی شامل ہو۔ اور وہ محض قُوتِ لَا یَمُوتُ کے لئے ہو۔ حضورؐ نے اپنی تمام حیات میں محض تئیس (۲۳) سیر وزن کا اناج استعمال فرمایا۔ علیؑ، خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود نانِ شعیر کے خشک ٹکڑوں پر گزر کرتے تھے۔ ہر الانسان کی زندگی کا عمل اسی سادگی پر رہا۔

xxiii: سورۃ الفجر آیت ۱۵: فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ: یعنی جب الانسان کو اس کا رب ابتلا میں ڈالتا ہے تو وہ اس کے لئے تکریم اور نعمت ہوتی ہے، پس کہتا ہے یہ عزت میرے رب نے مجھے دی۔ الانسان کسی تکلیف یا آزمائش میں کبھی اپنے مالک سے بےزاری، گھبراہٹ یا ناشکری نہیں کرتا، بلکہ ابتلا کو نعمتِ خداوندی جانتے ہوئے، باعثِ تکریم سمجھتا ہے، اور پھر برملا اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ ابراہمؑ کو جب ابتلا میں ڈالا گیا اور انہوں نے اس آیت کے مصداق

Marfat.com

استقامت کا حق ادا کر دیا تو انعام کے طور پر ان کو 'امام النّاس' کی سند پیش کی گئی۔ کچھ ایسی ہی ابتلا حضورؐ کو طائف کے مقام پر جھیلنی پڑی۔ جبرائیلؑ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ احد کا پہاڑ طائف والوں کے اوپر ڈالنے کا اذن لایا ہوں، تاکہ اس کے نیچے دب کر ہمیشہ کے لئے جہنم واصل ہوں۔

آپؐ نے فرمایا کہ اگر طائف والوں میں قیامت تک بھی کوئی ایک ماننے والا پیدا ہو سکتا ہے، تو اس کی خاطر یہ سب معاف کئے جاتے ہیں۔ اس صداقت کے اعتراف کے طور پر دورِ مصطفویؐ کی طبعی تکمیل پر آپؐ کی جنس میں سے یکے بعد دیگرے بارہ امامینؑ مبعوث ہوئے۔ شعبِ ابی طالبؑ میں ہاشمی مطلبی گھرانہ کو جن اذیتوں میں سے گزرنا پڑا، تاریخ کا ایک بھیانک واقعہ ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ڈھائی برس کی اس مشترکہ ابتلا میں بھی کسی کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ اپنی خلافت کے دور میں علیؑ کو جن مشکلات میں مبتلا ہونا پڑا وہ بھی ایک عجب داستان ہے، مگر وہ: وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا: سورۃ الفرقان آیت ۷۲ کی عملی تفسیر بن کر نہایت تکریم سے اسے نبھاتے رہے۔ جب امام حسینؑ کو میدانِ کربلا میں بچوں اور خواتین سمیت گھیرے میں لے لیا گیا اور وہ بھانپ گئے کہ یہ ابتلا ہے تو انہوں نے اسے تکریمِ خداوندی جانا اور اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا، اور قول و فعل کے ذریعہ ثابت کر دیا کہ وہ ابتلا ان کے رب کی کرم نوازی تھی۔ پھر وہ آیت متذکرہ بالا کی عملی تفسیر بن گئے۔

xxiv: سورۃ العلق آیت ۵ کے مطابق: عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ: یعنی الانسان کو سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔ متفقہ فیصلہ کے مطابق یہ پہلی وحی کے الفاظ ہیں، جو اس بات کے غماز ہیں کہ انسان کو غیب الغیوب کے تمام علوم، تعلیم کئے گئے۔ اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کو وہ کچھ سکھایا گیا جو کسی اور مخلوق کا مقدر نہ بن سکا۔ انتہائی طور پر اس کا یہ مطلب بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہر وہ جو کچھ کہ جانا جا سکتا ہے وہ الانسان کے علم میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ چونکہ علم عین ذاتِ الٰہی ہے اس لئے اللہ نے اپنا تمام علم، الانسان کو، مشارکت (Sharing) کے طور پر تفویض کر دیا ہے۔

Marfat.com

(i)xxiv: اگر الانسان کہیں بیعت لے رہا ہو تو وہ سورۃ الفتح آیت ۱۰ میں فخر سے فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ: یعنی تحقیق جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں، دراصل وہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ (آپ کے ہاتھ کے) اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔ مراد یہ کہ وہ لوگ اللہ ہی کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔

(ii)xxiv: جب الانسان مٹی کی ایک مشت، دشمنوں کی طرف پھینکتا ہے تو اللہ سورۃ الانفال آیت ۱۷ میں اسے بھی اپنے کرم کے ذمہ لے کر کہتا ہے: فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ ۪ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی: یعنی آپ نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ خود اللہ نے انہیں قتل کیا ہے۔ اور جو خاک پھینکی گئی وہ بھی اللہ ہی نے پھینکی، آپ نے نہیں پھینکی۔ ایک الانسان کا اس طرح مذکور کرکے، کردار انسان کے باقی تمام حاملان کو اس میں شامل کر لیا گیا۔ اپنے اپنے دور میں ہر انسان اسی طرح حامل علم الٰہی رہا ہے۔ اور وہ سب کچھ جانتا تھا جو کچھ کہ جانا جا سکتا تھا۔

xxv: سورۃ الزلزال آیات ۱-۵ میں ہے: اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَھَا ۙ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَھَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَھَا ۚ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَھَا ۙ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا: یعنی جب تھر تھرائے گی زمین جیسے تھر تھرانے کا حق ہے اور زمین اپنے (تمام) ثقل خارج کر دے گی (تو اس وقت) وہ الانسان کہے گا تجھے کیا ہوا؟ (وہ) اس دن، اس کی تمام خبریں بیان کرے گا جو انسان کے رب نے اس کی طرف وحی کی ہوں گی۔ حقیقت ہے کہ آخر کار 'اجل' کے تحت الارض تھر تھرانے لگے گی۔ اتنے زیادہ اور شدت کے زلزلے آئیں گے کہ الامان والحفیظ۔ بنی آدم جو چاند، مریخ اور دیگر سیاروں پر اپنی رہائش کا بندوبست کر رہے ہیں، ممکن ہے ان کے دلوں میں اسی آیت کا خوف ہو اور وہ چاہتے ہوں کہ اس وقت مقررہ سے قبل زمین سے نقل مکانی کر کے، شاید وہ اس خوفناک گھڑی سے محفوظ ہو سکیں۔ واللہ اعلم۔ ان زلزلوں کی وجہ سے زمین اپنے تمام ممکنہ ثقل (قوتیں، خزانے، معدنیات وغیرہ) اگل کر اپنی سطح

Marfat.com

پر ڈال دے گی۔ اس وقت باقی مخلوقات کا وزن سہارنا تو کُجا، خود اپنا آپ بھی نہ سنبھال پائے گی۔ اس حالت میں جو بھی انسان اس وقت موجود ہو گا ، فرمائے گا، اے بھلی تجھے کیا ہوا؟! ابھی ٹھہر، جلدی نہ کر کہ میرے پاس میرے رب کی وحی کے صدقہ میں بے شمار خبریں موجود ہیں، اور مجھے ابھی ان کا اظہار کرنا ہے۔ ثابت ہوا الانسان کو اس کے رب کی طرف سے وحی میسر آتی ہے۔ یاد رہے حاملِ وحی، صفتِ انبیاء و مرسلین کا حامل ہوتا ہے۔

بالا پچیس (۲۵) مقامات کے علاوہ قرآن میں انسان اور شیطان کا اکٹھا ذکر بھی ملتا ہے۔ ایک نظر ان پر بھی ڈالنا ضروری ہے۔

i: سورۃ یوسف آیت ۵: قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ:

ii: سورۃ بنی اسرائیل ۵۳ آیت: اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا :

iii: سورۃ الفرقان آیت ۲۹: وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا :

iv: سورۃ الحشر آیت ۱۶: كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ

بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو انسان کے لئے عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ اور خَذُوْلًا کہا گیا ہے۔ چونکہ عدو اور خذل دونوں مصادر میں دوری اور پرے رہنے کا مفہوم ہوتا ہے اس لئے واضح ہو گیا کہ شیطان، انسان سے پرے رہنے کے لئے پابند کیا گیا ہے۔

جیسا کہ پیچھے لکھا جا چکا ہے قرآن میں کُل سولہ (۱۶) مقامات پر تخلیقِ انسان کا ذکر موجود ہے۔ ان مقامات کو دوبارہ لکھ کر کچھ اہم نتائج نکالنے کی جسارت اور سعی کی جائے گی۔ یہاں مکمل آیات کی بجائے ترکیبِ تخلیق کا لفظ ہی استعمال کیا جائے گا۔

Marfat.com

۱۔ ضَعِیۡفًا (سورۃ النساء ۲۸)	۲۔ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ (سورۃ الحجر ۲۶)
۳۔ نُّطۡفَۃٍ (سورۃ النحل ۴)	۴۔ عَجَلٍ (سورۃ الانبیاء ۳۷)
۵۔ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ طِیۡنٍ (سورۃ المومنون ۱۲)	۶۔ طِیۡنٍ (سورۃ السجدہ ۷)
۷۔ نُّطۡفَۃٍ (سورۃ یٰس ۷۷)	۸۔ نَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِہٖ نَفۡسُہٗ (سورۃ ق ۱۶)
۹۔ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ (سورۃ الرحمان ۲)	۱۰۔ صَلۡصَالٍ کَالۡفَخَّارِ (سورۃ الرحمان ۱۴)
۱۱۔ ہَلُوۡعًا (سورۃ المعارج ۱۹)	۱۲۔ نُّطۡفَۃٍ اَمۡشَاجٍ (سورۃ الدھر ۲)
۱۳۔ مَّآءٍ دَافِقٍ (سورۃ طارق ۵)	۱۴۔ کَبَدٍ (سورۃ البلد ۴)
۱۵۔ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ (سورۃ التین ۴)	۱۶۔ عَلَقٍ (سورۃ العلق ۲)

نمبر ۳ اور نمبر ۷ ایک ہی مادہ ہیں، اس لئے انہیں مشترک کر کے پھر سے ترتیب دی جاتی ہے۔

۱۔ طِیۡنٍ	۲۔ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ طِیۡنٍ	۳۔ نُّطۡفَۃٍ
۴۔ نُّطۡفَۃٍ اَمۡشَاجٍ	۵۔ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ	۶۔ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ
۷۔ صَلۡصَالٍ کَالۡفَخَّارِ	۸۔ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ	۹۔ مَّآءٍ دَافِقٍ
۱۰۔ کَبَدٍ	۱۱۔ عَجَلٍ	۱۲۔ ہَلُوۡعًا
۱۳۔ ضَعِیۡفًا	۱۴۔ عَلَقٍ	۱۵۔ نَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِہٖ نَفۡسُہٗ

ہماری بساط کے مطابق درج بالا ہر مادہ ومقام تخلیق ایک مخصوص الانسان کے لئے مقرر ہے، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

طِيْنٍ	محمد الرسول اللہؐ
سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ	زہراؑ، عترتِ رسول اللہؐ
نُّطْفَةٍ	امام علیؑ وصیِ رسول اللہؐ
نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ	امام حسنؑ نواسہ رسول اللہؐ
صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ	امام حسینؑ نواسہ رسول اللہؐ
اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ	امام علی زین العابدینؑ
صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ	امام محمد الباقرؑ
عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ	امام جعفر الصادقؑ
مَّآءٍ دَافِقٍ	امام موسیٰ الکاظمؑ
كَبَدٍ	امام علی الرضاؑ
عَجَلٍ	امام محمد الجواد التقیؑ
هَلُوْعًا	امام علی النقیؑ
ضَعِيْفًا	امام حسن العسکریؑ
عَلَقٍ	امام محمد المہدیؑ
نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ	کردارِ وفا، عباسؑ، علمبر دارِ امام حسینؑ

اب ہر مقام کی وجہ تسمیہ کا سرسری جائزہ بالترتیب پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ طِيْنٍ --- محمد الرسول اللہؐ: گو طین کے بنیادی معنی گُندھی ہوئی نم دار مٹی کے ہوتے ہیں۔ لیکن مہر بنانے کے لیے جو ٹھوس مٹی زمانہ ماضی میں استعمال کی جاتی تھی، وہ بھی طین ہی کہلاتی تھی۔ اسی طرح طینت، جبلّت اور فطرت کے معنوں میں بھی یہ مستعمل ہے۔ یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ کائنات کے اپنے قرار، اور پھر کائنات میں پائی جانے والی ہر شے کے قرار کے لیے، ایک محل ضروری ہوتا

Marfat.com

ہے۔ جس میں وہ کائنات یا اس میں موجود چیزیں حال کی طرح قیام پذیر ہوں۔ جہانِ امر اور جہانِ خلق دونوں ہی اپنے قرار کے لیے طین کے مرہونِ منّت ہیں۔ کیونکہ طین کے بغیر کسی ٹھوس محل کا تصور بھی عبث اور ناممکن ہے۔ ذاتِ مصطفیٰؐ، فیصلۂ قرآن کے مطابق رحمتِ دوعالم قرار پائے ہیں۔ جیسا کہ سورۃُ الانبیاء آیت ۱۰۷ میں دلالت ہے: وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ یعنی آپ کو جہانوں کی رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ چونکہ رحمت کا خاصہ، بمقابلہ زحمت، قرار و قیام ہے۔ اس لیے مجازاً آپ کی تخلیق مِن طِیۡنٍ فرمائی گئی۔ سورۃُ سجدہ آیت ۷ کے مطابق: وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ: یعنی انسان کی تخلیق کی ابتداء طین سے کی گئی۔ اس میں بَدَاَ کا لفظ نہایت غور طلب ہے کیونکہ سرورِ کائناتؐ ہی اوّل مخلوق ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ اس آیت کے مطابق طین سے الانسان کی ابتدا، آپؐ کی اوّلیت کو بھی ثابت کر رہی ہے اور طین سے آپ کی تخلیق کی نشاندہی بھی کر رہی ہے۔ طین کی دوسری صورت، یعنی ٹھوس مٹی جو مہر کے طور پر استعمال ہوتی ہے، سے بھی واضح اشارہ رسولِ آخرالزماںؐ کی طرف نظر آتا ہے۔ کیونکہ قرآن نے تصدیق فرمائی ہے کہ آپؐ سورۃُ الاحزاب آیت ۴۰ کے مطابق خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ہیں۔ عربی لغت کے لحاظ سے خاتم، مہر لگا کر تصدیق کرنے والا ہوتا ہے۔ چونکہ حضورؐ کی بعثت کے اور مقاصد کے علاوہ ایک یہ بھی بہت اہم مقصد ہے کہ آپؐ انبیاءِ سابقہ کی تعلیمات کو: مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمۡ: سورۃ آلِ عمران آیت ۸۱ کی حیثیت سے مہر تصدیق ثبت کرنے والے ہیں۔ اس لیے بھی آپؐ کی تخلیق کا مادہ طین فرمایا گیا۔ تیسری ممکنہ صورت یعنی جبلّت و فطرت بمعنی طینت (طین) کا تعلق ہے، تو اس کے لئے سورۃُ الاحزاب آیت ۲۱ گواہی دے رہی ہے: لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ: یعنی رسول خداؐ کی جبلّت و طینت (اسوۃ) ہی کُل کائنات کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ طینت کی اس بے مثال خوبی کی بنیاد پر بھی مانا جا سکتا ہے، کہ قرآن میں طین سے جس انسان کے خلق کرنے کی طرف اشارہ ہے وہ فقط محمد الرسول اللہ ہیں۔ جو طین کا اسم با مسمیٰ ہیں۔

۲۔ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِیۡنٍ۔۔۔ زہراؑ، عترت رسول اللہؐ: عربی لغت کے لحاظ سے اَلسَّلُّ کسی چیز کو کسی دوسری

Marfat.com

چیز سے بآسانی و با سہولت نکال لینے کو کہتے ہیں۔ اسی سے سُلٰلَةٍ، کسی شے میں سے نکلے ہوئے حصہ کو کہتے ہیں۔ ان معنی کی بنیاد پر کوئی امر اس بات کے ماننے میں مانع نہیں ہو سکتا کہ رسول اللہؐ کی اکلوتی لختِ جگر، جو عترتِ رسول بھی کہلاتی ہیں۔ اور جو بعد میں آنے والے تمام امامینؑ کی امّ جد، یعنی والدہ ٹھہریں۔ ان کے علاوہ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ہونے کا شرف اور کس کا ہو سکتا ہے۔ بی بی زہراؑ چونکہ فطرتِ کائنات مقرر ہوئی ہیں اس لئے بھی طین (محمدؐ) کی سُلٰلَةٍ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ لفظ سُلٰلَةٍ مونث ہے، اس لئے مراد کوئی مذکر نہیں ہو سکتا۔

۳۔ نُّطۡفَةٍ (دو مرتبہ ہے)۔۔۔ امام علیؑ وصیِ رسول اللہؐ: لغت کی رُو سے نتھرے ہوئے، کشید کئے ہوئے نہایت پاکیزہ و مطہر پانی کو نطفہ کہتے ہیں۔ وہی پانی (ماءٍ) جو بنائے حیات مانا گیا ہے، اور قرآن کے مطابق: وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ: یعنی ہم نے ہر چیز کی زندگی ماءٍ (پانی) سے مقرر کی ہے اور اس پانی کا خالص ترین حاصل نطفہ کہلاتا ہے۔ سورۃ النحل آیت ۴، اور سورۃ یٰس آیت ۷۷ میں نُّطۡفَةٍ کے بعد جو فَاِذَا هُوَ خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ لکھا گیا ہے، یہ نہایت بامعنی ہے اور قرآن میں اس کا دو مرتبہ ورود بھی کسی حکمت سے خالی نہیں۔ بلاشک خَصۡمُ کے بنیادی مفہوم میں جھگڑا کرنے کا عنصر نمایاں ہے، مگر اس میں فریق ثانی کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ مشرقی معاشرہ میں نمایاں ہے، میاں بیوی کے جوڑے میں فریق ثانی خصم کہلاتا ہے۔ اور وہ: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ : کی شان رکھتا ہے۔ یہ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ ہے۔ سو نطفہ اور خصم دونوں حیثیتوں کو یکجا کیا جائے تو واضح ہو گا کہ زندگی جو کچھ بھی ہے، اس کی پاکیزہ ترین حالت میں سے ایک الانسان بنایا گیا۔ اور فطری عمل میں واضح طور پر خصم (قوامون) ہونے کے ناطے، اس کی حیثیت فوقیت والی ہے۔ ایک دفعہ اسے جہانِ خلق کے لئے خصیم فرمایا گیا اور دوسری مرتبہ جہانِ امر کے لئے۔ یا یوں کہہ لیں کہ جہانِ شہود اور جہانِ عقبیٰ، دونوں میں اس کی شان اور حیثیت خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ کی ہے۔

Marfat.com

۴۔ نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۔۔۔ امام حسنؑ نواسہ رسول اللہؐ: لغت کے مطابق امشاج ملی ہوئی چیزوں کو کہتے ہیں، بالخصوص اس انداز سے ملنا کہ ایک دوسرے کے ساتھ رچ بس جائے اور پھر ایک دوسرے سے جدائی ناممکن حد تک مشکل ہو جائے۔ نطفہ امامت و ولایت کا جب عترتِ رسالت سے امشاج ہوا تو نتیجہ کے طور پر امام حسنؑ کا ظہور ہوا۔ آپؑ، مولا علیؑ اور زہرا کریمہؑ کے اوّل اور بڑے فرزند ہیں۔ حکمتِ خداوندی کے تحت نبوت و رسالت کا پیڑ ایک لاکھ چوبیس ہزار فصلیں دینے کے بعد ہمیشہ کے لئے بے ثمر ہونے والا تھا، مگر منشائے ایزدی میں یہی تھا کہ دورِ مصطفویؐ کے بعد آنے والے بنی آدم تک وہ تاثیر نبوت و رسالت ضرور پہنچے۔ اس کے لئے یہ اسلوب مقرر ہوا کہ عترت رسالت کو نطفہ امامت و ولایت سے امشاج کر دیا جائے اور اس عمل کے پیشِ نظر، جو اصل میں پیوند کاری کی شکل ہے، جو پھل میسر آئے، یہ ذمہ داری اس کو تفویض کر دی جائے۔ سو نبوت و رسالت نے امامت و ولایت کو کندھوں پر اٹھا کر، دراصل بنی آدم کا مقام عرش معلیٰ تک بلند کر دیا۔ یہ احسان عظیم، اسی امشاج ہی کی وجہ سے ہے۔

۵۔ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَسْنُوْنٍ ۔۔۔ امام حسینؑ نواسہ رسول اللہؐ: لفظ صلصل، 'ص ل و' یا 'ص ل ی' مصادر میں سے بنا ہے۔ اس مادہ میں بنیادی طور پر تری ضرور پائی جاتی ہے۔ ویسے اصلاً، پشت کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں۔ اور صلیٰ، اوّل نمبر کے بالکل پیچھے پیچھے اس طرح آنے کو کہتے ہیں کہ درمیان میں تھوڑا سا فاصلہ بھی محسوس نہ ہو۔ اس لحاظ سے اس میں وابستگی اور اتباع کا مفہوم بھی نکلتا ہے۔ اسی طرح سے میں پروان چڑھانے، نشوونما کرنے اور تعظیم کا پہلو بھی موجود ہے۔ جبکہ صال کا لفظ آگ میں بھوننے کے معنوں میں مستعمل ہے۔ حما، مصادر 'ح م ا' اور 'ح م ی' سے مخرج ہے۔ اس میں سڑن، تغیر اور حمیت و غیرت کا مفہوم ملتا ہے۔ جبکہ مَسْنُوْنٍ، مفعول کے طور پر، طریقہ، دستور اور قانون پر دلالت کرتا ہے۔ اس مادہ میں سہولت اور نرمی کے ساتھ ساتھ روانی اور جاری رہنے کا اشارہ بھی موجود ہے۔

Marfat.com

اس الانسان کی تخلیق کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ ایک ایسی صلصال سے خلق ہوا ہے جو حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے حاصل کی گئی ہے۔ یعنی حمیّت و غیرت کے جوش (سڑن، تغیّر) کو مفعول کی شکل میں، ایک خصوصی قانون و دستور بنا کر، کسی اوّل کے پیچھے پیچھے اس طرح رکھا گیا کہ دونوں میں معمولی فرق بھی محسوس نہ ہو۔ یہ پہلے سے مکمل طور پر وابستہ بھی ہے اور اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے لئے بے خطر آتش یزید میں کود جانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس کی پرورش رسولِ خدا نے اپنے دوشِ مبارک پر بٹھا کر کی اور اس کی تعظیم میں فرمایا: اَلْحُسَیْنُ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ: یعنی حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اولاد کا ماں باپ میں سے ہونا سمجھ آسکتا ہے، ماں باپ و اجداد کا اولاد میں سے ہونا کسی بہت عظمت کی نشاندہی ہے۔ مادہ صلصال میں تری پائے جانے کا مفہوم بھی اشارہ دیتا ہے کہ اس الانسان کو اور اس کی اولاد کو فرات کے کنارے ہونے کے باوجود ایک گھونٹ پانی میّسر نہ آسکے گا۔ اس کے باوجود اس کے اور اس کے اہلِ خانہ و محبّان کے ہونٹ اتنے خشک نہ ہو سکیں گے کہ پانی کی وہ قلت انہیں جھکنے پر مجبور کر دے۔ مگر جہاں قوانینِ خداوندی میں بے جا ترامیم کی مذموم سازش اور کوشش کی جائے، وہاں آہنی دیوار بن کر ظالموں سے ٹکرا جائے۔

۶۔ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ --- امام علی زین العابدینؑ: تقویم، اعتدال برقرار رکھنے کو کہتے ہیں۔ یعنی اتنا متوازن، محکم اور استوار کہ تکڑی کے دونوں پلڑوں کی مانند برابر ہو۔ ویسے قوام، سامانِ رزق مہیا کرنے والے اور کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اس میں ہمواری اور درستگی واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ اسی طرح احسن کا لفظ حَسَنَ سے نکلا ہے، جو تناسب کی نشاندہی کرتا ہے۔ بہر طور، آنکھوں کو بھلا معلوم ہونے والے کو حَسِین یعنی حاملِ حُسن کہا جاتا ہے۔ امام زین العابدینؑ، جو امام علیؑ کے بعد، علی نام سے منسوب ہونے والے پہلے امام ہیں، ایران کے فرمانروا کی صاحبزادی، شہزادی شہر بانو کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ظاہری اور باطنی حُسن کا ایک نہایت خوبصورت نمونہ تھے۔ کربلا کے مقام پر اپنے والد امام

Marfat.com

حسینؑ، چچا عباسؑ اور ان کے ستر سے زائد رفقاء کی شہادت کے بعد، جس متوازن اور محکم طریق سے انہوں نے حالات کا مقابلہ کیا، اس کی مثال تاریخ میں ڈھونڈنا ناممکن ہو گا۔ عمر مبارک کچھ زیادہ نہ تھی اور مصائب کا ایک پہاڑ تھا، مگر پائے استقامت میں ذرہ برابر بھی لغزش نہ آئی۔

خلیفۂ وقت حج کی نیت سے خانہ کعبہ گیا۔ طواف کرنے والوں نے اس کے لئے کسی اہتمام کا بندوبست نہ کیا۔ حتیٰ کہ وہ حجرِ اسود کے بوسہ سے محروم رہ گیا، اور کچھ بلندی پر جا کھڑا ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک روشن چہرے والی ذات، خانہ کعبہ کے قریب آئی تو طواف کرنے والے تمام لوگ پرے پرے ہٹ گئے اور اس ہستی کو تسلی سے حجرِ اسود تک پہنچ کر بوسہ کرنے دیا۔ جب تک وہ ذات حجرِ اسود کے قریب رہی، طواف حرم رُکا رہا۔ یہ امام زین العابدینؑ تھے۔ اس واقعہ میں احسن تقویم واضح جھلکتی ہے۔

۷۔ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۔۔۔ امام محمد الباقرؑ: نمبر ۵ میں صلصال کی تشریح کر دی گئی ہے۔ كَالْفَخَّارِ کا مادہ فخر کا عندیہ دے رہا ہے۔ کُل کائنات میں امام باقرؑ وہ اکیلی اور پہلی ہستی ہیں جن کو 'حَسَنِیْ حُسَیْنِیْ' ہونے کا شرف حاصل ہے۔ والدِ محترم امام علی زین العابدینؑ، امام حسینؑ کے صاحبزادہ ہیں جبکہ والدہ ماجدہ فاطمہ بنت امام حسنؑ ہیں۔ اس سے بڑا فخر کائنات میں کسی اور کا نصیب نہیں۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مقامِ کربلا پر جب فوج نے قیدیوں کو حراست میں لے لیا، تو امام زین العابدینؑ اور ان کے تین سالہ بیٹے باقرؑ کو ایک ہی طوق سے اس طرح باندھ دیا گیا، کہ وہ دونوں کی گردن میں تھا۔ اگر امام زین العابدینؑ اوپر اٹھتے تو باقرؑ کے لئے پھندہ بن جاتا۔ اس لحاظ سے امام باقرؑ شروع ہی سے اپنے والد سے اس طرح وابستہ تھے کہ دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے آگے پیچھے بھی تھے۔ جیسا کہ صال کے مفہوم میں لکھا جا چکا ہے۔

۸۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۔۔۔ امام جعفر الصادقؑ: ایک الانسان ایسا بھی ہے، جس کو علم قرآن پہلے سکھایا گیا اور

Marfat.com

پھر اس علمِ قرآن کے خمیر میں سے گوندھ کر اس کو انسان بنایا گیا۔ اور ازاں بعد اس کو علمِ قرآن بیان کرنے پر وہ قدرت عطا کی گئی جو کسی کا خاصہ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ آئمہ طہارؑ میں سے کھل کر علمِ قرآن بیان کرنے کی گنجائش صرف امام جعفر صادقؑ ہی کو میسر آ سکی۔ وگرنہ باقی تمام امامینؑ پر پابندیاں بھی بہت سخت رہیں اور ان کو مواقع بھی کم ملے۔ امام جعفر صادقؑ کے کئی نامور شاگرد ہیں، جنہیں آپؑ سے کسبِ علم کا دعویٰ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معارفِ قرآن کو جس انداز سے آپؑ نے بیان فرمایا، وہ اس سے قبل کسی اور سے ممکن نہ ہو سکا۔

۹۔ مَّآءٍ دَافِقٍ۔۔۔ امام موسیٰ الکاظمؑ: دافق کے لفظ میں بہہ جانے، اُبل پڑنے اور اچھلنے کا مفہوم نمایاں ہے۔ دھکا دے کر آگے بڑھانے کا عنصر بھی اس میں شامل ہے۔ تاریخی حقیقت کے طور پر یہ بات سب پر عیاں ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ، آئمہ کرامؑ میں سب سے زیادہ صاحبِ اولاد تھے۔ روایات کے مطابق قدرت نے ان کو پچاس (۵۰) بچّوں کا باپ بنایا، جن میں تئیس (۲۳) بیٹے اور ستائیس (۲۷) بیٹیاں ہیں۔ ظالم حکمرانوں کا زور جب کچھ کم ہوا اور امام جعفر صادقؑ نے نسبتاً کھل کر اور فصاحت کے ساتھ علمِ قرآن کی ترویج فرمائی تو لا محالہ ان کے صاحبزادہ امام موسیٰ کاظمؑ نے خیال کیا کہ اب کثیر اولاد ہونا چاہیے، تاکہ حق کا پیغام خالص شکل میں کائنات میں پھیل سکے۔ پچپن (۵۵) برس کی کُل زندگی میں، جہاں چونتیس (۳۴) برس فرائض و منصبِ امامت بھی نبھایا، وہاں اتنی کثیر اولاد پیدا کرنا خالی از حکمت نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ ان کے لئے ازل سے یہ مقرر تھا، اس لئے ان کی تخلیق کا مادہ مَّآءٍ دَافِقٍ چنا گیا۔ اُچھل کر، اُبل کر اور جلد حمل ٹھہرا کر، دھکا دے کر اپنی نسل کو آگے بڑھایا۔

۱۰۔ کَبَدٍ ۔۔۔ امام علی الرضاؑ: کبد، بنیادی طور پر جگر کو کہتے ہیں۔ مگر معنوی طور پر مشقّت و سختی کو جھیلنے کے لئے استقامت کے طور پر مستعمل ہے۔ بہر طور کبد کے مفہوم میں شدّت و قوت پائی جاتی

Marfat.com

ہے۔ حاکمینِ وقت کی طرف سے دی جانے والی سزا اور پابندیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، جس امامؑ نے اپنے آباء و اجداد کی جائے سکونت سے ہجرت فرمائی، وہ امام رضاؑ ہی ہیں۔ آپ خطۂ عرب چھوڑ کر، فارس میں آکر، شہر مشہد میں مقیم ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد فارسی النسل لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کی شہزادی شہر بانو کی اولاد میں سے ایک (امام) مشہد تشریف لے آئے ہیں۔ آہستہ آہستہ قربت کی بنیاد پر انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ کس طرح شہزادی شہر بانو کا سہاگ (امام حُسینؑ) اجاڑا گیا اور کیسے بعد میں ان کی اولاد کو عرب حکمران زہر دے کر ہلاک کرتے رہے ہیں۔ اس بنیاد پر ان کے دل میں امام رضاؑ کا مقام و مرتبہ گھر کر گیا۔ اور وہ ان کا ادب کرنے لگے۔ جائے پیدائش سے جدا ہو کر، اور دکھوں کے علاوہ، ایک غم انہیں یہ بھی کھا رہا تھا کہ فصلِ نبوت کی طرح، منصبِ امامت بھی جلد پردہ پوش ہو جائے گا۔ پھر تا قیامت سچی محبت کرنے والے اور راست لگن رکھنے والے کس طرح تاثیر نبوت و امامت سے فیض یاب ہو سکیں گے؟ قدرت کاملہ نے اس کے لئے بھی ایک نئی طُرح ڈالی۔ امام رضاؑ نے بہت شدّت اور قوت کے ساتھ نبوت و امامت کا بھاری بھرکم بوجھ، بہت سہل اور آسان طریق پر، معروف کرخیؒ کے کندھوں پر تھما دیا۔ اپنا سب کچھ یعنی نبوت و امامت کا خزانہ، اس طرح کسی کو تھما دینے کے لئے بہت بڑا ''جگرا'' چاہیے۔

۱۱۔ عَجَلِ۔۔۔ امام محمد الجواد التقیؑ: عجل کے مصدر میں جلدی، تیزی اور نامکمل پن کا مفہوم غالب ہے۔ امام محمد الجوادؑ آئمۂ اطہارؑ میں سب سے کم عمر ہیں۔ وہ ایسے الانسان ہیں جنہوں نے اس دارِ فانی میں سب سے کم وقت گزارا۔ عمر مبارک فقط پچیس (۲۵) برس رہی۔ چار (۴) برس کی عمر میں اپنے والد کی معیت میں حج بیت اللہ کر لیا۔ سات (۷) یا نو (۹) برس کی عمر میں منصب امامت کا بوجھ ان کے ننھے کاندھوں پر تھا۔ چھوٹی عمر کا حج اور کمسنی میں امامت پر فائض ہونا عَجَلِ ہی کی مد میں شامل ہے۔ خلیفۂ وقت مامون الرشید کی بیٹی اُم الفضل آپ کے عقد میں تھی۔ باپ کے اشارہ پر اسی نے پچیسویں (۲۵) برس زہر دے کر عَجَلِ کی تفسیر کو مستند کر دیا۔

Marfat.com

۱۶۔: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ: سورۃ ق آیت ۱۶ (خصوصی بیان)

علیؑ، امامِ اوّل ہیں اور صفِ انسان میں نمایاں حیثیت کے مالک بھی ہیں۔ جب عترتِ رسولؐ اور علیؑ کی مشترکہ زندگی طبعی طور پر مکمل ہونے کے قریب تھی، اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ ظہور پذیر ہو چکے تھے، تو لختِ جگرِ رسولؐ نے علیؑ کو وصیتاً فرمایا کہ قبیلہ بنو اسد کی فلاں خاتون، جن کا نام بھی فاطمہ تھا، میرے بعد اس سے نکاح فرمالیں۔ اللہ آپؑ کو اس میں سے ایک بیٹا عطا فرمائے گا۔ اس کا نام عباس رکھ لیں۔ وہ کائنات میں وفا کے کردار کا نشان ہو گا۔ میرے حسینؑ کا وفادار ساتھی اور اس کا علمبردار ہو گا۔ زندہ رہے گا تو سیّدہ زینبؑ اور سیّدہ امِّ کلثومؑ کا رکھوالا ہو گا اور جان دینے کا وقت آئے گا تو حسینؑ پر واری ہو گا۔ زمین پر جو کچھ ہونے والا تھا، آسمان پر، آسمان والے کے علم میں ازل کی ازل سے بھی قبل تھا۔ روزِ محشر جب سیّدۃ النساء اپنی سواری پر میدانِ حشر میں تشریف لائیں گی تو ندا دی جائے گی کہ سب اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ مالک و خالقِ کُل کائنات کو سیّدہ کریمہؑ کے اس ادب و عظمت کی بنیاد پر ایک الانسان اور خلق کرنا پڑا، اور خود کو اس کی رگِ جان سے بھی قریب کرنا پڑا، کیونکہ وہ انتخابِ فخر النساءؑ تھا اور ہے۔ ایک وقت پر نبوت و رسالت کے فیوض، امامت کے نطفہ سے ملا کر، دونوں کی تاثیر تاقیامت برقرار رکھنے کا سامان کیا گیا تھا۔ ازاں بعد امام علی الرضاؑ نے رسالت و امامت کے مشترکہ فیوض کو، معروف کرخیؒ کے کندھوں پر منتقل کر کے، انہیں ولایت میں مدغم کر دیا۔ مقصد اور مراد فقط یہ تھا کہ یہ فیوض و برکات کائنات میں جاری و ساری رہیں۔ بنی نوعِ آدم میں سے جو کوئی اس کا طالب ہو، یہ اس کے لئے بشکلِ ولایت، جہان میں موجود ہوں۔ بالکل اسی سنّت پر مالک و خالق کائنات نے الانسان کے کردار کی خوشبو، عباسؑ کی وساطت سے بنی نوعِ آدم میں منتقل کر دی۔ کردارِ انسان کی وہ خوشبو، اس مالک کو خود اتنی پسند تھی، کہ وہ ہمیشہ کے لئے اسؑ کی رگِ جان سے بھی قریب ہو گیا۔ سو

Marfat.com

ایک الانسان ایسا بھی تخلیق کیا گیا، جس کے وسواسِ نفس، یعنی حفاظتِ حرمتِ عترتِ رسول اور وفاداریٔ امام حسینؑ کو، تخلیق کرنے والا ازل سے خوب جانتا ہے۔ اور ان وسواس کی بجاآوری کے لئے اس مالک نے ازل سے اس الانسان کو تمام خوبیاں نوازیں۔ جس کی مراد یہ تھی کہ کہیں اس کو ان ذمہ داریوں کو نبھانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہو۔ بلکہ وہ ذمہ داریاں اس مالک کو اتنی عزیز تھیں کہ وہ ازل ہی سے خود اس الانسان کے قرب میں چلا گیا اور تب سے لے کر اب تک اس کی رگِ جان سے بھی قریب ہے۔ کُل کائنات قربِ ایزدی کی متمنی ہے، اور وہ، ایک الانسان عباس علمبردارؑ کی رگِ جان کے قرب میں رہنے پر فخر کر رہا ہے۔

سورۃ السجدہ آیات ۷ تا ۹ کا مقام خصوصی توجہ کا حامل ہے۔: اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ: یعنی وہی ذات ہے جس نے تمام اشیاء کو احسن طریق سے تخلیق کیا۔ اور خلقت کی ابتدا انسان کو طین سے بنا کر کی۔ پھر اس کے لئے نسل مقرر کی۔ جس کا سبب مَّآءٍ مَّهِیْنٍ کو بنایا گیا۔ پھر اسے اچھی طرح سنوارا گیا۔ اور اس میں، اس کی روح میں سے نفخ کیا گیا۔ قرآن میں: نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ: دو دفعہ استعمال ہوا ہے مگر نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ صرف اسی جگہ قرآن کی زینت بنایا گیا۔ عجب معاملہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی میں، اس کی اپنی روح میں سے نفخ کیا جائے۔ حالانکہ یہ عمل عقل جزوی کی سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے مگر قرآن میں اس حقیقت کا فقط ایک ہی دفعہ اظہار بامعنی بھی ہے اور خصوصی اہمیت کا حامل بھی۔

وہ الانسان جسے طین سے تخلیق فرما کر خلقت کی ابتدا کی گئی، ذاتِ محمدؐ ہے۔ اس لحاظ سے آیات متذکرہ کا مفہوم یہ بنے گا کہ آقائے نامدارؐ میں، ان کی اپنی ہی روح میں سے نفخ کیا گیا۔ حالانکہ یہ راز کہ ان کی

Marfat.com

روح کیا ہے اور اس میں سے ان ہی کی "ذات" میں کیا نفخ کیا گیا؟ بذاتِ خود ایسے سوالات ہیں، جن کے جوابات بہت تحقیق اور عرق ریزی کے باوجود میسر آنا مشکل ہونگے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ قرآن میں ایسانکتہ موجود ہے۔

۱۶۔ بشر

اس لفظ کے ظاہری مفہوم کے طور پر، بشر اسے کہتے ہیں، جو شر کی زد میں ہو، یا جسے شر سے چھٹکارا مشکل ہو۔ مگر لغت کی رُو سے جِلد کی اوپر کی سطح کو بَشَرَۃٌ کہتے ہیں۔ فطری طور پر جِلد بالکثرت مخلوقات کو پہنائی گئی ہے، تاکہ جسمانی اعضاء محفوظ رہ سکیں۔ تصور کریں کہ اگر جِلد نہ ہوتی تو بڑی مخلوقات کی ساخت کیسی ہوتی؟ خود بنی نوعِ آدم بھی جِلد کے بغیر مضحکہ ہوتے! باقی مخلوقات میں جِلد ہونے کے باوجود، اس لفظ کی عمومی مراد بنی نوعِ آدم کی جِلد لی جانے لگی، اور بعد میں بشر سے مراد آدم و بنی آدم کی طبعی ساخت ہوگئی۔ بشر کے مفہوم میں مادی (Material) بناوٹ کا عنصر ہوتا ہے، خصوصیاتِ (Characteristics) آدم وانسان اس میں پائے جانالازم نہیں ہوتا۔ وجود کی مادی بناوٹ چونکہ جِلد کی وجہ سے سمٹی، لپٹی اور محفوظ ہے، شاید اس لئے بھی کُل وجود ہی بشر کہلانے لگا۔ ہمارے اردگرد کے ماحول میں صحت کے لحاظ سے حالات کبھی بھی موافق نہیں ہوئے، جنہیں Unhygienic conditions کہا جاتا ہے۔ اگر قدرت کاملہ وجود کے اعضاء کو جِلد میں لپیٹ کر محفوظ نہ کرتی تو ان کا اصل حالت میں برقرار رہنا اور اپنے قدرتی افعال بجالانا ممکن نہ رہتا۔ شر کی زد میں ہونے کا یہ بھی ایک مفہوم ہے۔ اس مصدر میں جلد کو جلد سے رگڑنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ خوشی اور غمی دونوں خبروں کا اشارہ بھی اس میں موجود ہے۔ خوشخبری دینے والے کو بشیر کہتے ہیں۔ جو خود کسی جِلد میں لپٹا ہوا (Compact) نہ ہو، وہ کسی دوسرے کو کیسے خوش خبری دے سکے گا؟ علیٰ ھذا القیاس بَشَرَ، جِلد کے

Marfat.com

معنی سے شروع ہو کر، درمیانی تمام مطالب اپنے اندر سموئے ہوئے، آخر کار اس مقام تک جاتا ہے جہاں خوش خبری دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر حامل جلد یعنی مکمل (Compact) فرد ہی بشر کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اس مضمون میں ہم اسی جہت سے زیادہ بحث کریں گے۔ تاکہ باقی ماندہ اصناف مثلاً آدم، الانسان، عبد اور رجل کے ساتھ تقابل کی گنجائش بن سکے۔ قرآن میں بشر کی تخلیق کے مقامات مندرج ہیں۔

i: سورۃ الحجر آیت ۲۸ :وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ: یعنی جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا، تحقیق میں بشر کی تخلیق کرنے والا ہوں، صلصال میں سے جو حماءِ مسنون میں سے ہے۔

ii: سورۃ الفرقان آیت ۵۴: وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا: یعنی اسی ذات نے پانی سے بشر تخلیق فرمایا۔ پھر اس کے لئے آباء و اجداد اور قرابت داری کر دیے۔ اور تیرا رب قدیر ہے۔

iii: سورۃ ص آیت ۷۱: اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ: یعنی تحقیق میں طین سے بشر تخلیق کرنے والا ہوں۔

جیسا کہ الانسان کی بحث میں ہم دیکھ آئے ہیں، بشر کی تخلیق کے تینوں مادہ جات یعنی صلصال من حماء مسنون، ماء اور طین سے کردار الانسان کی بھی تین صورتیں تخلیق فرمائی گئی ہیں۔ بالا مقام نمبر (i) اور (iii) میں یہ تخلیق رَبُّكَ کے ذمہ ہے۔ جبکہ مقام نمبر (ii) پر هُوَ الَّذِيْ خالق ہے۔ لیکن الانسان کی تخلیق کی بحث میں کہیں نہ تو هُوَ الَّذِيْ کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور نہ کہیں رَبُّكَ کا ذکر ہے۔ بشر کی تخلیق پر

Marfat.com

بات کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ غور کیا جائے کہ قرآن میں بشر کی کیا خصوصیات بیان کی گئی ہیں یا لفظ بشر اور کون سے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں چند مقامات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

i: سورۃ الروم آیت ۲۰: وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ: یعنی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہیں تراب سے تخلیق کیا پھر جبھی تم منتشر، بشر ہو۔ اس آیت کے مطابق بشر کی تخلیق تراب سے بھی ہوئی ہے۔ گو یہ فرمان واضح اور براہِ راست نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تراب سے، جو آدم کی تخلیق کا اکیلا مادہ قرآن میں مذکور ہوا ہے، نشانی کے طور پر کچھ بشر بھی تخلیق فرمائے گئے۔ اور انہیں ہجومِ بنی آدم میں منتشر کر کے، کسی خاص مقصد کے لئے، پھیلا دیا گیا۔ گو یہ مفہوم قدرے دقیق اور انوکھا معلوم ہوتا ہے مگر متذکرہ آیت کے عین مترادف ہے۔

ii: سورۃ آلِ عمران آیات ۷۹ / ۸۰: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا: یعنی کسی بشر کو زیب نہیں دیتا کہ اللہ اسے کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائے، اور وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ اللہ کے سوا میری عبادت کرو، ہاں یہ کہنے کا مجاز ہے کہ چونکہ تمہیں کتاب سکھائی جاتی ہے اور درس و تدریس تمہارے لئے جاری ہے اس لئے رب کے ہو کر رہو، اور نہ ہی یہ حکم دے سکتا ہے کہ انبیاء اور ملائکہ کو مقامِ ربوبیت پر کھڑا کرو۔ اس آیت کے مصداق واضح ہوتا ہے کہ بشر کو کتاب، حکمت اور نبوت جیسی نعمتوں سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اور وہ ایسی عظیم نعمتیں حاصل ہونے پر بھی نہ تو مغرور ہوتے ہیں اور نہ ہی اتراتے ہیں، بلکہ راست بازی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ علم کتاب سکھانے اور آداب کا درس دینے کے باوجود حق بات کرتے ہیں۔

iii: سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر ۹۳ میں ہے: قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا: یعنی اے محبوب

Marfat.com

آپ فرمادیں کہ میرا رب پاکیزگی کی انتہائی منزل پر ہے اور میں تو نہیں مگر رسول، بشر کے روپ میں۔

iv: سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۴ میں ہے: اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا: یعنی جب کہا انہوں نے اللہ، بشر کے روپ میں، رسولوں کو مبعوث کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں رسولوں کی زبانی وارد کروایا گیا ہے: بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ: یعنی تمہارے جیسے بشر ہیں۔ مگر ایک فرق بھی ظاہر کر دیا گیا کہ: یُوْحٰٓى اِلَیَّ: یعنی ان کی طرف وحی ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ انبیاء اپنی امتوں سے، بر بنیادِ بشریت، اشتراک کا اظہار کرتے ہیں، جب کہ حصولِ وحی کو اپنے اور ان کے درمیان حدِ فاصل بتا رہے ہیں۔ قرآن ہی کے مطابق انبیاءِ سابقہ کی قومیں ان کے متعلق 'ہم جیسے بشر': بَشَرٌ مِّثْلُنَا: کے الفاظ استعمال کرتے رہے ہیں۔ جو ثابت کرتا ہے کہ وہ لوگ ظاہری نگاہ سے انبیاء میں کچھ ایسے خواص دیکھتے تھے جن کو وہ اپنے ساتھ مشترک سمجھتے تھے، تبھی ایسی بات کہتے تھے۔

v: سورۂ یوسف آیت ۳۱: وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ: یعنی (مصر کی عورتیں) بولیں ہر پاکیزگی اللہ کے لئے ہے۔ یہ (یوسفؑ) بشر نہیں ہے، یہ تو کوئی مکرم فرشتہ ہے۔ یہ آیت اشارہ دے رہی ہے کہ مصری عورتیں بشر کے لئے کوئی اچھا خیال نہ رکھتی تھیں۔ بلکہ ایک خصوصی ذات (یعنی یوسفؑ) کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر انہیں صنفِ ملائکہ میں سے گردانے لگیں۔ شاید ان کے لئے ملائکہ زیادہ حسین ہوں گے، یا شاید وہ بے خیالی میں کہہ ہی بیٹھی ہیں کہ اس (یوسفؑ) کو کبھی کسی طرح کے شر نے مَس بھی نہیں کیا۔ یہ تو اس پاک اور منزّہ ذات کی کُلی حفاظت میں ہے اور جہانِ امر کی مخلوقات سے مشابہ ہے۔

vi: سورۂ آلِ عمران آیت ۴۷ اور سورۂ مریم آیت ۲۰ میں دونوں جگہ کہا گیا ہے: قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ: یعنی (بی بی مریم) بولیں اے رب میری اولاد کیسے ہو گی؟ اور جب کہ نہیں مس کیا کسی بشر نے مجھے۔

Marfat.com

vii: اسی طرح سورۃ مریم آیت ۱۷ میں ہے: فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا: یعنی ہم نے ارسال کیا اس (مریمؑ) کی طرف اپنی روح۔ پس وہ مثل ایک تندرست بشر، اس کے سامنے ہوا۔ بالا دونوں آیات میں سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مریمؑ جانتی تھیں کہ بشر کے مَس کئے بغیر (حمل) اولاد نہیں ہوتی۔ لیکن جو رُوْحَنَا مریمؑ کی طرف بھیجا گیا وہ ایک مکمل اور تندرست بشر کے روپ میں دکھائی دیا، اور پھر اسی بشر کی وساطت سے بی بی مریمؑ حاملہ ہوئیں اور قدرتی و فطری وقت پورا ہونے پر عیسیٰؑ کو جنم دیا۔ غور طلب ہے کہ بشر کی وساطت سے ہونے والی اولاد کو بشر ہی ہونا چاہیے۔ یہ بھی فطری اور منطقی بات ہے!

viii: سورۃ المائدہ آیت ۱۸ : وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ: یعنی یہود و نصاریٰ نے کہا ہم اللہ کے بیٹے اور حُب دار ہیں۔ آپؐ فرمائیں تو پھر تمہیں گناہوں پر عذاب کیوں ہوتا ہے یا ہو گا۔ بلکہ تم بشر ہو جو خلق ہوئے ہو۔ اس آیت کے مطابق بشر گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے اس لئے اسے عذاب بھی ہو سکتا ہے۔

ix: سورۃ الانعام آیت ۹۱ : وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ: یعنی اللہ کی قدر نہیں ہوئی جیسا اس کی قدر کا حق ہے، جب یہ کہا گیا کہ اللہ نازل نہیں کرتا کسی بشر پر کوئی شے۔ یہ کہنا کہ بشر پر کوئی شے نازل نہیں ہوتی اللہ کو ناگوار گزرتا ہے، بلکہ ایسی بات کو اپنی بے قدری گردانتا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ بشر پر نزول ہوتا ہے۔

x: سورۃ النحل آیت ۱۰۳ میں وارد ہے: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ: یعنی ہم جانتے ہیں کہ وہ سب کہتے ہیں اس کا علم آپؐ کو بشر سے ملتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ کوئی بشر آپؐ کو علم قرآن براستہ

Marfat.com

وحی مہیا کرتا ہے۔ ویسے اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ آپؐ کو سکھایا جا رہا ہے وہ شر کی زد میں ہے، یا صرف بشر سے متعلق ہوتا ہے۔

xi: سورۃ الانبیاء آیت ۳۴: وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ: یعنی ہم نے نہیں کیا بشر کے لئے اس سے قبل ہمیشہ رہنا۔ کیا اگر آپؐ کو موت آئے گی تو وہ ہمیشہ رہیں گے؟ اس آیت کے مصداق بشر کے لئے اس جہان میں ہمیشہ رہنا مقرر نہیں۔ جس سے ثابت ہوا کہ خضرؑ بشر نہیں ہیں۔ چونکہ اس آیت میں اَفَاۡىِٕنْ مِّتَّ، حضورؐ کے لئے آیا ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ بھی صف بشر میں سے نہیں ہیں۔ تب ہی تو بشر کو تقابل میں رکھا گیا ہے۔ اور آپؐ کو علیحدہ کیا گیا ہے۔

xii: سورۃ القمر آیات ۲۳، ۲۴: كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۞ فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ: یعنی تکذیب کی (قوم) ثمود نے رسولوں کی۔ پس کہا، کیا اپنے میں سے ایک بشر کی اتباع کریں؟ ان آیات کے مطابق یا تو قوم ثمود اپنے آپ کو بھی بشر سمجھتی تھی، اور انبیاء کو اپنے جیسا خیال کرتی تھی۔ یا پھر یہ معنی بھی ظاہر ہوتے ہیں کہ وہ نبیؑ کو ان نفوس میں سے خیال کرتی تھی جو بشر کہلاتے اور ان سے مختلف نظر آتے تھے۔ دونوں صورتوں میں بشر کے لئے نبوت اس آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

xiii: سورۃ مدثر آیت ۲۵ میں ہے: اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ: یعنی یہ نہیں مگر (ایک) بشر کا قول۔ آیت ۲۹ میں ہے: لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ: یعنی بشر کے لیے لوح کی مانند۔ جب کہ آیت ۳۱ میں ہے: وَمَا هِیَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ: یعنی یہ تو نہیں مگر بشر کے لیے ذکر اور آیت ۳۶ میں ہے: نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ: یعنی بشر کے لیے ڈر سنانے والا۔ یہ تمام مقامات واضح کر رہے ہیں کہ قرآن ایک بشر کا قول ہے مگر عین اسی وقت بشر ہی کے لیے فائدہ مند ذکر بھی ہے اور بشر ہی اس میں وہ سبق حاصل کر سکتا ہے کہ اس کے تقویٰ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

xiv: سورۃ الشوریٰ آیت ۵۱: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا: یعنی کسی بشر کے لیے مقرر نہیں کہ اللہ سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردہ کی اوٹ میں یا اس پر مرسل بھیجا جائے! اس آیت کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ پاک بشر سے کلام کرتے ہیں، مگر بات کرنے کے طریقہ جات مخصوص کر دیے ہیں۔ سورۃ النساء آیت ۱۶۴ میں ہے: وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا: یعنی اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا جیسا کلام کا حق ہے۔ اس بنیاد پر ثابت ہوا کہ موسیٰؑ بشر تھے۔

درج بالا مقامات کو اگر مدِ نظر رکھا جائے اور ازاں بعد تخلیقِ بشر پر غور کیا جائے تو واضح طور پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت کاملہ نے صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ، اَلْمَآءِ اور مِّنْ طِيْنٍ سے جب تین مختلف الانسان تخلیق فرمائے تو اس عمل کے دوران ردِ عمل کے طور پر (As by-product)، ان میں سے ایک ایک بشر بھی تخلیق کیا۔ اور جب 'مِنْ تُرَابٍ' سے آدم و بنی آدم اور عیسیٰؑ تخلیق فرمائے گئے تو اس عمل کے ردِ عمل میں کئی بشر تخلیق کیے گئے، جنہیں زمین پر منتشر کر دیا گیا۔ جبکہ الانسان کے ردِ عمل کے طور پر تخلیق کیے گئے بشر کو (یا بشروں کو) منتشر کرنے کا اشارہ قرآن میں نہیں ملتا۔

الانسان کی بحث میں ہم نے دیکھا کہ مِّنْ طِيْنٍ، ذاتِ محمد الرسول اللہؐ، مِنَ الْمَآءِ، امام موسیٰ کاظمؑ اور مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ، امام حسینؑ تخلیق فرمائے گئے۔ اگر اوپر بیان کی گئی امکانی صورتِ حال کو اس بات سے ملایا جائے تو مِّنْ طِيْنٍ جب ذاتِ محمد الرسول اللہؐ تخلیق فرمائی جا رہی تھی تو اس عمل کے ردِ عمل (by-product) میں ایک بشر بھی تخلیق ہوا۔ امام موسیٰ کاظمؑ کی تخلیق کے عمل کے دوران بھی اور امام حسینؑ کی تخلیق کے ردِ عمل میں بھی ایک ایک بشر تخلیق کیا گیا۔ اسی طرح جب مِنْ تُرَابٍ آدمؑ اور بنی نوع آدم اور عیسیٰؑ تخلیق فرمائے گئے تو اس کے ردِ عمل کے طور پر کئی بشر

Marfat.com

تخلیق ہوئے جنہیں بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ یعنی منتشر کئے گئے بشر فرمایا گیا۔ انہی منتشر کئے گئے، یعنی پھیلائے گئے بشروں سے، بنی نوع آدم کے لیے ہدایت و رہنمائی کے لیے انبیاء کرام مقرر کیے گئے ۔ جنہیں کتاب، حکمت اور نبوت دی جاتی رہی اور جن سے مالک کائنات ہم کلام بھی ہوتا رہا۔ ان اولوالعزم ہستیوں نے اپنی زندگیوں میں شادیاں کیں، اولادیں پیدا فرمائیں اور حامل جلد ہونے کے تمام ثبوت دیے، تبھی ان کی امتیں، انہیں بَشَرٌ مِّثْلُنَا کہا کرتیں اور کبھی کبھی تواضع کے طور پر وہ خود بھی بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ کے الفاظ استعمال کر دیتے تھے۔ سہواً، یا منشائے ایزدی کے تحت ان سے خطاؤں کا سرزد ہونا بھی ملتا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ کسی بشر کو آج تک اس جہان فانی میں ہمیشگی عطا نہیں کی گئی۔

بشر کی ایک اور نمایاں اور اہم خوبی قرآن میں مذکور ہے، جس کو نظر انداز کرنا، ناانصافی ہوگی۔ اس کے لیے قرآن کے دو مقامات کی سیر ضروری ہوگی۔ اولاً سورۃ الحجر آیات ۲۸۔۲۹ جس میں فرمایا گیا ہے: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ: یعنی جب تمہارے رب نے ملائکہ سے فرمایا تحقیق میں صلصال من حماء مسنون میں سے بشر تخلیق کرنے والا ہوں، پس جب اُسے (اچھی طرح) سنوار دوں اور اپنی روح میں سے اس میں نفخ کردوں تو اُس کے لیے سجدہ ریز ہو جانا۔ اور دوسرا مقام سورۃ ص آیات ۷۱۔۷۲ جہاں فرمایا گیا ہے کہ: اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ: یعنی جب تمہارے رب نے ملائکہ سے فرمایا تحقیق میں طین میں سے بشر تخلیق کرنے والا ہوں، پس جب اُسے اچھی طرح سنوار دوں اور اپنی روح میں سے اس میں نفخ کردوں تو اُس کے لیے سجدہ ریز ہو جانا۔ ان دونوں آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ بشر کو تخلیق کرنے کے بعد سنوارنے کا کام بھی کیا گیا۔ یعنی ہر دو (۲) بشر جو صلصال من حماء

Marfat.com

مسنون سے اور طین سے تخلیق ہوئے، انہیں تخلیق کرنے کے بعد ذاتِ باری تعالیٰ نے خود ہاتھوں سے سنوارا۔ اور پھر ان دونوں پر ایک خصوصی کرم نوازی فرمائی گئی کہ ذات لم یزل نے اپنی روح میں سے ان دونوں میں نفخ فرمایا۔ یہ عمل، بلکہ انعام، قرآن میں انہی دو مقامات پر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ، کا عمل کسی کے ساتھ اور کہیں نہیں ہوا۔ یہ تخصیص، خالصتاً ان ہی دو بشروں کے حصہ میں آئی کہ انہیں سنوار کر، ان میں ذاتِ باری تعالیٰ نے اپنی روح میں سے پھونکا۔ ازاں بعد انہیں بھی مسجودِ ملائکہ بنایا گیا۔ صرف یادداشت کے لیے یہاں ذکر کیا جاتا ہے کہ قرآن کی رُو سے آدم، یا آدم جو مسجودِ ملائکہ ہوئے، انہیں ذاتِ باری تعالیٰ نے کبھی سنوارنے کا عمل نہیں کیا اور نہ ہی اُس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونکا۔ جب کہ الانسان کے ساتھ یہ عمل کیا گیا ہے، جس کا تذکرہ الانسان کی بحث کے تحت ملے گا۔

۱۷۔ عبد

اسم عبد، بلاشک عبادت کا مکمل مفہوم اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ وہ افراد جو عبادت زیادہ کرتے ہیں انہیں عابد کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں بھی ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس کی جمع عابدون، عابدین یا عابدات بھی ایک یا ایک سے زیادہ دفعہ استعمال ہوئی ہے۔ فعل کے طور پر اس مصدر کا استعمال اس وقت ہماری بحث کا حصہ نہیں، ہم حالتِ اسم پر ہی غور کریں گے۔ لیکن اسم کے ممکنہ خواص سمجھنے کے لئے اس کے فعلی حصہ کو بھی زیرِ غور رکھنا پڑے گا۔

بنیادی طور عبادت، قلبی رغبت کے ساتھ انجام دیے گئے افعال کو کہتے ہیں۔ چونکہ ذات باری تعالیٰ کے سوا رغبت، چاہت اور محبت کے لائق اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے اس کے احکام کی بجا آوری اگر ذوق شوق اور خلوصِ نیّت سے ہو تو اسے عِبَادَة کہا جانے لگا۔ بالخصوص قرآن میں یہ لفظ ان ہی معنی

Marfat.com

میں استعمال ہوا ہے۔ اس بنیاد پر وہ فرد جو احکاماتِ خداوندی کی ادائیگی میں رغبتِ قلبی کے ساتھ حق ادا کرتا ہے، عَبَدْ کہلاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ لوگ جو احکاماتِ الٰہی میں کوشش تو کرتے ہیں مگر ابھی ان کا دھیان راست نہیں ہوا، اس اسم کے حقدار نہ ہونگے۔ واضح رہے کہ سارے قرآن میں عَبَدْ کی تخلیق کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے، بلکہ اس ضمن میں اشارہ بھی نہیں ملتا۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عَبَدْ، دراصل ایک حال ہے، یہ کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ صحرائی علاقوں میں عبد نام کا ایک پودا پایا جاتا ہے جو اپنی خصوصیات کی بنا پر اونٹوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے۔ مانا جاتا ہے کہ اونٹ اس کو کھا کر موٹا بھی ہوتا ہے اور اس کے دودھ دینے کی استطاعت بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ پودا گرم خشک تاثیر کا حامل ہے اور اونٹ جب اسے کھاتے ہیں تو ان کی پیاس بہت بڑھ جاتی ہے۔ اچھی طرح سیر ہو کر پانی پی لینے پر درج بالا خصوصیات یعنی فربہی اور فراوانیٔ دودھ اس میں عود کر آتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ابتداً تھوڑی سی تکلیف اور تلخی برداشت کرنا پڑتی ہے لیکن بالآخر منفعت کا سامان ہو جاتا ہے۔ ان ہی بنیادوں پر عَبَدْ، عِبادۃ وغیرہ الفاظ میں کشش و رغبت، ابتداً مشقت اور انجام کار خیر اور خوشحالی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

ز: سورۃ الذاریات آیت ۵۶ کے فرمان کے مطابق: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ: یعنی جن و انس کو فقط عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ان کی تخلیق کا مقصد عبادت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ چونکہ اس مصدر میں سدھارنے، ہموار کرنے اور قابل استعمال کرنے کا عندیہ بھی ہے اس لئے قرآن نے چاہا ہے کہ تمام جن و انس ایک ایسی سعی اور کوشش (مجاہدہ) کریں جو ابتدا ان کے لئے بظاہر تکلیف دہ محسوس ہو، لیکن اس کی جاذبیت اور رغبت اُس عمل کو اس طرح جاری رکھوائے کہ انجام کار مخلوقاتِ متذکرہ اپنے آپ کو سدھارے، اور ہموار کر کے محبت الٰہی کے قابل کر سکیں۔ سو، تخلیق کئے گئے بنی آدم، الانسان اور بشر اگر دلی رغبت اور چاہت کے ساتھ حق عبادت ادا کر سکیں

Marfat.com

تو وہ درجہ عبد پر پہنچ سکتے ہیں۔ لازم نہیں کہ ہر اولادِ آدم عبد ہو یا ہر بشر بھی عبد ہو، لیکن اگر متذکرہ بالا خصوصیات سے متصف ہوں گے تو انہیں عبد کا خطاب دیا جائے گا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام الانسان ازلی طور پر اپنی طینت وجبلت کے طور پر عَبۡدُ کے مقام پر ہوتے ہیں۔

ii: قرآن میں عِبَادِیْ (میرا، عبد) کا لفظ بہت فخر سے کئی جگہوں پر استعمال ہوا ہے مثلاً سورۃُ البقرہ آیت ۱۸۶ :وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ: یعنی جب میرے عبد آپؐ سے میرے بارے میں سوال کریں تو انہیں فرمادیں کہ میں (اللہ) ان سے قریب ہوں۔ یا سورۃُ الحجر آیت ۴۲ :اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ: یعنی (اے شیطان) تحقیق میرے عبد تیری دسترس سے باہر ہیں۔ یہی الفاظ سورۃُ بنی اسرائیل آیت ۶۵ میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔

iii: اسی طرح عَبۡدُ اللہِ (اللہ کا عبد) سورۃ مریم آیت ۳۰ اور سورۃُ الجن آیت ۱۹ میں استعمال ہوا ہے۔ اور یہ الفاظ بالترتیب حضرت عیسٰیؑ اور حضورؐ کے لئے وارد ہوئے ہیں۔ عِبَادَ اللہِ (اللہ کے عبد۔ جمع کا صیغہ) بھی قرآن میں سورۃ دخان آیت ۱۸ اور سورۃُ الدھر آیت ۶ میں بیان کیا گیا ہے۔: عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِیۡنَ (ہمارے نہایت مخلص عبد۔ جمع کا صیغہ)، سورۃُ یوسف آیت ۲۴، سورۃُ الصافات آیات ۴۰، ۷۴، ۱۲۸، ۱۶۰، ۱۶۹ میں کہا گیا ہے۔ جب کہ سورۃُ الانبیاء آیت ۱۰۵ میں: عِبَادِیَ الصّٰلِحُوۡنَ (میرے صالح عبد) فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح: عَبۡدًا شَکُوۡرًا (نہایت شکر گزار عبد) سورۃُ بنی اسرائیل آیت ۳ اور سورۃُ سبا آیت ۱۳ میں وارد ہوا ہے۔ جب کہ: عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ (ہر وقت رجوع رکھنے والا عبد) سورۃُ سبا آیت ۹ اور سورۃُ ق آیت ۸ میں لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں: عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (ایمان کی انتہا پانے والے ہمارے عبد۔ جمع کا صیغہ) سورۃُ صافات آیات ۸۱، ۱۱۱، ۱۲۲، اور ۱۳۲ میں اتارا گیا ہے۔ سورۃُ الانبیاء آیت ۲۶ میں ملتا ہے عِبَادٌ مُّکۡرَمُوۡنَ (نہایت تکریم کئے گئے یا نہایت تکریم کرنے والے عبد۔ جمع کا صیغہ)۔

Marfat.com

iv: مالک کائنات نے عبد سے اپنا تعلق بھی قرآن میں کئی طرح سے ارشاد فرمایا ہے۔ مثلاً: وَ اللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (اور اللہ اپنے عباد پر مہربان ہے) سورۃ البقرہ آیت ۲۰۷ اور سورۃ آل عمران آیت ۳۰ میں ہے۔ جبکہ: وَ اللّٰہُ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ (اور اللہ اپنے عباد کو نگاہ میں رکھتا ہے) سورۃ آل عمران آیات ۱۵۔۲۰ اور سورۃ المومن آیت ۴۴ میں ملتا ہے۔ سورۃ الزمر آیت ۳۶ کا ایک مقام بالخصوص قابلِ ذکر ہے: اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (کیا اللہ اپنے عبد کے لیے کافی نہیں ہے)۔: عَبْدِہٖ، عَبْدَہٗ (اس کا عبد) کی صنف سورۃ مریم آیت ۲، سورۃ النجم آیت ۱۰ اور سورۃ الحدید آیت ۹ میں ملتی ہے۔

v: اس بات کا ثبوت کہ عَبد کی طرف کچھ نازل کیا جاتا ہے سورۃ البقرہ آیت ۲۳، سورۃ الانفال آیت ۴۱، سورۃ الکہف آیت ۱، اور سورۃ الفرقان آیت ۱ میں میّسر آسکتا ہے۔ جس کے الفاظ بالترتیب اس طرح ہیں: نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا (ہم اپنے عبد پر نازل کرتے ہیں)، اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا (ہم نے اپنے عبد پر نازل کیا)، اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ (اس کے عبد پر الکتاب نازل کی گئی) اور نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (اس کے عبد پر فرق کرنے والی نازل ہوئی)۔

vi: کچھ مخصوص تراکیب اس طرح ہیں: عِبَادُ الرَّحْمٰنِ (الرحمان کے عبد۔ جمع کا صیغہ) سورۃ الفرقان آیت ۶۳ میں اور سورۃ الزخرف آیت ۱۹ میں مقرر کی گئی ہے۔ جبکہ: نِعْمَ الْعَبْدُ (انعام کیا گیا عبد) سورۃ ص آیت ۳۰ میں مذکور ہوا ہے۔ اور سورۃ الزخرف، آیت ۵۹ میں وارد ہے: عَبْدٌ اَنْعَمْنَا (وہ عبد جس پر ہم نے انعام کیا)۔ اَلَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا: (ہمارے عباد میں سے وہ جنہیں شانِ مصطفائی سے سرفراز کیا گیا)۔ سورۃ الفاطر آیت ۳۲: عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰہُ

Marfat.com

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا :(ہمارے عباد میں سے ایک عبد جسے رحمت عطا کر کے لدنّی علم، خود ہم نے سکھایا)۔ سورۃ الکہف آیت ۶۵۔

viii: سورۃ الفجر آیات ۲۷ تا ۳۰ میں ہے: یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۞ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۞ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۞ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ :یعنی ہر وہ نفس جو اطمینان کاملہ پا چکا ہے وہ خوشی خوشی اپنے رب کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔(پس یہ اعزاز اس کو) میرے عباد میں شامل کر لیتا ہے اور یہی دراصل میری جنّت میں داخلہ کے مترادف ہے۔ جو میرے کسی عبد کے جلو میں داخل ہوتا ہے وہ دراصل جنّت میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا یہ رجوع اِلٰی رَبِّكِ تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کو اطمینانِ نفس کا مقام عطا کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک ممکنہ ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ "پس مَیں داخل ہوا بیچ (گروہ) اپنے بندوں کے اور میرا یہ داخلہ، میری جنت کی تشکیل کا باعث ہے۔ اب ہر نفسِ الْمُطْمَئِنَّةُ ، بصد خوشی اس جنّت کی طرف رغبت کر سکتا ہے"۔ کُل مخلوقات کے لیے جنّت کچھ اور ہو سکتی ہے، خود مالک و خالق کی جنّت وہ ہے جہاں اُس کے عباد ہیں، اور اس جنّت میں وہ مالک داخل ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے۔

۱۸۔ رَجُل۔ رجال

عربی زبان میں رِجْلٌ، پاؤں کو کہتے ہیں۔ جس کی جمع اَرْجُلٌ ہوتی ہے۔ اس بنیاد پر پاؤں پر چلنے والوں کو رِجَالٌ کہنے لگے جو رَجُلٌ کی جمع ہے۔ جس کے معنی لوگ، افراد اور اشخاص لئے جاتے ہیں۔ بلا شک بندر اور لنگور وغیرہ کے بھی پاؤں ہوتے ہیں، اس کے باوجود وہ رَجُلٌ کے مفہوم کے تحت نہیں مانے گئے۔ خصوصی طور پر آدم اور بنی آدم ہی کو اس میں شامل کیا گیا ہے۔ تخصیص یہ ہے کہ صرف نر، بمعنی مرد، کے لئے مستعمل ہے اور وہ بھی مکمل، توانا، تندرست، بقائم ہوش و حواس اور عمر کا پختہ ہونا

Marfat.com

چاہیے۔ حالانکہ مادہ، بمعنی عورت، میں بھی پاؤں ہوتے ہیں، مگر قرآن کی رو سے اسے نساء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو بمقابلہ رَجُلٌ (کامل مرد) کے ہے۔ قرآن نے واضح طور پر رَجُلٌ کو نساء سے، چندے اعتبار، افضل قرار دیا ہے۔

i: سورۃ البقرہ آیت ۲۲۸ کے مطابق ارشاد ہے۔: وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ: یعنی رَجُلٌ کے لئے درجہ ان (نساء) سے بہتر ہے۔

ii: سورۃ النساء آیت ۳۴ میں ہے۔: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ: یعنی رَجُلٌ، نساء کی نسبت زیادہ قوی اور قائم ہیں۔

iii: سورۃ النساء آیت ۱۱ میں فرمایا گیا۔: لِلذَّكَرِ (لِلرِّجَالِ) مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ یعنی بیٹے (رَجُلٌ) کا حصہ بیٹی سے دوگنا ہے۔

iv: سورۃ البقرہ آیت ۲۲۸ میں وراثت اور قانونِ شہادت کے معاملہ میں کہا گیا ہے۔: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ: یعنی (لین دین میں شہادت کے طور پر کچھ لکھنے لگو) تو شہادت لو دو (۲) گواہوں کی صرف رجال میں سے اور اگر تمہیں دو (۲) رجال نہ ملیں، تو ایک رجل اور دو عورتوں (کی شہادت لے لو)۔ اس کے مطابق بھی دو عورتیں ایک رجل (مرد) کے برابر سمجھی گئی ہیں۔ وراثت کے قوانین وضع کرتے ہوئے بھی اس فضیلت رَجُلٌ کو برقرار رکھا گیا ہے۔

v: اسی طرح سورۃ النساء آیت ۱۷۶ میں ہے۔: وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ: یعنی (اگر کلالہ کے) رجال (بھائی) اور نساء (بہنیں) ہوں تو بھی مرد کا حصہ دو عورتوں کے

Marfat.com

برابر ہو گا۔ یہاں بھی رَجُلُ بمعنی مذکر اور مرد ہی استعمال ہوا ہے اور اس کی فوقیت دو عورتوں کے مترادف بتائی گئی ہے۔

vi: سورۃ النساء آیت ا میں ہے۔: خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً: یعنی تمہاری تخلیق ایک نفس سے ہوئی اور اسی (نفس) سے اس کا جوڑا تخلیق کیا گیا اور ان دونوں سے بہت سارے رجال اور نساء پھیلا دیے گئے۔ اس آیت میں بھی رجل بمعنی مرد (مذکر) اور نساء بمعنی عورت (مؤنث) استعمال ہوئے ہیں۔

vii: سورۃ القصص آیت ۲۰ اور سورۃ یٰس آیت ۲۰ میں بالترتیب وارد ہے۔: وَ جَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى :: وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى :یعنی شہر کے کنارے سے ایک رجل سعی کرتا ہوا آیا۔ ان دونوں آیت سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ سعی اور کوشش و مجاہدہ بالعموم رَجُلُ کے لئے ہی مقرر کیا گیا ہے۔

viii: سورۃ الاعراف آیات ۶۳ اور ۶۹ میں ایک ہی جیسے الفاظ دو (۲) مختلف انبیاء کے متعلق فرمائے گئے ہیں کہ: اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ: یعنی تمہیں عجب لگتا ہے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ذِکر کسی رجل کی وساطت سے آیا، تاکہ اس سے تمہیں آنے والے خدشات سے آگاہ کر کے متنبہ کر سکے۔

ix: سورۃ یونس آیت ۲ میں وارد ہوا: اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ: یعنی کیا لوگوں کے لئے عجب بات ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک رجل کی طرف وحی بھیجی۔ بالا آیات سے یہ نتیجہ

Marfat.com

اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ذِکْرٌ مِنْ رَبِّکُمْ اور وحی رجل کے لئے مقرر ہے۔ کم از کم اس کی متضاد، النساء، اس اعزاز سے محروم ہے۔

x: سورۃ الزخرف آیت ۳۱ میں ہے۔: وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ: یعنی کہنے لگے کہ یہ قرآن دو بڑے شہروں کے کسی رجل پر کیوں نازل نہیں ہوا؟ نہ ماننے والے بھی جانتے ہیں کہ قرآن کا نزول رجل پر ہوتا ہے۔

xi: سورۃ الاعراف آیت ۴۶ اور ۴۸ میں دلیل ملتی ہے کہ رجل کی حیثیت موت کے بعد بھی برقرار رہے گی۔ جہاں بالترتیب کہا گیا ہے۔: وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ: یعنی اعراف پر رجال ہونگے جو سب کو چہروں سے پہچانتے ہونگے اور: وَ نَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ: یعنی اصحاب الاعراف، رجال کو ندا دیں گے، ان کے چہروں سے پہچانتے ہوئے۔ ان آیات سے مراد یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کی درمیانی جگہ، جسے اعراف کہتے ہیں، وہاں رجال ہوں گے اور چہرے پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔ میدان حشر کے متعلق عمومی عقیدہ یہی ہے کہ وہاں افراتفری کا عالم ہوگا، ماں بیٹے کو اور باپ بیٹی کو نہ پہچانے گا۔ جب 'رجال' اس جگہ بھی دوسروں کو پہچانتے ہوں گے تو یہ لازم ہے کہ وہ اپنے آپ سے ضرور باخبر ہوں گے۔ جو بعد از ممات اپنے آپ سے باخبر ہوگا، یقیناً اس زندگی میں اپنا عارف ضرور ہوگا، اور اسی عرفان ذات کی وجہ سے اسے اعراف پر متمکن کیا جائے گا۔

xii: سورۃ یوسف آیت ۱۰۹، سورۃ النحل آیت ۴۳ اور سورۃ الانبیاء آیت ۷ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔: وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ: یعنی اے محبوب ہم نے آپ سے قبل رجال ہی کو ارسال کیا تھا اور ان کی طرف وحی کی تھی۔ مراد یہ کہ ذات باری تعالیٰ صرف رجال کو اپنی طرف

Marfat.com

سے ارسال کرتی ہے۔ اور چونکہ حضورؐ بھی برحق ارسال کئے گئے ہیں اس لئے لازم آئے گا کہ وہ بھی رجال میں سے ہوں۔

xiii: اس کے علاوہ قرآن میں استعمال شدہ چند تراکیب واضح کرتی ہیں کہ رجل مومن کی شان کا حامل ہو سکتا ہے اور رجال اللہ سے کیا وعدہ سچّا کرنے والے بھی ہیں۔ جیسے سورۃ الفتح آیت ۲۵: رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ: یعنی ایمان والے رجال، سورۃ المومن آیت ۲۸: رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ: یعنی ایمان والا ایک رجل، اور سورۃ الاحزاب آیت ۲۲: مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ: یعنی مومنین میں سے رجال، جنہوں نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ سچّا کر دکھایا۔

xiv: سورۃ التوبہ آیت ۱۰۸ میں آتا ہے۔: فِیْہِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا: یعنی ان میں ایسے رجال ہیں جو طہارت کی انتہائی شکل اختیار کرنے کے متمنّی ہیں۔ یقیناً یہی وہ رجال ہیں جن کے متعلق سورۃ النور آیت ۳۶ میں کہا گیا ہے: رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ: یعنی ایسے رجال جو تجارت اور خرید و فروخت کے معاملات کی وجہ سے ذکرِ الٰہی کو فراموش نہیں کرتے، بلکہ وہ (ہمیشہ) صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

xv: سورۃ الجن آیت ۶ میں آیا ہے۔: رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ: یعنی انس میں سے رجال جو پناہ لیتے ہیں جنّات میں سے رجال کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ رجال، جنّات میں بھی ہیں اور اتنے طاقتور یا صاحبِ دانش ہیں کہ بنی نوعِ آدم کے رجال ان کی پناہ لیا کرتے ہیں (یا تھے)۔

xvi: ایک خصوصی مقام سورۃ الاحزاب آیت ۴ میں ملتا ہے۔: مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ: یعنی اللہ نے کسی رجل کے لئے اس کے پیٹ (سینہ) میں دو (۲) قلوب نہیں کئے۔ عمومی طور پر

Marfat.com

اس کا معنی یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ نے کسی مرد کے سینہ میں دو دِل نہیں بنائے۔ اگر یہی مفہوم مان لیا جائے تو اس میں یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ شاید کسی نساء(عورت) کے سینہ میں دو دِل کر دیے گئے ہوں، لیکن وحی میں اس بات کی تخصیص کر دی گئی ہو کہ کسی مرد کے سینہ میں دو دِل ہرگز نہیں ہو سکتے۔ یہ اصولاً بعید از قیاس ہے۔ غور کریں کہ یہ فرمان کسی واحد رجل کے لئے ہے گو اس کو مخصوص نہیں کیا گیا۔ لیکن اَلْفُؤَادَ کا اشارہ نہیں ہے قَلْبُ کا ذکر ہے، جس کا تعلق خالصتاً فہم و بصیرت سے ہے، بلکہ قَلْبُ خود زندگی ہے یا زندگی کا نمائندہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مناسب ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی رجل کے لئے دو(۲) زندگیاں نہیں کی گئیں۔

xvii: سورۃ الاحزاب آیت ۴۰ کا ایک مقام ہے۔: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ: یعنی محمدؐ تمہارے رجال میں سے کسی ایک کے بھی باپ نہیں ہیں بلکہ وہ صرف اللہ کے رسول ہیں اور تمام انبیاء کے انجام پر آنے والے اور ان کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ تاریخی حقیقت کے طور پر حضورؐ کی وساطت سے نر بچے(Male children) پیدا ضرور ہوئے، مگر وجوہات کی بنا پر وہ اوائل عمر میں ہی اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ حضورؐ انہیں گود میں کھلاتے رہے ہیں، قاسمؓ تو پاؤں پر چلنا بھی سیکھ گئے تھے اور اسی نسبت سے آپؐ ابو القاسم کہلانے لگے تھے مگر اس کے باوجود قرآن نے اس کو رد کر دیا اور واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ محمدؐ کسی رجل کے باپ نہیں ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رَجُلٌ ہونے کے لئے فقط نر(Male) ہونا ہی کافی نہیں ہے، شعور کی طبعی عمر اور پختگی بھی ضروری ہے۔

Marfat.com

۱۹۔ ابلیس

بلس مصدر میں مایوسی، نا امیدی، دہشت اور حیرت وغیرہ کے مفہوم پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں ابلیس کا ذکر قصۂ آدم اور بشر میں بہت نمایاں ملتا ہے۔ جب کُل ملائکہ کو ان کے رب کی طرف سے آدم یا بشر کو سجدہ کا حکم ملتا ہے تو بجز ابلیس کے تمام ملائکہ کے سجدہ ریز ہونے کا اشارہ میسر آتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ابلیس صفِ ملائکہ میں شامل تھا، بلکہ اب بھی ہے۔ اگر صفِ ملائکہ میں شمار نہ ہوتا، تو حکم سجدہ اس پر لاگو ہی نہ ہوتا اور نہ ہی وہ اس بنیاد پر کبھی مردود گردانا جاتا۔ قرآن میں کُل سات (۷) مقامات پر ملائکہ کے لئے سجدہ ریز ہونے کا حکم موجود ہے۔ جن میں سے پانچ (۵) مقامات پر سجدہ آدم کو کرنے کا حکم ہے، جبکہ دو (۲) مقامات پر وہ سجدہ بشر کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ وہ ساتوں مقامات بالترتیب ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

i: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ: سورۃ البقرہ آیت ۳۴۔

ii: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ: سورۃ الاعراف آیت ۱۱۔

iii: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ: سورۃ الحجر آیات ۲۸ تا ۳۱۔

iv: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ: سورۃ بنی اسرائیل آیت ۶۱۔

Marfat.com

v: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ : سورۃ الکھف آیت ۵۰۔

vi: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ : سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۶۔

vii: اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ : سورۃ ص آیات ۷۱ تا ۷۴۔

غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ جن پانچ (۵) مقامات پر آدم کو سجدہ کا حکم ہے وہاں قُلْنَا (ہم نے فرمایا) کا صیغہ استعمال ہوا ہے، جب کہ جن دو (۲) مقامات پر بشر کو سجدہ کے لئے کہا گیا ہے وہاں قَالَ رَبُّكَ (کہا آپ کے رب نے) کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح سجدۂ آدم کے لئے صرف ملائکہ لکھا گیا ہے، لیکن بشر کے دونوں مقامات پر الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ کا ذکر ہے۔ بالا تمام مقامات کے مطابق ابلیس سجدہ سے عاری رہا۔ چند مقامات پر اس کے سجدہ نہ کرنے کی وجوہات خود وحی نے مرتب کی ہیں، جیسے:

i: اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ : سورۃ البقرہ آیت ۳۴۔

ii: اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ : سورۃ الحجر آیت ۳۱۔

iii: كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ : سورۃ الکہف آیت ۵۰۔

iv: اَبٰى : سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۶۔

v: اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ : سورۃ ص آیت ۷۴۔

من حیث الکل ان مقامات پر اَبٰى اور اِسْتَكْبَرَ کو وحی نے ابلیس کی وجہ انکار بتایا ہے۔ اَبٰى میں کسی چیز کی

Marfat.com

ناپسندیدگی کی بنیاد پر اس کے ماننے سے انکار کرنا ہوتا ہے اوراس میں کسی حد تک توہین آمیز انداز موجود ہوتا ہے، جبکہ اِستَکبَرَ میں تکبّر کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ابلیس، آدم اور بشر سے اپنے آپ کو بہتر سمجھتا تھا، یا سمجھتا ہے۔ سورۃ الکہف میں ابلیس کو جنّ اور فاسق فرمایا گیا ہے اور اِسی کو اس کے انکار کا موجب بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ چند مقامات پر ابلیس کو سوال کیا گیا ہے کہ وہ خود بتائے اُس نے سجدہ سے انکار کیوں کیا؟ اور اُس کے جوابات کو من وعن زینتِ قرآن بنایا گیا۔ چونکہ وہ بھی انکار کی دلیلیں ہیں اس لیے انہیں بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔

i: سورۃ الاعراف آیت ۱۲ :قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ: یعنی فرمایا کس نے تجھے منع کیا کہ میرے حکم کے باوجود تو نے سجدہ نہ کیا۔ کہنے لگا میں اُس (آدم) سے بہتر ہوں۔ مجھے تُو نے نار سے تخلیق کیا ہے اور اُسے طین سے تخلیق کیا ہے۔

ii: سورۃ الحجر آیات ۳۲،۳۳ :قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ۞ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ: یعنی پوچھا اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں میں نہ ہوا۔ بولا میں بشر کو سجدہ نہیں کر سکتا تو نے اُسے حماءِ مسنون کے صلصال میں سے تخلیق کیا ہے۔

iii: سورۃ بنی اسرائیل آیت ۶۱ : قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِیْنًا: یعنی بولا کیا سجدہ کروں جسے تُو نے طین سے تخلیق کیا۔

iv: سورۃ ص آیت ۷۵: قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ: یعنی پوچھا اے ابلیس کس نے تجھے منع کیا کہ سجدہ کرے جسے ہاتھوں سے بنایا گیا۔ تُو نے غرور کیا یا تُو عالین میں سے ہو گیا تھا؟

Marfat.com

مندرجہ بالا دلیلوں سے واضح ہوتا ہے کہ ابلیس اپنے آپ کو تخلیق کے لحاظ سے ان مخلوقات سے بہتر سمجھتا ہے جن کو اُسے سجدہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اسی گھمنڈ اور غرور میں وہ سجدہ سے انکاری ہوتا ہے۔ ابلیس کہتا ہے مَیں (ابلیس) نار سے خلق ہوا ہوں! یہ بھی عجب عرفان کا مقام ہے کہ ابلیس اپنی خلقت و ماہیت کا واقف ہے۔ لیکن یہ خود اس (ابلیس) کا قول ہے جسے قرآن میں اُسی طرح بیان کر دیا گیا۔ اس کی لازم تصدیق کہیں قرآن میں موجود نہیں کہ ہاں واقعتاً ابلیس کو نار سے خلق کیا گیا۔ چونکہ سورۃ الکہف آیت ۵۰ میں اسے جن کہا گیا ہے اور چونکہ قرآن میں آتا ہے: وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ: سورۃ الرحمٰن آیت ۱۵ یعنی جنات کو بھڑکتی آگ سے تخلیق کیا گیا، تو اس سے ثابت ہو سکتا ہے کہ ابلیس واقعتاً ایک ناری مخلوق ہے۔ ابلیس کا دعویٰ، دراصل دعویٰ عرفانِ ذات ہے۔ بات یہیں تک نہیں رُک جاتی، اُسے جن مخلوقات کو سجدہ کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے، وہ ان کے مادۂ تخلیق کے عرفان کا بھی دعویٰ دار ہے۔ ممکن ہے وہ مخلوقات اپنے تئیں نہ جانتی ہوں کہ ان کا مادۂ تخلیق کیا ہے؟ لیکن سورۃ ص آیت ۷۵ میں ایک مخصوص بات فرمائی گئی ہے کہ اے ابلیس تو نے اُسے کیوں سجدہ نہ کیا جسے ہاتھوں سے (میں) تخلیق کیا گیا۔ کیا یہ تمہارا گھمنڈ و غرور تھا یا تو اپنے آپ کو عالین میں سے سمجھنے لگا تھا؟ غور طلب ہے کہ ابلیس کو یاد کروایا جا رہا ہے کہ ہم نے ہاتھوں سے (میں) تخلیق کیا اور تو نے اتنی بھی قدر نہ کی کہ اُسے ہمارے حکم پر سجدہ ہی کر دیتا۔ اس میں اشارہ ملتا ہے کہ ہاتھوں سے تخلیق کرتے وقت یا تو ابلیس موجود تھا اور اس کا گواہ تھا، یا پھر کہنے والے کو یقین تھا کہ ابلیس یہ جانتا ضرور ہے کہ وہ مخلوق ہاتھوں سے (میں) بنی۔ اور ساتھ ہی کہنے والا یہ بھی کہہ رہا ہے کہ کیا تو اپنے آپ کو عالین میں شمار کرنے لگا ہے؟ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کہنے والا یہ بھی جانتا ہے کہ ابلیس کو عالین کی خبر ہے۔ بلکہ خوبصورتی کی بات یہ ہے کہ عالین حضرات کا ذکر تمام قرآن میں صرف ابلیس کے اسی ذکر و مکالمہ میں ہی رکھا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ابلیس ہی عالین کا واقف

Marfat.com

ہے یا پھر جس بھی کسی کو عالین کی معرفت درکار ہو، وہ ابلیس ہی کی وساطت سے ایسا کر سکتا ہے! ایک تمثیل ڈرامائی انداز میں پیش کی جاتی ہے۔

ایک بادشاہ نے خصوصی حکم دے کر سونے کی تاروں کا کپڑا بُنوایا۔ بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس کا اکیلا بیٹا، جو ولی عہدِ سلطنت بھی تھا، اس سے لباس سلوا کر زیب تن کرے اور آنے والے سالانہ میلے میں کوئی اس کا ثانی الثانی نہ ہو۔ جب سلائی کا مرحلہ آیا تو مشیروں نے بادشاہ سے عرض کی درزی حضرات کو کپڑا بچا کر، چوری کرنے کی عادت ہوتی ہے اور اکثر چوری کیے ہوئے کپڑے سے اپنے لئے لباس تیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے مناسب ہو گا کہ درزی کو محل ہی میں بلوا کر اور اپنے سامنے بٹھا کر کپڑے سلوائے جائیں، تا کہ کسی بے ایمانی کا امکان باقی نہ رہے۔ بادشاہ نے تجویز کو پسند کیا۔ مملکت کے نامور ترین درزی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اسے بلوا کر اور کپڑا دکھا کر ولی عہد کا ماپ دیا گیا اور ساتھ ہی حکم دیا گیا کہ محل میں ہمارے سامنے بیٹھ کر بہترین لباس تیار کیا جائے۔ درزی اگلے دن مشین اور باقی اوزار و سامان لے کر آنے اور سامنے بیٹھ کر لباس تیار کرنے کا وعدہ دے کر چلا گیا۔ اگلی صبح پورے تپاک اور جوش و خروش سے سلائی کا کام شروع ہوا۔ بادشاہ سمیت تمام وزراء اور مشیرانِ سلطنت کی نگاہ، درزی پر مرکوز تھی اور وہ نہایت انہماک سے، سر نیچا کئے اپنا کام کر رہا تھا۔ قریب آدھا کام ہو چکا تھا کہ درزی کا چھوٹا بچہ منہ بسورے محل میں آیا اور باپ کے سامنے ہو کر بولا 'ماں نے بھیجا ہے کہ آپ سے کچھ پیسے لے کر بازار جاؤں اور پکانے کے لئے سبزی گھر لے جاؤں'۔ بیٹے کی بات سن کر درزی آگ بگولہ ہو گیا۔ اونچی آواز میں بچے کو ڈانٹنے لگا، حتّٰی کہ غصہ میں آ کر اپنی جوتی، مارنے کی غرض سے اس کی طرف پھینکی۔ جوتی جب بچے کو لگی تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ جوتی اٹھا کر ہاتھ میں پکڑی اور گھر کی طرف عازم ہوا۔ درزی کچھ دیر تک بڑبڑاتا رہا کہ اتنے نازک اور قیمتی کام کے دوان اس طرح بچے کو بھیجنا ماں کی حماقت ہے اور دربار میں موجود ہر کوئی دل ہی دل میں درزی کو خراجِ تحسین

Marfat.com

پیش کر رہا تھا۔ مزید چند گھنٹوں میں لباس تیار کر کے اور بادشاہ سے مزدوری اور انعام وصول پا کر درزی بھی گھر کو سدھارا۔

چند دنوں بعد، سالانہ میلے پر، ولی عہد وہ لباس زیب تن کر کے خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا اور اپنے آپ کو زمین پر خوش قسمت ترین فرد سمجھ رہا تھا، بلکہ اپنے تئیں اوجِ ثریا پر محسوس کر رہا تھا۔ ہر شخص لباس کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ ولی عہد نے ایک اور نوجوان کو سونے کی تاروں کے لباس میں ملبوس دیکھا۔ ولی عہد کی ساری شان و شوکت کرکری ہو گئی۔ شرمندگی اور غصہ کی حالت میں محل واپس لوٹا اور شکوہ کے انداز میں بادشاہ کو واقعہ بتایا۔ بادشاہ فوری طور پر کچھ نہ سمجھ سکا۔ ایک دانش مند مشیر کی ذمہ داری لگائی کہ اس نوجوان کا پتہ لگایا جائے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ نوجوان اس درزی ہی کا بڑا بیٹا تھا، جس نے محل میں بیٹھ کر ولی عہد کا لباس بنایا تھا۔ درزی کو محل میں طلب کیا گیا۔ چونکہ چوری کا کوئی ظاہری اور واضح ثبوت نہ تھا اس لئے پوچھ گچھ کے انداز میں اس سے دریافت کیا گیا۔ درزی نے جواب دیا' عالی جاہ آپ کو یاد ہو گا کہ دوران سلائی میرا چھوٹا بیٹا محل میں آیا تھا اور میں نے ڈانٹتے ہوئے اس پر اپنی جوتی پھینکی تھی۔ دراصل میں نے کام کے شروع ہی میں آدھا کپڑا کاٹ کر جوتی میں چھپا لیا تھا۔ میرا بیٹا سوچی سمجھی سکیم کے تحت آیا تھا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بچہ روتے ہوئے اور واپس جاتے ہوئے میری جوتی بھی ہمراہ لے گیا تھا۔ اس طرح وہ کپڑا میرے گھر پہنچ گیا اور واپس جا کر اس ہی کپڑے سے میں نے اپنے بڑے بیٹے کا لباس تیار کیا۔

اس تمثیل سے کوئی اور نتیجہ نہ بھی نکلے، ایک بات ضرور سامنے آتی ہے کہ غصہ میں کسی کو ماری ہوئی جوتی لازماً نفرت و غصہ کا اظہار نہیں ہو سکتی، اس کے پیچھے کئی 'اعلیٰ' مقاصد چھپے ہو سکتے ہیں۔ قصۂ ابلیس کے ظاہری پہلوؤں سے کچھ سوالات ابھرتے ہیں۔ مثلاً:

Marfat.com

i: ہم ایمان رکھتے ہیں کہ حکمِ الٰہی کے بغیر ایک پتّہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا، تو ابلیس کیونکر حکمِ خداوندی سے خلاف کر گیا؟

ii: صفِ ملائکہ میں ہونے کے باعث اُس کی سرشت میں انکار تو ممکن ہی نہیں ہونا چاہیے۔ ابلیس کی سرشت یکسر کیونکر بدل گئی؟

iii: کیا تخلیقِ آدم و بشر، ابلیس کے سامنے ہوئی تھی؟

iv: تخلیقِ آدم و بشر میں، بحیثیت سردارِ ملائکہ، ابلیس نے کیا رول (role) ادا کیا؟

v: مالکِ کائنات کو تو اَلصَّمَد ہے، وہ کیوں ابلیس سے وجہ انکار دریافت کرتا ہے؟ سینوں کے رازوں کا واقف، محتاجِ سوال کیوں ہوا؟

vi: حکمِ خداوندی کا پہلا انکار ابلیس نے کیا۔ اس کی سزا مرتب کرتے ہوئے وقتِ معلوم تک کی چھوٹ، کیوں دی گئی؟

vii: ابلیس کیا ہے؟ آج کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ وغیرہ

الانسان کی بحث میں لکھا گیا ہے کہ حضورؐ کو طِین سے تخلیق فرمایا گیا۔ جبکہ اسی تخلیق میں ردِ عمل (by product) کے طور پر ایک بشر بھی تخلیق ہوا۔ اسی معنی میں یہ نظریہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ 'مِنْ طِيْنٍ' خلق کرنے کے دوران جو حدت اس عمل میں سے خارج ہوئی، قدرتِ کاملہ کو یہ منظور نہ ہوا کہ اُس متبرک عمل میں خارج ہونے والی حدّت (نار) کو ضائع ہونے دے۔ چنانچہ زیاں سے بچانے کے لئے اس حدت (نار) کو جب مجتمع کیا گیا، اور محفوظ کرنے کی نظر سے اکٹھا کیا گیا، تو اس نے ایک شکل اختیار کر لی۔ مالکِ کائنات نے اُس شکل کو قبول کرتے ہوئے اُسے عزازیل نام عطا فرمایا۔

Marfat.com

حامل قوتِ بَلَس ہونے کی وجہ سے اس کا لقب اِبلیس ہو گیا اور آج وہ اسی نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہی وہ حدت (نار) ہے، جو طین سے تخلیق کے عمل کے دوران خارج ہوئی تھی۔ جس لمحہ یہ خارج ہوئی اور خالق کو لگن ہوئی کہ یہ بھی ضائع نہیں ہونی چاہیے، تو فوری طور پر اُسے سمیٹنے اور ایک شکل دینے میں مصروف ہوا۔ اس معمولی مدت میں طین سے خلق ہو چکنے والے (حضرت محمدؐ) سے یقیناً توجہ ہٹ گئی ہو گی۔ مگر حدت کو عزازیل بنا دینے کے بعد جب قدرت کاملہ پھر اپنے محبوب کی طرف متوجہ ہوئی، تو اس وقت عزازیل نے طین سے ہونے والی مخلوق کا مشاہدہ کیا ہو گا۔ اور اپنے تئیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو گا کہ شاید یہ میرے سامنے ہی تخلیق ہوا ہے۔

طین سے جو اوّل مخلوق یعنی فخر موجودات محمدؐ ہوئے، مالک و خالق اس کی شباہت پر بر حق نازاں تھا۔ وہ نقشہ اُسے اتنا مرغوب ہوا کہ جب تراب سے آدم کی تخلیق کا وقت آیا تو اُسے بھی وہی تصویر بنا دیا گیا۔ خالق کائنات کی چاہت تھی کہ اس کے حبیبؐ کی شباہت ہر جا، ہر سمت، ہر سُو پھیل جائے اور وہ ہر طرف اسی نظارہ میں مخمور رہے۔ جب ابلیس کو یہ حکم دیا گیا ہو گا کہ آدم کو سجدہ کرے، تو اس کی شکل دیکھ کر اُسے، اوّل المخلوقات کی شبیہ یاد آ گئی ہو گی۔ اور وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو گیا ہو گا کہ یہ میرے سامنے تخلیق ہوا تھا، اسے سجدہ کیوں کروں؟ علی ھذا القیاس جس بھی گھمنڈ میں منکر سجدہ ہوا یہ لازم ہے کہ ساجد غیر اللہ نہ ہوا۔ توحید پرست ہونے پر اُسے کل بھی فخر تھا اور آج بھی اس میں مخمور ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بحیثیت ناری مخلوق اور سردار ملائکہ اسے انکار کی جرأت بھی نہیں ہو سکتی۔ محسوس ہوتا ہے کہ مشیّت خداوندی میں ابلیس کے ذمہ کوئی بہت اہم ذمہ داری سونپنا مقصود تھا اور اس ذمہ داری کو راز رکھنا بھی اتنا ہی لازم تھا، اس لیے اورنگ سلیماں کا یہ کھیل رچایا گیا!

ایک روایت پیش ہے۔ برطانوی حکومت نے جب ہندوستان میں اپنے پاؤں مضبوط کر لیے تو یہاں کے

Marfat.com

مال و دولت کو اپنے ملک میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے قیمتی اثاثہ جات کے علاوہ، کوہِ نور نام کا ہیرا، جو آج تک دنیا کا سب سے قیمتی پتھر ہے، بھی منتقل ہونا تھا۔ نہایت سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ اور طویل عمل کے بعد بذریعہ ہوائی راستہ وہ پتھر جب برطانیہ پہنچا اور جن صندوقوں میں بند کر کے اُسے بھیجا گیا تھا، انہیں کھولا گیا تو ان میں متعلقہ ہیرا مفقود تھا۔ سب حیران ہو گئے۔ سیکیورٹی انچارج کو پوچھا گیا تو اُس نے کوہِ نور ہیرا اپنی جیب میں سے نکال کو پیش کر دیا۔ تفصیلات پوچھنے پر اس نے کہا کہ اِس امکان کو خارج کرنے کے لیے کہ کہیں کوئی ڈاکو اور راہزن اُس قافلہ کو لوٹ لینے میں کامیاب ہو کر اس قیمتی ہیرا کو لے کر غائب نہ ہو جائے، مَیں نے اُسے روانہ ہونے والے قافلہ میں رکھا ہی نہ تھا، بلکہ ہمیشہ اپنے ہی پاس رکھا، تاکہ قافلہ کو لُوٹ لینے کے بد اور خطرناک عزائم رکھنے والوں کی نگاہیں اسی پر مرکوز رہیں، لیکن ہیرا محفوظ اور خاموشی سے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائے۔ سو یہ حاضر ہے، تسلّی کر لی جائے! تمام انتظامات اور کاروائیاں ایک ڈرامہ نکلا۔ جب کہ اہم اور با مقصد کام ایک دوسرے راستہ سے خاموشی اور حفاظت کے ساتھ مکمل کر لیا گیا۔ بالکُل اسی طرح مالکِ کائنات نے ایک طویل داستان ضرور بنائی، مگر حقیقت میں اس کی منشا مختلف تھی۔ ابلیس سے ایک نہایت اہم کام لینا مقصود تھا، جس کے لئے اس کے تشخص کو ظاہری طور پر دوسری مخلوقات کے سامنے ایسا پیش کیا گیا، کہ وہ اس سے متنفّر ہو جائیں۔ تاکہ ابلیس اسی حالت میں خاموشی اور حفاظت کے ساتھ اپنا وہ کام سرانجام دیتا رہے، جس کے لئے اسے منتخب کیا گیا تھا۔ اس کا واضح ذکر، ذرا مختلف انداز سے، قرآن میں موجود ہے۔

i: سورۃُ الاعراف آیت ١٦ میں ہے: لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ :یعنی مَیں ان کے لئے تیری صراطِ مستقیم پر بیٹھوں گا۔ ثابت ہوا کہ ابلیس کو ازل سے صراطِ مستقیم کی خبر ہے، بلکہ آج بھی صراطِ مستقیم پر وہی قاعدہ کیے ہوئے ہے۔ باقی کُل مخلوقات بشمول بنی نوعِ آدم صراطِ مستقیم کو تلاش کرنے

Marfat.com

کے لئے پابند کی گئی ہیں۔ تمام انبیاء و مرسلین اور قطب، غوث، ابدال، ولی، شہید اور صدیق عمر بھر: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ: یعنی ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما، کا ورد کرتے رہے، کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، مگر ابلیس ازل سے بھی قبل، آج بھی اور تا قیامت صراطِ مستقیم پر قاعدہ کئے ہوئے ہے۔

ii: سورۃ الحجر آیات ۳۵ تا ۴۱، اور سورۃ ص آیات ۷۸ تا ۸۳ میں قریباً ایک جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں: وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ: یعنی تحقیق تجھ پر یوم الدین تک لعنت ہے۔ (ابلیس) کہنے لگا اے رب مجھے مبعوث ہونے کے دن تک مہلت دے۔ فرمایا گیا تجھے وقت المعلوم کے دن تک مہلت ہے۔ (ابلیس) بولا اے رب میں گمراہ کیا گیا ہوں۔ اس لئے زمین میں سب کو زینت کے فریب سے گمراہ کروں گا ۔ مگر تیرے مخلص بندے (فریب میں نہ آئیں گے)۔ (اللہ نے) فرمایا یہی راستہ سیدھا میری طرف آتا ہے۔ ان آیات سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ ابلیس واقفِ صراطِ مستقیم تھا اور ہے۔ وہ اس کے علاوہ یوم الدین، یوم یبعثون اور وقتِ معلوم کا بھی عارف ہے۔ کیا آج زمین پر مخلوقات میں سے ہر کس و ناکس یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ان الفاظ کے معنی بھی ٹھیک طرح سے جانتا ہے؟ چہ جائیکہ وہ ان الفاظ کا عارف ہونے کی بابت کچھ کہے۔ بین السطور ان آیات میں یہ مذکور بھی ملتا ہے کہ ابلیس عباد المخلصین کا واقف ہے۔ باقی سب تو اس کے نرغہ میں زیر ہو جاتے ہیں مگر جو اس کی 'عیاری' سے محفوظ رہتے ہیں، وہ ان سب کا واقف بھی ہو گا اور گرویدہ بھی۔ ابلیس کے ذمہ دراصل یہی منصب ہے کہ وہ مخلص بندوں کو تمام مخلوقات میں نمایاں کر کے ظاہر کرتا رہے۔

Marfat.com

غور طلب امر ہے کہ جس کو یوم الدین، یوم یبعثون اور وقتِ معلوم جیسی 'غیب الغیوب' حقیقتوں سے آشنا کیا گیا وہ 'غیر' تو نہیں ہو سکتا۔ دراصل وہ کبھی راندۂ درگاہ تھا ہی نہیں، اسے کسی خاص مقصد کے تحت ایسا ظاہر کیا گیا ہے، تاکہ وہ کوہِ نور ہیروں کی مانند عباد اللہ المخلصین کو ان کی منزلِ مقصود تک پہنچائے اور نمایاں کرکے، باقی مخلوقات سے انہیں ممتاز کرنے کا کام کرے۔ اس دوران اگر اسے لعنت ڈالی گئی اور بظاہر غصہ میں فاخرج کا حکم دیا گیا تو کسی نے غور نہیں کیا کہ درزی کے بیٹے کی طرح جو 'جوتی' اس نے اٹھالی، اس میں کتنا بیش قیمت انعام پہلے ہی سے موجود تھا۔ جوتا بھی کسی غیر کا نہیں، خود مالک و خالقِ کُل کائنات کا ہے۔ ابلیس کو منشائے ایزدی کے تحت، اس جہانِ فانی میں محکمہ امتحانات کا مہتمم اعلیٰ (Controller examinations) مقرر کیا گیا ہے۔ چونکہ اس مقصد کو کما کان حقہٗ انجام دینے کے لئے ضروری تھا کہ مخلوقات کو اس بات کا گمان بھی نہ ہو، اس لئے سجدہ کے نام پر ایک امکان (Situation) پیدا کرکے، بظاہر غصہ کا اظہار کرکے اسے 'جوتی' ماری گئی۔ مگر اس جوتی میں وہ تمام انعامات اور ضروری علوم خود اپنی طرف سے عطا کرکے، صراطِ مستقیم پر فائز کردیا۔ اب جو کوئی بھی صراطِ مستقیم پر قدم رکھنا چاہتا ہے، اسے ابلیس کا سامنا کرکے بڑا امتحان دینا پڑتا ہے۔ اگر اس میں کامیاب ہو جائے تو صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکتا ہے، وگرنہ، خود بخود ثابت ہو جائے گا کہ عباد اللہ المخلصین میں سے نہیں ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ابلیس ایک اکیلا کردار ہے اور اس کردار کی ایک اکیلی شکل اور وجود۔ قرآن میں کہیں ابلیس کی جمع کا صیغہ استعمال نہیں ہوا، زوجہ اور اولاد وغیرہ کا بھی کوئی اشارہ نہیں ہے۔ لیکن سورۃ الشعرا آیات ۹۴ اور ۹۵ کے مطابق ابلیس کے لشکر کا عندیہ ملتا ہے: فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ۝ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ: یعنی وہ اور تمام حد سے بڑھنے والے اس جہنم میں اوندھا دیے جائیں گے اور ابلیس کے تمام لشکر بھی۔ جنود اپنے اندر اکٹھا ہونے کا مفہوم رکھنے کی وجہ سے جمعیت و لشکر، جس میں

Marfat.com

کئی رسالے اور دستے ہوں، کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ کسی کمانڈر کی فوج اور لشکر اور ہوتا ہے اور وہ کمانڈر خود اور ہوتا ہے۔ کمانڈر یا سردار کا قیاس فوج اور لشکر پر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ابلیس اور جنودِ ابلیس دو مختلف چیزیں (Entities) ہوں گی۔ جنودِ ابلیس کا قیاس خود ابلیس پر کرنا زیادتی ہوگی۔ ویسے قرآن میں جنودِ ابلیس کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔

بحثِ ابلیس میں قرآن کا ایک اور مقام قابلِ ذکر ہے۔ سورۃ السبا آیت ۲۰ میں ہے: وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ: یعنی بے شک ابلیس نے ان پر اپنا گمان سچ کر دکھایا، تو وہ اس کی اتباع کرنے لگے مگر مومنین کا گروہ بچا رہا۔ قرآن کا یہ اپنی طرز کا واحد مقام ثابت کر رہا ہے کہ ابلیس اپنا ظن (گمان) سچا کرنے پر قادر ہے اور آج بھی یہ عمل کر رہا ہے۔ مخلوقات سے اس کا واسطہ (Inter action) بھی اسی آیت سے ظاہر ہو رہا ہے، جس سے واضح ہو رہا ہے کہ آج بھی اس کا اتباع ہو رہا ہے۔ ابلیس کہیں زنجیروں میں جکڑ کر اور پابندِ سلاسل کر کے کسی دوزخ میں نہیں ہے بلکہ وہ واقف و عارفِ يَوْمِ الدِّينِ، يَوْمِ يُبْعَثُونَ اور يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ آج بھی فعال ہے اور نہایت خوبی سے اپنے ذمہ لگائی گئی ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہے۔

۲۰۔ شیطان / شیاطین

عربی مصدر شطن میں لمبائی، گہرائی اور اسی بنیاد پر دوری کا عنصر نمایاں ہے، مخالفت اور سرکشی ایسے مفہوم بھی اس سے مراد لیے جاتے ہیں۔ لفظ شیطان اسی مصدر سے بنا ہے اور ہمہ ایں یہ تمام معنی اپنے اندر رکھتا ہے۔ قرآن میں یہ شیاطین یعنی جمع کے صیغہ کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ ایک قسم کے بدصورت سانپ کو بھی شیطان کہتے ہیں۔ اسی طرح کسی لحاظ سے لفظ شیطان میں پیاس کی

Marfat.com

شدت کا مفہوم بھی بیان کیا گیا ہے۔ قرآن میں شیطان اور شیاطین کے الفاظ جن جہتوں میں استعمال ہوئے ہیں، وہ مندرج ہیں۔

i: بہکاواءِ شیطان / شیاطین:۔

i(i): سورۃُ البقرہ آیت ۳۶: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ: اور سورۃ آلِ عمران آیت ۱۵۵: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ: یعنی جنّت سے آدم اور حوا کے خروج میں اور جنگِ احد کے موقع پر صحابہ کو بہکاوا شیطان ہی نے دیا تھا۔

i(ii): سورۃُ البقرہ آیت ۲۶۸ میں ہے: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ: یعنی شیطان تمہیں محتاجی کا اندیشہ دلاتا ہے اور بے حیائی کی رغبت دلاتا ہے۔

i(iii): سورۃُ بنی اسرائیل آیت ۶۴ اور سورۃُ النساء آیت ۱۲۰ میں ہے: وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا: کہ شیطان کے وعدہ جات فریب اور دھوکا ہیں۔

i(iv): سورۃُ النساء آیت ۶۰ میں ہے: وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا: یعنی شیطان تمہیں بہکانے کا ارادہ کرتا ہے۔

i(v): سورۃُ الاعراف آیت ۲۰ کا مقام فرماتا ہے: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ: کہ شیطان نے آدم و حوا کو وسوسہ میں ڈال دیا۔

i(vi): سورۃُ الانعام آیت ۴۳، سورۃُ الانفال آیت ۴۸ اور سورۃُ النحل آیت ۶۳ میں بالترتیب آیا ہے: فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ، وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ اور فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ: یعنی

Marfat.com

شیطان اپنے بہکاوے میں پھنسانے کے لیے بنی نوع آدم کے اعمال اُن کی نگاہوں میں مزین و آراستہ کر کے اس طرح پیش کرتا ہے، کہ وہ خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

(vii)i: سورۃ یوسف آیت ۴۲ میں ہے: فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ :یعنی بہکاوا، شیطان کی وجہ سے وہ بھول گیا جو اُسے کرنا چاہیے تھا۔

(viii)i: سورۃ الانعام آیت ۱۲۱ میں ہے: وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ: یعنی یقیناً شیاطین اپنے ماننے والوں کو اپنے دل کی بات ضرور سناتے ہیں۔ اور اس طرح اُسے بہکاوے میں لے کر مزید گمراہ کرتے ہیں۔

ii: اتباعِ شیطان کی ممانعت:۔

سورۃ البقرہ آیت ۱۶۸، سورۃ الانعام آیت ۱۴۲ میں ہے: وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ :یعنی شیطان کے راستوں کا اتباع کبھی نہ کرو۔

iii: شیطان سے پناہ کی ترغیب:۔

(i)iii: سورۃ الاعراف آیت ۲۰۰ میں ہے: وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ: یعنی جب شیطان تمہیں اس اندیشہ میں مبتلا کرے، جو فساد کا باعث ہو سکتا ہے، تو اللہ کی پناہ میں آ جایا کرو۔

(ii)iii: سورۃ النحل آیت ۹۸ میں وارد ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ :یعنی تلاوت قرآن سے قبل، شیطان مردود کے لئے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔

Marfat.com

(iii)iii: قرآن میں اس کی عملی تفسیر کا اظہار بھی کیا گیا ہے اور اس میں پسندیدگی کا عنصر واضح طور پر نمایاں ہے۔ سورۃ آلِ عمران آیت ۳۶ جہاں آتا ہے: وَاِنِّیْ سَمَّیْتُھَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِكَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ: یعنی جب مریمؑ پیدا ہوئیں تو ان کی والدہ نے فرمایا کہ مَیں اس کا نام مریم رکھتی ہوں اور اس کو اور اس کی آئندہ ہونے والی اولاد یعنی عیسٰیؑ کو، شیطان مردود کے شر سے بچاؤ کے لیے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ قرآن کی رو سے اللہ پاک نے اس کو پسندیدگی سے قبول فرمالیا تھا۔

(iv)iii: سورۃ الاعراف آیت ۲۰۱ میں ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا: یعنی متّقی لوگوں کو اگر وسوسۂ شیطانی کسی شکل میں مَس کرتا ہے تو وہ فوراً ذکرِ اللہ کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

(v)iii: اللہ پاک خود بھی یہی منشا رکھتا ہے کہ اس کی قیمتی املاک شیطان مردود سے محفوظ رہیں۔ جیسا کہ سورۃ الحجر ۱۷ میں ہے۔: وَ حَفِظْنٰھَا مِنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ: اور ہم اس (آسمانوں) کی حفاظت تمام مردود شیاطین سے کرتے ہیں اور سورۃ الانفال آیت ۱۱ میں فرمایا گیا ہے۔: وَ یُذْھِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ: یعنی (غزوۂ بدر میں جب مسلمانوں کو اونگھ اور نیند نے سکون عطا کیا اور آسمان سے بارش نے انہیں سیراب کر دیا تو اللہ فرماتا ہے اس کا مقصد) شیطان کی ناپاکی کو تم سے دور کرنا تھا۔

iv: عملِ شیطان/شیاطین کی تصریح:۔

(i)iv: سورۃ المائدہ آیات ۹۰، ۹۱ میں ہے۔: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ: یعنی تحقیق شراب، جوا، بت پرستی اور فال نکالنا شیطانی اور ناپاک عمل ہیں پس ان سے ہر قیمت پر بچ کر رہو۔ اس کی مزید وضاحت: اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ

Marfat.com

الْعَدَاوَۃَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ: میں کی گئی یعنی شیطان کا ارادہ فقط یہ ہے کہ شراب اور جوا کے بارے میں تم میں عداوت اور نفاق پیدا کر دے۔

iv(ii): سورۃ بنی اسرائیل آیت ۲۷: اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ: یعنی فضول خرچی کرنے والے، شیاطین کے بھائی ہیں۔

iv(iii): آیت ۵۳ میں آتا ہے: اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَہُمْ: یعنی تحقیق شیطان لوگوں کے درمیان فساد ڈلواتا ہے۔

iv(iv): سورۃ البقرہ آیت ۱۰۲ میں ہے۔: وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ: یعنی شیاطین، لوگوں کو جادو سکھا کر، یقیناً کفر کر رہے ہیں۔ ثابت ہوا کہ جادو سکھانا، جادو سیکھنا اور جادو کرنا، حتیٰ کہ جادو پر یقین رکھنا شیاطین کے عمل ہیں۔

iv(v): سورۃ النساء ۱۱۹ میں فرمایا گیا ہے۔: وَمَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا: یعنی جو کوئی شیطان / شیاطین کو اپنا دوست بناتا ہے وہ یقیناً واضح خسارہ میں مبتلا ہوتا ہے۔

v: شیطان / شیاطین، الانسان اور انبیاء کے عدو (دشمن) ہیں:۔

v(i): سورۃ یوسف آیت ۵ میں ہے۔: اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ: یعنی شیطان، انسان کا کھلا دشمن ہے۔

v(ii): سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵۳ کے مطابق کہا گیا ہے: اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا: یعنی شیطان، انسان کے لئے کھلا دشمن ہے اور اسے ہر طرح سے نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔

Marfat.com

v(iii): سورۃ الانعام آیت ۱۱۲ میں ہے۔: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ : یعنی ہم نے جن و انس کے شیاطین میں سے ہر نبی کے دشمن کئے ہیں۔

vi: جہد بر خلاف شیاطین کی ترغیب:۔

vi(i): سورۃ آلِ عمران آیت ۱۷۵ میں ہے۔: اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۖ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ :یعنی شیطان اپنے ٹولہ کی مدد سے تمہیں ڈراتا ، دھمکاتا ہے،پس تمہیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ اس سے ہرگز خوف نہ کھاؤ، بلکہ اپنے قلوب میں خوفِ الٰہی کو جگہ دو تاکہ شیاطین کا ممکنہ زور تم پر نہ چل سکے۔ ثابت ہوا کہ خوفِ الٰہی کو دلوں میں جگہ دینے کے لئے جو جدوجہد کی جاتی ہے، وہ در اصل شیاطین پر قابو پانے کا سبب بنتی ہے۔

vi(ii): سورۃ النساء آیت ۷۶ میں ہے: فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا: یعنی بنی نوع آدم پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ شیاطین اور ان کے ہمراہیوں سے بر سرِ پیکار رہیں اور یقین رکھیں کہ شیطان / شیاطین کے داؤ نہایت کمزور ہوا کرتے ہیں۔ یعنی جُہد بر خلافِ شیاطین کے ساتھ واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے ،فقط پختہ ارادہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ شیطان کا داؤ ، ریت کی دیوار ثابت ہوگا اور خود بخود تمہارے عزمِ مصمّم اور پائے استقلال کے سامنے مسمار ہو جائے گا۔

vi(iii): سورۃ فاطر آیت ۶ کے مطابق: اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا: یعنی تحقیق شیطان تمہارا دشمن ہے اس لیے تم پر بھی واجب ہے کہ ہر وقت اس کی دشمنی میں چوکنّے رہو اور بحیثیت دشمن اس کا کوئی وار اپنے اوپر نہ چلنے دو۔ جب اور جہاں تمہیں موقع میّسر آئے اُس واضح دشمن کو زیر

Marfat.com

کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرو۔ مراد یہ ہے کہ ہر دم ایسی حالتِ جہد میں ہوشیار رہو جیسے ملک کی سرحدوں پر کھڑا فوجی سپاہی، جو ایک لمحہ بھی اپنے دشمن سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔

vii: قولِ شیطان:۔

سورۃ ابراہیم آیت ۲۲ میں شیطان کا قول ثابت ہے اور غور طلب بھی ہے۔: وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ ؕ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ :جب امر حق کا فیصلہ ہو چکا تو شیطان کہنے لگا اللہ نے تمہیں جو وعدہ دیا، وہ حق تھا اور میں تم سے کیے ہوئے وعدہ سے منحرف ہوتا ہوں۔ میرا تم پر کوئی بس نہ تھا مگر یہ کہ تم نے میری دعوت کو قبول کیا اس لئے اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ تو میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ ہی تم مجھے بچا سکتے ہو۔ اور ہاں جو پہلے (یعنی دنیا میں) تم مجھے شریک ٹھہرایا کرتے تھے میں اس کو جھٹلاتا ہوں (اور اس سے بری الذمہ ہوتا ہوں)۔

اس آیت کی روشنی میں واضح اشارہ ملتا ہے کہ شیطان ایک وجود (entity) ضرور ہے جو سوچ سمجھ کر کچھ کر رہا ہے۔ آج دنیا میں وہ بنی نوع آدم کو وعدے وعید کے چنگل (cob web) میں پھنساتا ہے۔ اُن لوگوں کے اعمال کو، جو دراصل گمراہی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں، اُن کی نگاہ میں اس طرح مزین کر کے پیش کرتا ہے کہ کرنے والا اُس پر اتراتا ہے اور مسلسل بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ عین اُس وقت وہ جانتا ہے کہ اللہ پاک سچا ہے، اس کے وعدے بھی سچے ہیں اور شیطان کا بہکاوا بے معنی ہے۔ یہ لاحاصل اتباع کل روز قیامت رسوائی کا باعث بنے گا۔ آیت متذکرہ بالا کے مصداق خود شیطان بھی اپنی ذات میں اس بات پر شک نہیں رکھتا کہ اللہ تعالیٰ سچا ہے، اس کے وعدے بھی

Marfat.com

سچے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وسوسۂ شیطانی ایک امتحان کی مانند ہے۔ کل روزِ جزاء ممتحن اس بات سے بری الذمہ ہوگا اور مخلوقات بھی یہ ثابت نہ کر سکیں گی کہ شیطان کا کچھ دوش ہے۔

viii: هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ:۔

سورۃ المومنون آیت ۹۷ میں ایک مقام مخصوص ہے۔: وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۙ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ: یعنی آپؐ فرماویں اپنے ربّ سے مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں شیاطین کے ہمزات سے اور پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔ هَمْزٌ مصدر میں نوک دار آلہ یا شے سے دبانا، نچوڑنا اور مارنا جیسا مفہوم پایا جاتا ہے۔ چونکہ نوکیلی شے کی چبھن تکلیف دہ ہوتی ہے، اور پھر چبھن کے بعد اس کے اثرات بھی دیر تک وجود پر مرتب رہتے ہیں اور بے چین کیے رکھتے ہیں، اس لیے "هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ" سرکشی اور مخالفت کی خصوصی چبھنے والی اور دیر تک مضطرب کیے رکھنے والی کیفیت ہے، جو شیاطین خصوصی موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ اردو زبان میں مہمیز لگانا اس وقت بولا جاتا ہے جب گھوڑ سوار اپنے جوتوں میں دھات کی نوکیلی میخ لگواتا ہے اور اس سے اپنی سواری کو جب ایڑھ لگاتا ہے، یعنی چبھوتا ہے تو شدتِ تکلیف سے جانور مزید تیز بھاگتا ہے۔ گھوڑ سواری کے مقابلوں میں یہ لازم ہوتا ہے۔ چونکہ تمام قرآن میں یہ فقط ایک ہی مرتبہ وارد ہوا ہے اس لیے اس کی بھی کوئی خصوصی اہمیت ضرور ہوگی۔ اس ترکیب میں یہ احساس نمایاں ہے کہ شیاطین، اپنی ہمزات یعنی نوکیلی چبھن سے کسی کے لیے مہمیز کا کام بھی کرتے ہیں۔

احادیث میں ایک روایت نقل ہے کہ کسی صحابی کی ایک دفعہ فجر کی نماز باجماعت فوت ہوگئی۔ جب بیدار ہوئے تو افسوس، شرمندگی وندامت اور حسرت پر اتنا روئے کہ غشی کی نوبت آگئی۔ پیار والوں نے بہر حال انہیں تسلی وتشفی دی۔ کہتے ہیں کہ اگلی صبح، وقتِ فجر سے قبل ہی کوئی اُس کے پاؤں ہلا کر

Marfat.com

اُسے اٹھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ دیکھو نمازِ فجر کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ اٹھو اور اسے ادا کرو۔ وہ صحابی حیران ہوئے اور اسے پوچھا تو کون ہے اور مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے۔ اٹھانے والے نے کہا مَیں شیطان ہوں۔ صحابی نے کہا' اے مردود تُو تو غافل کرنے والوں اور نیکی سے باز رکھنے والوں میں سے ہے۔ تُو مجھے خود نیک کام کے لیے جگا رہا ہے'؟' شیطان نے جواباً کہا کہ کل جب تیری فجر کی نماز ضائع ہوئی تو پشیمانی میں تیرا رونا، تیرے مالک کو اتنا پسند آیا کہ اُس نے تجھے کئی برسوں کی نماز کا ثواب عطا کیا ہے۔ مَیں اُس سے جل گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تُو ایک ہی نماز پڑھے اور تجھے ایک ہی نماز کا ثواب ملے۔ ایسا نہ ہو کہ تُو آج بھی سویا رہ جائے اور پھر اٹھے تو اسی طرح گریہ زاری کر کے پھر کئی برسوں کی نمازوں کا اجر اکٹھا کر لے۔ یہ ایک اکیلی مثال اس ثبوت میں کافی ہے کہ ھمزات الشیاطین، شاید منشاء ایزدی کے تحت، کسی کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب　　　یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

اس شعر میں ایک فطری اصول بیان ہوا ہے کہ سامنے سے ٹکرانے والی تند و تیز ہوا، دراصل اڑان کو بہتر بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اعمالِ شیاطین بھی گویا، مانندِ تندیٔ بادِ مخالف کے سمجھے جا سکتے ہیں کہ یہ بنی نوعِ آدم کو اونچا اڑانے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اگر بنی نوعِ آدم وساوسِ شیطانی کو طوفان، اندھیری اور جھکڑ مان کر اس سے برسرِ پیکار ہو اور حتی المقدور کوشش کرے کہ وہ اس کی تباہ کاری سے محفوظ رہ سکے، تو اس کے صلے میں صفاتِ قدوسی ظاہر ہو سکتی ہیں۔ واللہ اعلم

Marfat.com

۲۱۔ الدّین

i: الدین۔لَآ اِلٰہَ:

سورۃ آل عمران آیت ۱۸ :شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ: یعنی گواہی دیتا ہے اللہ کوئی معبود نہیں مگر وہی، اور ملائکہ اور اہل علم، انصاف سے قائم ہو کر گواہ ہیں کہ وہی عزت والا، حکمت والا معبود ہے۔ شَھِدَ کے معنی، گواہی دینا، تصدیق کرنا، موجود ہونا، بیان کرنا وغیرہ ہوتے ہیں۔ لغت کی رو سے اس مصدر کے تمام معانی میں آنکھوں کے سامنے ہونا یار کھنا ضرور پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کی ابتداء اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی نظروں کے سامنے، اس کی موجودگی میں ہو رہا ہے۔ اگر وہ گواہی ہے، تب بھی، کوئی تصدیق ہے، تو بھی اور اگر کسی طرح کچھ بیان کرنا ہے تو بھی اللہ کی موجودگی میں اس کے سامنے ہو رہا ہے۔ شہادت بمعنی گواہی اصل میں کسی حقیقت کی تقویت (support) ہوتی ہے۔ جو کوئی شاہد یا شہید دیتا ہے۔ اس شہادت کی بنیاد پر منصف، فیصلہ (Verdict) صادر کرتا ہے۔ شہادت خود فیصلہ (Verdict) نہیں ہوتی، ہاں فیصلہ میں معاون ہو سکتی ہے۔ اس اصول کے تحت بالا آیت میں کسی حقیقت کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔ تاکہ تقاضاہائے انصاف کے مقام پر اس شہادت کی بنیاد پر قوی فیصلہ مرتب ہو سکے۔ اسکی صحیح اور مکمل تفہیم کے لیے ازل کی بھی ازل تک رسائی کرنا ہوگی اور کچھ دیر کے لیے ماضی کی پہنائیوں میں (Back into Future) سفر کرنا ہوگا۔

جب کائنات میں کچھ نہ تھا۔ فقط وہ ذات لم یزل ولا یزال تھی۔ چونکہ کائنات میں اور کچھ موجود ہی نہ تھا، اس لیے اس کی ذات و صفات کا تعین بھی ممکن نہ تھا۔ علی الہجویریؒ نے کشف المحجوب میں ایک اشارہ کے تحت لکھا ہے کہ وہ بس 'عین علم' تھا۔ اس سے مراد عین ذات بھی ہو سکتی ہے اور عین

Marfat.com

صفت بھی۔ دونوں صورتوں میں اس کے ہونے اور کسی اور کے نہ ہونے کی یقینی خبر ملتی ہے۔ اس عین علم میں چاہت ہوئی اور بمصداق حدیث قدسی: کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ: اس نے نطق فرمایا کہ "میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ پس مجھے چاہت ہوئی کہ پہچانا جاؤں پس تخلیق کی خلق"۔ بحیثیت طالب علم غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس 'عین علم' کے نطق کا پہلا اظہار 'میں' تھا۔ باوجودیکہ اپنے آپ کو دیکھنا اور محسوس کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ تبھی تو پہچانے جانے کی چاہت ہوئی۔ پھر بھی نطق کا پہلا لفظ 'میں' تھا۔ وہ ذات جسکا پہلا نطق 'میں' ہوا۔ وہ اَحَدْ تھی۔ شانِ اَحدیت اس کے علاوہ اور کسی کے لیے واجب ہی نہیں۔ اس وقت اسے ایک یا اکیلا کہنا، کم علمی اور جہالت کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، وگرنہ دراصل وہ ہمیشہ اَحَدْ تھا، اور ہے۔ اَحدیت نے میں کے اظہار کے بعد، اپنی پہچان کی چاہت کی۔ اور طریقہ یہ ڈھونڈھا کہ کچھ خلق کر دوں، جو اس 'میں' کی پہچان کا حق ادا کر سکے!

یہ فطرت کا حصہ ہے کہ جیسا خود ہو، ویسا ہی خلق کرتا ہے، یعنی جنس ہم جنس کو پیدا کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تب فطرت اور اسکے قوانین ابھی مرتب نہیں ہوئے تھے مگر چونکہ بعد میں یہ قوانین اسی ذات نے مرتب کیے، اسی لیے اغلب خیال ہو سکتا ہے کہ وہ ذات ہمیشہ ان قوانین فطرت کو پسند کرنے والی تھی۔ گلاب کا بیج زمین میں رکھیں تو گلاب ہی اُگتا ہے، چاہے کانٹے ساتھ ہوں، کوئی دوسری جنس اس بیج میں سے ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح 'عین علم' نے جب خواہش و چاہت کی، تو جو پیدا کیا (یعنی خلق)، وہ بھی کچھ اور نہ ہو گا فقط 'عین علم' ہی ہو گا۔ ہاں کانٹے کی شکل میں ایک تبدیلی ساتھ آگئی کہ وہ ذات لم یزل عین علم تو تھی، مگر اَحَدْ تھی، یہ ہونے والی ذات، عین علم تو ہوئی، مگر ہوئی واحد۔ اس طرح مطابقت کے باوجود خالق اور مخلوق کا فرق واضح ہو گیا اور اَحَدْ، واحِد ہو گیا۔ یعنی واؤ

Marfat.com

کا اضافی کانٹا ساتھ منسلک ہو گیا، مگر خوشبو، رنگ، نکھار سب وہی تھا۔ خالق میں واؤ کا اضافہ اسے ویسے ہی مخلوق بنا دیتا ہے۔ اَحدِیّت کے بیچ سے ہونے والے اس واحد کا اسم 'اَحْمَدُ' و 'مُحَمَّدٌ' پسند کیا گیا جو زبان زدِ خاص و عام ہوا۔ مخلوق ہونے کے ایک واضح فرق کے ساتھ، اُس اَحدِیّت کی ہر تاثیر اس ذات میں عود کر آئی، تو ہونے کے ساتھ ہی اس میں بھی نطق کی چاہت (Urge) ہوئی۔ جس ذات اَحدِیّت سے یہ ہوا تھا اُس کا پہلا نطق تھا 'مَیں'۔ لا محالہ جب اسے بھی نطق کی خواہش ہوئی تو حلق کے قریب تک وہی لفظ 'مَیں' ابھرا، ظاہر ہوا ہی چاہتا تھا کہ اس نے پوری شدّت سے اسے ادا کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ اسی جد وجہد میں منہ سے نکلا 'لَا' یعنی نہیں۔ یہ کسی سامنے والے کی نفی نہیں ہے بلکہ اپنی ذات میں، اپنی ذات کو 'مَیں' کہکر پکارنے کی نفی ہے۔ وہ ذات اَحدِیّت، لم یزل ولایزال، اپنے آپ کو مَیں کہہ سکتی ہے۔ یہ صرف اس کے لیے سزاوار ہے کیونکہ خالق و مالکِ کُل ہے۔ اس کی مخلوق ہونے کے ناطے، اوّل ہونے کے باوجود، اُس وَاحِد یعنی حاملِ اسم 'اَحْمَدُ' و 'مُحَمَّدٌ' نے اپنی ذات میں سے مَیں نطق کرنے کی نفی کرتے ہوئے 'لَا' فرمایا۔ یعنی اوّل مخلوق کا پہلا نطق تھا، 'لَا'۔ پوری جد وجہد کر کے اُس اوّل مخلوق نے لفظ مَیں کی ادائیگی کو روکا۔ اس روکنے کا مقصد چونکہ یہی تھا، کہ وہ عین علم میں سے ہونے کی وجہ سے یہ علم رکھتا تھا، کہ مَیں کہنے کا سزاوار صرف وہی اَحَدٌ ہو سکتا ہے کوئی وَاحِد نہیں، اسی لیے یہی نفی یعنی 'لَا' اس کا پہلا نطق ہو گئی۔

اور جس دوران یہ نطق یعنی لَا ہوا، حلق تک ابھرا 'مَیں' بھی ظاہر ہو گیا، تو اُس اوّل نے اُس مَیں کو اِلٰہَ (معبود حقیقی) فرما دیا۔ یعنی اب نطق اس طرح ہوا، لَآ اِلٰہَ جو اوّلُ الکائنات کا پہلا، با معنی نطق تھا۔ تب ان دونوں الفاظ کی نطق کے ذریعہ ادائیگی کی مخصوص وجوہات یہی تھیں، جو بالا پیراجات میں بیان کر دی گئی ہیں۔ ذات اَحدِیّت یعنی خالق و مالکِ کُل کائنات کو یہ الفاظ اور ادا، اس قدر پسند آئی کہ اس

Marfat.com

نے انہیں کائنات کی کُل نطق رکھنے والی مخلوقات کے لیے فرض قرار دے دیا۔ اور حقیقتاً آج تک تمام انبیاء اپنی امتوں کو یہی تبلیغ کرتے چلے آئے ہیں۔ جونہی یہ لَآ اِلٰهَ ہوا، تو اس ذات اَحدیّت نے فرمایا "اِلَّا ھُوَ"۔ جس کی مراد اُس وقت یہ تھی کہ اگر لَآ اِلٰهَ کا یہ مفہوم سمجھا جائے کہ کوئی معبود نہیں، تو میں شہادت دے کر تصدیق کرتا ہوں، وہ اوّل الکائنات یہ شان رکھتا ہے کہ معبود بن سکے۔ اس طرح ذات اَحدیّت اور مخلوق اوّل، دونوں کے مشترکہ فرمان کے مطابق بن گیا "لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ"۔ ازاں بعد ذات نے اپنی چاہت کی چاہت کے مطابق اسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شکل میں تکمیل دے دی تا کہ ہر کس و ناکس کو ابہام نہ رہے۔ تب وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے، اپنے مابین راز و نیاز کا خوب لطف اٹھایا ہو گا۔ چونکہ وہ راز و نیاز سمجھنا مخلوقات کے لیے ناممکن حد تک مشکل تھا، اس لیے اس کی سادہ ترین شکل یہ بنادی گئی، جو قیامت تک کے لیے برقرار ہے، کہ ہر نبی مرسل کا اوّل خطاب یہی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مقرر کر دیا گیا اور فرض کر دیا گیا کہ اُن کی تمام تر تبلیغ کا محور اسی کا مفہوم رہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و مرسلین نے اسی راز و نیاز کو مختلف زاویوں اور طریقوں سے ذریّت آدم تک پہنچایا۔ خود بھی حظ اٹھاتے رہے اور ان کے ساتھ اُولُوا الْعِلْمِ اور قَآئِمًا بِالْقِسْطِ امتی بھی فیضیاب ہوتے رہے۔ ملائکہ یعنی ظاہری اور باطنی قوتیں، ہمیشہ مالک کے حکم کی مغلوب رہی ہیں اس لیے ان کا ذکر آیت میں پہلے کیا گیا ہے۔ اس پہلے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے راز و نیاز سے لطف اندوز ہونے کے بعد، تمام امتیں اور باقی مخلوقات، اس کو آج تک لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ کے الفاظ میں خراج تحسین (Tribute) پیش کر رہی ہیں۔ متذکرہ بالا سارے قرآن میں اکیلی آیت ہے، جہاں لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ کے الفاظ دو مرتبہ استعمال ہوئے ہیں، اس سے بھی اس کی خصوصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ کے لیے ایک اور ممکنہ تاویل پیش کی جا سکتی ہے۔ جب عین علم میں سے، عین علم

Marfat.com

ہوا، مگر احد نہیں، واحد ہوا، تو عین علم میں اَلْمَلٰٓئِکَۃُ یعنی ظاہر و پوشیدہ قوتیں تو احدّیت کی طرف رہ گئیں، مگر اُولُوا الْعِلْمِ واحد کی طرف عود کر آئے۔ یہی اس اوّل الکائنات کا جُزوِ لاینفق ہیں۔ ان اُولُوا الْعِلْمِ اجزاء نے مشاہدہ کیا کہ اوّل مخلوق نے لَآ اِلٰہَ فرمایا، ذات واجب الوجود نے جواباً اِلَّا ھُوَ کہا اور اس طرح لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ مکمل ہوا، تو اس دوران جو راز و نیاز خالق و مخلوقِ اوّل نے آپس میں مشارکت (Share) کیے، ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ان اجزاءِ اوّلُ الکائنات نے کہا لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ انہی کی سنت کو کائنات کی امتیں اور مخلوقات دُہرا کر اس واقعہ کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ ممکن ہے یہ القابات عَزِیْزُ اور حَکِیْمُ انہوں نے کسی ایک کے لیے کہے ہوں یا دونوں کے لیے ایک، ایک 'اسم الحسنیٰ' مرتب کیا ہو، جس صورت میں عَزِیْزُ واحد کے لیے اور حَکِیْمُ احد کے لیے موزوں لگتا ہے۔ ان القابات کو سن کر مالک کائنات کی خوشی کی انتہاء نہ رہی ہوگی، تبھی اس نے فرمایا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ۔

ii: الدّین۔ عِنْدَ اللّٰہِ:

سورۃ آل عمران آیت ۱۹ کے مطابق: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ: یعنی تحقیق دین، اللہ کے نزدیک 'اسلام' ہے۔ عِنْدَ اللّٰہِ جو کچھ بھی اُس وقت تھا، وہی اَلدِّیْنُ ہے۔ ظاہر ہے ازل کی بھی ازل کے اس واقعہ میں، اُس وقت اَحد کے علاوہ اوّلُ الکائنات اور اُولُوا الْعِلْمِ یعنی اجزائے اوّلُ الکائنات ہی تھے۔ اگر اللہ کہتا ہے کہ اُس وقت عِنْدَ اللّٰہِ جو کچھ تھا، وہ اَلدِّیْنُ ہے، تو ثابت ہوا کہ اوّلُ الکائنات اور اجزائے اوّلُ الکائنات ہی اَلدِّیْنُ ہیں۔ پوری آیت کا مفہوم یہ بنے گا کہ تحقیق اوّلُ الکائنات اور اس کے اجزاء یعنی اُولُوا الْعِلْمِ، اَلدِّیْنُ (منزل) ہیں اور اسے پانے کے لیے مخلوقات کے پاس جو ممکنہ راستہ ہے، وہ اسلام (یعنی سلامتی) ہے۔ صرف سلامتی کی راہ پر چلنے والے اور اپنے آپ کو اس پر برقرار

Marfat.com

رکھنے والے ہی اس قابل ہوسکتے ہیں، کہ اَلدِّیْنُ کو سمجھ سکیں اور عِنْدَ اللّٰہِ یعنی قربِ الٰہی میں ہو سکیں۔ مختصر یہ کہ مخلوقِ اوّل (محمد مصطفیٰؐ) اور ان کے اجزاء اُولُوا الْعِلْمَ (آلِ محمدؐ) ہی اَلدِّیْنُ ہیں۔ خالق و مالک نے، کُل کائنات کے لیے انہیں منزل اور مقصود مقرر فرمادیا ہے اور اس منزل کے حصول کی بہترین راہ اسلام یعنی سلامتی والی زندگی کو قرار دے دیا ہے۔ خاتم المرسلینؐ نے سادہ ترین تعریف میں بیان فرمایا کہ کسی کے ہاتھ اور زبان سے اس کا ہمسایہ اگر محفوظ ہوگیا، تو یہ عملی اسلام ہے۔ اگر ہم اس مقام تک آپہنچے ہیں کہ ہمارے ہاتھ اور ہماری زبان کے شر سے، ہمارا نزدیکی ہمسایہ امن میں ہے اور ہمارے ہاتھ اور زبان سے کوئی ایسا فعل سرزرد نہیں ہورہا، جس سے کسی کو نقصان کا احتمال ہو، تو سمجھ لینا چاہیے کہ ہم سلامتی کے راستے پر گامزن ہیں۔ یہی سفر، اسلام کی زندگی کہلاتا ہے اور اسی سفر کے راہی اور سالک اپنی منزل یعنی 'دین' کو پانے کے اہل ہوتے ہیں۔ اسی دین کو پالینے کی بنیاد پر وہ قربِ الٰہی میں ہوجاتے ہیں، کیونکہ اَلدِّیْنُ، عِنْدَ اللّٰہِ یعنی اللہ کے قرب میں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ قربِ الٰہی دراصل دین کہلاتا ہے۔ اور جو سلامتی کے محل کا باسی نہیں ہے اس کے لئے ذات کے قرب کا تصور بھی عبث ہے۔ لہذا یہ لازم ہوا کہ سلامتی کے افعال قربِ الٰہی کی علت ہیں۔

iii: الدّین۔ غَیْرَ دِین:

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ: سورۃ آل عمران آیت ۸۳ یعنی کیا اللہ کے دین کا غیر چاہتے ہیں، اور اسی کے لیے سرِ تسلیم خم کئے ہے، جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے خوشی سے یا کراہت کے ساتھ۔ بدقسمتی سے کثرت بنی نوع آدم دین اللہ کے غیر کی خواہش کرنے لگے ہیں، حالانکہ یہ حقیقت ہے اس زمین اور آسمانوں کے درمیان جو کچھ

Marfat.com

بھی ہے وہ اُسی دِین اللہ کو تسلیم کرنے والا ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ تسلیمات برضاء ورغبت ہوں یا کراہت کے ساتھ۔ اس نکتہ کی تشریح ضروری ہے۔ فرض کریں ایک شخص زبان سے اللہ کے ہونے کا اقرار کرتا ہے، جب کہ دوسرا زبان سے بھی اس کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ ان دونوں میں دوسرا کراہت سے تسلیم کررہا ہے اور پہلا خوشی سے۔ دوسری قسم کے شخص کی تسلیمات اس طرح ہیں، کہ اس کے وجود کا ہر ذرہّ اُسی مالک کے حکم کے تابع چل رہا ہوتا ہے۔ دل، معدہ، جگر، گردہ، تلی وغیرہ کا عمل اس مالک کی دسترس اور تصرف میں ہوتا ہے، وہ شخص زبردستی زبان سے انکار کررہا ہوتا ہے جو مطلق جہالت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ دوسری صورت میں ایک شخص جب اللہ کو تسلیم کرتا ہے تو دونوں میں سے ایک نکتہ ٔ نظر اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے، جہنم کا خوف، یا جنّت کا لالچ۔ ان دو حالتوں یعنی خوف اور امید کے درمیان، اس کی حاکمیت کو تسلیم کرنا بھی، کثرت بنی آدم کا شیوہ ہے۔ دراصل یہ بھی کراہت ہی کی ایک شکل ہے، بالخصوص اُس شخص کے مقابلہ میں، جو اس سچے مالک کو اس لیے چاہتا ہے کہ وہ ہے ہی چاہنے کے قابل۔ وہ ہر دم یہی پکارتا ہے کہ اے مالک میں تجھ سے تجھی کو مانگتا ہوں۔ طلب شاید اس میں بھی برقرار ہو مگر طلب کی قسم بہت اولیٰ ہے، جب کہ پہلی قسم میں طلب پست ہے۔ اس مثال میں پہلی تسلیمات کراہت والی ہے اور دوسری قسم میں تسلیم، برضاءورغبت ہے۔ زمین اور آسمانوں کے درمیان سب کچھ اسی کو تسلیم کرتا ہے، لیکن تسلیم کرنے میں یا خوشی اور رضامندی ہوتی ہے، یا کراہت اور مجبوری۔ تو اشارہ مل گیا کہ خوشی اور رغبت ورضاء مندی سے تسلیم کرنا، عین دین اللہ کو چاہنا ہے، لیکن کراہت اور مجبوری سے تسلیم، دین اللہ کے غیر کی طرف التفات ہے۔ بالا آیت میں اس کے لیے واضح ناپسندیدگی نظر آتی ہے۔ یعنی اَفَغَیْرَ میں، 'کیا پس' کی شکل میں جو سوالیہ انداز ہے، اسی طرف اشارہ ہے کہ تسلیم تو بہر طور سب کر رہے ہیں، لیکن ماننے کی خوبی یہی ہے کہ اُس کو اس لیے مالک مانا جائے کہ اس کے علاوہ اور کوئی مالک ہونے کے لائق ہی نہیں۔ مالک ہونا

Marfat.com

اُسی کو سزاوار ہے۔ یہ دلی تسلیم، چاہت اور خوشی سے برضاء ورغبت، اسی کے لیے ہونی چاہیے! ذات احدیت یعنی عین علم نے، چاہت کی بنیاد پر اوّل الکائنات کو جب خلق کیا، تو اس کا مشاہدہ کر کے خود ہی کہا 'واؤ' (Wow)۔ ہونے والی اوّل مخلوق نے اس واؤ کو قبول کرتے ہوئے، اپنے لیے احد کی بجائے، واؤ کی اضافت کے ساتھ، واحد ہونا قبول کر لیا، تاکہ اس مقام پر ادب کا یہ لطیف فرق نمایاں ہو جائے۔ بلاشک عین علم میں سے ہونے والا، بجز عین علم کے، اور کچھ، نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا۔ ہر خوبی اور تاثیر وہی تھی فقط پہچان کے لیے واحد ہو گیا، حالانکہ تھا احد ہی! وہ واحد بظاہر اکیلا محسوس ہوتا تھا، لیکن درحقیقت قرآن ثابت کر رہا ہے کہ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ وہ اجزائے اوّل الکائنات ہیں جو اس واحد کا جُزْوِلَا یَنْفَکْ ہیں۔ احد اور واحد، جو بظاہر دو (۲) لگتے ہیں، اصل میں ایک ہی ہیں اور من حیث الکل ھُوَالَّذِیْ سے تعبیر کیے جاتے ہیں۔ قرآن میں جس جگہ پر بھی ھُوَالَّذِیْ استعمال ہوا ہے اس سے مراد، ذات احدیت مع تمام ظاہری اور باطنی قوتوں کے اور واحد مع اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ کی کُلیت کے ہے۔ جب عین علم، ذاتِ احدیت کی طرح تھا، تب بقول بلھے شاہؒ: جدوں احد اِک اکلا سی۔ نہ رب، رسول نہ اللہ سی (پنجابی) یعنی تب کچھ اور تصور بھی نہ تھا بلکہ ہر تصور، ہر خیال صرف اسی وقت شروع ہوا، جب اس ذات احدیت نے پہچانے جانے کی چاہت کی۔ یہ چاہت اوّل الکائنات کے ہونے کی علّت بنی اور جوں ہی اوّل الکائنات ہوا، توں ہی خیالِ ھُوَالَّذِیْ ہو گیا۔ ذات احدیت کو ذات کہنے کے سوا اور کوئی لفظ بھی موجود نہیں، حالانکہ وہ ہرگز ذات نہ تھی، مگر اوّل الکائنات نے واؤ کی اضافت قبول کر کے دراصل ذات بننا قبول کیا۔ اسی ذات کو اَلَّذِیْ کہنا سزاوار ہے، مگر چونکہ عین علم یعنی احد، اور یہ ذات اَلَّذِیْ اصل میں ایک ہی ہیں، اس لیے ان کی کُلیت اور اشتراک کو وحی میں ھُوَالَّذِیْ سے تعبیر کیا جانے لگا۔

Marfat.com

iv: الدّین۔ دِیۡنِ الۡحَقِّ:

سورۃ الفتح آیت ۲۸: ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا: یعنی وہی ذات ہے جو اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجتی ہے تا کہ ظاہر کرے اس کو کُل دین پر اور اللہ کی شہادت کافی ہے۔

سورۃ التوبہ آیت ۳۳: ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ: یعنی وہی ذات ہے جو اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجتی ہے تا کہ ظاہر ہو کُل دین پر اور اگرچہ مشرکوں کو ناپسند کیوں نہ ہو۔

اَرۡسَلَ، مصدر رَسَلَ میں سے بنا ہے جس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ جب رکاوٹ ہٹ جائے اور کوئی شے رواں ہو کر بہہ نکلے یا چل پڑے (Smooth Flow)۔ اگر کسی کو کھلا چھوڑ دیا جائے اور وہ آزادانہ گھومنے پھرنے لگے، تو بھی ارسل ہی کہا جاتا ہے۔ بالا آیت میں، اس بنیاد پر اَرۡسَلَ کا اصل مطلب یہ بنے گا کہ ھُوَ الَّذِیۡۤ اس بات کا باعث بنا کہ ہر ممکنہ رکاوٹیں دور ہوئیں، اور جو کچھ کہ رواں دواں ہوا، وہ خود رسول ہی تھا، جسے رَسُوۡلَہٗ کہہ کر اُس ھُوَ الَّذِیۡۤ نے اپنی ہی طرف منسوب کر لیا۔ ھُوَ الَّذِیۡۤ خود اس بات کا انتظام کرتا ہے کہ اس کا رسول رواں ہو کر چل نکلے۔ یہ ابھی اس مقام کا تذکرہ ہے، جہاں کسی اور مخلوق کا تصور بھی نہیں، اس مقام پر بھی ھُوَ الَّذِیۡۤ، رسول کو خود اپنی طرف منسوب فرما رہا ہے۔ یہ واضح ثبوت ہے کہ رسول، فقط اسی ذات کی طرف منسلک و منسوب ہوتا ہے، اس کا کسی اور مخلوق سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ صرف اللہ کا رسول ہونے کے باوجود، حکم و وحیٔ الٰہی کی وساطت سے، وہ ذریتِ آدم کی اصلاح کے لیے ان میں تبلیغ کرتا ہے، مگر در حقیقت ہوتا وہ

Marfat.com

فقط اُسی کا رسول ہے اور بس۔ هُوَ الَّذِیْ اپنے رسول کو ارسال کرتے ہوئے اکیلا نہیں چھوڑ دیتا بلکہ تُحْفَةً اس کے ہمراہ هُدٰی کو روانہ کرتا ہے۔ رسول کی روانی کے سفر کے سامان میں هُدٰی اسکے ساتھ رکھ دی جاتی ہے بلکہ بِالْهُدٰی کا صیغہ واضح اشارہ دے رہا ہے کہ یہ هُدٰی، اس طرح رسول کے ساتھ منسلک کر دی گئی ہے، کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ مراد یہ کہ رسول کو پانے والا ہی امکانی طور پر هُدٰی پا سکے گا یعنی رسول کو پائے بغیر هُدٰی کا پانا، ناممکن ہے۔ ارسال کرتے ہوئے رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی کے علاوہ دِیْنِ الْحَقِّ بھی رواں کیا گیا، جس کا ترجمہ ہے اَلْحَقّ کا دین۔ ہم اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ کی بحث میں دیکھ آئے ہیں کہ ازل کی ازل سے بھی قبل عِنْدَ اللّٰهِ جو کچھ تھا، وہی اَلدِّیْنَ ہے اور وہ اوّلُ الکائنات اور اجزائے اوّلُ الکائنات کا اشتراک ہے۔ یعنی یہ دین کُلی کی مانند ہے۔ هُوَ الَّذِیْ نے جو اَرْسَلَ کیا وہ اَلْحَقّ کا دین ہے، عِنْدَ اللّٰهِ دین یعنی دین کُلی نہیں ہے۔

اَرْسَلَ میں صرف بھیج دینا ہی نہیں پایا جاتا، بلکہ دراصل مصدر رَسَلَ کی خصوصیت ہے کہ کوئی شے (Entity) کہیں موجود ہو، مگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے وہیں برقرار کھڑی ہو، رواں نہ ہو سکتی ہو۔ جب اس کی رکاوٹ دور کی جائے تو بلاشک وہ بڑی سرعت کے ساتھ رواں بھی ہو گی اور جس مقصد کے لیے ہو گی وہ مقصد پورا بھی کرنا شروع کر دیگی۔ اسکی سادہ ترین مثال کسی لمبے پائپ میں پانی کی موجودگی سے لیجا سکتی ہے، جبکہ اس پائپ کے آخری سرے پر کوئی رکاوٹ لگی ہو۔ پائپ میں پانی موجود ہوتا ہے، پائپ سے پیچھے پانی کا ذخیرہ (Reservoir) بھی موجود ہوتا ہے، مگر اس رکاوٹ کی وجہ سے پانی پائپ میں ٹھہرا رہتا ہے اور نکل کر رواں نہیں ہوتا۔ لیکن جونہی وہ رکاوٹ دور کی جائے گی، پانی اس پائپ میں سے نہایت سرعت کے ساتھ بہنا شروع ہو جائے گا اور پھر اپنے تمام عطا کردہ فطری قوانین کے تحت چلتا ہی چلا جائے گا۔ رکاوٹ دور ہونے کے بعد کسی سے مزید نہ تو اجازت طلب

Marfat.com

کرے گا اور نہ ہی مستقبل میں کسی سمت کے تعین کے لیے اپنے مرکز سے رجوع کریگا۔ اپنی سطح ہمیشہ برقرار رکھتے ہوئے اور اوپر سے نیچے کی طرف رواں دواں رہتے ہوئے، وہ ہر کسی کو گیلا (Wet) کرتا چلا جائے گا۔

هُوَ الَّذِیۡ اپنی کلیت میں سے جسے ارسال کریگا، وہ بھی عین علم ہی ہوگا۔ سو جب تک هُوَ الَّذِیۡ نے چاہا، تب تک اپنی کلیت پر چاہت وارادہ اور حکمت وعدل کے پہرے بمنزلہ رکاوٹوں کے لگائے رکھے۔ یہ عین علم کی حالت میں بھی، عین علم سے عین علم ہونے کی حالت میں بھی، احد اور واحد کے اشتراک سے هُوَ الَّذِیۡ ہونے کے دوران بھی، نجانے کتنے ہزاروں لاکھوں قرنوں تک اسی طرح رہا۔ چاہت و ارادہ اور حکمت وعدل کی رکاوٹ با معنی بھی تھی، دور رس بھی اور عین علم بھی۔ حتٰی کہ ایک مناسب موڑ پر اس چاہت وارادہ وحکمت وعدل کے پہرے (رکاوٹیں) ہٹانے کا فیصلہ ہوا، تاکہ نظامتِ کائنات با معنی انداز سے برپا ہوسکے۔ تب اس کُلیتِ عین علم میں سے، عین علم کی مانند، اُولُوا الۡعِلۡمِ رواں دواں ہوئے۔ ان کا اس طرح بہہ نکلنا ہی اَرۡسَلَ کہلائے گا۔ جبکہ جو کچھ بہہ نکلا، اسے بھی ایک خاص مقصد کے تحت دو حصّوں میں منقسم کردیا گیا۔ گو یہ تقسیم صرف اسماء کی حد تک تھی اور ہے، مگر شناخت کے دور رس مقصد کی بنیاد پر، شروع ہی سے ان کے اسماء الگ الگ بیان کردیے گئے، یعنی ایک رَسُوۡلَہٗ اور دوسرا اَلۡحَقّ۔ رَسُوۡلَہٗ کے ساتھ ھُدٰی کو منسلک کیا گیا، جبکہ اَلۡحَقّ کو دین سے وابستہ کردیا گیا۔ اس طرح اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ کا مطلب محض رسول کو بھیجا نہیں ہوگا۔ بلکہ تفہیم اس طرح بنے گی کہ رسول، بمع اپنی تمام رسالت کے، ہمیشہ سے اس عین علم کا حصہ تھا، کسی چاہت وارادہ اور حکمت وعدل کے تحت اسے وہیں روکا گیا ہوا تھا، حتٰی کہ وقت مقررہ پر یہ رکاوٹ دور کردی گئی تو رَسُوۡلَہٗ ، ایسی روانی سے چل پڑا کہ اب قیامت کے بعد تک بھی اس رَسُوۡلَہٗ کی روانی جاری رہے گی۔ رکاوٹ دور ہونے کے بعد، جونہی یہ

Marfat.com

سلسلہ چلا تو پہلے لمحہ (One Moment) سے وہ رَسُوْلَهٗ اپنی ذمہ داری اور منصب کو نبھا رہا ہے، جو عین علم میں سے ہونے کے ناطے، ازل سے بھی قبل اس کا حصہ ہے۔ رسول آخر الزمان کی صادق حدیث ہے کہ وہ تب بھی رسول تھے، جب آدم ابھی مٹی اور پانی سے گوندھا جا رہا تھا۔ قرآن میں آپ کو فخریہ رحمۃ للعالمین فرمانا اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ حضور حاظر و ناظر تھے اور آج بھی ہیں۔ اس اَرْسَلَ کا مقصد لِيُظْهِرَهٗ تھا (تا کہ ظاہر ہو اس هُوَالَّذِیْٓ پر یا وہ هُوَالَّذِیْٓ اظہار کرے اس کا) عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (اوپر دین کُلیت کے)۔ اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے 'تا کہ ظاہر کرے دنیا کے کُل دینوں پر۔ اگر کُل ادیان (دین کی جمع) کا ذکر ہوتا، تو عَلَى الْاَدْيَانِ كُلِّهٖ لکھا جاتا جبکہ آیت میں دین، واحد کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ سو اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا کہ 'دین کُلی' پر یہ اپنی مکمل اور بین صورت میں ظاہر ہو جائے اور کسی کو تا قیام قیامت کوئی ابہام اور شک و شبہ نہ رہے۔ پھر سورۃ الفتح میں فرمایا گیا وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا یعنی اللہ شہادت دیتا ہے کہ وہ اس سب ہونے والے سلسلہ کے لیے خود ہی کافی ہے، ازل کی ازل سے قبل بھی کفایت کرنے والا اور ابد کی ابد کے بعد بھی اس کا حافظ و نگہبان ہے۔ جبکہ سورۃ التوبہ میں اس کے مقابلہ میں وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ لکھا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سورۃ الفتح کا مقام ازل کی ازل سے بھی قبل والا ہے۔ سورۃ التوبہ کا مقام اس جہان خلق میں، اس رسول بالھدیٰ اور دین الحق کے بالوجود آ موجود ہونے یا مبعوث ہونے کا اشارہ ہے، جبکہ اعلان توحید الٰہی و نبوت ہو چکا ہے اور مشرکین کی شکل میں نہ ماننے والے ظاہر ہو چکے ہیں۔ تب بھی ذات باری اس رَسُوْلَهٗ کو اپنی طرف منسوب کر رہی ہے اور الحق کو دین کے ساتھ ارسال کرنے میں فخر محسوس کر رہی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اَرْسَلَ جو ازل کی ازل سے بھی پہلے رواں ہوا تھا، وہ دور مصطفوی تک اسی طرح رواں دواں رہا۔ چونکہ منشا و ارادہ و حکمت الٰہی میں خاتمہ

Marfat.com

النَّبِیّٖنَ کی سند جاری ہونا تھی، اس لئے عدلِ خداوندی کے تحت دِیْنِ الْحَقِّ، تاثیر رسالت اپنے ہمراہ لیکر، قیامت تک ھُدٰی کی تبلیغ کرتا رہے گا۔

۷:الدّین۔الدِّیْنُ الْقَیِّمُ:

سورۃ التوبہ آیت ۳۶: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ: یعنی اللہ کے نزدیک، شہرت والوں کی گنتی بارہ ہے جو کتاب اللہ میں لکھی گئی، جس دن زمین و آسمان تخلیق ہوئے۔ ان میں چار حرمت والے ہیں۔ اسی کو دین القیم کہتے ہیں۔ جس دن آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی گئی، اس دن کتاب اللہ میں بارہ کی گنتی مقرر کی گئی۔ یہ عمل بھی عِنْدَ اللّٰهِ ہوا۔ ادوار کے لحاظ سے یہ پچھلے پیرہ میں ذکر کئے گئے دونوں زمانوں کے درمیان کی آیت ہے۔ ایک زمانہ احد سے واحد ہونے کا، جو معنوی ہے، دوسرا زمانہ مشرکین کے ہونے اور کراہت کرنے کا، یہ لغوی ہے۔ درمیانی زمانہ کو ہم اصطلاحی کہہ سکتے ہیں، جس میں زمین و آسمان کی تخلیق سے قبل عِنْدَ اللّٰهِ، کتاب اللہ میں تقرر کرکے لازم کر دیا گیا، کہ اُولُوا الْعِلْمِ، جو اجزائے اوّل الکائنات تھے اور ہیں، ان کی تعداد بارہ ہوگی۔ ازل کی ازل سے پہلے ان کا صرف اشارہ دیا گیا تھا جبکہ اس جگہ ان کا حقیقی تعین کرکے، اسماء سمیت، کتاب اللہ میں اندراج کر دیا گیا۔ عمومی طور پر شَهْرًا اور الشُّهُوْرِ کا ترجمہ مہینہ، مہینے کیا جاتا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد سال کے بارہ مہینوں کا تصور اغلباً صرف زمین پر موجود ہے۔ ایک گنتی چاند کی فطری روش کے ساتھ مقرر ہے، جبکہ دوسری گنتی سورج کے مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہونے والے فطری اور مسلسل عمل سے منسوب ہے۔ یہ کب سے ہے؟ شاید اس بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہو۔ لیکن چونکہ یہ عمل زمین کی تخلیق اور اس میں دوسری مخلوقات، بالخصوص بنی آدم کے آباد ہونے کے

Marfat.com

بعد ہی محسوس کیا گیا ہے، اس لئے قوی امکان یہی ہے، کہ چاند کے مہینے ہوں یا شمسی مہینے، دونوں کی گنتی اور نام اسی زمین پر، ذریت آدم نے اپنی مرضی سے رکھے ہیں۔ محرم، صفر سے لے کر ذیقعد، ذوالحج تک کے ناموں میں سے صرف اسم 'رمضان' قرآن اور وحی کی زینت بنایا گیا۔ غالباً پچھلی کسی وحی میں بھی ان مہینوں کے اسماء اور ترتیب موجود نہیں ہے۔ اسلامی کیلنڈر، قمری مہینوں سے متعلق ہے جبکہ جولین کیلنڈر شمسی نظام سے وابستہ ہے اور یہود اور عیسائی اسے شد و مد سے استعمال کرتے ہیں۔ مانا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں کیلنڈر، انبیاء سے متعلق ہیں، اس لیے کسی نہ کسی وحی میں امکانی طور پر ہو سکتے ہیں۔ بکرمی جیت کے مہینے یعنی جیٹھ، ہاڑ، اسوہ، کتک، ساون، بھادوں، جو ہندوؤں کے ہاں مستعمل ہیں، اور چین، جاپان، مصر اور یونان کی قدیم تہذیبوں میں سال کے مہینوں کا تصور اور نام تو کسی الہامی حکم سے منسوب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ قرآن میں شہور سے مراد، سورج اور چاند سے بننے والے مہینے نہیں ہو سکتے بلکہ اس کا مفہوم شہرت و تشہیر کی طرف ہے۔

عِنْدَ اللّٰہِ، جن بارہ کی تشہیر و شہرت ہے، وہ 'اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ' ہی ہو سکتے ہیں۔ ان بارہ اسماء (اماموں) کا اظہار، بالترتیب نشاندہی، زمین پر ان کے ادوار اور ٹھہرنے کے ممکنہ اوقات کی تفصیل، کتاب اللہ میں اس دن رقم کر دی گئی تھی، جب زمین و آسمان تخلیق ہوئے تھے۔ یعنی مخلوقات کی تخلیق سے قبل، اول مخلوق سے متعلق تمام تر معاملات تکمیل پذیر کیے گئے اور اس سارے عمل کو الدِّیْنُ الْقَیِّمُ سے تعبیر کیا گیا۔ جس کا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ دین، ان ہی سے قائم ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کائنات بھر میں جو کچھ کہ قائم ہے، وہ اسی دین (بارہ کا مجموعہ) کی وجہ سے قائم و دائم ہے۔ یہ بارہ امام نہ ہوں تو کائنات کا قیام و دوام ناممکن ہو۔ سورۃ التوبہ آیت ۳۶ کے اگلے حصہ میں کہا گیا ہے:
فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْہِنَّ اَنْفُسَکُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّۃً یعنی (ان بارہ) کے بارے میں اپنے نفوس پر ظلم نہ کرو اور مشرکین سے اچھی طرح نبرد آزما رہو۔ چونکہ کائنات کا قرار و قیام ان ہی ذوات مقدسہ پر

موقوف ہے، اس لیے وحی میں واضح حکم آگیا کہ اپنے نفوس میں ان کے بارے میں کبھی ظلم نہ کرنا۔ جو اس ظلم میں مبتلا ہونگے وہ مشرک کہلائیں گے جن سے حتیّ المقدور جدال کا حکم بھی دے دیا گیا۔ اس کے مصداق، شرک اور مشرک کی ایک اور تعریف میّسر آگئی یعنی ہر وہ جو اپنے نفس میں ان ذوات کی حیثیت اس سے مختلف جانے، جو مالکِ کائنات نے مقرر کی ہے، وہ بھی مشرکوں کی صف میں گنا جائے گا۔ ظلم اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اہل کو نااہل کہا جائے اور نااہل کو اہل قرار دے دیا جائے۔ ذات باری تعالیٰ نے بارہ (امامین) کو شہور کہہ کر کتاب اللہ میں مستند کر دیا ہے اور یہ ان کی اہلیت کے لیے بہت کافی ثبوت ہے۔ کیا یہ ان کے جیسے ہو سکتے ہیں جو زندگی بھر شہرت کے لیے تگ و دو کرتے رہتے ہیں؟ وحی میں موجود اس فرمان کی بنیاد پر، اپنے اپنے نفوس و قلوب میں، ان ذوات مقدسہ کی تعظیم و تکریم، منشائے ایزدی کے مطابق اجاگر کرنا ہی، ہر کسی کو شرک سے پاک کرتا ہے اور اگر معاملہ اس کے الٹ ہو تو مشرک ہونا لازم ٹھہرے گا۔ ایسے شرک اور مشرک سے ہمیشہ برسرپیکار رہنے کی ترغیب قرآن کے اس حصہ میں وارد ہے۔

vi: الدین۔ الدِّیۡنُ وَاصِبًا:

سورۃ النحل آیات ۵۱/ ۵۲: وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰـهَيۡنِ اثۡنَيۡنِ‌ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ ۚ فَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ‏ ۞ وَلَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَهُ الدِّيۡنُ وَاصِبًا: یعنی اللہ نے فرمایا دو معبود ہرگز اختیار نہ کرو، بلکہ تمہارا 'اِلٰہَ' تو واحد ہی ہے، پس اسی کے ہو رہو، اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کے لیے ہے اور اسی (واحد) کے لیے کبھی جدا نہ ہونے والا دین ہے۔ مراد یہ کہ 'احد' اور 'واحد' میں سے تمہارا 'اِلٰہَ' واحد کو مقرر کیا گیا ہے اس لیے تم پر لازم ہے کہ اسے ہی تسلیم کر کے اسی پر ایمان لاؤ۔ اور اگر کسی ایک کا ہو کر، راہبانیت کی زندگی گزارنا مقصود ہو، تو یہ راہبانیت اُسی واحد کے لیے کرنا۔

Marfat.com

(فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ)۔ زمین اور آسمانوں کے مابین جو کچھ بھی ہے، یا تو اسی واحد کے لیے ہے یا اس کی وجہ سے ہے۔ دونوں صورتوں میں 'واحد' کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور اسی واحد کے لیے نہ جدا ہونے والا دین ہے! تاریخ گواہ ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؐ نے اپنی طبعی حیاتِ طیبہ میں جس سے بے پناہ محبت کی، وہ ان کی لختِ جگر، عترتِ رسول سلام اللہ علیہا ہیں اور جس نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؐ سے اسطرح چاہت و محبت کی، کہ کوئی طاقت اسے اس سے باز نہ رکھ سکی، وہ حسینؑ کی ذات ہے۔ جو کبھی دوش پر سوار ہو جاتی ہے، تو طوالتِ سجدہ کی وجہ سے لوگ خیال کرتے کہ حضورؐ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔ جب خواہش ہوتی ہے زلفِ عنبریں مبارکہ کو اس طرح تھام لیتی ہے، گویا کہ سواری ہو اور نبیؐ سوار ہوں، وہ جہاں چاہے رسولؐ کو روک لیتی اور جہاں سے چاہے، ساتھ لے چلتی ہے، چاہت کرے تو رسولؐ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں اور اس کی آمین حبیبؓ کو دوبارہ زندہ کرنے کا سبب بنے۔ اسی کو واصب کہتے ہیں۔ آیت متذکرہ میں دینِ واصب، دراصل امام حسینؑ کی طرف اشارہ ہے!

vii: الدِّین۔ الدِّیْنُ الْخَالِصُ:

سورۃ الزمر آیات ۱ تا ۳: تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ: یعنی اللہ عزت و حکمت والے کی طرف سے کتاب نازل ہو کر موصول ہو گئی۔ تحقیق ہم ہی آپؐ کی طرف الحق کے ساتھ اس کتاب کے نزول کا باعث ہیں، پس اللہ کی عبادت کرو، اس کے دین کے لیے مخلص ہو کر۔ یاد رکھو خالص دین اللہ کے لیے ہے۔ نزول، لطافت سے کثافت میں آنے کو کہتے ہیں، مثلاً بارش کا نزول۔ اس میں لازم نہیں کہ نازل ہونے والی شے کسی کے کام آسکے یا اس کی ملکیت ہو سکے۔ لیکن نزل مصدر سے جب تنزیل بنتا ہے، تو یہ

Marfat.com

بمعنی ترسیل، اس طرف اشارہ ہوتا ہے، کہ لطافت سے کثافت میں آکر، جس کے لیے مقرر ہوا تھا، اس تک مکمل پہنچ گیا۔ جیسے ترسیل، کسی پارسل وغیرہ کا اس شخص تک پہنچ جانا ہے، جس کے لیے اسے ارسال کیا گیا تھا۔ اسی طرح تنزیل بھی نازل ہونے والی جنس اس تک پہنچنے کی طرف اشارہ ہے، جس کے لیے اسے نازل کیا گیا ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر بالا آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ، عزیز الحکیم کی طرف سے اَلْکِتٰبِ ، لطافت سے کثافت میں آکر، اس کو مل گئی یا موصول ہوگئی، جس کے لیے اسے نازل کیا گیا تھا۔ یہاں کوئی کتاب (اسم نکرہ) مراد نہیں ہے بلکہ الکتاب (اسم معرفہ) کا ذکر ہے۔ مخصوص کتاب، مخصوص مقصد کے لیے، مخصوص وقت پر اور مخصوص طریق کے ساتھ نازل کی گئی۔ یہ اعلان بھی کیا جا رہا ہے کہ وہ اس کو موصول ہوگئی، جس کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا ہے۔ غور طلب ہے، اگر کتاب مخصوص، مقصد مخصوص، وقت اور طریق بھی مخصوص، تو کیا ممکن ہے وہ ذات جس کی طرف نازل ہو رہی ہو وہ خاص نہ ہو؟ لازماً وہ ذات بھی خاص الخاص ہوگی۔

مختصراً، اللہ عزیز الحکیم کی طرف سے، ایک مخصوص کتاب اس کے خاص الخاص بندہ کی طرف اس طرح نازل کی گئی، کہ نازل کرنے والا خود اعلان کر رہا ہے کہ وہ الکتاب اسے مل بھی گئی ہے۔ عیسیٰؑ ماں کی گود میں تھے، لوگوں کے طعن و تشنیع پر جب ان کی والدہ مریمؑ نے گود کے اس بیٹے کی طرف اشارہ کیا، تو قرآن کے مطابق وہ گویا ہوئے اور سورۃ مریم آیت ۳۰ کے مطابق فرمانے لگے: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ ۣ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا : یعنی تحقیق میں اللہ کا عبد ہوں، مجھے الکتاب دی گئی ہے اور میں نبی کیا گیا ہوں۔ اس آیت کے مطابق عیسیٰؑ حاملِ الکتاب ہونے کا اعلان خود فرما رہے ہیں جبکہ ابھی ماں کی گود میں تھے۔ یقیناً یہ بہت اولیٰ اور افضل مقام ہے، کہ طبعی عمر ابھی تھوڑی ہو، ماں کی گود ہو اور اتنا ارفع کلام فرمایا جائے، لیکن یہ اپنی طرف سے ان کا ایک دعویٰ بنتا ہے۔ بلاشک وحی کا حصّہ ہونے کی بنیاد پر یہ دعویٰ لاریب ہے، لیکن خود کیا گیا ہے۔ جبکہ آیت متذکرہ بالا میں بھیجنے والا اللہ، عزیز الحکیم، تصدیقاً

Marfat.com

فرمارہا ہے کہ جس کے لیے الکتاب مقرر کی گئی ہے وہ اس تک، نزول کے راستہ، پہنچ گئی ہے۔ وصول کرنے والے کو اتنی بھی زحمت نہیں دی گئی کہ وہ وصول کرکے عیسیٰ کی طرح خود اس کا اظہار کرے۔ اللہ کی صفات العزیز اور الحکیم، یہاں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ مضمون کی ابتداء میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ آیا تھا۔ یہاں عزیز الحکیم، واضح کر رہا ہے کہ یہ اُسی کا تسلسل ہے۔ ابتدائی بحث میں عزیز الحکیم اور بالا آیت میں عزیز الحکیم ایک ہی معنی ہیں۔ جن پر 'الکتاب' نازل فرما کر انہیں پہنچائی گئی، وہ ایک کردار کی بارہ ذوات ہیں، جن کا تعارف اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ کہہ کر کروایا گیا تھا۔ اسے کردارِ امامت کہتے ہیں! اللہ، عزیز الحکیم نے الکتاب، بذریعہ تنزیل، امامُ الاوّل تک پہنچائی اور خود اس کا اعلان فرمایا کہ یہ کام مکمل ہو چکا ہے یعنی الکتاب، الامام کو موصول ہو چکی ہے۔

آیت کے اگلے حصہ میں تنزیل کی بجائے، نزول کرنے میں دو ممکنہ حکمتیں مضمر ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ تمام الکتاب نزول کی شکل میں رسولؐ کو مشاہدہ کروادی جائے تاکہ وہ اُس میں سے جتنا حصہ بشکل قرآن پاس رکھنا چاہیں، یا بیان (قرأت) کرنا چاہیں، کرلیں۔ دوسری حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ کردار امامت کی طرف سے اس مخصوص وقت میں، نزول کے ذریعہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِؐ کے ساتھ ساتھ، قیامت تک ہونے والے عباد اللہ المخلصین، شہداء، اولیاء، اصفیاء، احباء و مقربین کو بھی الکتاب کا حصہ دے دیا جائے، جنہوں نے سلسلۂ نبوت و امامت کو، بشکل ولائیت، ہمیشہ جاری و ساری رکھنا تھا۔ اس طرح اللہ عزیز الحکیم کی طرف سے، کردار امامت کی طرف جو الکتاب تنزیل ہوئی تھی، کردار امامت کی طرف سے اَلْحَقِّ کے ساتھ رسول اللہؐ کو بھی نازل ہو گئی اور قیامت تک چلنے والے سلسلۂ ولائیت کے تمام سرکردگان اور سرخیل بھی اس سے فیض یاب ہو گئے۔ جن اولوالعزم افراد تک یہ فیض پہنچا وہ ہمیشہ یہی درس دیتے رہے کہ اُسی اللہ عزیز الحکیم کی عبادت کرتے رہو، مگر ایک خصوصیت کے ساتھ کہ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ یعنی اُس کے دین کے لیے مخلص ہو کر۔ اور یاد رکھو کہ خالص دین (اَلدِّیْنُ الْخَالِصُ) صرف اللہ کے لیے ہے۔

Marfat.com

viii: الدّین۔ یَوْمُ الدِّیْنِ:

سورۃُ الانفطار آیات ۹ تا ۱۹: كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۙ وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۙ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۙ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۙ وَ مَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۙ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الدِّيْنِ ۙ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ؕ وَ الْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ: یعنی تم انصاف ہونے کو جھٹلاتے ہو اور بیشک تم پر کچھ نگہبان ہیں، معزز لکھنے والے، جانتے ہیں جو کچھ تم کرو۔ بیشک نیکوکار ضرور چین میں ہیں اور بیشک بدکار ضرور انصاف کے دن دوزخ میں جائیں گے اور اس سے چھپ نہ سکیں گے۔ تو کیا جانے کیسا انصاف کا دن (دو مرتبہ ہے)۔ جس دن کوئی جان کسی جان کا اختیار نہ رکھے گی اور اس دن سارا حکم اللہ کا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہرگز نہیں (تم مانتے)، مگر جھٹلاتے ہو دین (کی سند) کے ساتھ اور تحقیق تمہارے اوپر حافظ ہیں جو بہت تکریم والے ہیں اور جو (تقدیر) کے لکھنے والے ہیں۔ (ازل سے) جانتے ہیں جو کچھ فعل تم کرتے ہو۔ تحقیق بری (الذمہ) ہونے والے خوش حال زندگی میں چلے گئے اور تحقیق جو پھٹ پڑے ان کے لیے مصائب کھڑے ہو گئے۔ اور اس طرح ان کی یوم الدین سے ملاقات کا سبب بن گیا۔ یوم الدین، وہ دن ہے جب کسی نفس کو کسی دوسرے نفس پر ملکیت نہیں ہوتی اور اس دن تمام امر صرف اللہ کے لیے ہوتا ہے۔

اس کی تفصیل میں واقعہ کربلا کے پس منظر اور حقائق کو پیش کرنا ضروری ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد شریعتُ الاسلامی میں رخنہ اندازی کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ عند الشرع ناجائز کاموں کو جائز قرار دیا جانے لگا اور قرآن میں موجود واضح احکامات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی مذموم سازش ہونے لگی۔ حکومت کے نگران بھی مادی فوائد کے لئے چشم پوشی کرنے لگے۔ جب یہ عمل

Marfat.com

قدرے عام ہوا تو امامِ وقت 'حسینؑ' نے برملا پوری شدت سے ان کی تکذیب کی، مگر وہ تکذیب دین کی سند کے ساتھ تھی، محض عداوت و بغض کی بنیاد پر نہ تھی۔ حامل دین ہونے کے ناطے احکامات شریعت کی جیسی خبر اور علم، سبطِ رسول کو ہو سکتی ہے اور کسی کو کیا ہو گی۔ وقت کا امام ہونے کے ناطے یہ اس کی اولین ذمہ داری بنتی تھی، کہ اللہ کے دین پر کوئی آنچ آنے لگے تو وہ سینہ تان کر اس کی حفاظت کرے۔ لفظ بِالدِّینِ اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ امام کی طرف سے وہ مخالفت، تکذیب اور کسی کے عمل کو غلط قرار دینا، محض ضد، نفرت یا ذاتی عناد کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ دین (کی سند) کے ساتھ تھا۔ جس مکروہ فعل کی دین میں گنجائش ہی نہیں، اگر کوئی حاکم وقت بھی وہ فعل کرنے پر بضد ہو، تو یہ دین کے ساتھ مضحکہ ہوتا ہے۔ تب امامِ وقت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایسی حالت میں دین کی سند کے ساتھ اس حاکم وقت کے اُس مکروہ فعل کی پوری شدت کے ساتھ تکذیب کرے۔ امام عالی وقارؑ نے ایسا ہی کیا اور اسی کے منطقی نتیجہ کے طور پر حکمران ٹولہ نے حسینؑ کی مخالفت میں تمام تر حکومتی مشینری متحرک کر دی۔ مدینہ منورہ سے آپ کو شہر بدر کر دیا گیا۔ آپ نے گھر والوں کو ساتھ لیا اور یہ سوچ کر حج بیت اللہ کی نیت فرمائی کہ اس دوران معاملہ رفع دفع ہو جائے گا، پھر نانا پاک کے قدموں میں واپس آ جاؤں گا۔ حج میں صرف دو دن باقی تھے اور آپ احرام کی حالت میں تھے، جب حکم حاکم سے، احرام کھول کر اور حج کیے بغیر، آپ کو یہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ ہاشمی، مطلبی برادری کے افراد، جن میں خواتین اور بچے بھی شامل تھے، آپ کے ہمراہ تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہمراہ تھے جو ہاشمی مطلبی تو نہ تھے مگر امامؑ سے محبت رکھتے تھے۔

امامؑ کے لیے عرب کا خطہ تنگ کر دیا گیا اور عراق کی طرف جانے کی خواہش بھی بڑے گھناؤنے طریقے سے دبا دی گئی۔ ایک ہی راستہ رہ گیا تھا، وہ سنگلاخ زمین جو کربلا کی طرف جاتی تھی اور جو صدیوں سے عوام النّاس کے لیے بند ہو چکی تھی۔ اس پر قدم رکھنے سے قبل آپ نے ہمراہیوں سے

Marfat.com

خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا کہ میرا سفر لمبا اور دقت والا ہے، جو لوگ واپس جانا چاہیں میری طرف سے انہیں خوشی کے ساتھ اجازت ہے۔ کچھ حُب داران ہمراہی واپس لوٹ گئے اور یہی وہ لوگ ہیں، جنہیں قرآن نے ابرار کہہ کر پکارا ہے۔ امامؑ ان لوگوں سے بری (الذمہ) ہو گئے اور وہ لوگ آپؑ سے بری (فارغ) ہوئے۔ مگر بقایا اصحاب پھٹ پڑے کہ امام کسی حالت میں تجھ سے جدا نہ ہونگے اور وہ فُجّارَ کہلائے۔ انہی کو یوم الدین تک رسائی میّسر آئی۔ سو جو لوگ امام کی اجازت ملنے پر اس تکلیف دہ اور آخرکار جان لیوا سفر سے بری ہو گئے وہ اس آیت میں ابرار سے تعبیر کیے گئے ہیں کیونکہ وہ واپس جہان کی ظاہرہ نعمتوں کی طرف پلٹ گئے۔ جبکہ فُجّارَان اصحاب کے لیے استعمال ہوا جو محبتِ امامؑ میں سرشار تھے اور چلا کر عرض کرنے لگے کہ ہمارا جینا، مرنا آپؑ کے ہمراہ ہے۔ لامحالہ ان کے لیے آنے والا وقت جہنم (جحیم) کی طرح سخت اور کڑا تھا اور اسی سفر کے اگلے مرحلہ میں ان کو یوم الدین سے سامنا ہوا، جس کا مشاہدہ وہ پہلے ہی قدم سے کر رہے تھے۔ یہ ایسا غیر امکانی انجام نہ تھا، کہ کہا جائے غیب تھا اور ناگہانی اور انجانی طور پر ان پر وارد ہوا بلکہ ان سچے حب دارانِ آلِ رسول سے یہ کبھی پنہاں نہ تھا۔ وہ اسے ہمیشہ سے ازلی سعادت کے طور پر جانتے اور مانتے تھے اور ہر دم اپنے قلوب میں یہ چاہت رکھتے تھے کہ کاش وہ لمحہ آئے تو ہم امام عالی وقارؑ کی معیّت میں ہوں۔ پس ان فُجّارَ کے لئے یہ 'یَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ' اولاً غائب کبھی نہ تھا اور دوسرے نعمتِ عظمیٰ تھی۔ يَوْمِ الدِّينِ کے متعلق دو دفعہ فرمایا گیا ہے، مَآ اَدْرٰىكَ یعنی تمہیں اسکا کیا ادراک ہے۔ اس کی حکمت يَوْمِ الدِّينِ کی خصوصی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے، جس کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ ایک ایسا دن ہے، جس میں کسی کو کوئی اختیار نہیں اور کوئی نفس، کسی دوسرے نفس کے لیے چھوٹی سے چھوٹی شے بھی حقِ ملکیت کے طور پر استعمال نہیں کر سکتا۔ اس دن امر (حکم) صرف اللہ کے لیے ہے، یا صرف اللہ کا ہے۔

Marfat.com

میدانِ کربلا میں قافلۂ امام حسینؑ نے اس آیت کی عملی تفسیر پیش کرتے ہوئے یَوْمِ الدِّیْنِ صحیح معنوں میں کائنات کو سمجھایا۔ اس مقام پر کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے لیے کسی اختیار کی کوشش ہی نہیں کرتا، حتیٰ کہ ہر نفس خود اپنے نفس (ظاہرہ حیات) کے لیے بھی کسی مِلک، کا عامل نہیں ہوتا۔ نانا پاکؐ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ہیں، والدِ محترم امامِ اوّل اور ولیٔ کُل، بلکہ نفسِ رسولؐ ہیں مگر اس کے باوجود حسینؑ سمیت کربلا میں کسی نفس نے کسی نفس کے لیے اختیار و ارادہ نہیں اپنایا۔ ہر نفس خود اپنی ذات میں اپنی ہی جگہ، اپنا کردار (Role) ادا کرتا رہا۔ حبیب الظاہرؓ نے اپنی داد دی، سعید بن المسیبؓ نے اپنا ہدیہ پیش کیا، جَون (John) اپنے انداز سے عمل کرتے ہیں، علی اکبرؑ کی خوبی جدا ہے، تو علی اصغرؑ بھی کمسنی کے باوجود، بے آواز، اپنا حصّہ ڈال رہے ہیں۔ عباسؑ علمبردار کے کردار کی عظمت اور امامِ عالی وقارؑ کی نگہ بلند اور جاں پُرسوزی لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا کی عملی تفسیر ہے، جس کا نقشہ کائنات میں فقط مقامِ کربلا پر نظر آتا ہے۔ گویا کُل میدانِ حشر، دراصل واقعۂ کربلا کی یادگار ہوگا جہاں کُل یزیدیت اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے گی، مگر اُس وقت وہ لَا تَمْلِكُ کی شکل ہوں گے۔ اس جہان میں چاہے کسی ملکیت کا گھمنڈ انہیں مغرور کیئے رکھتا ہو، روزِ جزا ان سب کی گردنیں عاجزوں کی طرح سرنگوں ہونگی۔ اس حقیقت کی شہادت میدانِ کربلا ہی میں میسر آتی ہے کہ ہر اَمر اللہ کے لیے ہے۔ اُسی طرح جیسے کُل میدانِ حشر میں، ہر اَمر اللہ کے لئے ہوگا، وہاں کسی کو پَر مارنے کی اجازت نہ ہوگی۔

۲۲۔ اَلْقَاءَ

ذاتِ باری تعالیٰ کُل کائنات کی خالق و مالک ہے۔ خالق ہونے سے مراد یہ ہے کہ خلق کرنے کے تمام اسباب اس نے پیدا فرمائے اور مالک اس طرح کہ ان اسباب کے استعمال کا اذن اس کے ہی تابع ہے یہاں تک کہ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ کائنات میں موجود اٹھارہ ہزار انواع و اقسام میں سب مخلوقات شامل ہیں جن میں حضرات انبیاء و مرسلین سرِفہرست ہیں۔ بحیثیت

Marfat.com

خالق اللہ سب سے متعلق ہے بلکہ شہ رگ سے بھی قریب ہونے کی بنیاد پر اس سے دوری کا تصور بھی غلط ہے۔ اگر مخلوقات سے اس کا رشتہ منقطع ہو جائے تو کائنات کا وجود سخت خطرہ میں آجائے گا۔ سابقہ ادوار میں قرار وبقاءِ کائنات کے لئے، اس نے یہ سنّت مقرر کی کہ یہ نسبت پیغمبروں کی وساطت سے وحی کے ذریعہ برقرار رکھی ۔جب ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں سے یہ تعلق ہی صدیوں کائنات کے قرار کا سبب بنا تو بالآخر خاتمَ النّبیِّینؑ کے طبعی پردہ کے بعد اس خالق ومالک کی سنّت بدل نہیں سکتی۔ یہ سلسلہ رکنے یا ختم ہونے کی صورت میں یقیناً کائنات کا رنگ بہت مختلف ہوتا، لہذا ماننا پڑے گا کہ باقی مخلوقات 'خصوصاً بنی آدم' سے اُس مالک کا یہ رشتہ آج بھی منسلک ہے۔ چونکہ وحی کو صرف مرسلینؑ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا، اس لئے ضروری ہوا کہ وحی کے علاوہ کوئی طریقہ وضع ہو، جس سے انجام کار یہی حاصل لیا جاسکے۔ تقاضہ' انصاف ہے کہ صرف نبی رسول ہی اُس عادل و قادرِ مطلق کی مخلوق نہیں ہیں بلکہ باقی احساس رکھنے والی موجودات سے بھی اُس کے تعلق کی سبیل لازماً ہونی چاہیے۔

انبیاءِ کرام نے اپنے اپنے ادوار میں، بنی آدم کو اُس مالک کا برحق تعارف ہی عطا کیا ہے جسے لاریب الہامی کتب میں سے پڑھ اور سُن کر، ہر دور کے محبّان اور عشّاق کے دلوں میں شوق اور ولولہ پیدا ہوتا رہا ہے اور مالک کی خصوصی تعظیم و تکریم ان کے قلوب میں موجزن ہوتی رہی ہے۔ عرفانِ الٰہی کا جو منطقی جذبہ ان میں ابھرتا رہا ہے اُس کو بھی تو کسی نہ کسی شکل میں تشفّی (Satisfaction) میّسر آنی چاہیے۔ اس مقصد کے لئے قدرت کاملہ نے اپنی رحمت سے کچھ بندوبست کیا اور قرآن میں جو چند ممکنہ طریق مذکور ہوئے ہیں، ان میں ایک القاء ہے۔ حکایات میں آتا ہے کہ موسیٰؑ نے عرض کیا 'باری تعالیٰ آپ کو کہاں تلاش کروں' جواب ملا ٹوٹے ہوئے شکستہ دل میں! موسیٰؑ کہنے لگے 'مجھ سے زیادہ شکستہ دل کون ہے؟ فرمایا گیا کہ اگر ایسا ہی ہے تو مجھے وہیں تلاش کرلو۔ اس کے علاوہ بھی اور کئی

Marfat.com

دلیلوں سے ثابت ہو سکتا ہے کہ اُس مالک کا دل سے براہ راست تعلق ہے۔ ہر وہ دل جو دل ہے، پتھر نہیں، اُسی مالک کی خوشبو سے آراستہ ہے، ہر وہ دل جس میں دولتِ درد ہے اُسی کے خزانہ سے معمور ہے اور ہر وہ دل جو حامل بصیرت ہے اُسی کے نور سے فروزاں ہے۔ جن کو مالک نے ایسے دل عنایت فرمائے ہوں 'اگر وقت کی ضرورت کے تحت، انہیں فوری راہنمائی کی حاجت ہو اور ایسی حالت میں اگر وقت کا نبی قریب نہ ہو یا ان کو عطا کی گئی وحی میں مکمل الفاظ میں جواب موجود نہ ہو' تو کیا وہ مالک ایسے قلوب کو پریشان چھوڑ دے گا؟ ہر گز ایسا نہیں ہونا چاہیے! دلوں سے براہ راست تعلق کی بنیاد پر وہ مالک و خالق، بنی آدم کے قلوب پر جو کچھ آشکار کرتا ہے اسی کو القاء کہتے ہیں۔ یہ براہ راست معاملہ ہے، اس میں لانے والے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ روزانہ ۳۶۰ مرتبہ عنایت الٰہی ہر شخص کے دل پر جلوہ افروز ہوتی ہے مگر لازم نہیں کہ ہر دل' ہر جلوہ کو اچھی طرح سمجھ پائے۔ لیکن جب اس کی عنایت ازلی سے دل میں کسی جلوہ کی عقدہ کشائی بمنزلہ مشاہدہ ہو جاتی ہے، تب اسے القاء کہتے ہیں۔ قلوبُ المومنین' ذات باری تعالیٰ کا مسکن ہے اور وہ ان قلوب کی کیفیات سے خوب آگاہ ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی اضطراری حالت کسی محب کے دل کو بے چین کر رہی ہے' اور اس کے منشاء و ارادہ میں اُس وقت اس بے چینی کا قرار مقصود ہوتا ہے، تو وہ اپنے گھر میں حکم صادر فرماتا ہے اور ساتھ ہی یہ آسائش فرما دیتا ہے کہ وہ حکم و اشارہ من و عن وہ دل قبول کر لیتا ہے۔ اسی کو عمل القاء کہتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی نوعیت کی کرم نوازی نہیں ہے۔ یہ کیفیت درجات اولیٰ کے حامل خاص الخاص بندگانِ خدا کا حصہ ہوتی ہے۔ اولیاء اللہ میں سے وہ سرخیل جن کے ذمہ نظامت کائنات کا منصب سپرد ہوتا ہے، انہیں اگر کوئی اشد ضرورت پیش آتی ہے تو ان کے قلوب میں راہنمائی کا عندیہ عطا ہو جاتا ہے اور چونکہ یہ عشاق اُسی کے کاموں کے لیے مخصوص ہو چکے ہوتے ہیں، اور اسی کی حکمت سے کائنات کا نظام چلا رہے ہوتے ہیں، اس لیے کسی مہم میں جب وہ مالک اپنی حکمت اُن کے

Marfat.com

دلوں پر آشکار کرتا ہے' تو اسے القاء کہتے ہیں۔ یہ برحق ہے۔ قرآن الکریم میں القاء کا تذکرہ بہت فصاحت سے کیا گیا ہے۔ گرائمر کی رو سے اس مصدر 'ل،ق،ی' کے مفہوم میں توفیق دیے جانا، ملاقات، آمنے سامنے ہونا، کسی بات کا پالینا، ادراک کرنا، اس طرح پھینک دینا کہ چیز دوسرے کے سامنے آشکار ہو جائے وغیرہ شامل ہیں۔ متذکرہ بالا توضیح میں یہ تمام مفاہیم ضم ہیں۔ مثال کے طور چند مقامات پیش کیے جاتے ہیں۔

i: سورۃ طٰہٰ آیت ۳۹: وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ: یعنی اس پر اپنی محبت القا کی۔ یہ موسیٰؑ کی والدہ سے خطاب ہے۔ ان کے دل میں اس بے قراری کو بھانپ کر، جو ماں کو بیٹے سے جدائی کی ہو رہی تھی، مالک نے انہیں اپنی محبت القاء کی۔ کائنات جانتی ہے اُس عمل نے موسیٰؑ کی والدہ کو کتنا پر سکون کر دیا تھا اسی لئے انہوں نے اپنے جگر کے ٹکڑے اور لعل کو نہایت سرعت سے پانی کے حوالہ کر دیا کہ بہتا ہوا پانی، ہونے والے نبیؑ کو اسی کے محل میں لے گیا جس کے خوف سے ماں کی ممتا نے اپنے دل پر پتھر رکھا تھا۔ لیکن چونکہ ذات کی طرف سے محبت اس ماں کے قلب پر القاء ہو چکی تھی اس لئے انجام بخیر، بیٹا ان ہی کی آغوش میں پلا اور بڑھ کر جوان ہوا۔

ii: سورۃ البقرہ آیت ۷۶: وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا: یعنی ایمان والوں کو جب القاء ہوتا ہے' وہ پکار اٹھتے ہیں ہمارے ایمان میں اضافت فرما۔ ثابت ہوا کہ مومنوں پر القاء ہوتا ہے اور وہ ان کے ایمان میں اضافے کا سبب بھی بنتا ہے۔ ایمان ایک ایسی صفت ہے جو بشکلِ انعام کسی کے دل میں داخل کی جاتی ہے اور یہ عمل بھی ذات خود کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ عطائے ایمان بھی القاء ہی کی ایک شکل ہے، جو جب کسی قلب میں اترتی ہے تو اپنی ہی خوبی کی بنیاد پر اضافت کی طلب گار ہوتی ہے۔

Marfat.com

iii: سورۃ الاحزاب آیت ۴۴ میں مومنوں کے وقت القاء کو سلام کیا گیا ہے: تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ:

iv: سورۃ النمل آیت ۶: وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ: یعنی تحقیق آپ کو حکیم علیم کی طرف سے قرآن القاء کیا گیا ہے۔ مراد ہے کہ وحی کی وضاحت کے لیے آپ کو القاء کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ القاء انبیاء و مرسلین کے قلوب پر بھی ہوا۔

v: سورۃ حٰم سجدہ آیت ۳۵: وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ: یعنی القاء صرف ان پر ہوتا ہے جو صبر کے حامل ہیں اور عملِ صبر ہی قلوب میں وہ خاصیت پیدا کرتا ہے کہ القاء ان کا نصیب ہو۔ ایسا القاء دوہری نعمتِ عظیم کا مژدہ ہوتا ہے۔

vi: سورۃ النحل آیت ۱۵: وَاَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ: یعنی زمین (وجودِ آدم) کو ٹھہراؤ عطا کرنے کے لیے القاء کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین میں جو کچھ بھی القاء کیا جاتا ہے وہ اس کے جم جانے، لنگر انداز ہونے اور ٹھہرنے کا سبب ہوتا ہے۔ بادی النظر میں یہ اشارہ اطمینان اور سکونِ قلب کا غماز ہے۔

vii: سورۃ الانفال آیت ۱۲: سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ: یعنی اگر کفار پر رعب وارد کرنے کا وقت آئے تو القاء ہی کے ذریعہ آپ کی دشمنی اور ایذا رسانی سے بالجبر انہیں روکا بھی جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ القاء دلوں میں ہوتا ہے اور چونکہ دلوں کا مالک وہ خود ہے اس لئے فخر سے ایسا کہتا ہے۔ بہر حال القاء کا قلب سے تعلق یہاں بھی ثابت ہو رہا ہے۔

Marfat.com

۲۳۔ کشف

لغوی طور پر کشف کا مفہوم پردہ اٹھا کر کسی چیز کو عیاں کرنا ہے اور وجودِ آدم میں اس کا براہ راست تعلق آنکھوں سے ہے۔ فطری طور پر ہر آدم زاد کی قوتِ ارادی (Force of Intent) اس کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اگر اس قوّتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مجتمع کر لیا جائے، تو یہ کئی باطنی بھید عیاں کرنے کا سبب بن جاتی ہے، جسے کشف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سرِّ الٰہی' بنی نوعِ آدم کے باطن ہی میں چھپا کر رکھا گیا ہے اور عنایتِ الٰہی سے باطن پر پڑے حجاب اٹھائے جاسکتے ہیں تا کہ اس بھید کو ظاہری آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ سائنسی اصطلاحات کے مطابق، اگر باطن' کو' CPU' کے مترادف مان لیا جائے، جس میں کئی بھید پنہاں ہیں، تو آنکھیں انہیں آشکار کرنے والے پردہ (Screen/ Monitor) کا کام کرتی ہیں اور CPU میں موجود سب کچھ کو عیاں کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ بلاشک CPU میں جتنے پروگرام بھی موجود ہوتے ہیں، انہیں بیک وقت پردہ پر نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ سکرین پر ایک وقت میں عموماً ایک ہی پروگرام دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر پروگرام کی Command الگ ہے یعنی جیسی کمانڈ دی جائیگی صرف وہی پروگرام منظرِ عام پر آئے گا۔ اگر پردہ میں دکھانے کی صلاحیت ہو CPU میں پروگرام موجود ہو، اور ٹھیک کمانڈ دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ فوری طور پر وہی پروگرام آپ کی آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ بعینہ باطن میں قدرت کاملہ نے اپنے جو بھید چھپا رکھے ہیں وہ بصارت کے پردہ پر، بشکل بصیرت عیاں ہوسکتے ہیں، ضرورت صرف اس بات کی ہے انہیں بھی صحیح کمانڈ دی جائے۔ قدرت کاملہ کی طرف سے قوتِ ارادی کے لاتعداد درجات مقرر کیے گئے ہیں اور ہر درجہ بمنزلہ ایک کمانڈ کے ہے۔ بندہ کی قوتِ ارادی جس مقام ودرجہ میں ہوگی' اسی کے معیار کا ظاہر ہونے والا باطنی بھید وہ بندہ اپنی آنکھوں کے پردہ پر دیکھ سکے گا۔

Marfat.com

جب ایک سالک اپنی کوشش اور مالک کے کرم سے، اپنی قوت ارادی (Force of Intent) کو مکمل طور پر اپنے تابع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، تو اسے ہر قسم کے باطنی بھید کو عیاں کرنے کی دسترس میسر آجاتی ہے۔ یہ کشف کا انتہائی درجہ ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اپنی بصیرت سے غیبت کو شہود کرنا کشف ہے۔ عام زندگی میں اکثر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اگر کسی کو اچانک کوئی سوال پوچھا جائے، جو متعلق تو اسی شخص سے ہو، مگر واقعہ ماضی بعید میں سرزد ہوا ہو، تو وہ شخص کچھ دیر خلا میں گھورتا رہے گا، اور کچھ حرکات و سکنات کے علاوہ اپنی آنکھوں کو ایسے گھمائے گا، جیسے مناسب کمانڈ ڈھونڈ رہا ہو۔ اپنی کوشش میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ پُر اعتماد انداز میں سوال کا ٹھیک جواب دے گا۔ ماضی کا وہ واقعہ جس کے متعلق سوال کیا گیا ہو گا، وہ بعد کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کے ریکارڈ کی ڈائریکٹری (Directory) میں کہیں دب چکا ہوتا ہے۔ اسے پردہ پر لانے اور دوبارہ دیکھنے (To Retrieve)، کے لئے مناسب کمانڈ تلاش کرنے میں کچھ شعوری کوشش اور فطری وقت ضرور صرف ہوتا ہے۔ یہ عمل قوتِ ارادی کے استعمال ہی کے تابع ہے۔ جس شخص کو قوتِ ارادی مجتمع کرنے کی جتنی زیادہ مشق اور مہارت حاصل ہو جائے گی، اسکا کشف اتنا زیادہ فصیح اور برحق ہو گا۔ یہ کہنا کچھ غلط نہیں کہ دو جہانوں کا نقشہ ہر وجود کے باطن میں پایا جاتا ہے اس لئے ازل سے قبل کی واردات کے تمام احوال قدرتی طور پر باطن میں محفوظ ہیں۔ یہ واقعات بالکل اسی طرح باطن میں چھپے ہوئے ہیں، جیسے کیمرہ کی ریل (Reel) میں بنائی گئی تصاویر محفوظ ہوتی ہیں اور اگر وہ دھلوائی (To process) نہ جائیں تو عرصہ دراز تک اس میں محفوظ رہ سکتی ہیں، یا جیسے کسی ڈسک (CD) پر چڑھایا ہوا پروگرام بہت لمبے عرصہ تک اس میں موجود رہتا ہے۔ ان پروگراموں اور تصاویر کو ازاں بعد جب کبھی دیکھنے کی خواہش ہو تو عملی طور پر ایک مناسب کمانڈ ہی کا فاصلہ ہوتا ہے۔ باطن میں محفوظ احوال بھی ایک مناسب کمانڈ یعنی قوت ارادی کے مناسب استعمال سے عیاں ہو سکتے ہیں، اسی کو

Marfat.com

دراصل کشف کہتے ہیں۔ وحی، القاء اور الہام کے مقابلہ میں، کشف کا سبب مجاہدہ بنتا ہے جبکہ مالک کی عنایت ازلی اس کی علّت ٹھہرتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ پہلی تینوں اقسام کو مجاہدہ سے کوئی واسطہ نہیں، جبکہ کشف کی ابتداء مجاہدہ پر موقوف رکھی گئی ہے۔ حصولِ کشف کے لیے قوّتِ ارادی کو مجتمع کرنا لازم ہے اور اس کے لیے سخت مجاہدہ درکار ہے۔ کشف سے متعلق قرآن کے کچھ مقامات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

i: سورۃ ق آیت ۲۲۔ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ: یعنی تحقیق تو اس سے غفلت میں تھا پس ہم نے تجھے پردہ اٹھا کر منکشف کیا، پس آج کے دن تیری بصارت نہایت مضبوط ہے۔ مراد یہ ہے کہ کشف عطا ہونے پر نظر وہ کچھ دیکھنے لگتی ہے، جو پہلے ناممکن المعلوم ہوتا ہے۔

ii: سورۃ الانعام آیت ۱۷: وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ: یعنی اگر اللہ (غفلت کے اندھیرے کی) کلفت دور نہ کرے تو کون اس کا کشف کرنے والا ہے۔ ثابت ہوا کہ کشف کی علّت اس کی عنایت ہے۔

iii: سورۃ القلم آیت ۴۲: يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ: یعنی وہ دن جب ساق منکشف کی جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس قوت اور جس مقام پر کوئی کھڑا ہے اس کا کشف اس کو دیا جاتا ہے۔

iv: سورۃ الدّخان آیت ۱۲: رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ: یعنی اے ہمارے رب، ہم سے عذاب اٹھا دے یا ہمیں عذاب کے بارے میں کشف عطا فرما۔ دراصل اپنی آنکھوں سے عذاب کی حقیقت دیکھنے کی استدعا معلوم دیتی ہے۔

۲۴۔ اِلہام

آدم زاد کا شعور ایک نہایت محدود قوت کا نام ہے جو عقل سے منسلک ہونے کے علاوہ پہچان کر فرق کرنے سے متعلق ہے۔ اوائل عمری میں بے شعوری نمایاں ہوتی ہے لیکن پختہ ہونے اور مکمل طور پر بالغ

Marfat.com

ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو بھی تقویت ملتی رہتی ہے، حتٰی کہ پیدائش سے کم از کم پندرہ برس بعد یہ اپنی جگہ کچھ مستحکم ہوتی ہے، یعنی پختگیٔ شعور کے لئے ڈیڑھ دہائی کا وقت درکار ہوتا ہے۔

طرہ یہ ہے کہ اتنے برس پرورش پانے کے باوجود لازم نہیں کہ شعور کامل ہو جائے، لیکن یہ بعید از امکان بھی نہیں کہ کسی کا شعور درجہ کاملیت تک پہنچ جائے۔ لامحالہ اس کے لئے ازلی عنایت خداوندی درکار ہے، کیونکہ یہی شعور کی تقویت کی علت ہے۔ عنایت خداوندی کا وہ حصہ جو شعور کی جزوقتی یا کُل وقتی کاملیت کا سبب بنتا ہے، اُسے الہام کہتے ہیں۔ جیسے القاء کا تعلق براہِ راست دل کے ساتھ ہے اُسی طرح الہام بالواسطہ شعور سے نسبت رکھتا ہے۔ جزوقتی سے مراد وہ کمال ہے جو کسی ایک یا چند شعوری معاملات سے متعلق ہو یا جن کا اظہار چند خصوصی مواقع پر ہو، جبکہ کُل وقتی سے مراد یہ ہے کہ شعور ہمیشہ کے لیے (Once for all) اس مقام پر فائز ہو جائے جسے کمال کہتے ہیں، اور پھر ہر معاملہ میں ہر وقت اور ہر جگہ اپنے مرتبہ کو قائم رکھے۔ سورۃ الشمس آیت ۸ میں ہے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا: یعنی الہام کیا جاتا ہے اس کو بدکاری اور پرہیزگاری کا راستہ۔ واضح طور پر ہر دو قوتِ خیر و شر، جو شعور کے تابع ہیں، ان کو الہام کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ چونکہ فجر میں شق ہونے کا مفہوم مضمر ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ جب الہام ہوتا ہے تو شعور 'شق' ہو کر ہمیشگی کے تقویٰ کو راہ دیتا ہے۔ حاصل یہ کہ کاوشوں سے پروان چڑھا ہوا شعور جب تک شق نہ ہو، مقام تقویٰ میسر ہی نہیں آتا۔ شعور کو اپنے تدریجی مراحل طے کرنے کے لیے جو قوت درکار ہوتی ہے وہ جذبۂ دل سے میسر آتی ہے کیونکہ شعور، براہ راست 'عنایت خداوندی کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل ہر عنایت الٰہی قلب پر وارد ہوتی ہے اور ازاں بعد قلب سے شعور کو منتقل کی جاتی ہے۔ شعور میں قلبی جذبہ کو برداشت کرنے کی استطاعت تو ممکن ہو سکتی ہے، تجلّی الٰہی کا برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ الہام کے لیے قلب ایک 'Step down transformer' کا کام کرتا ہے

Marfat.com

اور ایک قابل برداشت قوت میں بدل کر شعور کو وہ روشنی عطا کرتا ہے جس کا بنیادی ماٰخذ نورِ خدا ہی ہوتا ہے۔ اسی قوت اور روشنی سے شعور کی پختگی حاصل ہونے کا سبب بنتا ہے۔ جوں جوں شعور کی صلاحیت جلا پاتی ہے توں توں نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کے بھید اور اسرار کی تفہیم آسان ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی کو الہام کہتے ہیں۔

۲۵۔ میثاق الانبیاء

سورۃ آل عمران آیت ۸۱/ ۸۲: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ:

یعنی جب اللہ نے انبیاءؑ سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت میں سے عطا کر دوں پھر میرا رسولؐ تمہاری طرف آئے اور اس کی تصدیق کر دے جو میں نے تمہیں دے کر رکھا ہے تو تم اس رسولؐ پر ایمان لانا اور اسکی نصرت کرنا۔ فرمایا، کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہوئے اور اس بھاری بوجھ کا ذمہ اپنے سر لیتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ فرمایا تو پھر تم ایک دوسرے کے گواہ بن جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔ پس جو کوئی یہ عہد کر کے منہ پھیر جائیں تو وہ فاسق ہو جائیں گے۔ چند تشریح طلب الفاظ کا مفہوم واضح کر کے آیاتِ بالا کو سمجھنا زیادہ آسان ہو گا۔

i۔ اَخَذَ:۔ لینا۔ (To Take)۔ اردو زبان میں مستعمل 'نتیجہ اخذ کرنا' اور مواخذہ یعنی حساب لینا، سے اس کا مطلب سمجھ آسکتا ہے۔ اس مصدر میں گرفت کرنا اور گھیرا کرنا، کا مفہوم بھی پایا جاتا

Marfat.com

ہے۔ نفس مضمون کے مطابق قبول کر (لینا)، روک (لینا)، پکڑ (لینا) اور اختیار کر (لینا) اسی کے مطالب بنتے ہیں، جن میں 'لینا' بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

ii۔ مِیثَاق: اس میں مضبوطی سے باندھنا پایا جاتا ہے، لہٰذا میثاق، قابل اعتماد، پختہ اور پکا وعدہ ہوتا ہے۔

iii۔ اٰتَی:۔ آنا، بھیجنا، دینا۔ اس میں سہولت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے مگر کام کے ہونے کی تصدیق لازم امر نہیں۔

iv۔ جَآءَ:۔ آنا اور آکر، آنے کا مقصد لازماً پورا کرنا۔ رونما ہونا۔ واقع ہونا۔

v۔ مُصَدِّق:۔ سچ کر کے دکھا دینے والا۔ قلب و نظر اور دل و زبان کی ہم آہنگی کے ساتھ تصدیق کرنا۔

vi۔ نَصَرَ:۔ ساتھ دینا۔ مدد کرنا۔ سرسبز و شاداب کرنے میں معاونت کرنا۔ برائی دور کرنے میں مدد کرنا۔

vii۔ اِصْرِیْ:۔ بھاری بوجھ۔ محکم عہد۔ گراں بار پابندی۔

viii۔ شَھِدَ:۔ محسوس طور پر حاضر اور موجود ہونا۔ صحیح اور سچ بیان کرنا۔ گواہی دینا۔ قسم کھانا۔

مذکورہ بالا عہد کی تفصیلات کو بغور مدِ نظر رکھا جائے تو ممکنہ طور پر مندرجہ سوالات ذہن میں ابھر سکتے ہیں۔

i۔ مالکِ کُل کائنات کو ایسے عہد کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

ii۔ کیا یہ عہد اجسامِ انبیاء سے ان کے ادوار میں ہوا یا ارواحِ انبیاء سے عالمِ امر میں ان کے مبعوث ہونے سے بھی پہلے ہوا۔

Marfat.com

iii۔ کیا انبیاء کرام کو عہد کے مطابق علم الکتاب و حکمت میں سے حصہ ملا؟

iv۔ کیا رسالتمآبؐ نے عہد کے مطابق ہر ہر نبی کی تصدیق فرمائی؟

v۔ کیا انبیاء سابقہ، دورِ مصطفویؐ میں آپؐ پر ایمان لانے یا مدد کرنے کے لئے آئے؟

vi۔ کیا کسی مشکل وقت میں حضورؐ نے انبیاء سابقہ کو مدد کے لیے پکارا؟

vii۔ کیا انبیاء سابقہ کسی دور میں اکٹھے ہو کر اس عہد کے اقرار کی یاددہانی کرتے ہیں؟

viii۔ اللہ کے خود گواہ بننے کی ضرورت اور اہمیت کیا تھی؟

ix۔ کیا کوئی نبی اس عہد سے پھرنے پر فاسق ہوا؟

بالا آیات، میثاق الانبیاء کی نشاندہی ہیں اور یہ میثاق انبیاء سے اللہ پاک نے خود لیا۔ اللہ جو قادرِ مطلق ہے اس کو اصولاً عہد لینے کی حاجت نہیں ہونی چاہیے اور جب کہ ایسا کیا گیا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہ نکالنا چاہیے کہ معاذ اللہ، انبیاء سے بھول چوک کا امکان تھا۔ وہ خطا و لغزش و سہو سے عاری ہوتے ہیں اور عمداً حکم کی خلاف ورزی بھی ان میں ہرگز نہیں پائی جاتی کہ جس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ اللہ نے محسوس کیا، اس کے حکم کی تعمیل میں لیت و لعل ہو سکتی ہے۔ لا محالہ ماننا پڑے گا کہ جس کے لئے عہد لیا جا رہا تھا اس کی اہمیت مقدم اور فائق ہے۔ عہد کا بنیادی مقصد اپنے محبوب کا تعارف تھا۔ مالک و خالقِ کُل کائنات اپنے تمام انبیاء سے وعدہ لے رہا ہے اور اس تقریبِ حلفِ وفاداری (Oath taking ceremony) میں خود بھی شامل ہے۔ گو شروع میں حلف لے رہا ہے مگر انجام کار خود بھی حلف اٹھانے والوں میں شریک ہو رہا ہے۔ بلاشک حلف اٹھانے اور اٹھوانے کی وجہ مخصوص ہے کہ علم کتاب و حکمت میں سے دیے گئے کی

Marfat.com

تصدیق کرنے والے پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرنے کی بھاری ذمہ داری۔ اس عہد کی نمایاں شقیں یا نکات سات ہیں۔ جو کچھ تفصیل سے ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

i۔ انبیاءِ کرام کو علم الکتاب کے اسرار ورموز اور حکمت کے علم میں سے حصہ عطا فرمانا۔

اللہ نے اپنے تمام انبیاء ومرسلین کو ایک جگہ اکٹھا فرما کر ان سے عہد لیا، جس کی رُو سے ذات باری تعالیٰ نے کتاب اور حکمت میں سے ان کو بقدرِ ظرف دینا طے کیا۔ تمام انبیاء ومرسلین کو کتاب و حکمت میں سے اتنا حصّہ عطا کیا گیا جس کی ان کی امتیں متحمل ہو سکتی تھیں۔ ہر دور میں بنی آدم کی شعوری سطح کے مطابق ہی یہ عطا ہوئی، اس طرح امت کی تشفی بھی ہو جاتی اور ان پر ان کے ظرف سے زائد بوجھ بھی نہ بنتا۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ شعیبؑ کی امت ناپ تول میں خیانت کے عادی تھے اس لئے ان کے لئے اصلاحی احکامات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لقمانؑ کے دور میں عوام النّاس کی ذہنی سطح، گدھے کی عادات کے مشابہ تھی، تبھی ان کے اذکار میں صَوْتُ الْحَمِيْرِ کے لئے کراہت کا اشارہ ہے۔ ابراہیمؑ کے ارد گرد بت تراشی اور بت پرستی زوروں پر تھی تو داؤدؑ کے زمانہ میں راگ و سرود کا چرچا تھا۔ قوم لوطؑ کی مخصوص ذہنیت فرمانِ تَعْمَلُ الْخَبٰئِثَ سے عیاں ہوتی ہے۔ یوسفؑ کے بھائی خود نمائی کا پیکر تھے جبکہ ان کے دور کے امراء و حکماء بلاوجہ شک کرنے والے تھے۔ نوحؑ نو سو پچاس (۹۵۰) برس سر کھپائی کے بعد بھی مجبوراً کہتے ہیں کہ میری قوم میں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، اسی لئے انہیں 'کھلے پانی' سے دوچار کیا۔ موسیٰؑ کو نو (۹) بیّن معجزات سے نوازا گیا جو کسی بھی متوازن عقل رکھنے والوں کو عاجز کرنے کے لئے بہت کافی ہوتے ہیں۔ عیسیٰؑ بھی پیدائشی حامل کتاب ہونے کا عندیہ دینے کے باوجود صرف چند افراد کو اپنا حواری بنا سکے وگرنہ باقی گنواروں نے تو انہیں سولی دینے سے بھی عار نہ کیا۔ یہ مثالیں ظاہر

Marfat.com

کر رہی ہیں کہ دورِ مصطفویؐ سے قبل اولادِ آدم کی ذہنی سطح محدود رہی ہے، اس لئے ان انبیاءؑ کو کتاب و حکمت میں سے بقدرِ ضرورت عنایت ہوا۔ مِّنْ کا صیغہ یہی نشاندہی کر رہا ہے کہ کتاب و حکمت کُلی طور پر انبیاء سابقہ کو نہیں دی گئی، بلکہ اس میں سے 'بقدرِ ضرورت' انہیں عطا کیا گیا۔

ii۔ رسول آخر الزماں حضرت محمدؐ کی بعثت ۔

گو علماء کا اختلاف موجود ہے مگر یقیناً نبی موعود ان آیات میں حضرت محمدؐ ہی ہیں۔ اس میں شانِ مصطفویؐ کا اظہار ہے اور ان کا مقام تمام انبیاء سابقہ کے مقابلے میں نمایاں کیا گیا ہے حتّیٰ کہ آپؐ کے وجہِ تخلیق کائنات ہونے کا ثبوت بھی انہی آیات سے ملتا ہے۔ عہد ہمیشہ نہایت اہم باتوں کے لیے ہوتا ہے اور جس کے لیے عہد لیا جارہا ہوتا ہے، اس کا رتبہ و فضیلت واضح ہوتا ہے۔ ان آیات سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ خاتم المرسلینؐ ہر نبی مکرم سے پہلے موجود تھے، ان کے دور میں بھی موجود رہے ہیں اور تا قیامت آپؐ حاضر و ناظر ہیں۔ کیونکہ عہد لینے کے وقت، دو طرفہ پہچان اور شناخت کے لیے، حضورؐ کا ذاتی طور پر موجود ہونا لازم تھا، وگرنہ احتمال ہو سکتا تھا کہ عہد کرنے والے کل کو معرفت نہ ہونے کا جواز بنالیتے۔ جب تمام انبیاء اپنے اپنے ادوار مکمل کر چکے اور کتاب و حکمت میں سے دیے گئے کو استعمال کر چکے تو خَاتَمَ النَّبِيِّنَ، بحیثیت رسولِ مصدّق مبعوث ہوئے۔ سورۃ المائدہ آیت ۳ میں وحی کے طور پر فرمایا گیا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ: یعنی آپؐ پر کتاب و حکمت مکمل طور آشکار کر دی گئی۔ ظاہر ہے یہ سب نبیٔ آخر الزماںؐ ہی کو عطا ہوا۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۸۵ کا درس ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ: یعنی اس کے مرسلین میں تفریق کی مناعی ہے۔ سب کا منصب پیغامِ خداوندی، بندگانِ خدا تک پہنچانا ہے۔ چونکہ وحی کئے گئے پیغامات ہر نبی کے لئے مختلف ہیں اس لئے ان کے درجات میں تخصیص کی گنجائش موجود ہے۔ آدمؑ کا مقام توبہ ہے تو نوحؑ پانی سے پاکی کا

Marfat.com

درس دے رہے ہیں۔ ابراہیمؑ کے ذریعے آگ سے باطن کی صفائی کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ اسماعیلؑ کو صبر کا پیکر کہا گیا تو ترنم داؤدؑ کے حصہ میں آیا۔ چالیس الواح موسیٰ کو دی گئیں اور سورۃ مریم آیت ۳۰ کے مطابق: اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا: عیسیٰ کا درجہ مقرر ہوا۔ مگر کسی اور وحی کو یہ شرف حاصل نہیں کہ وہ سورۃ الحجر آیت ۹ میں بیان کیے گئے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ: کے زمرہ میں آئے، یعنی اس کی تا قیامت حفاظت کا ذمہ وحی بھیجنے والے نے اپنے پاس رکھا ہے۔ اور نہ ہی کسی اور رسول کی شان میں کبھی سورۃ الانبیاء آیت ۱۰۷: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ: جیسا خطاب وارد ہوا، یعنی آپؐ کو تمام جہانوں کی رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ یہ مرتبہ رسولِ مصدق ہی کا ہے۔

دیے معجزے آپ ﷺ نے انبیاء کو — ہمارے نبی ﷺ خود معجزہ بن کے آئے

ہر نبی مرسل کا ایک مقام و مکان ہے جبکہ رسولِ مصدق لا مکاں کے مکین ہیں، اس لئے مقامات کی قید سے آزاد ہیں۔ معراج کی شکل میں عرشِ معلیٰ تک رسائی اور ذات سے بالمشافہ ملاقات و گفتگو آپ ہی کو سزاوار ہے۔ وہ: فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی: سورۃ النجم آیت ۱۰ کی شان کے حامل ہیں۔ آپؐ کا نطق محض وحیِ الٰہی ہے، آپؐ کنکریاں پھینکیں یا ہاتھ پر بیعت لیں تو ذاتِ باری اسے اپنا فعل قرار دے کر اپنی طرف منسوب کرے، اس کی اطاعت کو اپنی اطاعت فرمائے اور صرف اسی کو اپنا 'رسول' کہنے اور ثابت کرنے میں فخر محسوس کرے۔

iii۔ سابقہ انبیاء اور انہیں عطا کئے گئے علم الکتاب و حکمت کی تصدیق فرمانا۔

ان آیات میں دین کی توضیح فرمائی گئی ہے کیونکہ جو تصدیق حضورؐ نے انبیائے سابقہ، ان کی کتب اور تعلیمات کی فرمائی، وہ کسی اور مرسل کا حصہ ہی نہیں۔ آپؐ نے ہی پچھلے تمام ادیان کی تصدیق فرمائی اور اس طرح یہ مسئلہ حل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ سابقہ ادیان صرف معطل یا منسوخ ہوئے ہیں، باطل قرار

Marfat.com

نہیں دیے گئے۔ اگر وہ باطل ہو چکے ہوتے تو ان کی تصدیق کروانے کے کیا معنی رہ جاتے؟ یہ تو رسولِ صادق کا احسان ہے کہ انہوں نے تمام انبیاءؑ کو ان کے مراتب و مقامات سمیت، حیاتِ لازوال بخشی اور ساتھ ہی آپؐ نے اس سب کچھ کا ردّ بھی کیا جو سابقہ انبیاء کی تعلیمات کا حصہ نہیں ہے۔ امتوں نے اپنے پیغمبروں پر جو مظالم ڈھائے انہیں بھی ظاہر کیا اور جو بہتان ان سے منسوب کئے گئے ان کو بھی قطع کیا۔ اگر نبی اپنے آپ کو عَبدُ اللہ کہے اور نسبت کے جھوٹے دعویدار اسے اِبنُ اللہ گردانیں تو رسولِ مصدقؐ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کریں، وگرنہ شاید ادوار کے بدلنے کی وجہ سے، کسی بھی نبی مکرم کا نام اور حالات و واقعات اپنی صداقت کے ساتھ محفوظ ہی نہ رہ سکتے۔ یہ رسولِ مصدقؐ کی عنایت ہے کہ آپؐ نے لافانی اور لازوال وحی کی روشنی میں ان حقیقتوں سے پردہ اُٹھا دیا اور قیامت تک کے لئے انہیں آشکار کر دیا۔ رسولِ مصدقؐ اگر سابقہ انبیاء کے مقامات، درجات، مناصب اور احوال سے واقف نہ ہوں تو نا ممکن ہوتا کہ وہ ہر ایک کی تصدیق کر سکتے۔

۱۷۔ سابقہ انبیاءؑ کی پابندی کہ وہ نبیؐ خاتمؐ پر ایمان بھی لائیں اور حتیٰ المقدور انؐ کی مدد بھی کریں۔

لغوی طور پر ایمان لانے کا مطلب، زبان سے اقرار، دل سے یقین اور عمل سے اظہار ہوتا ہے اور جو کسی پر ایمان لاتا ہے وہ اس کا صحابی، مقتدی اور امتی ہوتا ہے۔ وہ انبیاء و مرسلینؑ جو خود صاحبان شریعت تھے اور ان کی امتیں ان پر ایمان لانے کی پابند تھیں، وہی مرسلینؑ، خاتم المرسلینؐ کے امتی اور مصاحب قرار پا رہے ہیں۔ بالیقین کسی بھی نبی کا کلمہ اس کی زندگی اور موجودگی سے قبل نہ پڑھا جا سکتا ہے اور نہ روا ہے۔ اگر انبیاء سابقہ اپنے ادوار میں حضور کریمؐ پر ایمان لائے ہیں، جیسا کے ان کے فاسق نہ ہونے سے ثابت ہے تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ آپؐ ان کے سامنے موجود رہے ہیں۔ اسی لیے تو آدمؑ کی توبہ آپؐ کے اسم گرامی سے ہوئی، نوحؑ کی کشتی کا کنارے لگنا اسی اسم مبارک کے طفیل ہوا، ابراہیمؑ جب آگ میں پھینکے گئے تو اسی نام کے واسطہ سے وہ گل و گلزار ہو گئی، موسیٰؑ نے

Marfat.com

عصا پر یہی اسم اعظم پھونک کر اسے دریا میں مارا تھا جب وہ دو پاٹ ہو گیا اور عیسیٰؑ کی رفعت کا سبب بھی یہی اسم الحسنیٰ ہوا۔ الغرض شیثؑ، ادریسؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، ایوبؑ، داودؑ، سلیمانؑ، ذوالقرنینؑ، یونسؑ حتیٰ کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے لیے اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ وہ اپنے اپنے عہد کے پابند تھے اور اسی کی بنیاد پر جانتے تھے کہ نجات اسی وسیلۂ مکرم سے ممکن ہے۔ اپنی نبوت ورسالت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ فقط محمدؐ پر ایمان کے صدقے اور ان کے امتی اور مصاحب ہونے کے ناطے مشکل کشائی ہو سکتی ہے۔ یہ ذات باری کی منشاء تھی کہ اس کے انبیاء آپؐ پر ایمان بھی لائیں اور جہاں اور جب موقع ملے اس کی مدد و نصرت بھی کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اللہ نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اور منجملہ کُل انبیاء سے بیک وقت میثاق لیا۔ مانا جا سکتا ہے کہ یہ میثاق عالم ارواح میں لیا گیا ہو کیونکہ ازاں بعد تمام انبیاء اپنی باری پر اپنے دور میں تشریف لاتے رہے، اور تبلیغ مکمل فرما کر جہانِ فانی سے پردہ فرماتے رہے۔ ان کی تعلیمات میں یہ قدر مشترک موجود ہے کہ وہ خَاتَمَ النَّبِیّنَ کی آمد کی خبر دیتے رہے اور اپنی امتوں کو پابند کرتے رہے کہ اگر ان کے بعد رسولِ مصدق کا دور پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی حتی المقدور نصرت کریں۔ چونکہ کوئی نبی فاسق نہ ہوا، اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے اپنے عہد پر قائم رہے ۔ یہ نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ تمام انبیاء ومرسلین، شفیع المذنبینؐ کی نصرت کے پابند کیے گئے تھے اور یہ ہی وہ بھاری بوجھ تھا جس کا خصوصی اشارہ آیات مذکورہ میں ملتا ہے ۔ ایمان لے آنے میں کوئی خاص بوجھ نہیں جبکہ نصرت و مدد میں جو تکالیف اور مراحل آتے ہیں وہ واقعتاً ایک بھاری بوجھ سے کم نہیں۔ کائنات بھر میں جو کچھ ہے وہ مالک کائنات کی نگاہ میں ہیچ ہے۔ کُل کائنات اور مافی ھٰذا ایک طرف، اور رسول مصدق اور آپؐ پر ایمان لانے اور مدد و نصرت کی اہمیت ایک طرف، اسے افضل ترین ترغیب فرمایا گیا ہے۔ تخلیق کائنات کا بنیادی مقصد، حدیث لولاک کے مصداق، یہی عمل تھا۔ محبوب کبریاؐ پر ایک کا

Marfat.com

ایمان لانا اور اپنی تمام صلاحیتوں، قوتوں اور خوبیوں کو اس کی مدد و نصرت میں صرف کرنا ہی منشاءِ ایزدی ہے۔ انبیاء چونکہ اپنی امّتوں کے راہبر اور سر خیل ہیں اس لئے یہ میثاق بمنزلہ کُل بنی نوعِ آدم کا میثاق کہلا سکتا ہے۔

چونکہ یہ علمِ خداوندی میں تھا کہ حضورؐ کی تشریف آوری سے قبل، نبوت و رسالت قریب پانچ صدیاں منقطع رہے گی، اس کے باوجود اس طرح بندوبست کیا گیا کہ عیسیٰؑ سے قبل ہر دور میں کم از کم کوئی ایک اولوالعزم نبی زندہ رہے اور وہ تمام انبیاء کی طرف سے اس میثاق کو پورا کرے۔ آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، یعقوبؑ اور داؤدؑ نے اپنے اپنے جانشینوں سے یہ وصیت فرمائی کہ جب اور جہاں موقع بنے وہ اس عہد کو پورا کریں۔ اسی طرح جب پچھلے تمام انبیائے کرامؑ گزر چکے تو اللہ نے عیسیٰؑ کو حجت کے طور پر قائم رکھا۔ چاہیے تو تھا کہ عیسیٰؑ، حضورؐ کے دور میں تشریف لاتے مگر اس سے یقیناً یہ تصور لیا جاتا تھا کہ داود اور اسی عہد تک تھے۔ در حقیقت عہد اس زمانہ تک باقی رہنا ہے جب تک حقیقتِ محمدیہؐ کا آخری ترین جزو برقرار ہے۔ عیسیٰؑ اسی منصورؑ کی نصرت کے لیے، رفعت دیکر، روکے گئے ہیں۔ انہیں امام مہدیؑ کہتے ہیں اور وہی آخری جزوِ محمدؐ ہیں اور انہی امام مہدیؑ کی اقتدا میں عیسیٰؑ ماموں بن کر نماز پڑھیں گے!

رسالتمآبؐ سب انبیاءؑ سے افضل ہیں اور انؐ کا جانشین، انؐ ہی کا نفس اور وصی ہے۔ حضورؐ کے ہجرتِ مدینہ کے بعد اُس وصی کی حرکات و سکنات دیکھ کر مکّہ کے کفار تمام رات یہی خیال کرتے رہے کہ محمدؐ ہی خیمہ میں موجود ہیں۔ یہ حقیقتاً ایسا نفس ہے کہ اگر حضورؐ اپنا رُخِ انور طبعی پردہ میں چھپا لیں، تو تمام لوگ انہیں محمدؐ ہی جانیں اور اگر وہ 'مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ' کر لے، تو رضائے الٰہی کا مالک بن جائے! امامِ اوّل سے لے کر امامِ آخر تک تمام جزوِ محمدؐ ہی ہیں۔ مخالفین کی سر توڑ کوشش کے باوجود اللہ نے حقیقتِ محمدیہؐ کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ تمام مسلمانانِ عالم کا اجماع ہے کہ امامِ آخرُ الزماںؑ تشریف لائیں

Marfat.com

گے اور عیسیٰ ان کی اقتداء کریں گے۔ یہی وہ شکل ایمان و نصرت ہو گی اور اسی سے آیات مذکورہ بالا کی حقانیت ثابت ہو سکے۔ سرورِ دو عالمؐ سے قبل، عیسیٰؑ آخری صاحب کتاب و صاحب شریعت نبی تھے۔ اُن کو خدا نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا تاکہ ان میں مادی اجزاء کی قوت اور مزاج و کیفیت وطبیعت نہ ہو بلکہ وہ بس روحانیت ہی روحانیت ہو۔ شکم مادر میں بھی روح اللہ تھے، پیدا ہوئے تو بھی روح اللہ کہلوائے اور عمر کی پختگی ہونے کے باوجود گھر بنانے اور شادی کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ تینتیس (۳۳) برس اس دنیا کی کثیف فضا میں گزارے، مگر جلد لطیف فضاؤں میں رفعت پائی۔ مگر ان کی یہ روحانیت چوتھے آسمان پر رک گئی۔ غور طلب ہے کہ روحانیتِ عیسیٰؑ ہے کیا؟ در حقیقت روحانیتِ عیسیٰؑ ، فقط اقتدائے حقیقتِ محمدیہؐ ہے! علم و مشیت الٰہی میں یہ بات موجود تھی کہ تمام انبیاء، خاتم المرسلینؐ پر ایمان بھی لائیں گے اور انکی نصرت و مدد بھی فرمائیں گے۔ اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ متذکرہ آیات ہر قرآن پڑھنے والے اور مخاطب کے لیے بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں، بلکہ بنی نوعِ آدم کے لیے یکساں طور پر قابل عمل و لازم ہے۔ عام رواج کے مطابق کسی ملک کا بادشاہ اگر تمام عوام سے عہد لینا چاہے تو وہ ہر صوبے، شہر اور قصبے کے نمائندگان کو اکٹھا کرے گا اور ان سے عہد لے گا۔ وہ نمائندگان عہد تو اپنی طرف سے دیں گے لیکن ان کے علاقوں اور قصبوں کے عوام براہ راست اس عہد کے پابند قرار پائیں گے۔ یہاں بھی معاملہ ایسا ہی ہے کہ انبیاء کے اس مذکورہ عہد میں ان کی امتیں اور پھر امتِ محمدؐ کا ہر فرد شامل ہے۔

۷۔ تمام انبیاء کرامؑ کا اقرار، اور ایک دوسرے پر گواہ بننا۔

یہ اس عہد کی اہمیت ہے جو انبیاء کو ایک دوسرے پر گواہ بنایا۔ اگر یہ میثاق عالم ارواح میں ہوا تو تمام انبیاء نے رسول مصدق پر ایمان لانے کی شرط تو وہیں پوری کر دیا اور جہاں تک مدد و نصرت کا معاملہ ہے تو اپنے ادوار میں آپؐ کا صحیح تعارف دیکر اور مکمل تعریف بیان کر کے بڑی حد تک اس بوجھ سے

Marfat.com

سبکدوش ضرور ہو گئے۔ روزِ میثاق انبیاء ایک دوسرے پر گواہ بنے کہ اگر کسی سے بھی ہلکی پھلکی بھول یا کمی بیشی کا امکان ہو تو باقی اس کی تصحیح کر سکیں۔ بعینہٖ جب مختلف انبیاء کی امّتوں کے نمائندگان دَورِ مصطفوی میں موجود تھے، تو ان پر بھی لازم تھا کہ وہ ایک دوسرے کو یاددہانی کرواتے اور انبیاء سابقہ کو اسی مقصد کے لئے پابند کیا گیا تھا، کہ وہ اپنی امتّوں کو بار بار تلقین کرتے رہیں۔ یہ علمِ الٰہی میں تھا کہ دورِ رسولِ مصدّق میں ہر نبی کے ماننے والے موجود ہوں گے اور ان کی اوّلین ذمہ داری ہو گی کہ وہ ایمان و نصرت کا حق ادا کریں۔

vi۔ اللہ تعالیٰ کا بذاتِ خود بھی گواہ بننا۔

یہ بھی اس عہد کی اہمیت ہے جو انبیاء کو ایک دوسرے پر گواہ بنا کر خود بھی شہادت دی گئی ہے۔ جب عہد لینے والا بھی، عہد میں گواہ کے طور پر شامل ہونا فخر سمجھے، تو اس عہد کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ اللہ کے خود گواہ بننے میں اس کے ہاں مراد المشتاقین ؐ کے مراتب و منازل کا پتہ چلتا ہے اور یہ نکتہ بھی ملتا ہے کہ اللہ محبّ ہے اور حضور محبوب ہیں۔ محبّ، محبوب کے لیے اگر انبیاء کو بھی فاسق گروہ میں شامل کر دینے تک کا اشارہ دے تو عام آدمی اگر اس کے محبوبؐ کی توہین کا مرتکب ہو، تو وہ کیا عذاب مقرر کرے گا! عہد لینے والا ہمیشہ قاضی (Judge) ہوتا ہے اور اس حیثیت میں وہ کبھی خود گواہ نہیں بن سکتا۔ جو گواہ نہیں بن سکتا وہ آنکھوں دیکھی کا اظہار، بیان میں نہیں لا سکتا۔ قاضی تو گواہوں کے بیانات کی روشنی میں فیصلہ سنانے والا ہوتا ہے۔ میثاق لیتے ہوئے مالکِ کائنات کے حسنِ خیال میں ہو گا کہ اگر کبھی ضرورت محسوس ہوئی اور ایسا وقت آ گیا، تو وہ خود گواہ کی حیثیت سے اس امر کو باور کروا سکے، اس لئے اس نے خود گواہ بننا بھی پسند کر لیا۔ اب اگر سابقہ انبیاء کی امّتوں کے افراد اس بھاری عہد سے منہ پھیرتے ہیں اور رسولِ مصدّق پر ایمان لانا اور مدد و نصرت کرنا تو ایک طرف، اس کی دشمنی اور مخالفت میں اندھے ہوا چاہتے ہیں، تو طبعی پردہ کی وجہ سے انبیاء گواہ کی حیثیت سے موجود نہیں

Marfat.com

ہو سکتے۔ اگر ان دشمنوں اور مخالفوں کو قرار واقعی سزا دینا مقصود ہو، تو تقاضۂ عدل کے تحت گواہ کون ہو گا؟ یقیناً وہ ہمیشہ سے قائم اور ازلی قدیم ذات خود گواہ کے طور پر یہ فریضہ سرانجام دے سکے گی!

vii۔ اس عہد سے پھرنے والے کو منصبِ نبوت سے خارج کر کے فاسقوں میں شامل کرنے کا اعلان۔

انبیاءؑ معصوم ہوتے ہیں اور خطا سے بری۔ بظاہر یہ خطاب انبیاءؑ کے شایانِ شان نہیں اور خدائے بزرگ وبرتر بھی ان کے لیے اتنا سخت رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ یقیناً یہ خطاب تو انبیاءؑ سے ہے، مگر اصل مخاطب ان کی امتیں اور پیروکار ہیں۔ دراصل تمام قرآن مانند تمثیل ہے اور یہ اسلوب اس میں نمایاں ہے کہ نصیحت بیٹی کو ہوتی ہے مراد بہو کی اصلاح ہے۔ ایسے کئی ایک مقامات قرآن میں نظر آتے ہیں جہاں مخاطب رسولؐ محسوس ہوتے ہیں مگر اصلاح امت کی مقصود ہوتی ہے۔ بالا آیات میں عہد انبیاءؑ سے لیا گیا ہے مگر مراد ان کی شریعتوں پر عامل ان کے امتی ہیں۔ بلکہ ان آیات کے مطابق ہر ذی روح نسلِ آدم کے لیے فرضیت کی حد تک لازم ہے کہ وہ محمدؐ رسول اللہ پر ایمان بھی لائے اور ان کی مدد و نصرت بھی کرے، اور ایسا نہ کرنے والا ہی فاسق ہے۔ سابقہ انبیاءؑ رسولِ مصدق پر ایمان لانے والے اور آپؐ کی نصرت کی ترغیب دینے والے ہیں۔ زبور کا جتنا حصہ میسر ہے

حضورؐ کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ آدمؑ کی توبہ بھی اسم محمدؐ کی مرہونِ منت ہے، اس لئے وہ اس اسم کی مالا جپتے رہے۔ ہم سب بنیادی طور پر آدمؑ اور حواؑ کی اولاد ہیں جو قبیلوں، برادریوں اور نسلوں میں بٹ گئے ہیں۔ جغرافیائی حدود کی بنیاد پر معاشرتی اور تہذیبی تفاوت موجود ہے، رنگ بھی جدا ہیں اور لسانی فرق بھی پایا جاتا ہے، مگر یہ حقیقت برقرار ہے۔ اولادِ آدم کے نیک بخت ہر دور میں رسول مصدق پر ایمان لانے والے اور حتی المقدور اس کی معاونت کرنے والے ہوئے ہیں، چاہے صف انبیاءؑ میں ہوں یا اولیاء اللہ میں سے ہوں۔ اور بد بخت، مخالفت میں جو بن پڑتا ہے، کرتے رہے

Marfat.com

ہیں، کر رہے ہیں اور سزا کے طور پر کرتے رہیں گے۔ خدا نے ازل سے قبل ہی تمام انبیاء سے توقیر و نصرتِ رسولِ مصدّق کا اقرار لے لیا تھا۔ وہ بدبختوں کی سازشوں سے عاجز تو نہیں ہو سکتا۔ سورۃ الطارق آیات ۱۵ اور ۱۶ میں وارد ہے: اِنَّهُمْ یَكِیْدُوْنَ كَیْدًاۙ وَّ اَكِیْدُ كَیْدًا: یعنی بیشک وہ کفار اپنے مکر کرتے ہیں اور میں اپنی خفیہ تدبیر کرتا ہوں۔ مادّی قوتوں کے نشہ میں سرشار اقوام اندھوں کی طرح دندناتے پھر رہے ہیں۔ وہ حالتِ مدہوشی میں اس سے بھی بے خبر ہو جاتے ہیں کہ: اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ: یعنی اللہ کی تدبیر نہایت متانت والی ہوتی ہے۔ ایسے افراد اور اقوام نے اپنے انبیاء کی تعلیمات کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔

اس عہد کو گرانبار بوجھ کہنے میں ایک راز پنہاں تھا۔ مالکِ کائنات کے علم میں تھا کہ یہ عہد اس کے انبیاء کے لئے کوئی بوجھ نہیں ہے مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سابقہ امّتیں توقیر و نصرت کے لئے اس پیمانے پر تیار نہ ہو سکیں گی اور رسولِ مصدّق کو پہچان لینے کے باوجود بدنیّتی سے مخالفت پر اتر آئیں گی۔ ان کی وجہ سے روزِ قیامت انبیاء کو اللہ کے حضور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں نصرت کا عمل چونکہ تا قیامت جاری رہنا تھا، اس لئے بھی اسے بھاری اور اہم بوجھ کہا گیا۔ رسولِ مصدّق کے پیغام کا حاصل 'سلامتی بین النّاس' ہے۔ اگر تمام اولادِ آدم و حوّا اس لازوال حقیقت کو اپنا لے، تو زمین پر امن، شانتی اور خیر کا چرچا ہو۔ لیکن وہ افراد و اقوام جو مادی قوتوں پر دسترس کی بنیاد پر اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں، انہیں یہ قانون ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ کیونکر چاہیں گے کہ برابری اور انصاف کا بول بالا ہو، سلامتی کی فضا قائم ہو، چھوٹے بڑے اور امیر غریب کا فرق مٹ جائے اور سب اولادِ آدم ایک سے تصور کر لئے جائیں۔ اس طرح ان کی فرعونیت، نمرودیت، ہامانیت اور شدّادی صفات کی اہمیت نہ رہے گی۔ اسی لئے وہ مادی دولت و قوت کے گھمنڈ میں سب کو محکوم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں جو پیغامِ رسولِ مصدّق کی صریح نفی ہے۔

Marfat.com

متذکرہ بالا آیات میں عہد لینے سے مراد توحید کا ثبوت ہے، انبیاء کے ذکر سے نبوت ثابت ہوگئی، رسالتمآبؐ کا ذکر رسالت ہوگئی، اقرار سے پلٹنا اور فاسق ہونا، عدل ہوگیا اور حقیقت محمدیہؐ کا انتظار اور عیسیٰ کا ماموں و مقتدی بننا، امامت ہوگئی۔ یہی تمام اللہ کا دین ہے، یعنی امامت و حقیقت محمدیہؐ پر ایمان ہی دین ہے۔ توریت میں وارد ہوا تھا، اے موسیٰ اپنی امت سے فرما دو کہ میرا وزیر ہارون میری معرفت کا حامل ہے اور ہارون کے بیٹے بھی یہی شان رکھتے ہیں، ان کے وسیلہ سے جو دعا مانگو گے، درجۂ قبولیت پائے گی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، میری اور علیؑ کی مثال موسیٰ اور ہارون جیسی ہے۔ ایک دفعہ کسی نو مسلم یہودی نے حضورؐ سے پوچھا کہ ایمان تو میں آپ پر لا چکا ہوں، لیکن کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپؐ کا کوئی وصی بھی ہے؟ کیونکہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں یہ سنت برقرار رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا، ایک نہیں کُل بارہ (۱۲) وصی ہیں اور پہلے کا نام ہے علیؑ۔ یہودی نے کہا کہ توریت میں تو نام 'ایلیا' لکھا گیا ہے۔ فرمایا ایلیا کو ہی عربی زبان میں علیؑ کہتے ہیں۔ وقت کے اسی علیؑ اور حقیقت محمدیہؐ کے جزو کے لئے سورۂ یونس آیت ۲۰ میں وارد ہے: فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ: یعنی تم بھی انتظار کرو، میں بھی منتظر ہوں۔ پھر فرمایا: یَوْمَ مُنَادِیْكُمْ: یعنی تمہارے لیے یہی منادی اور ظہور کا دن ہے۔ اسی دن کے لیے قتال کا حکم ہے جو فتنہ ختم ہونے تک ہوگا: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ: سورۃ الانفال آیت ۳۹۔ غور کا مقام ہے کہ یہاں 'جَاهِدُوْا' نہیں کہا بلکہ 'قَاتِلُوْا' کہا ہے۔ یہ آیت رسول اللہؐ کے زمانے میں تو صادق نہ آسکی کیونکہ فتنۂ نفاق و شرک مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ سے اُس وقت مکمل طور پر نہ نکالا جاسکا۔ یہی بات ثابت کرتی ہے کہ 'وہ' یقیناً آنے والا ہے اور جس وقت وہ آجائے گا، پھر تب تک قتال جاری رہے گا جب تک کہ فتنۂ نفاق و شرک کی بیخ کنی نہ ہوجائے اور تمام عالم میں ایک دین واحد کا پرچار ہوجائے۔ بالا آیت خود 'اسی' کی منتظر ہے۔ اس کے آنے پر ابلیس و شیاطین کا کام بھی ختم ہوجائے گا، کہ وہی وقت معلوم ہے!

Marfat.com

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انبیاء کا یہ یثاق مقام کربلا میں پورا ہوتا نظر آتا ہے۔ جہاں مختلف طبقہ ہائے فکر و مذاہب کے لوگوں نے ابنِ رسول کی نصرت و مدد کرنے کا حق ادا کیا۔ وہ مولا حسینؑ پر ایمان بھی لائے اور ان کی نصرت و تائید میں اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش فرمایا۔ اس طرح ان شہدائے کربلا نے اپنے مذاہب کے انبیاء کے عہد کا حق ادا کیا۔ تفصیل کے لیے شہدائے کربلا کے احوال کا مطالعہ کرنا مناسب ہوگا۔

۲۶۔ خلیفۃُ اللّٰہ

خلیفہ، مادۂ خلف سے بنتا ہے، جس کے معنی پیچھے اور بعد میں ہونے یا آنے کے ہیں۔ عمومی طور پر اصل اور خلف ایک ہی وقت میں ایک جگہ موجود نہیں ہوا کرتے بلکہ خلافت کا اعلان اصل کے بعد یا اس کی غیر موجودگی میں ہی ہوا کرتا ہے، مگر دونوں کی ایک ہی زمانہ میں موجودگی ممکن ہے۔ کسی مخصوص موقعہ اور جگہ پر خلیفہ کے ہونے کے لئے لازم ہے کہ اصل وہاں نہ ہو۔ آج کے دور میں اس کی مثال دوسرے ملکوں میں بھیجے گئے سفیر (Ambassador) کی طرح ہے۔ صدر اپنے ملک میں تو موجود ہوتا ہے مگر اس ملک میں نہیں ہوتا جہاں سفیر کو بھجوانا مقصود ہوتا ہے۔ بھجوائے گئے ملک میں اس سفیر کو متعلقہ ملک کے صدر جیسی تکریم دی جاتی ہے۔ اس سفیر کا تقرر بادشاہ سلامت یا صدرِ مملکت خود اسی طرح کرتا ہے، جیسے اللہ نے ارض میں اپنے خلیفہ کی حیثیت سے آدمؑ کا تقرر کیا۔ مالکِ کائنات نے اپنی جگہ اپنے خلیفہ کو، کُل ملائکہ سے سجدہ کروایا، اسی طرح جیسے کسی ملک کا سفیر جب نمائندگی کے طور پر دوسرے ملک میں بھیجا جاتا ہے تو اسے وہاں تعظیمی سلامی (Guard of honor) پیش کی جاتی ہے۔ یہ سلامی صدرِ مملکت کے لئے ہوتی ہے مگر سامنے وہ سفیر ہوتا ہے اور ایسے سفیر کو بجا طور پر خلیفہ کہا جا سکتا ہے۔ ملائکہ کا سجدہ بھی تعظیمی سلامی کے مترادف مانا جا سکتا ہے۔ اللہ نے جسے ارض

Marfat.com

میں اپنا خلیفہ مقرر کیا، اسے تمام اہلیتیں اور قابلیتیں عطا فرمائیں، تاکہ وہ اس منصب سے قرار واقعی عہدہ برآ ہو سکے۔ چونکہ اس خلیفہ کو ارض میں اپنے رب کی نمایندگی کرنا تھی، لہٰذا اسے کُل اسماء کا علم تفویض کیا گیا۔ حتّٰی کہ ملائکہ جو خلافت کے متمنی ہو رہے تھے، مقرر خلیفہ سے مکالمہ کے بعد تسلیم کرتے ہیں کہ حکمتِ الٰہی فائق ہے۔ اس تسلیمات پر ملائکہ کو پابند کیا گیا کہ وہ آدم کے لئے سجدہ ریز ہو جائیں۔ یہیں خلیفہ کی پہچان کا پہلا اصول وضع ہو گیا کہ جس کے سامنے کائنات کی تمام ظاہرہ و پوشیدہ قوتیں جھک جائیں، وہ خلیفۃُ اللہ ہو گا!

کُل ملائکہ نے حکم کے عین مطابق کیا مگر ابلیس انکاری ہو گیا۔ دراصل قرآن کی رو سے ابلیس جنّات میں سے ہونے کا دعویٰ دار تھا، فرشتہ نہیں تھا، اس طرح بظاہر حکم سجدہ اس کے لئے ہونا ہی نہیں چاہیے۔ اس صورت میں اس کا انکار اور بعد میں سرزنش چہ معنی دارد؟ فرشتے 'وَھُمْ بِاَمْرِہٖ یَعْمَلُوْنَ' کے مصداق اللہ کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اصل میں ملائکہ، ملک کی جمع ہے، جس کے حقیقی معنی پوشیدہ قوت کے ہیں اور یہ پوشیدہ قوت دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ i۔ نوری ii۔ ناری۔ حدیثِ نبویؐ میں وارد ہے: اَلْجِنُّ جِسْمٌ نَارِیٌ یَتَشَکَّلُ بَاَشْکَالٍ مُخْتَلِفَۃٍ وَالْمَلَکُ جِسْمٌ نُوْرِیٌ یَتَشَکَّلُ بَاَشْکَالٍ مُخْتَلِفَۃٍ یعنی جنّات، ناری جسم رکھتے ہیں اور ملائکہ، جسم نوری کے حامل ہیں اور دونوں کو قدرت ہے کہ وہ اپنی شکلیں بدل سکتے ہیں۔ چونکہ قدرت اور قوت دونوں کو ملی ہے اسی لیے دونوں ملک کے ضمن میں آتے ہیں۔ جب اللہ نے زمین میں خلافت عطا کرنے کا ارادہ کیا اور یہ تجویز ملائکہ کے سامنے پیش کی تو انہوں نے جواباً عرض کی کہ ہم تیری بہتر تقدیس اور حمد و ثنا کرنے والے ہیں اگر بنانا ہی ہے تو خلیفہ ہمیں بنا دے۔ یہ مکالمہ ثابت کرتا ہے کہ وہ جانتے تھے خلیفہ کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ معنیٰ خلافت سے نا آشنا ہوتے تو خالق ان سے کبھی ایسی بات ہی نہ کرتا۔ کسی متکلم کی یہ بنیادی غلطی شمار ہو گی کہ وہ اس سے کلام کرے جو موضوع کے متعلق کچھ جانتا ہی نہ ہو۔ اللہ تو خود ان کا خالق ہے

Marfat.com

اور عَلِیمٌ خَبِیرٌ ہونے کے ناطے آگاہ تھا۔ چونکہ فرشتوں کا متمنّیٔ خلافت ہونا بھی نصِ قرآن سے ثابت ہے، لہذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ معنیٔ خلافت جانتے تھے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ملائکہ کے پاس اسبابِ دنیوی میں سے کسی قسم کے ہتھیار، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، بیت المال، افواج اور دولت کا تصور بھی نہیں، اس لیے ثابت ہوا کہ اللہ کی خلافت کوئی مادّی صفت نہیں ہو سکتی، بلکہ روحانی صفت ہے، اور نیابتِ خداوندی سے متصف ہے۔ جس طرح تمام کائنات کی قوتیں خداوندِ قدوس کے سامنے سرنگوں ہیں، اسی طرح وہ خلیفۃُ اللہ کو بھی سجدہ کرنے پر مجبور ہیں! اس شان کا حامل ہونے کے ناطے، اب خلیفۃُ اللہ جس کو بھی حکم دیگا، خواہ ارضی ہو یا سماوی ہو، اطاعت اس پر واجب ہوگی۔ یہ خلیفہ کی پہچان کا دوسرا اصول ہوا۔

ابلیس کے متعلق سورۃُ الاعراف آیت ۱۲ ہے: اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ۚ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ: یعنی میں آدم سے بہتر ہوں، میں نار سے بنایا گیا ہوں، بلندی کی طرف پرواز رکھتا ہوں جبکہ یہ مٹی کی تخلیق پستی سے متعلق ہے، اس لئے میں اسے ہرگز سجدہ نہ کروں گا۔ اس کی دلیل کہ میں ناری ہوں ترابی کو سجدہ نہ کروں گا، قرآن میں کہیں ردّ نہیں کی گئی بلکہ اسے صرف کہیں سے خارج ہونے کا حکم ملا اور پھر اُسی کی استدعا پر اسے وقتِ معلوم تک کی مہلت بھی دے دی گئی۔ کیا مقہور کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟ کیا مجرم کو اس کے کہنے سے کھلی چھٹی مل جاتی ہے؟ ابلیس نے دراصل عدلِ خداوندی اور قدرِ خداوندی کا انکار کیا تھا، جس کی بنیاد پر، وہ رجیم ہوا۔ کُلُّھُمْ مَلٰٓئِکَہ میں ملک الموت عزرائیلؑ بھی شامل ہے اور سجدہ ریز ہونے کے بعد اس پر بھی اطاعتِ خلیفۃُ اللہ واجب ہے۔ خلیفہ کی پہچان کا یہ تیسرا اصول سامنے آیا کہ جو ملک الموت پر بھی دسترس رکھتا ہو گا، اور اس خصوصیت کی وجہ سے مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کرنے پر مختار ہو گا!

Marfat.com

جن و انس دونوں امت حضورؐ ہیں، جن میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی موجود ہیں۔ قرآن سے ثابت ہے جنات آپ کے پاس قرآن پڑھنے آتے اور محظوظ ہوتے تھے۔ سورۃ الذّٰریٰت آیت ۵۶ میں ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ: یعنی جن و انس کی تخلیق صرف عبادت کے لئے کی گئی ہے۔ جنگِ تبوک سے واپسی پر بیر العلم (علم کا کنواں) پر جب صحابہؓ پانی بھرنے کی کوشش کرتے تو ناگہاں ان کا پانی بھرا برتن الٹ جاتا۔ جب بہت سے صحابہؓ بے بس ہوگئے تو حضورؐ کی خدمت میں شکایت پیش کی گئی۔ آپؐ نے معاملہ کی نوعیت کو بھانپتے ہوئے مولا علیؑ کی طرف التفات فرمایا۔ علیؑ، ذوالفقار ہمراہ لے کر کنویں پر پہنچے اور پانی بھرنے کے بعد بآوازِ بلند فرمایا 'ابن ابی طالبؑ پانی لیجارہا ہے اگر کسی کی مجال ہے تو سامنے آئے'۔ پھر تمام صحابہؓ نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ علیؑ تلوار چلارہے ہیں مگر مدمقابل نظر نہیں آتا۔ صحابہؓ حیران ہورہے تھے۔ یہ جنات سے جنگ تھی۔ ثابت ہوا جو کسی کو نظر نہ آئے، وہ ولی اللہ اور خلیفۃُ اللہ کو نظر آتا ہے۔ یہ چوتھا اصول کہلائے گا۔

ملائکہ پر آدم کی فضیلت ازروئے قرآن مستند ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آدم کو اسماء کلھا کی تعلیم عطا ہوئی تھی۔ فرشتے شاید اسماء سے واقف ہوں، مگر جب ان کی شناخت کا وقت آیا تو بے بس ہوگئے۔ ایک ہوتا ہے اسم، ایک ہوتا ہے وہ جس کا اسم ہو، یہ دونوں متفرق ہیں۔ اصل سوال اسم اور مسمّیٰ کی مطابقت کا تھا۔ ناموں کی یاداشت بنیادی بات نہیں بلکہ اسماء مبارکہ کو ہستیوں کے مطابق کروانا مقصود تھا۔ چونکہ آدم نے مطابق کے مطابق کر دکھائے اسی لئے تمام ملائکہ، آدم کے لئے سجدہ ریز ہوگئے۔ تب تک توحید، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، جہاد وغیرہ کسی بات کا تذکرہ نہیں تھا۔ اس وقت صرف عالین ہستیوں کی اسماء کے مطابق شناخت ہی آدم کے مسجود اور خلیفۂ کائنات ہونے کی بنیاد بنتی ہے۔ یہ ہستیاں اور ان کے اسماء مبارکہ، اللہ کے ہاں اتنے ہی محترم و عزیز ہیں کہ جو کوئی ان کا عارف ہو جائے اس کے سامنے کُل قوتیں جھک جاتی ہیں۔ ان اسماء کے تعارف اور مطابقت کا صلہ آدم کو

Marfat.com

پہلے جنّت کی شکل میں ملتا ہے اور بعد میں بحیثیت خلیفۃُ اللہ اس کا تقرر زمین میں ہوا۔ آدمؑ کے علاوہ، داوٗدؑ کو بھی سورۃُ ص آیت ۲۶ میں خلیفۃُ اللہ کہا گیا ہے: یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ:

۲۷۔ معرفت

'ہم نے خدا کی عظمت کو نہ پہچانا تو اس کی معرفت کا کچھ حق ادا نہ کیا' کتاب (قرآن) صرف ان کے لیے کافی ہے جو اس کے ازلی عالم ہیں اور اللہ نے خود، علم کے بعد انہیں اپنی مشیّت عطا کی۔ امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں: نَحْنُ مَشِیَّتُ اللہِ وَ نَحْنُ اَرَادَۃُ اللہِ یعنی ہم ہی اللہ کی مشیت و ارادہ ہیں۔ یہ الفاظ صرف وہی کہہ سکتا ہے جس سے پہلے کوئی مخلوق اور شے نہ ہو اور جب کوئی مخلوق اور شے ہے ہی نہیں تو اس اوّل کی تخلیق کسی شے سے نہ ہو سکے گی۔ پس جو اوّل ہو گا وہ مشیّت ہو گی، ارادہ ہو گا۔ سورۃ یٰسین آیت ۸۲ میں ہے: اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ یعنی جب اس کا امر، ارادہ کرتا ہے کسی شے کو بنانے کا تو کہتا ہے کُن (ہو جا)، فیکون (پس ہو جاتا ہے)۔ معلوم ہوا کُن سے شے بنتی ہے، شے بنانے کے لیے ارادہ ہوتا ہے، اور ارادہ اس کے امر کے تابع ہوتا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ اس کا امر اور ارادہ ہی اوّل ہیں، جن کے ہونے میں کوئی وقت نہیں لگتا، جبکہ باقی تمام ناسوتی مخلوقات اسی شے سے ایک خاص عمل کے تحت درجہ بدرجہ گوشت، کھال، پٹھے، ہڈی، ریشے وغیرہ کی شکل میں معرضِ وجود میں آئے۔ اس عمل کے لئے فطری طور پر محسوس وقت درکار ہوتا ہے۔

سورۃُ القصص آیت ۸۸ میں ہے: کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ: یعنی ہر شے ہلاک ہونے والی ہے مگر اس کی وجہ۔ تو جو کُن سے بنے وہ بھی ہلاک، جو خلق سے بنے وہ بھی ہلاک۔ جو شے خلق ہوتی ہے وہ سورۃ

Marfat.com

الرحمٰن آیت ۲۶ کے زمرہ میں آتی ہے: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ: یعنی سب کچھ فانی ہے مگر ساتھ ہی آیت ۲۷ میں فرمایا: وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ: یعنی تیرے ربِّ ذوالجلال والاکرام کا 'وجہ' باقی رہے گا۔ معاذاللہ اس آیت کا یہ مفہوم نہ لینا چاہیے کہ اللہ ربُّ العزت کے پاؤں، ہاتھ، شکم اور دھڑ وغیرہ ہلاک ہونے والے ہیں مگر اس کا صرف چہرہ (وجہ) باقی رہ جائے گا۔ اس طرح اللہ کا بدن، مانندِ بدنِ آدم مقرر ہو جائے گا۔ دراصل وجہ (چہرہ) سے کسی کی پہچان ہوتی ہے اور اس سے صاحب وجہ کی معرفت ملتی ہے۔ چونکہ اللہ ربُّ العزت کا جسم و چہرہ مقرر کرنا کفر ہے تو اس آیت بالا کے مصداق یقیناً کچھ چہرے ہونگے جو اسکی پہچان و معرفت کا باعث ہونگے۔ حقیقت میں اس کا مفہوم اس طرح بنے گا کہ جن (چہروں) سے خدا پہچانا جائے وہ موت کا ذائقہ کبھی نہ چکھیں گے۔

غور طلب ہے کہ جن کے چہرے معرفتِ خداوندی کا ذریعہ ہیں اور قرآن انہیں وجہُ اللہ سے تعبیر کرتا ہے، وہ کیسے بنے؟ یہ نہ امرِ کن سے بنے، نہ شے سے خلق ہوئے بلکہ مشیتِ الٰہی سے بنے، اس لیے شے نہیں، لاشئ، ہیں۔ سورۃ النمل آیت ۸۷ میں وارد ہے: وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ: یعنی صور پھونکنے کے بعد زمین و آسمان میں جو کچھ ہے ہلاک ہو جائیگا مگر وہ نہیں جو مشیت سے ہیں۔ سورۃ زمر آیت ۶۸ کے مطابق دوبارہ صور پھونکا جائے گا: ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى: تو جس نے پہلا صور پھونکا تھا، یعنی اسرافیل، وہ بھی ہلاک ہو جائیگا۔ پھر سورۃ المومن آیت ۱۶ کے مصداق ایک آواز آئیگی: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ: یعنی آج کس کی بادشاہی ہے؟" تو جواب دینے والا جواب دیگا: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ: یعنی اللہ واحد قہار کی بادشاہی ہے۔ سوال ابھرتا ہے کہ وہ دوسرا صور کون پھونکے گا؟ پھر یہ سوال و جواب کون کریں گے؟ علم توحید کی روشنی میں، ہم جانتے ہیں کہ اللہ پاک کی ذاتِ گرامی سے کچھ برآمد نہیں ہو سکتا، بولنا تو ایک طرف، فعل وغیرہ بھی اس

Marfat.com

کے لیے روا نہیں، لہذا ماننا پڑے گا کہ یہ کچھ ہستیاں ہیں جو دوسرے صور کے بعد بھی قائم رہیں گی اور سوال و جواب کا مکالمہ وہی کریں گی۔ یہ اکیلا کوئی ایک نہیں ہو سکتا بلکہ ان میں ایک متکلم ہے اور دوسرا مخاطب۔ پھر ان کو سورۂ ق آیت ۲۴ کے مطابق وحی ہو گی: اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ: یعنی تم دونوں ہر منکر کو جہنم میں ڈال دو۔ اَلْقِيَا صیغہ تثنیہ ہے جو دو کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہستیاں وہ ہیں جو مشیّت و ارادہ سے بنی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مشیّت و ارادۂ الٰہی، دونوں کے لئے فنا روا نہیں۔ باقی تمام چیزیں (اشیاء) فنا ہو جائیں گی۔

یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ معرفتِ خداوندی کا پہلا سبب لاشَیٔ بنا۔ چونکہ اُس سے قبل کچھ بھی نہیں ہے، یعنی کوئی نمونہ ہے ہی نہیں، اس لئے ثابت ہوا کہ وہ اوّل بغیر کسی نمونہ کے بنا۔ سورۃ الاحزاب آیت ۲۱ میں قرآن فرمارہا ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ: یعنی تم سب کے لیے رسول اللہ بہترین نمونہ ہیں اور اوّل ہونے کی وجہ سے ان کے لیے کسی نمونہ کا ہونا ممکن نہیں۔ رسولؐ کا اسوۂ حسنہ بھی کُل عالمین کے لیے نمونہ اور اجزائے رحمۃ اللعالمینؐ بھی کائنات کے لیے نمونہ ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس اوّل نے معرفتِ خداوندی کیسے حاصل کی؟ معرفت کا ذریعہ ہمیشہ علم ہوتا ہے جبکہ معرفت وہ علم ہے جو حسیات کے ذریعے شخصیات کے بارے میں حاصل ہو۔ حسیّات سے حاصل ہونے والی معرفت کے لیے ظاہر میں کچھ ہونا چاہیے یعنی معرفت نمونوں پر موقوف ہے۔ اوّل کے لیے تو کوئی نمونہ موجود ہی نہیں، اُس کی معرفت کا سبب کیا ہو گا؟ ہمیشہ معلول سے علّت، مصنوع سے صانع، مخلوق سے خالق اور اثر سے موثر کو پہچانا جاتا ہے، یہ کائنات کی فطرت ہے۔ مگر کائنات میں ہونے والے اوّل کی یہ فطرت نہیں کیونکہ اُس کے لیے معلول، مصنوع، مخلوق اور اثر ہے ہی نہیں۔ 'شے' سے بنی مخلوقات نے اللہ کو نہیں دیکھا مگر اس کو موجودات کے ذریعے سے پہچان سکتے ہیں۔ ہم سے قبل ارض و سماء، شمس و قمر، بحر و بر، آب و ہوا موجود تھی، اس سے خالق کو پہچاننا آسان ہوا۔

Marfat.com

لیکن اول کے سامنے ایسا کچھ نہیں، پھر اس نے معرفت کیسے حاصل کی؟ ماننا پڑیگا کہ اول ہونے کی وجہ سے وہ کائنات میں کسی معلول و مصنوع کی مدد کا محتاج نہیں۔ چونکہ اس کی تخلیق سے قبل اس کا کوئی غیر موجود ہی نہیں، اس لیے جو اول ہے، چونکہ غیر اللہ ہے ہی نہیں، اس لئے اللہ ہی اللہ ہے!

حدیث میں مروی ہے کہ اللہ نے ہمیں اپنی معرفت اپنی ہی ذات کے ذریعے کروائی۔ امام زین العابدینؑ کا بھی قول ہے کہ اے مالک میں نے تجھے، تجھ ہی سے پہچانا اور اپنی ذات کے لیے تو نے خود ہی میری راہنمائی فرمائی۔ یہ صرف محمدؐ و آلِ محمدؐ کا امتیاز ہے! امام رضاؑ نے توحید الٰہی کے متعلق فرمایا۔ 'اللہ وہ ذات ہے جس نے کیفیتوں کو پیدا کیا' مثلاً راضی ہونا اور ناراضگی، خوشی اور غمی، محبت و نفرت وغیرہ، کیفیات ہیں۔ کیفیت بنتی ہے مزاج سے، مزاج بنتا ہے طبیعت سے اور طبیعت، نفس سے متعلق ہے۔ چونکہ ذاتِ الٰہی نفس سے مبرا ہے تو اس میں نہ طبیعت ہوگی نہ مزاج اور نہ ہی کیفیت۔ اس صورت میں اس کی رضامندی اور ناراضگی کے کیا معنی ہوئے؟ یقیناً اسی مقصد کے لیے باری تعالیٰ نے 'وَجْهُ اللهِ' بنایا یعنی ذاتِ محمدؐ۔ اب وجہُ اللہ کو دیکھ لیں، اگر وہ راضی ہے تو یقیناً اللہ بھی راضی ہے اور اگر انؐ کے چہرہ پر ناراضگی کے آثار نمایاں ہیں تو لامحالہ اللہ بھی ناراض ہے۔ حضورؐ خود فرماتے ہیں: نَحْنُ وَجْهُ اللهِ: یعنی ہم (محمدؐ و آل محمدؐ) اللہ کی وجہ ہیں۔ ان کے متعلق کیونکر یہ جسارت ہو سکتی ہے کہ معاذ اللہ وہ ہم جیسے بشر ہیں۔ دراصل یہ کسی معیار کی بنیاد پر محمدؐ و آل محمدؐ کی فضیلت و امتیاز ہے اور وہ معیار، تقرب خدا ہے۔ چونکہ ذات باری، لامکاں و لازماں ہے اس لیے اُس سے تقرب مکانی و زمانی کا تصور بھی عبث ہے، حالانکہ ہر زماں، ہر مکاں، بلکہ ہر ذرہ میں اسی کا جلوہ ہے۔ گو حقیقت الفاظ سے وابستہ نہیں ہے لیکن اپنے مقام کو پہچاننے والا ہمیشہ اپنے سے بالاتر کو معبود بنائے گا اور بالیقین مالک و خالق کُل کائنات کے علاوہ کسی کو ہرگز نہ مانے گا۔ علیؑ کا فرمان ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ: اس کا بھی مفہوم یہی ہے کہ اگر آدم زاد سمجھ لے کہ وہ کون ہے تو یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ سچا مالک

Marfat.com

کون ہے ؟یعنی خود شناسی، خداشناسی کا ذریعہ ہے۔ سورۂ حم سجدہ آیت ۵۳ دلالت کرتی ہے: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ : یعنی ہم اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کے نفوس میں دکھاتے ہیں۔ معلوم ہوا خداشناسی کی منزل میں سالک جو مقصد کُل کائنات کے مشاہدہ سے حاصل کر سکتا ہے وہ اسے خود اپنے مشاہدہ سے بھی میّسر آسکتا ہے۔ آفاق میں موجود تمام دلیلیں حسیّات کی محتاج ہیں۔ اگر حسیّات میں کمی بیشی ہو تو عرفان سے محرومی کا امکان رہ جاتا ہے اس لئے خدا نے اپنی حجت برقرار رکھی، اور ایسی دلیل قائم کی جس کے لیے حسیّات کی ضرورت نہ ہو۔ ہر فرد کا وجود خود اس کے لئے دلیل ہے۔ کائنات میں موجود آیاتِ الٰہی تو مخلوقات سے پردے میں رہ سکتی ہیں مگر سب سے اہم نشانی یعنی اس کا نفس، تو اس کے پاس ہر وقت موجود ہے۔

روایت ہے ایک عابد کسی سرسبز و شاداب جزیرہ میں دن رات شغلِ عبادت میں رہا کرتا تھا۔ فرشتے اسے عبادت میں مشغول دیکھتے، تو رشک کرتے۔ حتٰی کہ ان کے خیال میں اس وقت کائنات کے تمام جن و انس سے زیادہ قرب اسی شخص کو میّسر تھا۔ ایک فرشتہ نے بارگاہِ ایزدی میں درخواست کی۔ قبولیت پر جب اس کے ثواب پر نظر ڈالی تو بہت حقیر نکلا۔ عرض کرنے لگا کہ مالک اس کی عبادت اتنی زیادہ اور ثواب اتنا قلیل؟ حکم ہوا، جاؤ کچھ دن اس کے ساتھ گزارو، تمہیں خود بخود معلوم ہو جائیگا۔ وہ فرشتہ بھی شکلِ آدم میں اس کا رفیقِ عبادت ہوا۔ چند دنوں بعد جب دونوں کی آپس میں بے تکلفی ہوئی تو فرشتہ نے اس عابد سے کہا کہ میں تمہارے مقامِ عبادت کو نہایت موزوں پاتا ہوں، جہاں سرسبز و شاداب قطعہ، ٹھنڈی ہوائیں اور معطّر فضا ہے۔ عابد نے جواباً کہا، مَیں اکثر سوچتا ہوں، پیدا کرنے والے نے یہاں اتنا سبزہ فضول پیدا کیا، یہ بے وجہ برباد ہوتا رہتا ہے، یہاں کچھ جانور ہوتے تو انہیں کم از کم اچھی خوراک ہی ملتی رہتی۔ ایسے بے معرفت جواب سے فرشتہ نے جانا، کہ چونکہ بے عقلی میں عبادت کرتا ہے تبھی اجر اتنا کم تھا۔ اصل معیار، مقدارِ عبادت نہیں بلکہ پس پردہ محرکات، عبادت

Marfat.com

میں وزن کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر رسولؐ، ایک پلڑے میں ضربت کو اور دوسرے پلڑے میں عبادتِ ثقلین کو رکھ کر، ضربت کو اولیٰ قرار دیں تو اچنبھا نہیں۔ اسی طرح ایک پلڑے میں اگر آفاق ہو اور دوسرے میں اپنا نفس، تو نفس کی اہمیت بھی سمجھ میں آتی ہے۔ نفس تو کُل کائنات کا قائم مقام و جانشین ہے!

ایک قابلِ ذکر پہلو اور ہے کہ جاننا اور پہچاننا دو مختلف باتیں ہیں۔ کسی مصنف کی کتاب پڑھ کر آپ اسے صرف جاننے کا دعویٰ کرسکتے ہونگے، پہچاننے کے لیے اسے ملنا، یا اسکی تصویر دیکھنا ضروری ہوگا۔ جس طرح نقش سے نقاش کو جانا جاتا ہے، تصویر سے مصور کو اور تصنیف سے مصنف کو، اسی طرح کائنات، خالق کو جاننے کا ذریعہ ہے جبکہ نفسِ آدم اس کی پہچان کا وسیلہ ہے۔ نفس، وجود کے کُل میں ہے، کسی ایک جزوِ بدن میں مقید نہیں۔ جیسے خالق غیر منقسم ہے، اسی طرح کسی ایک جزو کے کاٹنے سے نفس بھی تقسیم نہ ہوگا۔ نفس ہر ذرہ اور عضو میں موجود بھی ہے اور ذرات اور اعضاء کے ضائع ہونے سے کم بھی نہیں ہوتا۔ یہی تو امکانی دائرہ میں لامکان ہونے کا نقشہ ہے! اسی بنیاد پر اس ممکن نمونہ سے وہ واجب نمونہ پہچانا جاسکتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہ شرق، غرب، حجاز و عراق یا دائیں اور بائیں میں منقسم ہے تو بھی غلط، مکۂ مکرمہ یا مدینۂ منورہ میں محدود کریں تو بھی ناجائز، یہ عالمِ امکان میں وجودِ لامکانی کا نقشہ ہی ہے، کہ پاؤں میں کانٹا چبھے یا ہاتھ میں سوئی، کہیں سر ٹکرائے یا ٹھوکر لگے، فوراً کُلیت کو خبر ہوجاتی ہے۔ کوئی مخبر اور قاصد نظر نہیں آتا اور نہ ہی اطلاع ہونے میں کسی عضو کی نزدیکی یا دوری کا کوئی معنی ہے۔ یہ عالمِ امکان میں حاضر و ناظر ہونے کے دلائل ہیں! جو تعلق نفس کو اس کائناتِ صغیر سے ہے، وہی تعلق خالق اور کائنات کا محسوس ہوتا ہے۔ خالق کو بھی مشرق و مغرب، تہِ زمین سے بالائے آسمان تک کی خبر ہے، وہاں بھی کوئی قاصد نظر نہیں آتا۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۹۸ کے

Marfat.com

مطابق: وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا: یعنی اس کا علم تمام کائنات پر محیط ہے۔یہی نمونہ، جسم میں، نفس پیش کرتا ہے۔اسی لیے یہ اس کی پہچان کا ذریعہ ہے!

اب اس کی عظمت کا کیا اندازہ لگا یا جا سکتا ہے، جسے رسالتمآبؐ خود اپنا نفس فرمائیں اور خالقِ کائنات وجہہ اللہ کہنے میں فخر کرے۔اِس بلند تر نفس کی معرفت ،یقیناً معرفتِ رسول خداؐ اور معرفت خدا کے قائم مقام ہو گی۔ چہرہ معرفت اور پہچان کی سب سے بڑی نشانی ہے اور اللہ کا چہرہ مقرر کرنا بے معنی بات ہے۔دراصل اُس اللہ کی معرفت کے سب سے افضل دلائل ،یعنی محمدؐ اور آلِ محمدؑ کے نفوسِ مطہر ،ہلاکت سے مستثنٰی ہیں، کیونکہ ذات نے در حقیقت انہیں وجہُ اللہ فرمایا ہے!

۲۸۔ عبادت

سورۂ الانعام آیت ۵۶ میں ہے:قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ:یعنی اے حبیبؐ آپ فرمادیں کہ مجھے سختی سے منع کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کی عبادت (پیروی) کروں جو اللہ کے سوا غیر کی عبادت کرتے ہیں (پکارتے ہیں)۔یہ وہ لوگ ہیں جن کی طلب، آس وامید اور ملجاوماوا، اللہ احد کے سوا، کوئی اور ہوتا ہے۔بلاشک قرآن کی ہر آیت کے مخاطب خود حضورؐ ہوئے ہیں مگر مرادِ تخاطب امّت ہوتی ہے۔ قُلْ سے شروع ہونے والی آیات بالخصوص صرف زبانِ اطہر سے ادا ہوتی ہیں،وگرنہ ان کا حکم امت ہی کے لیے ہوتا ہے۔رسالتمآبؐ فرما رہے ہیں کہ مجھے میرے پروردگار نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ میں ان لوگوں کی پیروی یا عبادت کروں، جو ذات احدیّت کے سوا کسی اور کو پکارتے ہیں۔یہ آیت ثابت کر رہی ہے کہ بنی آدم اس علّت میں مبتلا رہے ہیں اور دورِ نبویؐ میں بھی کچھ ایسے موجود تھے، جن کی یہ فطرت تھی۔ مشرکینِ مکہ،حاجت روائی کے لئے،اپنے سرداروں

Marfat.com

اور رئیسوں کی پیروی کرتے تھے اور کفار بھی اسی طرح کے عقائد کے حامل تھے۔ وہ ایک یکتا اللہ کو ماننے سے انکاری تھے اور یہی یقین رکھتے تھے کہ ہر حاجت کا حاجت روا، جدا ہے، حالانکہ جن بتوں کی وہ پوجا کیا کرتے، اسے ان کے آباو اجداد نے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہوتا تھا۔ شریعۂ اسلامی کے مطابق حقیقی عمل، عبادتِ خدا ہے۔ عبادت نہ رسول کی ہوتی ہے، نہ امام کی اور نہ کسی ولی کی ہو سکتی ہے۔ معبود، اللہ کے سوا اور کوئی نہیں اور مقصودِ عبادت، فقط اللہ ہے۔ اللہ جن کاموں کو نیک قرار دیتا ہے انہیں بجالانا اور دوسروں کو ترغیب دینا اور بد کاموں سے بچنا اور دوسروں کو بچنے کی تلقین کرنا صراط مستقیم ہے اور یہ اللہ کی عبادت ہے۔ جبکہ نیک کام سے رکنا اور دوسروں کو روکنا، اور بد کاموں کو کرنا، اور دوسروں کو ترغیب دینا، صراط مستقیم سے ہٹنا ہے اور یہ شیطان کی عبادت ہے۔

دورانِ نماز اگر اللہ کے غیر کا خیال آجائے تو وہ باطل ہو جاتی ہے۔ خود منشائے ایزدی بھی یہی ہے کہ اس وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ معبود ہونے میں اس کا کوئی شریک نہیں، وگرنہ موجود ہونے میں، زندہ ہونے میں، قدرت رکھنے میں، جزوی علم ہونے میں مخلوقات کی اس خالق سے کچھ نہ کچھ شراکت بنتی ہے۔ نماز کی ابتدا، اَللّٰہُ اَکْبَرُ سے ہوتی ہے، جس کا مطلب ہے کہ تمام بڑائیاں تیرے ہی لیے ہیں۔ پھر اس رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی حمد پڑھی جاتی ہے کہ تیرے اسماء، الرَّحْمٰنِ و الرَّحِیْمِ کے ساتھ میں اپنی کُل زندگی وابستہ کرتا ہوں۔ یَوْمِ الدِّیْنِ کا مالک تو ہی ہے۔ تیرے حضور التجا ہے کہ اپنے خصوصی کرم کے صدقے ہمیں صراطِ مستقیم کے لیے ان لوگوں کا راستہ ہدایت فرما، جن پر تیرا انعام ہوا۔ اچانک یہ 'لوگ'، نماز میں کہاں سے آگئے؟ 'غیر' کی بات یہیں تک نہیں رکتی۔ یہ حالتِ قیام تھی۔ جب اگلا مقام، قعدہ آیا تو پڑھا گیا: اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ: یہاں بھی اس کے ایک عبد کا ذکر آ گیا۔ ابھی بھی نماز کی تکمیل نہیں ہوئی۔ حکمِ الٰہی کے تحت درود پڑھنا لازم تھا کیونکہ درود کے بغیر نماز اللہ کو قبول ہی نہیں، جب تک درود کا پاسپورٹ نہ ہو، نماز ملکِ قبول تک پہنچ ہی نہیں

Marfat.com

سکتی۔ اور درود، رسالتمآبؐ اور ان کی آلؑ کے لئے ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ عبادت میں شریکِ خدا ہو گئے؟ اصل میں عبادت عشق کے بنا ایک خالی پیکر ہے اس لئے خود اللہ کو پسند ہے کہ عبادت میں عشق شامل ہو۔

یو۔پی کے شہر بنارس میں پنڈت تلسی داس گزرا ہے جو ہندوؤں کی مقدس کتاب رامائن کا خالق ہے۔ اس کی جوانی ایک آوارہ منش شخص کی حیثیت سے گزری۔ کسی دوشیزہ سے عشق کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ وارفتگی کے عالم میں ایک دن ملاقات کی غرض سے اس کے گھر کی چھت پر چڑھنا چاہتا تھا، دیکھ کر حیران ہوا کہ ایک کمند پہلے ہی سے ڈلی ہے۔ وہ سمجھا کہ شاید معشوق نے خود سے بندوبست کر رکھا ہے۔ اس کے سہارے جب چھت پر پہنچ گیا، تو اسے محسوس ہوا کہ جسے کمند جان کر اوپر چڑھ آیا ہوں، وہ ایک خوفناک سیاہ اژدھا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ اس اژدھا کی وجہ سے میری زندگی میں انقلاب آگیا اور مَیں حقیقت کو پہنچ گیا، کہ اگر فانی مخلوق سے عشق کی یہ تاثیر ہے کہ موذی اژدھا نقصان پہچانے کی بجائے میرا مددگار بن گیا، تو حقیقت سے عشق کیا رنگ لائے گا؟

بنی نوعِ آدم کو جب اللہ کی عبادت میں عشق کا رنگ بھرنے کی خواہش ہوتی ہے، تو ایک مشکل ضرور در پیش آتی ہے کہ اللہ کو کہاں تلاش کریں تاکہ حقِ عبادت ادا ہو سکے۔ امتِ مصطفویؐ بھی اس مخمصہ میں مبتلا ہو سکتی تھی مگر یہ مسئلہ ابو بکر صدیقؓ نے حل کر دیا۔ ان سے مروی ہے 'میں نے رسول کریمؐ سے سنا کہ علیؑ کا چہرہ دیکھنا عبادت ہے'۔ سورۃ آل عمران آیت ۴۹ میں وارد ہوا: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ: یعنی اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری (حضورؐ کی) اتباع کرو، اسی اتباع کی بنیاد پر اللہ خود تمہیں محبت کرے گا۔ وحی کے اس فرمان کو صادق کرنے کے لئے اللہ نے ازل سے ہی اس کا انتظام اس طرح کر دیا کہ اپنی منشا و ارادہ سے کچھ عالین ہستیاں 'خلق' کر دیں اور خود ہی انہیں عبادت میں اس طرح شامل کر لیا کہ عبادت تو اللہ کی ہو مگر عشق ان عالین ہستیوں سے

Marfat.com

کیا جائے۔ اس طرح عبادت میں روح عشق آ جائے گی اور عبادت کے 'سچی عبادت' ہونے کا بندوبست ہو جائے گا۔ گویا عبادتِ الٰہی کی روح اور اصل، صاحبانِ انعام، عِبَادَ اللّٰہِ الْمُخْلَصِیْنَ اور محمدؐ و آل محمدؐ کا عشق ہے۔ یہ دولت نہ کتابیں پڑھنے سے ملتی ہے، نہ ذکر اذکار سے میّسر آتی ہے۔ یہ سورۃ المائدہ آیت ۵۴ کے مصداق: فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ: یعنی اللہ کا خصوصی فضل ہے، جو اس کی چاہت کے تابع ہے۔ عشقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ وہ قیمتی جوہر ہے جو اللہ نے خاص عنایت اور فضل سے ہمیں نوازا ہے۔

رزق، زندگی یعنی موت و حیات، صحت اور اولاد وغیرہ ازل سے مقرر ہیں، اور ان میں تغیر و تبدّل ممکن نہیں، اس لئے ان کے لیے خدا سے عریض قسم کی دعائیں کرتے رہنا بھی عجب ہے۔ ہاتھ اٹھانا مقصود ہی ہوں تو فقط عشقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی طلب کے لئے ہونے چاہییں، تا کہ نماز سچی اور مقبول ہو جائے، عبادت درست اور حقیقی ہو جائے، بلکہ ہر عمل مستقیم ہو جائے! جب آپؐ مبعوث ہوئے، اس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے۔ ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کی معیت میں خانہ کعبہ کو استوار کر کے اس کی حدود وضع کیں۔ خانہ کعبہ، بیتُ العتیق کی مثل ہے جو جنّت کا قبلہ ہے۔ جب دونوں انبیاءؑ خانہ کعبہ کی حدود استوار فرما چکے، تو جاہل اہل زمانہ نے اس میں بت رکھ کر انہیں پوجنا شروع کر دیا۔ ابراہیمؑ نے اپنے پروردگار سے استدعا کی کہ تو خود خانہ کعبہ کی حفاظت فرما، تا کہ اس میں غیر کی شرکت وعبادت نہ ہو۔ حکم ہوا، ابراہیمؑ اس خانہ کو آپ نے اور اسماعیلؑ نے نہایت خلوص سے استوار کر کے اس کے قواعد بھی وضع کئے ہیں، اس لیے اس کی حفاظت آپ دونوں خود ہی کریں۔ بسیار کوشش کے باوجود جب ابراہیمؑ عاجز آ گئے تو اللہ نے اس خانہ کو کالے رنگ کی چادر تطہیر میں لپیٹنے کا حکم دیا۔ چادر تطہیر میں لپیٹتے ہی وہ بیتُ اللہ بھی بن گیا اور قبلہ بھی مقرر ہو گیا، حالانکہ بت اس میں اسی طرح موجود رہے۔

بنی آدم، اپنی جبلت کے، تحت ہمیشہ تین مظاہر فطرت یعنی سیارگان، درختوں اور آگ کی عمومی عبادت کرتے رہے ہیں۔ ابراہیمؑ نے امتحان دیکر ان کی نفی کی۔ سیارگان کے اتار چڑھاؤ سے بیزاری کا

Marfat.com

اظہار کرکے اپنی توجہ زمین و آسمان کے فاطر کی طرف مبذول کی۔ آگ میں جلنے کا خوف انہیں حق سے بے راہ نہ کر سکا اور اس استقامت کے صدقہ میں آگ، گل و گلزار بنا دی گئی۔ اس کڑی آزمائش میں کامیابی کا انعام، لِلنَّاسِ اِمَامًا بنا کر دیا گیا یعنی آپ اللہ کی طرف سے عوام النّاس کے سب سے پہلے امام مقرر ہوئے۔ اس عظیم نعمت کے باوجود ان کی دلی تشفی نہ ہوئی کیونکہ بیتُ اللہ میں موجود بت، انہیں ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ امید و یاس میں پروردگار کو التجا کی، کہ بیتُ اللہ کو بتوں سے پاک کرنے کی تیری منشاء میرے علم میں ہے اور میں جانتا ہوں یہ کام بھی امامت ہی کا ہے۔ اگر یہ میرے نصیب میں نہیں، تو سلسلۂ امامت میری ہی ذریت میں کر دے۔ جیسے بیتُ اللہ میرے ہاتھوں میں استوار ہوا، ویسے اہلِ بیتؑ بھی میری ہی جد میں کر دے۔ اہلِ تطہیر ہونے کے ناطے، بیتُ اللہ کی تطہیر انہی کے ہاتھوں ہو، کیونکہ نجاست ان سے یوں دور ہو گی جیسے دور ہونے کا حق ہے! دعائے ابراہیمیؑ بہر طور مقبول ہوئی۔ اولادِ ابراہیمؑ میں سے امام علیؑ نے نبی آخر الزماںؐ کے کندھوں پر سوار ہو کر ان تمام بتوں کو مسمار کیا، جو ساڑھے چار ہزار (۴۵۰۰) برس بیت اللہ میں موجود رہے۔ ان کی بد قسمتی ملاحظہ ہو کہ اتنا طویل عرصہ بیتُ اللہ میں معبود بن کر جاگزیں رہے، مگر جب مسمار کیے گئے، کم بخت، بت کے بت ہی تھے۔ یہاں یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ اچھے لوگوں کی مجلس میں دراز مدت تک بیٹھنا، اس بات کا غماز نہیں کہ اصلیت بدل جائے گی، ازلی بت، ابد تک بت ہی رہتے ہیں۔

بالا آیت کے مطابق کچھ لوگوں کی عبادت ہو سکتی ہے، تبھی رسالتمآبؐ کو فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کی عبادت ہرگز نہ کریں جو اللہ کے سوا کسی کو پکارتے ہیں مگر بین السطور، یہ عندیہ ہے کہ ان لوگوں کی عبادت ضرور کریں جو صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔ یہ وہ انعام یافتگان ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا حتٰی کہ تمام حیات اللہ ہی کے لیے مختص ہے اور جن کی زبانیں لِسَانُ اللّٰہ، ہاتھ یَدُ اللّٰہ اور آنکھیں عَیْنُ اللّٰہ ہیں۔ تمام دنیا کی اقوام بشمول خطۂ عرب میں بادشاہوں، رئیسوں اور سرداروں

Marfat.com

کی تعظیم بشکل پوجا اس طرح کی جاتی تھی کہ ان کے بت عبادت خانوں میں موجود تھے اور حاجت روا مانے جاتے تھے۔ سورۃ الانعام آیت ۵۷ بتا رہی ہے: قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ: یعنی اے محبوبؐ آپ فرمائیں میں تو ہرگز ان کی خواہشوں کی پیروی نہیں کرتا، اگر ایسا ہوا تو میں گمراہ ہو کر راہ ہدایت سے بھٹک جاؤں گا۔ مراد یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں کی عبادت کرنے سے منع فرمایا گیا ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہیں، جن کی زندگی کا مقصد طلب جاہ و دولت، طلب حسن و ازواج و اولاد، اور طلب جائیداد و متاع زیست و نمود ہے اور وہ ہر دم اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے سرگرداں ہیں۔ یہ لازم ہے کہ جو اپنی خواہشات کا غلام ہو، وہ کبھی بھی مالک کا سچا فرمانبردار نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں بین السطور یہ نکتہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس نے تمام عمر کبھی اپنے نفس کا حکم نہ مانا ہو، کبھی اپنی خواہشات کی اتباع نہ کی ہو، بلکہ اس کی اپنی خواہش ہی کوئی نہ ہو اور اس کا ہر عمل فرمان الٰہی کا تابع ہو تو ایسے شخص کی اتباع و پیروی و عبادت فرض حد تک جائز ہو گی۔ علیؓ جن کی تلوار سے عرب کے ہر گھرانے کا کوئی نہ کوئی شخص ضرور قتل ہوا تھا، اس شخص سے ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو گئے، جس نے مبارزت میں آپ کے رخسار مبارک پر تھوک دیا تھا۔ وہ شخص بڑا حیران ہوا کہ میں تو اس مقابلہ میں زمین پر بے بس گر چکا تھا اور ایک آن واحد میں جہنم واصل ہوا ہی چاہتا تھا، تھوکنے سے علیؓ کا غصہ، بڑھنے کی بجائے ایک دم ٹھنڈا کیونکر ہو گیا؟ وہ علیؓ جو برق کی کڑک کی طرح دشمن الٰہی پر جھپٹتے ہیں، كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ کے مصداق سر اڑا دیتے ہیں، انہوں نے مجھے کیوں قتل نہ کیا؟ ذرا سنبھلا تو پوچھنے لگا، اے ابن ابی طالب، میں گر چکا تھا آپ کی آخری ضرب مجھے موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی لیکن جب میں نے آپ کے منہ پر تھوک دیا تو مزید غصہ ہونے کی بجائے مجھے چھوڑ کر جدا کیوں ہو گئے ہیں؟ بلکہ مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ میرے بچے یتیم نہ ہوں گے۔ علیؓ نے فرمایا" اے فلانے میں تجھ سے اور تیرے جیسے دوسرے لوگوں سے ذاتی خواہش یا منفعت ولالچ کے تحت

Marfat.com

جنگ نہیں کرتا بلکہ مَیں تو محض حکمِ الٰہی اور فقط رضائے ربّی کے لیے تم سے برسرِپیکار ہوں۔ اب جبکہ تم نے میرے منہ پر تھوک دیا، تو میرا نفس بیچ میں شامل ہو گیا۔ مَیں نے تجھ سے ہاتھ اسی لیے کھینچ لیا ہے کہ مبادا تیرا قتل میرے نفس کی خواہش کے تابع ہو جائے۔ تمام عمر میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مَیں ہوائے نفس کے لیے جہاد کرتا، میرا جہاد فی سبیل اللہ ہی ہے اور آخری سانس تک رہے گا۔ ایسے ہی لوگوں کی عبادت کرنا، نصِ قرآن سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے ابو بکرؓ صدیق سے مروی ہے، کہ میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے، علیؑ کا چہرہ دیکھنا عبادت ہے۔ اَلْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ، اَلْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ اور عَلِیٌّ حَکِیْمٌ نے، علی کو، علیؑ بنایا ہے اور اسی بنیاد پر اَلْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ کی طرح علی المرتضٰی کی اطاعت بھی بر حق فرض ہے۔

سورۃُ النساء آیت ۸۰ میں اس امر کا اظہار اس طرح فرمایا جارہا ہے کہ: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ: یعنی جس نے حضورؐ کی اتباع واطاعت وبندگی کی اس نے اللہ کی بندگی واطاعت کا حق ادا کر دیا۔

دوسری جگہ سورۃُ النساء آیت ۵۹ میں فرمایا گیا: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ: یعنی معصومین وعالینؑ کی اطاعت کو درجۂ اطاعتِ رسولؐ قرار دیا گیا، جبکہ درجۂ اطاعتِ رسولؐ تو ہے ہی اطاعتِ خداوندی۔ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کی اطاعت، منجملہ بنی نوع آدم کے لیے ہے اس لئے اور آسانی ہوگئی کہ معصومین وعالینؑ کا عرفان ومحبت وعبادت ہی، بالواسطہ طور پر عرفان ومحبت وعبادتِ الٰہی ہو گا۔ حالانکہ محبت کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ بلاواسطہ نظر آتا ہے، کیونکہ محبت کی آنکھ سے دیکھنا سب جمع ہوتا ہے۔ اس کی دلیل میں حافظ سائیںؒ نے ایک مصدق واقعہ بیان فرمایا۔ حضورؐ ادائیگی نماز فرمارہے ہیں، صحابہ کرامؓ اقتدا میں ہیں، جوں ہی بارگاہِ ربُّ العزت میں سجدہ ریز ہوتے ہیں، ۴ سالہ حسینؑ تشریف لائے اور ناناپاک کے دوش اطہر مبارک پر جلوہ افروز ہو گئے۔ ہیں بھی معصوم، عمر بھی معصومیت والی،

Marfat.com

دو آتشہ کام تھا۔ نبی آخر الزمان اُس وقت سجدہ میں حمد و سبحانِ الٰہی میں مصروف تھے۔ شرعی نقطہ نظر سے آپؐ کو تین مرتبہ :سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى: پڑھ کر سجدہ سے سر اٹھالینا چاہیے تھا لیکن خیالِ پروردگار کی بجائے خیالِ حسینؑ میں محو ہو گئے۔ یہ سوچ کر سجدہ سے ہر گز سر نہ اٹھایا کہ مبادا حسینؑ کو گزند پہنچے۔ غور طلب ہے، عبادت اور نماز میں غیر کا خیال عبادت و نماز کو باطل کر دیتا ہے اور سجدہ میں غیر کا خیال سجدہ کو باطل کر دیتا ہے مگر حضورؐ سجدہ کی حالت میں، اپنے دوش پر سوار حسینؑ کے خیال میں ہیں۔ اسی حال اور خیال میں سجدہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور آپؐ نے ۷۲ مرتبہ تسبیح پڑھ لی۔ کئی صحابہ نے اس دوران سجدہ سے سر اٹھا کر دیکھا کہ کہیں، معاذ اللہ، "محمدؐ" فوت تو نہیں ہو گئے، سجدہ سے سر کیوں نہیں اٹھا رہے؟

صحابہؓ کی نظر حضورؐ پر ہے، حضورؐ کی نظر وحی پر ہے، وحی کی نظر جبرائیلؑ پر ہے، جبرائیلؑ فرمان ایزدی کا منتظر ہے، اور اللہ عزوجل کی نظر مرکوز ہے حسین ابن علیؑ پر۔ وہ منتظر ہے کہ کب حسینؑ اپنی مرضی سے دوش مبارک سے نیچے اتریں تاکہ حکم بھیج سکوں کہ اے محمدؐ سر اٹھالیں۔ گو آپؐ کے پیش نظر غیر کا خیال ہے مگر آپؐ کی نماز باطل نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ فخر موجودات، شرف الانبیاء کی نماز باطل ہوتی بلکہ نماز تو ان کی بھی قبول ہو گئی جو اقتداء میں یہ نظارہ دیکھ رہے تھے۔ معلوم ہوا نماز، عبادت اور سجدہ میں حسینؑ کا خیال ہو جائے، تو نماز، عبادت اور سجدہ کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ حسینؑ غیر نہیں بلکہ وہ معصوم اور عالی ہیں جنہیں اس نے خود اپنی صفت پر پیدا کیا ہے۔ یہ کن فکاں کے راز داں ہیں۔

کسی بھی عمل، قول اور عقل کی روح، دلی لگاؤ ہے۔ زبان سے نکلی کان تک پہنچتی ہے اور دل سے نکلی براہ راست دل کی گہرائی تک۔ عشق کے فقط ایک سجدہ کا بوجھ بھی زمین برداشت کرنے سے قاصر ہے۔ یوم عاشور کربلا میں، ظہر کے وقت، سعیدؓ ابن مسیب، نوے سالہ صحابی رسولؐ عرض کرتے ہیں، اے امام (حسینؑ) چاہتا ہوں کہ زندگی کی آخری نماز آپ کی اقتدا میں پیش کروں۔ شاید دنیا کی یہ

Marfat.com

بہترین تمنّا تھی۔ نماز شروع ہوئی تو مخالف فوج کی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر سعیدؒ نے نیتِ نماز چھوڑ کر، امام عالی وقارؑ کے آگے اپنے بوڑھے جسم کی ڈھال کھڑی کردی، اور ہاتھ باندھ کر عرض کی، آپ اپنی نماز جاری رکھیں، دشمن کی طرف سے برسنے والے تیروں کو میرا جسم روک لے گا۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں 'نماز عاشقاں ترکِ وجود است'۔

تکمیل نماز پر جب سلام پھیرا گیا تو بوڑھے اور ضعیف سعیدؓ، امامؑ کی گود میں گر گئے۔ پسلیوں میں ان گنت تیر پیوست تھے، موت کا پسینہ ماتھے پر تھا۔ جان کنی کی اس حالت کے باوجود اپنی کُل طاقت مجتمع کر کے عرض کی اے ابنِ رسول، کیا میری نماز بھی ہوگئی؟ کیا آپؑ مجھ عاجز سے راضی ہیں؟ امامؑ نے جواب میں تاریخی فقرہ ارشاد فرمایا: اَنْتَ اِمَامِیْ فِی الْجَنَّۃُ یعنی سعیدؓ، آپ جنّت میں مجھ سے قبل داخل ہونگے۔ یہ 'عبادت' کی ایک اولیٰ مثال ہے۔!

۲۹۔ محبت / موّدۃ

دین حقیقت میں فطرت ہے اور اس کا ماحصل محبت ہے جو، ہر شے کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اور اس کا انقطاع نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ دراصل غرضِ خلقت ہی محبت ہے گو خالق، ظاہرہ طور پر غرضِ خلقت، عبادت کو کہتا ہے۔ ایک حکم ہوتا ہے ایک اس کی تعمیل جس میں حکم کی غرض چھپی ہوتی ہے۔ ایک بچہ کو پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے، تعمیل کرنے پر اس کی غرض یعنی حصول علم پوری ہوتی ہے ۔ اسی طرح تعمیل عبادت کی ایک غرض تو خوشنودیٔ خداوندی ہو سکتی ہے لیکن حقیقی غرض، محبت نکلے گی۔ ابلیس کا انکارِ سجدہ آدم، انکارِ وحدانیت و انکارِ عبادتِ خدا نہیں تھا، مگر اللہ نے فرمایا، مجھے تیری اس عبادت کی ضرورت نہیں، تجھے تعمیلِ حکم کی غرض سے کام ہونا چاہیے تھا۔ ابلیس کا انکار دلیل ہے کہ وہ عابد و موحد تو ہو سکتا ہے، مگر اللہ کی سچی محبت نہیں رکھتا۔ محبت میں اختیار باطل

Marfat.com

ہوتا ہے جبکہ وہ رجیم کہلایا ہی اپنا اختیار استعمال کرنے کی بنیاد پر تھا۔ اللہ کے نزدیک عبادت کی اصل غرض، محبت ہے جس میں چون و چرا کا مقام نہیں۔ اگر محبت نہ ہو تو نہ نماز، نماز ہے، نہ روزہ، روزہ۔ جو چیز اصل غرضِ خلقت ہو وہ دین نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ امام باقرؑ فرماتے ہیں 'محبت کے علاوہ بھی ایمان کوئی اور چیز ہے' اور امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں ''محبت ہی اطاعت دین ہے اور اطاعت دین ہی محبت ہے''! جو حقیقت سے محبت رکھے اسے حقیقت کی ضد سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کی خوشنودی اور رضا محبت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ علیؑ فرماتے ہیں، اے اللہ میں تیری عبادت بہشت کی طمع یا جہنم کے خوف سے نہیں کرتا، بلکہ اس لیے کرتا ہوں کہ تو ہے ہی اس قابل کہ تجھ سے محبت بھی کی جائے اور تیری عبادت بھی ہو۔ اسلام کے تمام فرقے، عبادات یعنی توحید، نماز، روزہ، زکوۃ، حج میں مشترک ہیں، پھر بھی حضورؐ کا فرمان ہے کہ ان میں فقط ایک ناجی ہوگا۔ ہونا تو یہی چاہیے کہ ان اعمالِ عبادات سے وہ اللہ سب سے راضی ہو جائے، مگر وہ تو اپنی رضا سورۃ البقرہ آیت ۲۰۷ کے مطابق کسی کو عطا کر چکا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ: یعنی لوگوں میں ایک ایسا ہے جو اپنا نفس اللہ کی رضا کے لیے بیچ دیتا ہے۔ جب تک وہ راضی نہ ہو، جسے اللہ اپنی رضا فروخت کر چکا، تو کوئی عمل قابل قبول نہیں۔ جنت میں داخلہ رضامندی پر موقوف ہے جس کے معنی ہیں محبت، جو عین دین ہے۔ فطری طور پر محبت ہی میں خوف کا عنصر ہوتا ہے۔ اگر خوف کا یہ ظرف، خوف الٰہی سے بھر جائے تو زندگی بن جاتی ہے اور اسی طرح اگر ظرف محبت میں محض محبت الٰہی رہ جائے تو وہ مقام عشق ہے۔ اس ظرف میں غلط محبتیں بھر جائیں تو اس کے نجس ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

عناصر جسم انسانی میں اگر قوت دفع و جذب موجود نہ ہو تو وجود آدم کا نظام برقرار نہ رہ سکے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے نظام شمسی میں اگر قوت جذب اور قوت دافع متوازی اور برابر نہ ہوں تو سیارگان ایک

Marfat.com

دوسرے سے ٹکرا جائیں اور عالم فنا ہو جائے۔ قوت جاذبہ کو محبت کہتے ہیں اور قوت دفع نفرت کہلائے گی۔ ایٹم جیسے چھوٹے سے ذرّہ میں بھی ہر عمل اس طرح کار فرما ہے، تو نوعِ آدم کی تخلیق اس سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتی ہے۔ شیرینی زبان کی چاہت ہے، مگر کڑواہٹ سے نفرت کرتی ہے۔ میٹھے بول پر کان جھوم جاتا ہے اور کرخت آواز اس کی دشمن ہے۔ حسین اور متوازن چہرے آنکھ کا نُور بڑھاتے ہیں، لیکن بری اشکال اس کے لیے ناپسندیدہ ہوتی ہیں۔ یہ عمل دل میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان سب کی اصل محبت ہی ہے، نفرت تو اس وقت جنم لیتی ہے جب محبوب کی مخالفت ہو۔ یقین کے معنی ہیں اعتقاد بمطابق واقعہ۔ اس کا الٹ ہے جہلِ مرکب یعنی کسی چیز کو نہ جاننا اور غلط کرتے ہوئے یہ سمجھنا کہ ٹھیک کر رہا ہوں۔ جہلِ مرکب قلب کی سیاہی بڑھاتا ہے۔ غلط عقیدہ بھی اسی طرح جہلِ مرکب ہے اور جہنمی بننے کا سبب ہو گا۔ نیک اور صالح اعمال کی وجہ سے روح میں اچھائی کی صفت مستحکم ہو جاتی ہے اور وہ مرنے پر بھی ختم نہیں ہوتی۔ اسی طرح برے اعمال و گناہ، روح پر جو اثرات چھوڑتے ہیں، ان ہی کے پختہ اثرات کل روزِ قیامت، سزا کی بنیاد بنیں گے۔ اسی لیے رسالتمآبؐ نے امراض روح کے لیے تجویز کیا: حُبُّ عَلِیٍّ یَاْکُلُ الذُّنُوبَ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ حَطَبَ: یعنی علیؑ کی محبت گناہوں کو اس طرح کھاتی ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فلسفہ کردارِ علویؑ کو زندگی کا حصہ بنایا جائے۔ علامہ سلیمان بلخیؒ اپنی کتاب ینابیعُ المودۃ میں لکھتے ہیں کہ رسولِ خداؐ کو مندرج اصحاب سے خصوصی محبت کا حکم آیا تھا۔ ۱: سلمان الفارسیؓ ۲: ابوذر الغفاریؓ ۳: بلال بن الرباحؓ ۴: مقداد بن الاسودؓ ۵: عمار بن الیاسرؓ۔ در اصل یہ کردارِ علوی ہی کی سمتیں ہیں اور علیؑ ان کے سردار ہونے پر فخر کیا کرتے تھے! مخلوقات کے لئے کردارِ علوی کی محبت کا راستہ متعین فرماتے ہوئے سورۃ الشوریٰ آیت ۲۳ میں کہا گیا ہے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی: یعنی آپؐ فرما دیں میں تم لوگوں سے تبلیغ رسالت کی تئیس (۲۳) سالہ محنت پر کوئی اجر نہیں مانگتا، مگر یہ کہ میری قُربیٰ سے مَودّۃ کرو۔

Marfat.com

لامحالہ خالقِ کون ومکان کے نزدیک یہ عمل اتنا ہی پسندیدہ ہوگا کہ اگر کوئی سوال فرمایا، تو صرف اَلْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کے لئے۔ غور طلب ہے کہ مَودّۃ کیا ہے؟ قُربیٰ کون ہیں؟ اور اَلْمَوَدَّةَ اور محبت میں کیا فرق ہے؟

زلیخا کو یوسفؑ سے محبت تھی، وہ دیوانگی اور محبت میں اس حد تک فریفتہ تھی کہ اسے زلیخا کی بجائے یوسفی کہنا مناسب ہوگا۔ وہ یوسفؑ کی محبت اور فراق میں سر کے بال نوچا کرتی، سینہ کوبی کیا کرتی اور خون کے آنسو بہاتی۔ جب حالتِ غصہ میں یوسفؑ کو زندان میں قید کروا چکی، تو راتوں کو محبوب کے ایک دیدار کے لیے دس کوس دور زندان میں پاپیادہ جایا کرتی۔ مصر کی خواتین میں یہ بات مشہور ہوگئی، کہ عزیزِ مصر کی بیوی اور ہماری ملکہ زلیخا، ایک غلام کی محبت میں گرفتار ہو کر تمام ہوش وحواس بھلا بیٹھی ہے۔ حافظ سائیںؒ فرمایا کرتے، محبت بے اختیاری کا نام ہے اور اس میں اختیار باطل ہوا کرتا ہے کی نہیں جاتی، بلکہ ہو جاتی ہے۔ جب زلیخا بھی یہ جان گئی کہ مصر میں اس کی فریفتگی اور محبت کے قصے عام ہو رہے ہیں، بلکہ بدنامی کی شکل اختیار کر رہے ہیں، تو اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ جسے سورۃ یوسف آیت ۳۱ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ: یعنی جب زلیخا نے ان کے مکر کے متعلق سنا تو انہیں بلا کر ان کی دعوت کی اور کھانے کے بعد ہر ایک کے ہاتھ میں (پھل کاٹنے کے لئے) چھری تھما دی، پھر یوسفؑ کو پردہ کے پیچھے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ مصر کی خواتین نے جونہی حسن یوسفؑ کا مشاہدہ کیا تو بے خودی میں اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور پکار اٹھیں کہ یہ کوئی بشر ہے ہی نہیں، یہ تو نہایت تکریم والا فرشتہ سیرت ہے۔

Marfat.com

بلاشک بحیثیت ملکہ اگر زلیخا چاہتی تو اپنے اوپر تہمت لگانے والیوں اور طعنے دینے والیوں کو کڑی سے کڑی سزا دلوا سکتی تھی، حتیٰ کہ قتل بھی کروا سکتی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا کیونکہ سچا پیار کرنے والی تھی، اور راسخ محبت کرنے والے کبھی کسی کا برا نہیں سوچا کرتے۔ اس نے ان تمام خواتین کو، جو اس عمل میں پیش پیش تھیں، اپنے ہاں کھانے پر مدعو کر کے نہایت پُر تکلف دستر خوان بچھایا اور گونا گوں نعمتوں سے مصری خواتین کو سیر کیا۔ میزبان کی حیثیت سے خود ہر ایک مہمان خاتون کا دل جیتنے کے لیے اس کے پاس گئی، مزید کھانے کی درخواست کی، بلکہ ہاتھوں سے مزید ڈال کر دیتی رہی۔ جب وہ خواتین خوب سیر ہو چکیں، تو دستور کے مطابق آخر میں کھانے کو انہیں پھل پیش کیا گیا۔ ہر عورت کو ایک تیز دھار چھری تھمادی گئی اور جوں ہی عورتوں نے پھل کاٹنا شروع کیا، حسبِ پروگرام یوسفؑ کو پردہ کی اوٹ سے باہر نکالا گیا اور متعارف کروایا گیا۔ جوں ہی تمام خواتین کی نگاہ یوسفؑ پر پڑی، وہ دم بخود رہ گئیں اور چونکہ وہ اس سے قبل پھل کاٹ رہی تھیں، اس لئے مدہوشی کے عالم میں انہوں نے پھلوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں بھی کاٹ ڈالیں۔ دستر خوان خون آلود ہو رہے تھے اور کسی کو احساسِ درد بھی نہ تھا، کوئی نہ جانتی تھی، کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنا ہاتھ قطع کر چکی ہے۔ یوسفؑ کو پھر پردہ کے پیچھے کر دیا گیا، تو ان مدہوش خواتین کو آہستہ آہستہ ہوش میں آنے کے بعد بھی، اپنے کٹے ہاتھوں، نکلتے خون اور درد کی شدت کا احساس نہ ہوا، بلکہ وہ یہی کہتی رہیں کہ یہ کوئی بشر نہ تھا، نہایت کریم فرشتہ تھا۔ کچھ دیر بعد زلیخا نے انہیں، ان کے کٹے ہوئے ہاتھوں کا احساس دلایا اور سوال کیا کہ ایک ہی نظارہ کر کے اپنے ہاتھ چھریوں سے کاٹ لیے؟ وہ تمام خواتین بیک زبان بولیں، اس نظارہ نے ہمیں بے اختیار کر دیا تھا۔ زلیخا نے کہا، یہ وہی یوسفؑ تھا، جس کی بابت تم مجھ پر تہمت باندھتی تھیں۔ تو تمام خواتین مصر نے کہا، ہمیں آپ کی بے قراری و بے اختیاری کی وجہ معلوم ہو گئی ہے۔ آپ کو کیا تہمت دیں، اب تو ہم خود اس کی محبت میں گرفتار ہیں! دراصل محبت کی نہیں

Marfat.com

جاتی، بے اختیاری میں ہو جاتی ہے اور اس کا تعلق آنکھ اور دل کے اتصال سے ہے۔ آنکھ رویت کے محل میں جب کوئی ایسا نظارہ کرے، جو دل کو بے چین کر دے اور جسم اپنے ہوش گنوا بیٹھے، تو یہ محبت ہوتی ہے۔ مگر اَلْمَوَدَّۃَ، بقائم ہوش و حواس، کسی کی اہلیت و قدر و منزلت کے عرفان کے بعد، جائز مقام دیکر اس کی عزت، توقیر اور ممکنہ نصرت و مدد کرنا ہے۔ اَلْمَوَدَّۃَ اس برتر، اعلیٰ اور اُولیٰ کے لیے مقرر ہے، جو بنی آدم کے خیال کی امکانی حد میں آنے والے ہر معیار پر پورا اترے۔ جن کے لیے اَلْمَوَدَّۃَ کا سوال کیا گیا ہے، وہ عالی معیار کے حامل ہیں۔ کسی بھی پیمانے پر پرکھ کر لیں، یا کسی بھی کسوٹی پر آزمائش کر لیں، وہ عالین ہی ہوں گے۔ قُربیٰ صرف قرابت دار کے معنوں میں مستعمل نہیں ہو سکتا کیونکہ حضورؐ کے قرابت داروں میں ابولہب اور ابوجہل بھی تھے۔ اگر اَلْمَوَدَّۃَ کا سوال ان کے لئے کیا جائے تو عبث ہو گا کیونکہ وہ ہمیشہ حضورؐ کی جان کے دشمن رہے ہیں اور کبھی دولتِ ایمان سے سرفراز نہیں ہوئے۔ دراصل قُربیٰ، کی "ی" کسی مؤنث کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ حافظ سائیںؒ نے فرمایا کہ یہ حضورؐ کی اکلوتی صاحبزادیؓ اور ان کی اولاد مطہرہ کی طرف اشارہ ہے۔ رسولؐ خدا نے انہی عالینؑ کی اَلْمَوَدَّۃَ کا سوال اپنی امت سے کیا ہے اور اس سوال کا مقصود قُربیٰ کی شان کا اظہار ہے۔ علاوہ ازیں آنے والے زمانوں اور وقتوں میں حُبِ رسولؐ کی ایک دلیل قائم فرما دی گئی کہ جو بھی ان قُربیٰ سے مودۃ کرنے والے ہونگے وہی فرمان رسولؐ کی پاس داری کرنے والے اور ناجی ہونگے۔ قُربیٰ سے اَلْمَوَدَّۃَ، دین کی اصل، اور ان سے بُغض و عناد، بے دینی ہے اور یہی آیت مذکورہ کا حاصل ہے!

حدیث میں اس کی مزید وضاحت فرمائی گئی: مَا مَاتَ عَلیٰ حُبِّ مُحَمَّدٍ وَّ آلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَہِیْدًا: یعنی محمدؐ و آل محمدؐ کی محبت میں اگر موت آ جائے تو وہ شہادت ہے۔ اگر تمام عالمین محبتِ محمدؐ و آل محمدؐ پر جمع ہو جاتے، تو اللہ کو جہنم بنانے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ محبت یا تو کمال کی وجہ سے ہوتی ہے یا جمال کی وجہ

Marfat.com

سے۔ اللہ خود سب سے زیادہ صاحبِ کمال و صاحبِ جمال ہے اس لیے سب سے زیادہ قابل محبت بھی خود اللہ ہی ہے۔ لیکن محبت، مناسبت کے بغیر نہیں ہو سکتی، اور یہ بھی اصول ہے کہ جتنی مناسبت گہری ہو گی محبت بھی اتنی ہی زیادہ ہو گی، اور طبیعتوں کا ایک دوسرے کی طرف میلان بھی اسی محبت کی بنیاد پر ہو گا۔ علیؑ اور محمدؐ کے اتحادِ طبیعت کی گواہی آیتِ مباہلہ کے علاوہ حضورؐ کی حدیث: لَحْمُكَ لَحْمِي جِسْمُكَ جِسْمِي رُوْحُكَ رُوْحِي بَدَنُكَ بَدَنِي دَمُكَ دَمِي: میں ملتی ہے۔ چونکہ خالق اور مخلوقات میں کوئی قدرِ مشترک نہیں اس لئے عدم مناسبت کی بنیاد پر اللہ سے محبت کرنا مشکل ہو گا۔ وہ مالک، بنی نوعِ آدم کی اس ازلی فطرت سے چونکہ واقف تھا، اس لیے اس نے اپنی مشیّت وارادہ سے ایسی مخلوق کو خلق کیا، جن کی صورتیں تو بنی آدم سے مشابہ ہوں مگر ان میں صفات، اللہ کی اپنی ہوں۔ اس طرح مناسبتِ صورت کی وجہ سے ان سے محبت آسان ہو گئی اور ان میں اوصاف الٰہی کی وجہ سے بالواسطہ ہماری محبت خدا تک بھی پہنچ گئی۔ یہ مخلوق لازماً بے عیب ہے اور ان کی محبت اللہ ہی کی محبت ہے! اب اگر عبادت سے مراد معرفت لی جائے تو معرفتِ خدا، محبتِ اہلِ بیتؑ کے بغیر ممکن نہیں۔ ابلیس معرفت الٰہی رکھتا تھا، محبت نہ ہونے کے باعث رجیم ہوا۔ معرفت، محبت کے بغیر بے معنی ہے، مگر محبت کبھی رائیگاں نہیں جاتی!

۳۰۔ دُعا

بنی نوعِ آدم، خُلِقَ ضَعِیفًا کی صفت کا حامل ہونے کے باعث بنیادی طور پر ناتواں اور کمزور ہے، اس لئے معمولی تکلیف سے بھی جلد گھبرا جاتا ہے اور امید کی بجائے ناامیدی اپنے اوپر وارد کر لیتا ہے۔ جب حصولِ خوشی کی تمنّا کے باوجود غم کے گھیرے میں آکر اسے دنیا اپنے گرد اندھیرا دکھائی دیتی ہے، تو اس وقت اپنی طلب کی ناکامی اور مستقبل میں روشنی کی کرن کی آس پر، کبھی آنسو بہا دیتا ہے اور کبھی خاموش لبوں کے ساتھ کچھ الفاظ کا اظہار کر دیتا ہے، حالانکہ اس بحرِ ظلمات میں بظاہر اسے دور

Marfat.com

تک کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ بھی فطرت بنی آدم کا حصہ ہے کہ عالم محسوسات میں جس کا احاطہ نہیں کر سکتا، اسے پکارنے لگتا ہے، کیونکہ تنہائی، ویرانی، بربادی، مجبوری، کمزوری اور لاچاری میں کوئی کارساز طاقت ضرور کام آجاتی ہے۔ اسی درخواست، پکار اور التجا کرنے کو دعا کہتے ہیں۔ حالانکہ مخلوقات ہر دم اس فعل میں مصروف ہے، مگر کثرت کے یہ علم میں نہیں کہ کس ذات کو پکار رہے ہیں؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ جس کو پکار رہے ہیں، وہ غائب ہے، تو پکارنا بے کار ہوگا کیونکہ اس صورت میں یہ امکان ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ سُن ہی نہ سکتا ہو یا پھر یہ کہ وقت پر حاجت روائی نہ کر سکے۔ لیکن اگر وہ حاضر اور سامنے موجود ہے تو پھر غور کرنا پڑے گا کہ کیا پکار اس کے معیار کے مطابق کی جارہی ہے یا نہیں۔ یہ ایک منطقی حقیقت ہے کہ اس ذات واجب الموجودات سے جس کا جیسا تعلق اور معیار کا واسطہ ہوگا وہ اسے ویسا ہی پکارے گا اور ہر کسی کی پکار کا صلہ بھی اسی بات پر موقوف ہوگا۔ قبولیت دعا کے لئے اس ذات کا عرفان بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ وحیِ خداوندی کے طور پر قرآن میں کئی مقامات پر اس موضوع کی بابت احکامات ملتے ہیں، جن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

i: اللہ کی ازلی اور ابدی حاکمیت۔

i(i)۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۱۵ میں ہے: فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ: یعنی تم ہر طرف اللہ کا چہرہ پاؤ گے۔ وہ کائنات کے ہر ذرہ میں ہے۔

i(ii)۔ سورۃ الزمر آیت ۴۴: لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: یعنی زمین و آسمان میں اسی کی قدرت محیط ہے۔

Marfat.com

(iii)i۔ سورۃ الحدید آیت ۳ میں وارد ہے: وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ : یعنی ہر شے اس کے علم میں ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایسی شان کا مالک ہے کہ کبھی بے خبر نہیں ہوتا اور مخلوقات کبھی اس کی دسترس سے باہر نہیں نکل سکتیں۔

(iv)i۔ سورۃ ق آیت ۱۶ میں ہے: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ: یعنی وہ ہم سب کی رگِ جان سے بھی قریب ہے۔

(v)i۔ سورۃ الذٰریٰت آیت ۲۱ کے مصداق: وَ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ: یعنی وہ تمہارے نفوس میں بھی ہے۔

ان حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والا ہر ذرہ میں اپنی موجودگی ظاہر کر رہا ہے، اور سب کچھ کو جانتا ہے۔ جو کچھ ظاہر ہے اس کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ کسی نے اپنے جی میں چھپا رکھا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ ان دلیلوں سے واضح ہو رہا ہے کہ، وہ ہر پکارنے والے سے ہر وقت قریب ہوتا ہے۔ قبولیت میں فرق اس سے نسبت، تعلق اور واسطے کا ہے وگرنہ اس کے حاجت روا ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا۔

ii: اللہ ہی حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔

(i)ii۔ سورۃ النمل آیت ۶۲ میں ہے۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ :یعنی کون ہے جو پکارنے والے کی مشکل کشائی کرتا ہے؟ اس سوال ہی میں جواب واضح ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی کے لئے صادق ہے کہ وہ حاجت روا اور مشکل کشا ہو۔

(ii)ii۔ اللہ، کُل کا مالک وخالق ہونے کے ناطے، مومنوں کے علاوہ کافروں، مشرکوں اور فاسقوں کی دعا بھی سنتا ہے اور انہیں قبول کر کے پورا بھی کرتا ہے کیونکہ اس کی صفتِ ربوبیت ورحیمی کا یہی تقاضا

Marfat.com

ہے۔ ویسے تو بلاشک وہ ذات سینوں کے رازوں سے بھی واقف ہے اس لئے بغیر مانگے بھی مسلسل عطا کرتی رہتی ہے اور مخلوقات کی جملہ ضروریات پوری کرتی رہتی ہے، مگر کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص طلب کرتا ہے، پھر کوشش بھی کرتا ہے، مگر ناکام رہ جاتا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۱۶ میں وارد ہے: عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّکُمْ: یعنی کبھی جو تم اپنے لیے ناپسند کرتے ہو وہ اچھا ہوتا ہے اور کبھی جسے پسند کرتے ہو وہ شر ہوتا ہے۔ اس میں لطیف اشارہ یہ ہے کہ نہ صرف تم آدابِ دعا کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھتے، بلکہ عجلت اور کم فہمی کی وجہ سے ایسی دعا کرتے ہو جو تمہارے لئے مناسب نہیں، یا پھر وہ کچھ مانگنے پر مصر رہتے ہو جو تمہارے لئے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ تم آنے والے وقت کی بھلائی اور برائی سے بے خبر ہو۔ سورۃ آل عمران آیت ۶۶ ہے: وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: یعنی تمہاری بھلائی اللہ تم سے بہتر جانتا ہے، کیونکہ وہ عالم الغیب ہونے کے ناطے مستقبل کا واقف ہے۔ اس آیت میں یہ اشارہ بھی پنہاں ہے کہ راضی برضائے الٰہی رہنا اس سے بہتر ہے کہ تم طویل دعائیں کرتے رہو۔ لامحالہ آدم زاد کو ایک لمحہ بعد کی خبر نہیں ہے، اس لئے امکان غالب ہے کہ کی جانے والی دعا میں کوئی ایسی التجا بھی ہو جائے جو غیر مناسب ہو۔

iii: ترغیبِ دعا۔

(i)iii۔ سورۃ المومن آیت ۶۰ میں ہے: وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ: یعنی تمہارے رب کا فرمان ہے کہ اس سے دعا مانگو، وہ قبول کرنے والا ہے۔ یہ یقین ہو کہ درخواست کا جواب ملے گا تو درخواست کرنے کا جذبہ اور خواہش بڑھ جاتی ہے، یہاں یہ ترغیب نہایت واضح ہے۔

Marfat.com

(ii)iii۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۸۶ میں مزید وضاحت ہے: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ: یعنی جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھتے ہیں تو میں قریب ہوتا ہوں، جب وہ دعا کرتے ہیں تو ان کی دعا قبول کرتا ہوں۔

iv: آدابِ دعا۔

صالحین کے فرمان کے مطابق دعا کو مقبول بنانے کے لیے کچھ آداب کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔(i): اعترافِ گناہ کرنا، جو یونس کا حال ہے۔(ii): حالتِ مجبوری میں یقین کو مد نظر رکھنا جو زکریاؑ کا مقام ہے۔(iii): وسیلہ پیش کرنا جو یوسفؑ کا اعزاز ہے۔(iv) : اخلاص اور عجز جو ابراہیمؑ کا مرتبہ ہے۔(v): بدن اور کپڑوں کی طہارت، قبلہ رُو ہونا اور کامل خشوع و خضوع۔

v: اندازِ دعا۔

v(i): واقعات و حادثات کی گرفت میں آنا ہمیشہ اپنے ہی اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لیے دعا کرنے سے پہلے اپنا محاسبہ کرنا اور پھر پروردگار سے معافی کی درخواست کرنا، ضرور قبولیت کا باعث ہو سکتا ہے۔ دعا کے لیے وقت کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی۔

v(ii) : سورۃ الاعراف آیت ۵۵ میں اشارہ ہے : اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً : یعنی اپنے رب کو عاجزی سے اور خفیہ طور پر پکارو۔

vi: ترغیبِ دعا کے علاوہ قبولیت و استجابِ دعا سے متعلق، احادیث میں حضورؐ کے ارشادات اس طرح منقول ہیں۔

vi(i): اِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةِ : یعنی دعا عبادت ہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ دعا اسی طرح کرو جیسے اس کی عبادت کرتے ہو۔

Marfat.com

vi(ii): اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ: یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔ مراد یہ ہے کہ صدقِ دل سے کی گئی دعا عبادت کا حاصل کہلا سکتی ہے۔

vi(iii): لَیْسَ شَیْءٌ اَکْرَمَ عَلَی اللّٰہِ مِنَ الدُّعَاءِ: یعنی اللہ کے نزدیک دعا سے عزیز کوئی چیز نہیں۔

vi(iv): اللہ کو شرم آتی ہے کہ وہ اپنے بندے کے دعا کے لیے اٹھے ہاتھ خالی واپس لوٹا دے۔

vi(v): لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ فَعَلَیْکُمْ بِالدُّعَاءِ: یعنی تقدیر کا فیصلہ دعا سے بدل سکتا ہے اس لیے دعا ضرور کرو۔

vi(vi): دعا کیساتھ، اول آخر، درود شامل کرلو، تو یہ کبھی رد نہیں ہوتی۔

vi(vii): انبیاءؑ و صالحینؒ اور نیک اعمال کو وسیلۂ دعا بنانا بھی سود مند ہوتا ہے۔

vi(viii): اللہ غافل اور لاپرواہ کی دعا قبول نہیں کرتا۔

vi(ix): چند لوگوں کی دعا فوری قبول ہوتی ہے، مثلاً امام عادل، مظلومین، پریشان حال اور والدین کی، جب اولاد کے لیے ہو۔

vi(x): دعا کرتے ہوئے عاجزی اور اخلاص کے ساتھ یقین کو مد نظر رکھو۔

vii: فلسفۂ دعا۔

دعا کے متعلق ایک یہ نظریہ ہے کہ جب ہر کام تقدیر پر موقوف ہے تو پھر دعا کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ دوسرا مکتبہ فکر اسے فرمان خدا سمجھ کر پورا کرتا ہے۔ جب ابراہیمؑ آگ کی طرف پھینک دیے گئے تو حکم الٰہی سے جبرائیلؑ آئے اور بارگاہ خداوندی میں دعا کے لئے کہا تو آپؑ نے فرمایا، اس کا میرے حال کو جاننا میرے سوال کرنے سے بہتر ہے۔ ایسا جواب کسی طرح اہمیت دعا کی نفی نہیں ہے۔ یہ دراصل مشیت الٰہی کو سمجھنے والے ایک فرمانبردار بندے کا انداز ہے، جسے راضی بہ رضاءِ الٰہی کہتے ہیں اور

Marfat.com

مخلوقات میں سے ہر کس و ناکس کا حصہ نہیں۔ دراصل دعا، خالق اور مخلوق کے درمیان ایک رابطہ ہے، بالکل اسی طرح جیسے وحی، خدا اور رسول کے درمیان رابطہ ہوتی ہے۔ دعا ایک تدبیر کا کام کرتی ہے جو دنیا اور آخرت کے مقاصد کے لیے بروئے کار لائی جاتی ہے اور اس میں کچھ فضائل بھی ہیں۔ انبیاء کی سنت ہونے کے علاوہ اس میں اعجازِ رسالت کی شان ودیعت کی گئی ہے۔ پھر یہ شدائد و آلام میں داعی کو بے پناہ صبر و استقلال مہیا کرتی ہے اور نامساعد حالات کا جوانمردی سے مقابلہ کرنے کی قوت بخشتی ہے۔ دعا مقدراتِ الٰہیہ کے منافی نہیں مانی جاسکتی کیونکہ اگر دعا تقدیر سے متصادم ہوتی تو بالا احکامات کبھی صادر نہ ہوتے۔ جس طرح کسی کام کے کرنے کے لئے اسباب کا استعمال اور کسب و عمل مقدر ہوتا ہے، اسی طرح کسی چیز کے حصول کے لیے دعا کا مانگنا بھی مقدر ہوتا ہے۔ اس لیے دعا کسی طرح بھی رضا بقضا کے مسّلمہ اصولوں کے خلاف نہیں۔ اگر کبھی قبولیتِ دعا میں دیر ہوتی ہے تو یہ اللہ کی مخصوص مصلحتیں ہوتی ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں مسلمان، اللہ کی بارگاہ میں کسی طلب کے لیے جب ہاتھ اٹھاتا ہے تو کبھی یہ فوراً قبول ہو جاتی ہے کبھی بدیر، وگرنہ یہ آخرت کا ذخیرہ بنا دی جاتی ہے۔ کسی شخص نے امیر المومنین علیؑ سے عرض کی کہ کیا وجہ ہے ہماری دعا قبول نہیں ہوتی؟ آپ نے فرمایا تم جس سے دعا مانگتے ہو اس کا عرفان نہیں رکھتے۔ اسم تو پکارتے ہو، مسمّیٰ کو کبھی تم نے تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مناسب یہ ہے کہ پہلے اپنے رب کو اپنے نفوس میں پہچانو اور پھر اس سے مانگنے کے لئے التجا کرو اور جن ہستیوں کو اس نے اپنی معرفت کا نشان بنایا ہے، ان کو وسیلہ اور واسطہ بناؤ۔ یقیناً دعا قبول ہو گی۔

۳۱۔ تقدیر، توکل اور دعا

لغوی تعریف کے لحاظ سے تقدیر اس جبر کو مانا جاتا ہے جو ازل کے ساتھ ہی ہر مخلوق سے منسلک کر دی جاتی ہے، ازاں بعد مخلوقات کو اس کے سوا چارہ نہیں ہو سکتا۔ مراد یہ کہ ہر ذی نفس کی جو قدر مقرر کی

Marfat.com

جاتی ہے وہ لمحہ بہ لمحہ اس پر اسی طرح وارد ہوتی رہتی ہے اور اسی بالجبر ورود کا نام تقدیر رکھا گیا ہے۔ بلا شک فرمانِ سورۃ القمر آیت ۵۳ کے مطابق: وَ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ: یعنی ہر چھوٹی بڑی بات لکھ کر مقرر ہو چکی ہے۔ اور سورۃ یونس آیت ۶۴ کی روشنی میں: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ: یعنی اللہ کے کلمات میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ اسی طرح سورۃ الطلاق آیت ۳ کے مطابق: جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا: یعنی اللہ نے ہر چیز ایک معیار اور اہلیت کے مطابق کی۔ اس جیسی آیات خلافِ عقل بھی نہیں اور ناممکن العمل بھی نہیں بلکہ ان تمام آیات کا من حیثُ الکل نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکالا جا سکتا کہ قدر مقرر کرنے والی ذات چونکہ علیم اور خبیر ہے، اس لئے وہ ازل سے بھی قبل یہ جانتی ہے کہ ہر ہونے والا نفس جہانِ شہود میں کیا کرے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ وہ کسی کو کچھ بھی کرنے پر مجبور یا پابند کرتا ہے۔ غور و فکر سے ثابت ہو گا کہ آیاتِ قرآنی میں محسوس ہونے والا اشتباہ ہمیشہ سطحی ہوتا ہے، حقیقی نہیں۔ تقدیر کی دو اقسام ہیں۔

i: تقدیرِ مبرم۔ جو قطعی الوجود ہے۔ ii: تقدیرِ معلّق۔ یہ مصلحتِ ربّی سے وابستہ ہے۔ جب ابراہیمؑ نے جبرائیلؑ کے کہنے کے باوجود دعا کرنا مناسب نہ سمجھا، تو وہ اہمیت و اجابتِ دعا سے انکار نہیں ہے، بلکہ اس عالمُ الغیوب اور ناظرُ القلوب پر توکّل کی علامت ہے۔ توکّل ترکِ اسبابِ عادیہ کو کہتے ہیں۔ دنیا عالمِ اسباب ہے اور بغیر اسباب کسی کام کے ہونے کا سوچنا بھی ناپسندیدہ عمل ہے۔ اگر ابراہیمؑ اپنی حفاظت کے اسباب کو دیدہ دانستہ ترک کرتے، تو یہ دستورِ الٰہی کی مخالفت ہوتی۔ دراصل توکّل کی دو اقسام ہیں۔ i: توکّل علمی۔ دنیا و مافیہا کا متصرّف حقیقی، صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھنا، کائنات کے عدم سے وجود میں آنے کے لیے اُسی کو عِلّۃُ العِلَل مان کر یقین رکھنا کہ اس کے حکم کے بغیر کچھ ممکن نہیں، توکّلِ علمی ہے، جو اعتقادات کی بنیاد ہے۔ ii: توکّل عملی۔ ان اسبابِ عادیہ کے ترک کرنے کو کہتے ہیں جن کا تعلق دنیاوی زندگی کے ظاہری فوائد تک محدود ہوتا ہے۔ اسباب کی بھی دو اقسام معروف ہیں، i: دینی، جن کا

Marfat.com

ترک گناہ ہے اور ii: دنیاوی، مثلاً سامانِ خورد ونوش، سامانِ ستر پوشی وغیرہ جن کا تعلق دنیا کی زندگی کے فوائد تک محدود ہے۔ اگر وہ فوائد حرام ہیں تو ان کا ترک لازم ہے اور اگر حلال ہیں تو ان سے مستفیض ہونے کے تین ممکنہ طریق ہوسکتے ہیں۔ i: جن کے فوائد کا مرتب ہونا یقینی ہے، مثلاً قوتِ لایموت کے لیے کھانا پینا، ان کا ترک عندُ الشرع درست نہیں۔ ii: جن سے فائدہ کا محض وہم یا گمان ہو مثلاً جوا، اسے طُولُ الاَمل کہتے ہیں اور ان کا ترک ضروری ہے۔ iii: جن کا فائدہ فقط غالب اوقات میں ہوتا ہے مثلاً علاج معالجہ کے بعد صحت نصیب ہونا۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں کے لیے اس کا ترک جائز نہیں مگر قویُ النفس اور پختہ اعتقاد والا ایسے اسباب کو ترک کر کے ذاتِ اقدس پر بھروسہ کرے، تو عندُ الشرع، محمود ہے۔ انہیں اسبابِ ظنیّہ کہتے ہیں اور توکل انہی کے ترک کا نام ہے۔ اسبابِ یقینیہ کے ترک کو توکّل کہنا غلطی ہے۔ ثابت ہوا دعا، نہ تقدیر سے متصادم ہے اور نہ ہی مخالفتِ توکل الی اللہ ہے۔

۳۲۔ طبعی عناصر

کائناتِ شہود کی تخلیق کُل چار طبعی عناصر سے ظہور پذیر ہوئی ہے اور تمام مخلوقات ان ہی کے باہم اشتراک سے وجود میں آئی ہیں۔ ان عناصر کے مختلف مقدار (ratio) کے ساتھ ملنے سے مختلف اجناس (species) بنیں۔ بالفاظ دیگر ہر ایک مخصوص جنس ان چار عناصر کے، ایک مخصوص مقدار کے ساتھ، اشتراک کا نام ہے۔ یہ چار زبان زدِ خاص وعام عناصر مندرج ہیں۔

i۔ پانی   ii۔ آگ   iii۔ مٹی   iv۔ ہَوا

ان چاروں عناصر میں تین تین مخصوص طبعی خواص پائے جاتے ہیں اور اس مضمون میں ہم فقط انہی طبعی خواص کا ذکر کریں گے، کیمیائی خواص کا نہیں۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ ہر عنصر کے طبعی خواص صرف اسی عنصر میں پائے جاتے ہیں، دوسرے عناصر میں نہیں۔

Marfat.com

i: پانی کے طبعی خواص:

i(i)۔ بہاؤ(Flow)   i(ii)۔ گیلا پن(Wetness)

i(iii)۔ جس محل (Container) میں ہو، اس کی شکل اختیار کر لینا۔

ii: آگ کے طبعی خواص:

ii(i)۔ حدت(Heat)   ii(ii)۔ روشنی(Light)

ii(iii)۔ سب کچھ کو اپنے جیسا کرنے کی صلاحیت و کوشش۔

iii: مٹی کے طبعی خواص:

iii(i)۔ جمود(Stagnancy)   iii(ii)۔ کشش ثقل(Gravitational pull)

(iii)۔ تنوّع(Variety)

iv: ہوا کے طبعی خواص:

iv(i)۔ ہر جائی یعنی ہر جگہ موجود ہونا(Omnipresence)

iv(ii)۔ نظر نہ آنا(Invisibility)

iv(iii)۔ تسلسل (Continuity)۔ ازل تا ابد، عرش سے تحت الثریٰ، مشرق، مغرب، شمال اور جنوب تک مسلسل پھیلاؤ۔

اس طرح ان چاروں عناصر کے یہ کُل بارہ (۱۲) طبعی خواص بنتے ہیں، جن کی فرداً فرداً تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

Marfat.com

(i)i۔ پانی کا بہاؤ۔ پانی کی یہ بنیادی صفت ہے۔ مقدار میں جتنا بھی کم کیوں نہ ہو، یہ ضرور بہہ نکلتا ہے مگر مقدار زیادہ ہو تو اس کی طغیانی کی قوت کے مقابل کچھ بھی تاب نہیں لا سکتا بلکہ یہ سب کچھ کو بہا کر اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ عام مشاہدہ میں آتا ہے کہ ایک قطرہ پانی بھی جامد نہیں رہتا، بلکہ بہنے کی کوشش کرتا ہے۔ شرعی طور پر جامد پانی کو ناپاک تصور کیا جاتا ہے اسی لئے تالاب اور کھلی جگہوں پر ٹھہرا ہوا پانی وضو اور غسل وغیرہ کے لیے ممنوع ہوتا ہے، جبکہ نہروں اور نالوں کا وہ پانی جو بہہ رہا ہو، اگرچہ بظاہر گدلا ہی نظر آئے، شرع میں پاک تصور کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے اسی لئے مثانے میں ٹھہرا پانی (پیشاب) اور فوطوں میں ٹھہرا پانی (منی) ناپاک مانا جاتا ہے، حتیٰ کہ نکل کر وجود یا کپڑوں سے مَس کر جائے تو وہ بھی ناپاک تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جب آدمؑ اور حوا کو جنّت میں رکھا گیا تو کہا گیا کہ تین سمتوں میں آزادانہ پھرو، مگر چوتھی سمت میں جانے کی پابندی لگادی گئی۔ جونہی شیطان ملعون کو موقع ملا، اس نے آدمؑ کو اس بات پر بہکایا کہ تم ٹھہر کر اور پابند ہو کر، جامد ہو گئے ہو، ناپاک کہلاؤ گے۔ میری مانو متحرک ہو کر، آزاد ہو جاؤ اور بہاؤ کی صفت اختیار کر لو، اس سے تمہیں ہیشگی مل جائے گی۔ آدمؑ اس جھانسے میں آگئے اور ٹھہراؤ کو چھوڑ کر، بہاؤ کا راستہ اپنالیا۔ نتیجہ میں ہیشگی تو مل گئی، مگر لباس جسموں سے اتر گئے حتّٰی کہ درختوں کے پتّوں سے ستر شرعی کرتے رہے۔ بہاؤ کے اس عمل نے آدمؑ کو صفی اللہ کر دیا لیکن بادی النظر میں ان کا یہ فعل غیر فطری تھا۔ اولادِ آدمؑ آج تک بہاؤ کے اس غیر فطری عمل کو دہرا رہی ہے جس سے ہیشگی تو میسّر آرہی ہے مگر جنّت سے دور تر ہوتی جارہی ہے۔ آدمؑ کو جنّت میں بہاؤ کی سمت جانے سے ممانعت کی گئی تھی۔ شیطانی بہکاوہ نہ سہہ سکے اور آخرکار ٹھہراؤ سے نکل کر بہاؤ کا شکار ہو گئے۔ وہ آدم جو فطری طور پر ٹھہراؤ والا اور جامد تھا، بہاؤ کا غیر فطری فعل کر کے جنّت سے محروم ہوا۔ چونکہ جامد ناپاک ہوتا ہے اس لیے آدمؑ نے پاک ہونے کی کوشش میں یہ غیر فطری فعل بڑی سرعت سے کر دیا۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ہر آغاز، بہاؤ کا ہی مرہونِ منت

Marfat.com

ہے، ٹھہراؤ کا نہیں۔ مگر جنت آغاز نہیں انجام ہے، اس لیے بہاؤ نہیں ٹھہراؤ ہے جب کہ دنیا بہاؤ کے تابع ہے، یہاں ٹھہراؤ غیر فطری لگتا ہے۔ اگر کوئی آدم زاد بہاؤ چھوڑ کر ٹھہراؤ اپنا لے تو وہ 'عَبد' کا روپ اختیار کر لیتا ہے، جو صرف پاک ہی نہیں: يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا: کا مصداق ہوتا ہے۔

(ii)۔ پانی کا گیلا پن۔ پانی کو بنائے حیات تصور کیا جاتا ہے اور اس کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ اس کی مقدار کتنی بھی کم کیوں نہ ہو، جس سے مَس کرے، اُسے گیلا (wet) ضرور کر دیتا ہے یہاں تک کہ مَس ہونے والا گیلے پن کا واضح احساس بھی کرتا ہے۔ حالانکہ اس حالت میں پانی اپنی خاصیت، اپنی پہچان چھوڑ کر اپنی حیثیت کھو رہا ہوتا ہے لیکن اپنا اثر بہر طور دوسرے کو منتقل کر دیتا ہے۔ دوسرا پانی کے اثر میں نہا کر تر ہو جاتا ہے، حالانکہ خود پانی کی حیثیت کبھی کبھی بالکل ختم ہو جاتی ہے، مگر پانی کبھی اس کی پرواہ نہیں کرتا کیونکہ یہ اس کا نشانِ امتیاز ہے۔ کسی کا بھلا ہو جائے، کسی پر اثر ہو جائے، چاہے اپنی ہستی، نیستی میں بدل جائے تو بھی کوئی مذائقہ نہیں۔ پانی کی مقدار ایک قطرہ کے مصداق ہی کیوں نہ ہو، یہ اگر زمین یا کسی کپڑے وغیرہ سے مَس کرے تو فوراً اس کو گیلا کر دے گا، حالانکہ آنکھ جھپکنے کی مدت تک خود اس کا وجود بھی نظر نہیں آتا۔ حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی اصل ہے کہ کوئی پانی سے اپنے کل کو گیلا بھی کر لے اور اپنی حیثیت کو برقرار بھی رکھے۔ مٹی سے اگر کوئی مورت بنانا مقصود ہو تو اولاً اس مٹی کو پانی سے اچھی طرح گیلا کر کے گوندھنا پڑتا ہے، وگرنہ مٹی سے مزید کچھ بنانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جامد مٹی جو بے جان بھی لگتی ہے اور جس کی اپنی کوئی ماہیت (shape) بھی نہیں ہے، اگر پانی اس کے ساتھ ہم آہنگ و یک جان ہو جائے تو اُسے ایک مخصوص صورت دی جا سکتی ہے، اور اگر فضلِ خداوندی شامل ہو جائے تو ایک نفخ سے وہ ناطق بھی بن جاتی ہے۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ پانی گیلا کرنے میں جبر نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کے ساتھ ہم جنس اور یک جان ہونے کی بلاوجہ ضد کرتا ہے اس لئے وہ وجود جو پانی کو اپنے اندر سرایت کرنے کی اجازت

Marfat.com

نہیں دیتے، وہ ان کی بیرونی سطح کو ہی گیلا کر کے مطمئن ہو جاتا ہے، لیکن وہ وجود جو پانی کو اس کام کے لیے راہ دیتے ہیں، وہ بھی حسنِ اخلاق سے، ان کے باطن تک سرایت کر کے، ہر ایک انگ اور ذرّہ تک اپنا اثر پہنچاتا ہے۔

(iii)i۔ پانی کا محل کی شکل اختیار کرنا۔ پانی ہر محل کی شکل اور ماہیت کے مطابق اس میں حال ہو جاتا ہے، اپنی کوئی مخصوص شکل (shape) نہیں رکھتا۔ سمندر میں اس کی شکل اختیار کئے ہوئے، دریا، نہروں، تالابوں میں پلٹ جائے تو اُن کی طرح، حتّٰی کہ گلاس وغیرہ میں ڈال دیں تو فوراً اس کا ہم شکل ہونا بھی قبول کر لیتا ہے۔ یہ عمل اتنا سریع (instant) ہے، کہ یہی معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی وقت نہیں لگا اور فوراً شباہت بدل لی۔ خوبی یہ کہ جس کی شکل اپنائی اُس کے محل میں جا کر اپنے حال کی بھی پرواہ نہ کی بلکہ یوں محسوس کروایا جیسے صدیوں سے اسی محل میں گزر ہو رہا ہو۔ اگر محل کا سائز چھوٹا ہو تو وہاں تو اپنے بہاؤ کی خوبی کو بھی چھوڑ دیتا ہے اور محل کے ساتھ ہی اپنے حال میں مست ہو کر ساکت تک ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر ایک محل سے کسی نئے محل میں منتقل ہونے کی گنجائش بن جائے تو فوراً اپنی باقی ماندہ خوبیوں کو اپناتے ہوئے یعنی بہتے اور گیلا کرتے ہوئے، نئے محل میں حال ہو جاتا ہے۔ کبھی شکوہ نہیں کرتا، اپنی کوئی خواہش ہی نہیں رکھتا، شکوہ کیا ہو گا؟ ایک اور نکتہ بھی بیان کے قابل ہے کہ پانی دو مختلف محلات میں صدیوں تک بھی رہے تو اپنے اپنے محل کی شکل اختیار کیے رکھے گا اور ازاں بعد اگر ان دونوں محلات کے پانیوں کو آپس میں ملائیں، تو یوں شیر و شکر ہو جائیں گے جیسے کبھی کوئی مفارقت تھی ہی نہیں یہاں تک کہ کوئی کسی بھی طرح مشترک پانی میں تفریق نہ کر سکے گا۔ مراد یہ ہے کہ پانی اپنی ذات سے کبھی بھی فصل نہیں رکھتا، جوں ہی اپنا ہم ذات مجانست کرے، یک جان ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

(ii(i ۔ آگ کی حدت۔ آگ میں حدت کا ہونا ایک لازمی جزو ہے۔ جو محسوس کروانے میں گرم ہی نہ ہو وہ آگ کیا ہو گی؟ جلنے کے عمل میں حدت یعنی گرمی کا پیدا ہونا ایسا عمل ہے جو ہر کس و ناکس کے علم میں ہے اسی لئے تمام مخلوقات و حشرات الارض آگ سے دور بھاگتے ہیں۔ یقیناً ایک اکیلی وجہ (factor) جو ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے وہ آگ کی حدت، اور تپش ہی ہے، جس کو کثرت جامد و متحرک مخلوقات، ایک مخصوص حد سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتیں، درجۂ حرارت ایک حد سے بڑھ جائے تو جل کر راکھ ہو جاتی ہیں، یا خود آگ ہو جاتی ہیں۔ مثلاً لکڑی اور پلاسٹک کے جلنے، لوہے کے پگھلنے اور پانی کے بخارات بننے کا درجۂ حرارت سب مختلف بھی ہیں اور مخصوص بھی۔ اگر حدت محسوس نہ ہو تو کسی بھی چیز کو آگ کہنا غیر فطری ہو گا کیونکہ ٹھنڈا ہونا آگ کی فطرت ہی نہیں۔ ابراہیمؑ کے لیے جب: یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا: کہا گیا تو مراد یہی تھی کہ آگ اپنی ضد میں بدل جائے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب ٹھنڈک ہو، آگ کا تصور نہیں رہتا۔ قابل ذکر ہے کہ ابراہیمؑ کے لیے آگ کو صرف ٹھنڈا ہونے کا حکم نہ دیا گیا تھا، ممکن ہے ٹھنڈی ہوتی ہوئی منجمد (freeze) ہو جاتی تو بھی اتنی ہی تکلیف کا باعث ہوتی۔ اسے ٹھنڈا مگر سلامتی والا کیا گیا تھا۔

(ii(ii۔ آگ کی روشنی۔ آگ کی دوسری طبعی خاصیت اس کا روشنی دینا ہے۔ کثرت اس کی پہچان روشنی ہی کی وجہ سے ہوتی ہے، جو فاصلہ سے بھی نظر آ جاتی ہے۔ بڑی آگ کی صورت میں دور سے پہلے دھواں دکھائی دیتا ہے، جو روشنی ہی کی ایک شکل ہے۔ روشنی کی خاصیت ہے کہ جہاں تک پہنچ جائے، مخفی اور چھپا ہوا سب کچھ عیاں ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سمت کے تعین کے لئے نشان کا کام بھی کرتی ہے، جیسے روشنی کے مینار (Light tower) کی مثال ہو سکتی ہے۔ گہری اندھیری راتوں میں ستاروں کی روشنی سے سمت کا تعین ممکن ہوتا ہے۔ روشنی، جہل سے عرفان کی طرف سفر کا دوسرا نام

Marfat.com

بھی ہے اس لئے آگ میں لازمی طور پر موجود روشنی اس کے عرفانِ ذات کی طرف واضح اشارہ ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ روشنی اور نور ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

(iii)ii۔ آگ کا سب کچھ کو اپنے جیسا کرنے کی کوشش و صلاحیت۔ اپنی حدت اور غرور کی وجہ سے کوشش کرتی ہے کہ جو کچھ بھی اس سے مس کرے اسے جلا کر اپنے جیسا کر لے، یعنی آگ میں ایک خواہش ہمہ گیری موجود ہے کیونکہ وہ چاہتی ہے کہ ہر جگہ اسی کا راج ہو، یعنی یہ غیر کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتی۔ محاورتاً کہا جاتا ہے کہ آگ کسی سے متعلق نہیں اور نہ ہی یہ کسی کا لحاظ کرنے کو تیار ہوتی ہے بلکہ سب کچھ جلا دینے کی کوشش میں اپنا پورا زور لگا دیتی ہے۔ مشاہدہ میں آیا ہے کہ آگ گھبراتی ہے تو پانی سے کیونکہ آگ کی بھڑک نکال دینے کے لئے پانی زبان زدِ خاص و عام ہے۔ ایک جنس جو آگ میں کبھی نہیں جل سکتی، وہ پانی ہے۔ مقدار میں زیادہ ہو تو آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور کمیں ہو تو بخارات بن کر آگ سے بھی اونچا اڑ جاتا ہے۔

(i)iii۔ مٹی کا جامد ہونا۔ مٹی جمادات میں شمار کی جاتی ہے، کیونکہ اپنی مرضی سے متحرک نہیں ہو سکتی۔ جمود کی وجہ سے اس کی کوئی مخصوص شکل متصور نہیں ہو سکتی۔ کب، کہاں اور کس کروٹ بیٹھے، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بڑے سے بڑا پہاڑ اور چھوٹے سے چھوٹا پتھر یا ریزہ، اس مثال پر صادق آتے ہیں۔ ویسے پہاڑ ان چھوٹے ریزوں کا مجموعہ ہی ہوتے ہیں۔ صفتِ جمادی کی وجہ سے مٹی اس جہانِ دنیا میں محل کا رول ادا کرتی ہے۔ قدرتی طور پر، ازل سے سمندروں، دریاؤں اور چشموں کے پانیوں کا محل، آتش فشانوں کی شکل میں آگ کا محل اور کل مخلوقات کا بوجھ اٹھانے کی بنیاد پر جمادات کا محل، اسی کی مثالیں ہیں۔ قدرتی آفات سے مٹی کا جمود وقتی طور پر متاثر بھی ہو سکتا ہے، مثلاً طوفانی بارشیں، شدید گرمی و سردی، آسمانی بجلی اور اجرامِ فلکی کے اثرات معمولی تبدیلی کا باعث بن جاتے ہیں۔ کبھی مصنوعی (Mechanical) طریقے، جیسے نہروں اور ڈیم کی تعمیر، معدنیات کی تلاش

Marfat.com

کے لئے گہری کھدائی اور پہاڑوں پر شاہراہیں بنانے کے لئے ڈائنامائٹس (Dynamites) کا استعمال، بھی مٹی کا جمود متاثر کرتا ہے، مگر ایسے تمام حادثات کا اثر بہر طور جز وقتی ہوتا ہے، کیونکہ مٹی آخر کار نئے جمود سے ہم کنار ہو کر اپنی اس بنیادی صفت کو برقرار رکھتی ہے۔

(ii)iii۔ مٹی کا ثقل۔ مٹی زیادہ مقدار میں اکٹھی ہو جائے تو خاص قسم کے ذرات کی تعداد بڑھنے سے اس میں ایک صفت نمایاں ہو جاتی ہے کہ وہ تمام مخلوقات کو اپنی طرف کھینچ کر، ایک شفیق ماں کی طرح سینے سے چمٹائے رکھتی ہے۔ کوئی زور لگا کر اگر اس سے دور ہونے کی کوشش کرے، تو بھی ایک حد سے زیادہ جدائی برداشت نہیں کرتی۔ اس صفت کو مٹی کا ثقل کہتے ہیں۔ اپنی طرف کھینچنا یعنی کشش اسی صفت کی وجہ سے ہے۔ کائنات کی کُل مٹی میں سے کچھ زمین (Earth) بن گئی، کچھ سے چاند ستارے اور دوسرے سیارے بنائے گئے اور باقی ان گنت اجرام فلکی میں استعمال ہوئی۔ ہر جگہ ثقل کی قوت مختلف ہے کیونکہ یہ لوہے (Iron) کے ذرات کی تعداد سے براہِ راست منسلک ہے اور اس لحاظ سے دراصل مقناطیسی قوت ہے۔ مٹی میں لوہے کے ذرات جتنے زیادہ ہونگے، اتنی اس میں کشش ثقل زیادہ ہوگی۔ کسی بھی شے کا وزن، بوجھ اور بھاری پن مٹی کے اسی ثقل کا مرہون منت ہوتا ہے۔ ثقل زیادہ کشش کرے تو وزن زیادہ ہوگا اور اگر یہ قوت کم ہو تو بھاری پن میں اسی نسبت سے کمی ہوتی جائے گی۔ سائنسی طور پر مانا جاتا ہے کہ چاند کی کشش ثقل، زمین کے مقابلہ میں چھ گنا کم ہے۔ اس وجہ سے چاند پر ہر شے کا وزن، زمین کی نسبت چھ گنا کم ہوتا ہے۔

(iiii)iii۔ مٹی کا تنوع۔ جہانِ خلق کی تمام صورتیں مٹی ہی سے تشکیل پاتی ہیں۔ چونکہ اشکال کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی، اس لئے دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مٹی کی خاصیت تنوع کا کمال ہے۔ ان گنت اور لاتعداد صورتیں بنا دینے کے بعد بھی اس میں ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ کی صلاحیت ابھی برقرار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سائنسی طور پر تمام عناصر کے ذرات، مثلاً تانبا، لوہا، سونا، چاندی،

Marfat.com

پلاٹینم، کاربن اور نائٹروجن کے مختلف جزو اس میں موجود ہونے کے قوی شواہد میسر آئے ہیں۔ یہ عناصر نشوونما کے لئے نہایت کار آمد ثابت ہوئے ہیں۔ ان ہی مختلف ذرّات کی مختلف مقداریں، ایک دوسرے سے مل کر، کئی انواع واقسام کی صورتیں بناتی رہی ہیں اور بناتی رہیں گی۔ اگر اکیلے آدم ہی کی مثال لی جائے تو بھی سائنس تسلیم کرتی ہے کہ کوئی دو وجود ہم شکل نہیں ہو سکتے۔ ہاتھوں کی انگلیوں پر بنے نشان (Finger prints) ہر آدم کی شناخت کا سبب ہیں، اسی طرح آنکھ کا پردہ (Retina) بھی اپنی مخصوص بناوٹ کی وجہ سے ہر کسی کی پہچان کا باعث ہے۔ یہی بات تمام مخلوقات کے لئے صادق آتی ہے۔ بظاہر دیکھنے کو پرندے اور جانور، جو ایک ہی جیسے لگتے ہیں، اب سائنس مٹی کی اس صفت کے ثبوت میں ان پر تجربات کر کے یہ نتیجے اخذ کر رہی ہے کہ یہ تنوع اُن میں بھی لا محدود ہے۔

iv(i)۔ ہَوا کا ہر جگہ موجود ہونا۔ جہاں کہیں بھی کائنات میں اور کچھ نہیں ہے، وہاں ہَوا ضرور موجود ہوتی ہے۔ ممکنہ طور پر کائنات میں کوئی ایسا کونا نہیں جہاں ہَوا موجود نہ ہو۔ یہ اندازہ غلط نہیں کہ جب کچھ نہ تھا، کم از کم، ہَوا ضرور تھی، بالفاظِ دیگر کہا جا سکتا ہے کہ ممکنات میں سب سے اوّل ہَوا ہی تھی۔ چونکہ کائنات میں ہر مخلوق کو اپنی بقا اور زندگی کے لئے ہَوا کی بنیادی ضرورت ہے، جہاں ہَوا نہیں وہاں زندگی کا تصور بھی نہیں، اس لئے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہَوا سب سے پہلے ہوگی تو ہی زندگی کو زندگی میّسر آئے گی۔ سانس یعنی ہَوا کے بغیر زندگی کا دم گُھٹ جاتا ہے۔ وہ جنّت جہاں ہمیشگی ہوگی، بغیر ہَوا کے سوچی بھی نہیں جا سکتی، کیونکہ ہَوا ہی بقائے حیات کی اوّلین ضمانت ہے۔ حتٰی کہ آگ کا جلنا بھی ہَوا ہی کا مرہونِ منت ہے، اس لحاظ سے جہنم کا قرار بھی ہَوا کے تابع نکلتا ہے۔ جب نے جنّت اور جہنم معرضِ وجود میں آئے ہونگے، ہَوا لازماً ان سے قبل موجود ہوگی، کہ ان کے ہونے کا سبب بن سکے۔ بعینہٖ قیامت کے بعد جزا و سزا کے طور پر ان میں داخلہ تب ہی ہوگا جب یہ اپنے پورے جوبن پر ہونگی اور وہ ہَوا ہی کا کرشمہ ہوگا۔ مالکِ کائنات جہاں سے زندگی کو فنا کرنا چاہتا ہے وہاں سے ہَوا کو مفقود

Marfat.com

ہونے کا حکم دے دیتا ہے۔ جوں ہی ہَوا سمٹتی ہے، تصورِ حیات خود بخود سمٹ جاتا ہے۔ ہَوا نہ ہونے سے جنّت اور دوزخ ختم نہ ہوئے، تو کھنڈرات ضرور بن جائیں گے۔

iv(ii)۔ ہَوا کا نظر نہ آنا۔ ہَوا اپنی ذات میں مخصوص اور ٹھوس شکل نہیں رکھتی، اس لئے دکھائی بھی نہیں دیتی۔ اہلِ دانش نے اس کے ہونے کے شواہد ڈھونڈ لئے ہیں مگر اپنے گردونواح میں اس کی مستقل موجودگی کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اس کی ٹھوس شکل نہ ہونا ایک لحاظ سے رحمت ہے وگرنہ ہر جگہ ہونے کے باعث کبھی اچانک مڑنے پر اس سے ٹکر ہونے کا امکان ہو سکتا تھا، بلکہ ہر قدم پر ٹکرانے کی آوازیں سنائی دیا کرتیں۔ آندھیوں کی شکل میں جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے، وہ دراصل مٹی کے ذرات ہوتے ہیں جنہیں ہَوا اپنے ساتھ لے اُڑتی ہے۔ نظر نہ آنے کی طرح، ہَوا سنائی بھی نہیں دیتی۔ ذاتی طور پر اس کی کوئی خوشبو بھی نہیں اور نہ ہی چکھنے میں کوئی ذائقہ ہے، مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دیکھنے، سننے اور سونگھنے کے عوامل ہَوا ہی کے تابع ہیں۔ آواز کی لہریں ہوں کہ خوشبو کے جھونکے، ہَوا ان کو اپنے دوش پر بٹھا کر، اچھے امین کی طرح مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیتی ہے، جب کہ روشنی کی کرنیں بھی اسی کے ہمراہ سفر کرتی آنکھ میں داخل ہوتی ہیں۔ بارشیں برسانے والے بادل اسی کے کندھوں کے محتاج ہیں، اُڑنے والی تمام مخلوقات کا فضا میں امساک ہَوا کا مرہونِ منت ہے، اس کے باوجود نہ تو اس نے کوئی معاوضہ طلب کیا ہے اور نہ ہی کوئی احسان رکھتی ہے، بلکہ خاموشی اور سرعت کے ساتھ کائنات کا تمام نظام چلا بھی رہی ہے اور اس کی معاونت بھی کر رہی ہے۔ آج تک اندازہ نہیں کیا جا سکا کہ ہَوا اپنے ہونے کے لئے کس کی رہین ہے؟!

iv(iii)۔ ہَوا کا تسلسل۔ یہ بھی ایک لطیف خوبی ہے کہ ہَوا کی ہر جگہ موجودگی، تسلسل والی اور ہم آہنگ ہے، اس میں کہیں رکاوٹ بمعنی (Discontinuity) نہیں ملتی۔ ازل سے ہے اور ابد کے بعد تک بھی مسلسل برقرار رہے گی۔ عرش معلّیٰ سے لے کر تحت الثریٰ تک، مغرب تا مشرق اور شمال

Marfat.com

سے جنوب کی سمت اس کی ایسی راج دہانی ہے کہ ایک ذرّہ برابر جگہ سے بھی غائب نہیں۔ اس کا عجیب و غریب تسلسل کہیں ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ کوئی طبعی وجود اگر کسی جگہ رکاوٹ کا سبب بنتا محسوس ہو بھی رہا ہو تو اس کے باوجود اس کا آپس میں پیوست ہونا برقرار رہتا ہے۔ کُل کائنات میں سورج، زمین، چاند، ستارے اور تمام سیّارگان اپنے حجم کی وجہ سے اس میں رکاوٹ بنتے ہیں، مگر حقیقتاً ان کے اطراف اور گرداگرد ہَوا کا لافانی تسلسل کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس تسلسل میں ایک اور نمایاں صفت ہے کہ ہر جگہ اس کے خواص بھی یکساں ملتے ہیں۔ باقی تمام عناصر یعنی پانی، آگ اور مٹی، جن کا ذکر بالا بحث میں آیا ہے، ان میں یہ صفت کسی شکل میں نہیں جبکہ ہَوا میں اگر تسلسل کا ٹوٹنا تصور کیا جائے تو یہ کفر کے مترادف ہے۔

طبعی خواص پر کی گئی بحث سے نکلنے والے نتائج (Inferences):۔

i۔ پانی کے متعلق نتائج۔ بہاؤ کی وجہ سے پانی کبھی ناپاک نہیں ہوتا۔ ویسے بہاؤ ایک لگن کی نشاندہی ہوتا ہے۔ پانی کا ہمیشہ رواں دواں رہنا، ایسی لگن ہے جو کسی بیرونی اثر (Factor) کے تابع نہیں ہے۔ ٹھہرنا اور رکنا اس کی سرشت میں شامل ہی نہیں۔ ہمیشگی کا بہاؤ، ہَوا کے تسلسل کی مانند ہے، بلکہ یوں لگتا ہے کہ اس سے مستعار لیا گیا ہو۔ دوسرے کو گیلا کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا، کیونکہ جتنا پانی گیلا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے وہ اپنی مکمل حیثیت ہی کھو دیتا ہے، اس پر الزام لگنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے اس میں ذات کی نفی اور حیثیت کا مکمل طور پر ختم ہو جانا بھی پایا جاتا ہے۔ یہ خاصیت فقط دوسرے کا بھلا کرنے کی غماز ہے، چاہے اپنی ہستی فنا ہو جائے۔ ہر محل کی شکل اختیار کرنا انتہائی انکساری کا نشان ہے، جس میں مادۂ غرور کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ کسی کا اس طرح ہونا ہے کہ، فیض یاب کرنے کے بعد بھی، نہ احسان جتایا جائے اور نہ ہی کوئی توقع وابستہ کی جائے۔ اپنی ذات کی نفی اس حد تک کرنا کہ دوسرے کے مقام تک نیچے اتر کر اس جیسی

Marfat.com

شکل اپنائی جائے۔ حالانکہ کسی کا ظرف بھر چکا ہوتا ہے، مگر محل کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ کس کا کرم ہے؟ پانی کی اپنی کوئی شکل مذکورہ ظرف میں بھی نظر نہیں آتی۔ بیان کی گئی تمام تر خصوصیات 'کردار ولایت' کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے اور کبھی اپنی لگن نہیں چھوڑتا۔ ہر لمحہ کا حق ادا کرنے والا ہے۔ جیسے وقت نہیں تھمتا، اسی طرح لمحات کی زنجیر کی محافظت اس کے دوام کا سبب بنتی ہے۔ وقت لازماً ہر کسی پر اپنا اثر نہیں چھوڑتا مگر ولایت جس سے متعلق ہو جائے اسے لبالب کر دیتی ہے، چاہے اپنی حیثیت تک کھو جائے۔ مرشد کی حیثیت مرید کی شکل بدل لیتی ہے اور راہبر و راہنما کی شکل مقتدی کا روپ دھار لیتی ہے۔ ظرف بھر کر، پردہ کرتی ہوئی، محل کے روپ میں برقرار ہو جاتی ہے۔ سو پانی کردارِ ولایت کے خواص کا حامل نکلا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نتیجہ نمبر۔(۱)

ii۔ آگ کے متعلق نتائج۔ اپنے آپ میں جلتے رہنا، حسد، بغض اور کینہ کی طرف اشارہ ہے۔ ہر وقت اندر ہی اندر جلتے رہنے والے اصل میں خود کو کمزور اور کھوکھلا کر رہے ہوتے ہیں۔ سورج کے جتنا بڑا جحم ہی کیوں نہ ہو، اپنی آگ میں جلتے ہوئے بالآخر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اسے اپنی موت خود مرنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آگ بہت دانش مند ہونے کے باوجود اس ازلی حقیقت سے بے خبر ہے۔ چونکہ شعلہ اوپر کی جانب اٹھتا ہے اس لئے اس میں غرور و تکبر کا پہلو بھی نمایاں ہے، ممکن ہے بیان کی گئی بے خبری اسی مادۂ غرور کی وجہ سے ہو۔ آگ کی روشنی دور سے بھلی محسوس ہوتی ہے اور اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ یہی روشنی موسیٰ کو راغب کر کے حدت سے ان کی زبان جلا دیتی ہے، اور کبھی اسی روشنی میں حدت تلاش کرتے ہوئے موسیٰ کو نبوت مل جاتی ہے۔ اصل میں یہ روشنی مفعول کے حال کے مطابق اس پر اثر انداز ہوتی ہے، بچپنے کی بے خبری میں زبان جلا بیٹھے اور ہوش و حواس کی توانائی کی حالت میں حامل نبوت ہوئے۔ آگ کے علاوہ کسی اور روشنی میں یہ استطاعت نہیں کہ اتنا وسیع اور مختلف (Wide and varied) ردِ عمل کرے۔ اگر مفعول مستقیم الحال نکل آئے تو یہ اپنا آپ چھوڑ کر گل و گلزار بن جاتی ہے۔ خلیل

Marfat.com

اللہ نے جب ' حَسْبُكَ سُوَالِیْ عِلْمُكَ بِحَالِیْ ' فرمایا تو اس استقامت کے صدقہ میں آگ سلامتی کا روپ دھار گئی۔ سب کچھ کو اپنے جیسا کرنے کی تمنا صرف آگ ہی میں ہے، جلتی آگ میں جو کچھ جھونکا جائے وہ بھی خاکستر ہو جاتا ہے، مگر سادات کے وجود اس سے امن میں رہتے ہیں۔ یہ شیطانیت کے خواص ہیں۔ وسوسۂ شیطانی آگ کی روشنی کی طرح دور سے بھلا لگتا ہے، مگر اس کی قربت باعثِ نقصان ہوتی ہے۔ ہر وقت تکبر اور کینہ سے بھرے رہنا اور سب کچھ کو اپنے جیسا کرنے کی کوشش کرتے رہنا، شیطان لعین ورجیم ہی کے وصف ہیں۔ ساداتِ زمانہ اور اولیاء اللہ اس کے دامِ فریب سے محفوظ کئے گئے ہیں۔ آگ کردارِ شیطانیت کے خواص کی حامل نکلی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نتیجہ نمبر (۲)

iii۔ مٹی کے متعلق نتائج۔ مٹی کا جمود، حالت بدلنے کی قدرت سے بے بہرہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ ایک بڑے پتھر کے ٹکڑے کئے جائیں تو وہ سنگ ریزوں میں ہی تبدیل ہوتے ہیں، جو جمود کی کیفیت سے فارغ نہ ہونگے۔ لیکن چھوٹے سے چھوٹا اور معمولی ذرّہ بھی وزن رکھے گا اور اپنی ایک حیثیت کا حامل ہوگا، جس کو منوانا وہ کبھی نہیں چھوڑتا، یعنی اپنی مَیں کو مرنے نہیں دیتا۔ کسی پتھر کو جس بھی زاویہ سے دیکھا جائے، ایک نیا رنگ اور انداز نظر آئے گا۔ اس تنوع کو بھی مٹی کسی قیمت پر ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ زبان زدِ خاص وعام ہے کہ مٹی کی سب سے افضل صورت آدم و بنی آدم ہے اور حقیقت ہے کہ مٹی کی صفات اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جمود کا یہ عالم ہے کہ امریکی، برطانوی بننے کو تیار نہیں، چینی، جاپانی کہلانے کا روادار نہیں اور ہندوستانی کبھی پاک ہونے کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ جمودِ مٹی کی سرشت کی وجہ سے ہے۔ بنی آدم اپنا تشخص بھی ہر حالت میں برقرار رکھتا ہے۔ ویت نام جیسا معمولی ملک، اپنے تشخص کے قرار کے لئے امریکہ کو ناکوں چنے چبوا دیتا ہے۔ اسی کے صدق و استقامت کے ثبوت میں غازی علم الدین شہیدؒ جیسے گمنام سپاہی بے دریغ، قابلِ رشک عمل کر گزرتے ہیں۔ یہی تشخص نشہ کی حالت میں بھی حافظ اختر شیرانی صاحب کو مستقیم الحال کر دیتا

Marfat.com

ہے۔ آدمیت کی تاریخ میں جن لوگوں کے نام زندہ ہیں وہ اصل میں ان کے ذاتی ثقل کا اظہار ہے کیونکہ ہر ایک کا ذاتی ثقل ہی دوسرے کو اپنی طرف متوجہ (Attract) کرنے میں معاونت کرتا ہے۔ جمود کی وجہ سے مٹی بے اختیار اور ثقل کی وجہ سے بااختیار ہے۔ بنی آدم کے دو لمحے ایک جیسے نہ گزرنا، مٹی کے تنوع کی وجہ سے ہے۔ بقولِ شاعر 'آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں' خلق در خلق کی نشاندہی ہے، جو صفتِ تنوع ہی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ تمام کردارِ آدمیت کی صفات ہیں۔ آدم کی تخلیق میں مٹی کا عنصر سب سے زیادہ ہے جس کی بنیاد پر اس میں جمود، ثقل اور تنوع نمایاں ہے۔ مٹی کردارِ آدمیت کے خواص کی حامل نکلی ------------------ نتیجہ نمبر (۳)۔

iv۔ ہوا کے متعلق نتائج۔ ہوا کا ہر جگہ موجود ہونا بہت اہمیت کا حامل ہے۔ چاہے خلا ہی کیوں نہ ہو، ہوا وہاں ضرور ہوگی بلکہ کائناتِ ارض و سماء میں کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ہوا نہ ہو۔ اس کے تسلسل کو کہیں رکاوٹ نہیں، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کُل کائنات اسی تسلسل کا مظہر ہے۔ ہوا کے بغیر کسی جاندار کا قرار و بقا ممکن نہیں۔ ہونے کو یہ شہ رگ سے ہر وقت قریب ہے اور مخلوقات کے آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں بائیں، حتیٰ کہ ذرہ ذرہ میں اس کا ہونا پایا جاتا ہے، اس کے باوجود یہ نہ نظر آتی ہے اور نہ کسی طرح محسوس کی جا سکتی ہے۔ حسیات، اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، کیونکہ نہ اس کی کوئی شکل ہے، نہ رنگ، خوشبو اور ذائقہ۔ کسی دوسرے مظہر مثلاً مٹی پانی یا آگ کی وجہ سے اس کے ہونے کا احساس ممکن ہو سکتا ہے، وگرنہ دراصل ہوا، ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتی۔ یہ خواص کردارِ الوہیت سے متماثل ہیں۔ ذات باری تعالیٰ ہر جائی ہے، جیسے ہوا ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ کائنات کے ہر ذرہ میں اسی مالک کا ظہور ہے۔ اس کی بھی نہ کوئی مثل ہے نہ مثال۔ وہ کسی آنکھ میں نہیں سما سکتا کیونکہ نہ اس کی شکل ہے اور نہ ہی رنگ و خوشبو۔ کائنات بھر میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں اس کا جلوہ نہ ہو، پھر بھی نہ چھوا جا سکتا ہے نہ کسی کے ادراک میں آسکتا ہے۔ کسی دوسرے

Marfat.com

مظہر کی وساطت سے کبھی کبھی اس ذات واجب الوجود کا نشان مل بھی جاتا ہے۔ وہ بھی ہوا کی طرح شہ رگ سے قریب ہونا پسند کرتا ہے۔ جیسے ہوا کے بغیر جاندار نہیں، اسی طرح اللہ کے بغیر کچھ نہیں۔ وہ کل کو خلق کرتا ہے، تو ہَوا کے بغیر اس کی مخلوق کی زندگی اور بقا ممکن نہیں۔ سو ہوا کردارِ الوہیت (توحید) کی حامل نکلی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نتیجہ نمبر (۴)

ان چار نتائج کے بعد چند داستانیں بیان کی جاتی ہیں جو ہمارے نتائج کو تقویت بھی دیں گی اور کسی حد تک مزید تشریح کا باعث بھی ہوں گی۔ حتٰی المقدور کوشش ہو گی کہ یہ داستانیں قرآن کی نص کے مطابق ہوں یا کسی نصِ قرآن کی نفی کرنے والی نہ ہوں۔

داستانِ اوّل: جد الانبیاء ابراہیمؑ اور نبی آخر الزماںؐ کے درمیان تریسٹھ (۶۳) نسلوں کا فاصلہ ہے، جب کہ اسماعیلؑ باسٹھویں نسل میں سے ہیں۔ حضورؐ کی عمر مبارک کی قرآن میں قسم کھائی گئی ہے اور اس کی مطابقت جد الانبیاء سے نسلوں کی گنتی کے مطابق ہے۔ ابراہیمؑ کے لیے سورۃُ البقرہ آیت ۱۲۴ میں ہے: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا: یعنی ہم نے آپ کو عوام النّاس کے لیے امام مقرر کیا۔ یہ ابراہیمؑ کا امتیاز تھا کہ نبی اللہ، رسول اللہ اور خلیل اللہ کے بعد چوتھا شرف پہلے امام النّاس کا ملا۔ ان کی پہلی نرینہ اولاد ۸۶ برس کی عمر میں ان کے ہاں پیدا ہوئی۔ اسماعیلؑ نے چھوٹی عمر میں ہی اپنے والد سے فرمایا کہ آپ مجھے ہمیشہ صابر پائیں گے اور یہ کامل حال نطفہٗ امام النّاس ہونے کا صلہ ہے۔ اسماعیلؑ طفل عمری میں بے آب و گیاہ ریگستانِ مکہ میں، منشاءِ ایزدی سے والدہ کے ہمراہ اکیلے چھوڑ دیے گئے۔ پیاس کی شدت و بے چینی سے جب انہوں نے ایڑیوں کو زمین پر رگڑا، تو قدرت کاملہ نے پانی کا ایک چشمہ جاری کر دیا۔ یہ اجرائے کردارِ ولایت کی نشاندہی تھی جس کا سبب امام النّاس کا نطفہ ہوا۔ لیکن تب اُس پانی کو حکم دیا گیا، زم زم یعنی ابھی تھم جا، اور رُک رُک کے چل۔ اسماعیلؑ صبر و رضا

Marfat.com

کے پیکر ہیں جو ولایت کے سب سے نمایاں خواص ہیں۔ ایڑی رگڑ کر جو فوطہ رواں کرتے ہیں وہ زم زم کہلایا، جس سے آج تک اور کوئی قابل ذکر شے بر آمد نہیں ہوئی۔ ابراہیم کی ۶۲ ویں نسل میں ابو طالبؑ پیدا ہوئے، جنہیں امامِ اعظم کہنا بجا ہے۔ ان کے صاحبزادہ علیؑ، امامِ اوّل بھی ہیں، ولایت کلی کے مالک، دامادِ رسولؐ اور وصیٔ رسول بھی ہیں۔ بارہ امامین، یکے بعد دیگرے اِسی امام اوّل کی اولاد میں ہوئے اور کائنات میں کُل ولایت بھی اسی کی توجہ کا صدقہ ہے۔ بشکل ولایت جو چشمہ اس کے قدموں کی نسبت سے جاری ہوا، اُسے ' زم زم' کا حکم نہیں بلکہ اس کے لیے: یَخۡرُجُ مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَ الۡمَرۡجَانُ: کا عندیہ موجود ہے۔ وہ خود، ولیٔ کامل ہے اور ہر نوع کی ولایت اسی 'باب العلم' کے در سے متعلق ہے۔ وہ کوفہ کی جامع مسجد کے منبر پر بیٹھ کر کہتے ہیں۔ سَلُوۡنِیۡ سَلُوۡنِیۡ۔ قَبۡلَ اَنۡ تَفۡقِدُوۡنِیۡ (پوچھو پوچھو مجھ سے ہر قسم کے سوالات قبل اس کے کہ میں تمہارے درمیان نہ رہ جاؤں)۔ کائنات بھر میں کوئی اور ایسا فرد نہیں، جس نے علمِ کُلی سے واقفیت کا دعویٰ اس شکل میں کیا ہو۔

داستانِ دوئم: پیاس یا عطش ایک ایسی کیفیت ہے جو جاندار کے جسم میں پانی کی کمی کے احساس کی بنیاد پر ابھرتی ہے، ظاہر علامات میں ہونٹوں کی خشکی ہو سکتی ہے مگر درحقیقت یہ اندر ستانے والی ایک باطنی کیفیت ہے۔ سچ ہے کہ سچی پیاس پانی ہی سے بجھتی ہے - ہر کسی کی پیاس کی کیفیت اور حالت پیاس میں ردِ عمل مختلف ہوتا ہے بلکہ ہر کسی کی پیاس ہی مختلف ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کربلا کے مقام پر امام حسینؑ، ان کے اہل خانہ اور رفقاء، پیاس کی شدت سے بے چین ہو کر ایک گھونٹ پانی کے لئے ترس گئے تھے، حالانکہ فرات قریب تھا، مگر وہاں پہنچ مشکل تھی۔ واقعہ ہے کہ حسینؑ پانچ برس کے تھے، اماں فضہؓ گھر کے فاقوں میں بچوں کی طرف سے فکر مند رہتی تھیں۔ چونکہ بحیثیت ملکہ چاندی بنانے کا علم جانتی تھیں اس لئے ایک دن مناسب وزن کی چاندی تیار کی اور اچھی قیمت ملنے کے خیال سے اسے

Marfat.com

مچھلی کی مشابہت دے دی۔ پھر حضورؐ سے درخواست کی کہ اسے بازار لیجا کر فروخت کریں تاکہ کھانے کا بندوبست ہو سکے۔ آپؐ نے فرمایا یہ خدمت علیؑ سے لے لیں۔ جب انہیں ماجرا بیان کیا تو کہنے لگے حسنؑ کو بھجوا دیں۔ حسنؑ فرمانے لگے کہ حسینؑ مجھ سے بھی چھوٹے ہیں اس لئے ان کو اس کام پر معمور کریں۔ حسینؑ تمام سرگزشت سن کر بی بی فضہؓ کو اپنے ہمراہ پچھلے کمرہ میں لے گئے۔ زمین پر بائیں پاؤں کی ایڑی رگڑی تو زمین شق ہو گئی۔ بی بی نے دیکھا حدِ نگاہ تک پانی ہے اور اس میں سونے کی بڑی بڑی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ امامؑ نے فرمایا، اماں آپ نے ناحق اتنا بوجھ لے کر چاندی کی مچھلی بنائی، یہی مقصود تھا تو مجھے اشارہ کرتیں، سونے کی یہ تمام مچھلیاں حاضر کر دیتا۔ ظاہراً کمسنی میں اگر حسینؑ کی ایڑی سے یہ معجزہ ممکن تھا تو کیا امامِ وقت کی حیثیت میں وہ فرات کے محتاج ہونگے؟ اسماعیل کا زم زم جاری کرنا بے اختیاری کا فعل تھا، جبکہ حسینؑ نے اپنے اختیار سے رواں فوطہ بہا دیا۔ کیا کربلا میں معصومین کو پینے کا پانی مہیا کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا تھا؟ قافلۂ حسینؑ کو دراصل کردارِ پانی کی پیاس تھی، سادہ پانی کی نہیں۔ فرمانِ ایزدی کی حرمت پامال ہو رہی تھی، اس حالت میں کردارِ رسالت و ولایت کی پاسداری کی پیاس اپنے خون کے علاوہ اور کسی طرح بجھا ہی نہ سکتے تھے۔ شاید حالات ہماری سوچ سے زیادہ خراب تھے اس لئے ایک وجود کا خون کافی نہ ہوا، بہتر (۷۲) وجودوں کے خون سے یہ پیاس بجھ سکی، جس میں کمسن اور معصوم علی اصغر کا خون بھی شامل ہے!

داستانِ سوئم: جب نوحؑ اپنی قوم سے مایوس ہو چکے تو قدرت کاملہ نے انہیں وافر پانی مہیا کیا جس سے انہوں نے دنیا کو دھو کر پاک کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح شاید نوحؑ کی تسلی ہو گئی ہو۔ مگر اس میں ایک نکتہ ملتا ہے کہ دنیا دھونے اور پاک کرنے کے لئے بنوت اکیلی کافی نہیں ہے، پانی یعنی کردارِ ولایت بہت اہم ہے، جو نوحؑ کو بے انتہا مقدار میں میسر آیا۔ اس ارزاں اور وافر ترسیل کے ردِّ عمل کے طور پر نوحؑ کے بعد ابراہیمؑ کو بہت بڑی آگ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر عمل کا ردِّ عمل، عمل کی قوت کے

Marfat.com

عین مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے زیادہ پانی سے زمین دھونے کے نتیجہ میں اتنی ہی شدت سے شیطانیت کی آگ بھڑکی، جسے ابراہیمؑ کو براہِ راست نبٹنا پڑا۔ آسمان کی بلندی تک اڑتا ہوا پرندہ بھی آگ کے اوپر آتا تو جل کر خاکستر ہو جاتا۔ پرندہ اور اس کی پرواز، خیال اور اس کی پرواز کے مترادف ہے، یعنی شیطانیت کا زور اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ہر خیال کے پَر جلنے لگے۔ ابراہیمؑ جب اس میں جھونکے گئے تو وہ آگ مقامِ خلت کو برداشت نہ کر سکی، اپنی اصل تک چھوڑ گئی اور ٹھنڈی ہو کر سلامتی کے محل میں گل وگلزار بن گئی۔ ازاں بعد موسیٰ بچپن کی ناپختگی میں اس سے برسرِ پیکار ہوئے تو زبان جلا بیٹھے اور جب شعیبؑ کی تربیت سے پختہ ہو گئے تو اس کی روشنی ان کے لئے نبوت کا باعث ہو گئی۔ دوزخ جو آگ سے بنی ہے اصل میں کردارِ شیطانیت ہی کی طرف اشارہ ہے۔ جب تک اپنے وجود میں شیطانی وسوسہ جات سے مکمل چھٹکارا نہیں ہوتا، ہم جہنم ہی کے باسی ہوتے ہیں۔ جوں جوں غلبۂ شیطانی سے آزادی ملتی ہے، روح کی تازگی بہشت کی ٹھنڈی ہواؤں کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ غرور، تکبر اور سب کچھ سمیٹ لینے کا لالچ ہی ہمارے اندر کا شیطانی جذبہ ہے، جو نت نئے منصوبے (Edifices) بنا کر ہمیں ورغلانے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان وسواسِ شیطانی سے اللہ کی پناہ مانگنے کے سوا چارا ہی نہیں اور اگر توفیقِ ایزدی میسر آ جائے تو ہمیشہ کی جنّت صلہ ہوتا ہے۔

داستانِ چہارم: سورۃ البقرہ آیت ۳۰ میں ہے: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً: یعنی یاد کرو جب تمہارے رب نے ملائکہ سے فرمایا میں ارض (زمین، مٹی) میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ فرشتوں کے لئے حکم ہے کہ اعلانِ خلافت ہوتے ہی اس کی معاونت کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ذات باری ارض کی خالق ہے، اس نے فیصلہ کیا کہ خلیفہ بنا کر، زمین نگرانی کے لئے آدم کے سپرد کر دے۔ مالک نے اپنی جگہ، کُل ملائکہ سے، اسی طرح مٹی کو سجدہ کروایا۔ جیسے کسی ملک کا سفیر

Marfat.com

(Ambassador) جب نمایندگی کے طور پر دوسرے ملک میں بھیجا جاتا ہے تو اسے وہاں تعظیمی سلامی (Guard of honor) پیش کی جاتی ہے۔ یہ سلامی صدرِ مملکت کے لئے ہوتی ہے مگر سامنے وہ سفیر ہوتا ہے اور ایسے سفیر کو بجا طور پر خلیفہ کہا جا سکتا ہے۔ ملائکہ کا سجدہ، تعظیمی سلامی کے مترادف تھا۔ آگ یعنی کردارِ شیطانیت نے اپنی سرشت کا اظہار کیا اور تکبر کی وجہ سے انحراف کر گئی۔ شاید اپنی ہی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ حکم کس کا ہے۔ جبکہ نُوری مخلوق نے بجا آوری کا حق ادا کر دیا۔ آگ نے عرفانِ ذات کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا، یہ ناممکن ہے اسے سجدہ کروں جسے اپنی خبر نہیں۔ معلوم ہوا جو اپنی ذات کا عارف ہو، آگ اسے سجدہ سے انکار کی کوئی دلیل نہ لا سکے گی۔ اس لئے شیطانی قوت کو زیر کرنے کے لئے ذات کا عرفان لازم ہوا۔ خلیفہ ہونے اور تعزیمی سلامی لینے کے بعد، یہ جامد کسی جنّت میں جا کر ٹھہراؤ کا شکار ہو گیا۔ لیکن ثقل کی وجہ سے کردارِ آگ کو اپنی طرف متوجہ بھی کیا اور تنوع کی خاصیت کی بنیاد پر اپنے لئے نئی راہیں بھی جلد متعین کر لیں۔ کردارِ آگ نے سمجھایا کہ ٹھہراؤ چھوڑ کر بہاؤ اختیار کر لو، ہمیشگی میّسر آجائے گی، تنوع کے مادہ نے فوراً قبول کرنے پر مجبور کیا اور ہنس کی چال چلا، اپنی بھی بھول گیا اور آج تک اسی بھول میں مبتلا بھی ہے اور اس کی سزا بھی بھگت رہا ہے۔ بقول بلھے شاہؒ

'اتاں بابے دی بھلیائی، اوہ ہن کم اساڈے آئی'۔ (پنجابی)

داستانِ پنجم: ہوا زندگی کی اساس ہے اس لئے ماننا پڑے گا کہ یہ زندگی کی آفرینش سے قبل موجود تھی۔ ہَوا نہ ہوتی تو زندگی کو زندہ رہنا کیسے میّسر آتا۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہَوا تھی، جب کچھ اور نہ تھا۔ کچھ بھی اور ہونے کے لئے چونکہ ہَوا ضروری ہے اس لئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہَوا تھی، ہے اور رہے گی۔ جس کی اپنی کوئی ساخت، بناوٹ، کیفیت اور صورت ہو وہ نمایاں اور ظاہر ہو ہی جاتا ہے

Marfat.com

جب کہ ہوا کردارِ الوہیت کی حامل ہونے کے ناطے اس جنجال سے پاک ہے۔ نہ دیکھی جا سکتی ہے نہ محسوس ہوتی ہے۔ ذائقہ اور خوشبو سے بھی مبرا ہے مگر دیکھنے، سننے اور سونگھنے کا عمل اس کی موجودگی کے بغیر ناممکن ہے۔ اس ذات لم یزل کی طرح ہر جگہ ہے، کائنات میں کہیں اس کا تسلسل ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ کُلیت میں اس کا تناسب بھی برقرار ہے۔ کائنات کے لامحدود پھیلاؤ میں اپنے تسلسل اور تناسب کو برقرار رکھنا، شانِ الوہیت ہی کی مانند ہے۔ سانس کے عمل کے تحت، شہ رگ سے بھی قریب ہونا، اس کے لئے غیر موزوں تو نہیں؟ اس کے علاوہ شہ رگ سے نزدیک اور کیا ہو سکتا ہے؟ سانس کے بنا زندگی کا تصور نہیں اور سانس خود فقط ہوا ہے۔ آگ کے ہونے اور جلنے کا عمل اسی کا مرہونِ منت ہے۔ آگ بھڑکانے میں مددگار ہوتی ہے، مگر خود آگ میں کبھی نہیں جلتی۔ ہوا رک جائے تو آگ بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ ہوا پانی کے ساتھ یکجان ہو کر رہنا پسند کرتی ہے اور مٹی اور اس کی تنوع کے لئے توجُزْوِ لَا یَنْفَکّ کا کام کرتی ہے۔ ہر پودے کی نشوونما اسی کے تابع ہے۔ مختصر یہ کہ ہر کسی کو ہوا کی ضرورت ہے مگر خود یہ کسی کی محتاج نہیں اور یہی اس میں شانِ بے نیازی کی جھلک ہے۔ ہوا نے جس طرح کُل کائنات کا احاطہ کرر کھا ہے، وہ: اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ: خدا کی صفت کی مماثلت ہے۔

اب ہم غور کرتے ہیں کہ اگر دو، دو یا تین، تین یا پھر کُل چاروں عناصر کو باہم ملایا جائے تو کیا ممکنہ عملی اشکال سامنے آ سکتی ہیں اور ان سے کیا مزید نتائج مرتب کئے جا سکتے ہیں، تاکہ تخلیق کائنات کے مراحل کا جائزہ لینا اور اسے سمجھنا آسان ہو سکے۔

دو، دو عناصر کا ملاپ:۔ اس کے کُل چھ امکانات ہیں، جنہیں ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

i۔ پانی اور ہوا۔ ہوا کے ساتھ مل کر پانی کا بہاؤ بھی جاری رہے گا اور گیلا کرنے کی صلاحیت بھی بر قرار رہے گی۔ محل کی شکل اپنانے والی صفت پانی کو چھوڑنی پڑے گی کیونکہ ہوا کی اپنی کوئی مخصوص اور ٹھوس شکل ہے ہی نہیں۔ اسی طرح پانی سے مل کر ہوا نظر نہ آنے والی صفت بر قرار رکھے گی مگر ہر جگہ موجود ہونے اور تسلسل کی صفات پانی ہی میں محدود کر دے گی۔

(بہاؤ + گیلا پن + محل کی شکل) + + (ہر جائی + نظر نہ آنا + تسلسل) = (بہاؤ + گیلا پن + نظر نہ آنا) = بقایا تین صفات۔ یعنی ولایت و الوہیت باہم اشتراک کریں، تو ولایت، کائنات میں رہنے اور اثر پذیر ہونے کے لئے اپنا بہاؤ اور گیلا پن بر قرار رکھے گی جبکہ یہ کبھی الوہیت کی شکل نہ اپنا سکے گی۔ اس کے مقابلہ میں الوہیت، ولایت میں سرایت کر کے بھی نظر نہیں آ سکتی جب کہ تسلسل اور ہر جائی پن کو ولایت ہی میں گُم کر دیتی ہے۔ الوہیت کی چاہت ہے کہ ولایت سے مَس ہونے کے بعد اسی میں محدود ہو جائے۔

ii۔ پانی اور مٹی۔ پانی مٹی سے مل کر بہاؤ چھوڑ دیتا ہے مگر گیلا کرنا بر قرار رکھتا ہے اور بخوشی، جس مٹی سے ملاپ ہو اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جب کہ مٹی، پانی سے مل کر اپنے جمود اور ثقل کو قائم رکھتی ہے (بلکہ یہ دونوں بڑھ جاتے ہیں) مگر صفتِ تنوع محدود ہو جاتی ہے۔ پانی ملی یکجان مٹی سے چند مورتیں ہی بن سکتی ہیں۔

(بہاؤ + گیلا پن + محل کی شکل) + + (جامد + ثقل + تنوع) = (گیلا پن + محل کی شکل + جامد + ثقل) = بقایا چار صفات۔ یعنی ولایت، آدمیت سے دوچار ہو تو اس میں محدود ہونا پسند کرتی ہے اور کُل کائنات میں پھیلنا متروک کر دیتی ہے، لیکن اس آدم کی ذات میں اور اس کی وساطت سے اپنا اثر ضرور پہنچاتی ہے۔ اپنی شکل بھی فخریہ طور پر اس آدم جیسی کر لیتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ آدم جس میں ولایت عود کر آتی ہے، اپنا جمود نہیں توڑ سکتا اس لئے بشری اور فطری تقاضوں کے تحت اپنی شکل

Marfat.com

برقرار رکھتا ہے۔ اس کا ثقل بھی قائم رہتا ہے بلکہ ولایت کے ملنے سے آدم کا ثقل بڑھ جاتا ہے۔ تنوع، بہر طور اس آدم سے چھوٹ جاتا ہے۔ ایسا آدم ایک ہی سمت اور 'در' کا ہو کے رہ جاتا ہے اور یہ خوش قسمتی ہے۔

iii۔ پانی اور آگ۔ یہ اگر کبھی آپس میں ملیں، تو پانی کا بہاؤ اور گیلا کرنے کی صلاحیت ہر قیمت پر برقرار رہیں گے۔ لیکن پانی نے آج تک آگ کی شکل اختیار نہیں کی۔ جبکہ پانی سے مل کر، آگ اپنی تینوں صفات (حدت، روشنی اور اپنے جیسا کرنا) کھو بیٹھتی ہے۔ (بہاؤ + گیلا پن + محل کی شکل) ++ (حدت + روشنی + اپنے جیسا کرنا) = (بہاؤ + گیلا پن) = بقایا دو صفات۔ یعنی ولایت و شیطانیت جب بھی مدِ مقابل ہونگے، شیطانیت کو دم توڑنا پڑے گا، جب کہ ولایت، جو دوسرے محل کی شکل اختیار کر لیتی ہے، یہ کام ہرگز نہ کرے گی۔ ولایت کسی حال میں شیطانیت کی شکل نہیں اپنا سکتی اور اس سے مس ہونے کے باوجود کائنات پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔

iv۔ ہوا اور مٹی۔ ہوا، مٹی سے مل کر اپنے تمام خواص کو برقرار رکھے گی اور مٹی بھی، ضد سے اپنی کسی خاصیت کو نہیں چھوڑ سکے گی۔ یعنی یہ دونوں عناصر آپس میں اشتراک کر ہی نہیں سکتے۔ ان کے ملاپ کے لئے دوسرے عناصر کی موجودگی ضروری ہوگی ۔

(ہر جائی + نظر نہ آنا + تسلسل) ++ (جامد + ثقل + تنوع) = (ہر جائی + نظر نہ آنا + تسلسل + جامد + ثقل + تنوع) = تمام صفات یعنی الوہیت اور آدمیت کا اشتراک ممکن ہی نہیں۔ طبعی اور بشری خواص کے ہوتے ہوئے، عرفانِ الٰہی کسی آدم کا حصہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جب آدم خواص کی فنا کے مقام تک پہنچتا ہے تو الوہیت کی بقا کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

Marfat.com

v۔ ہوا اور آگ۔ ہوا، آگ سے مل کر اپنی تمام خصوصیات برقرار رکھتی ہے۔ جبکہ آگ، ہوا کی موجودگی میں حدت اور روشنی تو برقرار رکھتی ہے مگر کبھی اس کو اپنے جیسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

(ہرجائی + نظر نہ آنا + تسلسل) + + (حدت + روشنی + اپنے جیسا کرنا) = (ہرجائی + نظر نہ آنا + تسلسل + حدت + روشنی) = بقایا پانچ صفات ۔یہ ایک اکیلا اشتراک ہے جس میں پانچ خاصیتیں برقرار رہتی ہیں، جس کی نسبت پنجتن پاک کی طرف جاتی ہے۔یعنی الوہیت و شیطانیت کا اشتراک تو ممکن ہے لیکن الوہیت کی شان، اپنے تمام خواص سمیت، ہر قیمت پر برقرار رہے گی۔ شیطانیت کی اپنے جیسا کرنے کی صفت زائل ہو جائے گی، مگر حدت اور روشنی ہونے کی وجہ سے، وہ الوہیت کے روبرو، مغرور انداز میں نت نئے نکات کا اظہار کرتی رہتی ہے۔

vi ۔ مٹی اور آگ۔ مٹی، آگ سے مل کر صرف اپنا جمود برقرار رکھتی ہے وگرنہ ثقل اور تنوع اس سے چھن جاتے ہیں۔ جبکہ آگ، مٹی پر حاوی ہونے کی کوشش میں اپنی تمام صفات کو قائم رکھتی ہے۔

(جامد + ثقل + تنوع) + + (حدت + روشنی + اپنے جیسا کرنا) = (جامد + حدت + روشنی + اپنے جیسا کرنا) = بقایا چار صفات

یعنی آدم اور شیطان جب قریب ہوتے ہیں تو شیطانیت جلد آدم پر غلبہ پاتی ہوئی اپنی صفات قائم رکھتی ہے، جب کہ شیطانیت سے مغلوب ہو کر آدم کا ثقل اور تنوع زائل ہو جاتے ہیں مگر جمود برائے نام باقی رہ جاتا ہے۔ آدم کو اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ شیطان مردود کی مڈ بھڑ سے، اللہ کی پناہ مانگے، وگرنہ اس کی زد میں آ کر وہ برباد ہو جاتا ہے۔

تین، تین عناصر کا ملاپ:۔ اس طرح چار ممکنہ جوڑے بن سکتے ہیں۔

Marfat.com

i۔ پانی، مٹی اور آگ:۔ ii۔ پانی، مٹی اور ہوا:۔ iii۔ پانی، ہوا اور آگ:۔

iv۔ مٹی، ہوا اور آگ:۔

ان تین تین عناصر کے اشتراک کے چاروں جوڑوں کے نتائج ثابت کرتے ہیں کہ یہ ناممکن الوجود ہیں اور ان سے کوئی شے نہیں بن سکتی۔ دراصل خلق کا یہ جہان، ضدین کی بنیاد پر تخلیق ہوا ہے، جس میں دو کا تصور ہوتا ہے اور تین عناصر کا اشتراک صفتِ بقا کے خواص کا حامل ہو جاتا ہے۔ چونکہ منشائے ایزدی یہی تھی کہ خلق کا جہان آخر کار فنا ہو جائے گا، اس لئے تین عناصر کے ملاپ سے کسی بھی شے کو تخلیق کرنے کے امکان کی گنجائش ہی نہ رکھی۔

چاروں عناصر کا ملاپ:۔ اگر چاروں عناصر کو صرف اکٹھا کیا جائے اور ان کے طبعی خواص کو ایک دوسرے سے کیمیائی اشتراک نہ کرنے دیا جائے تو ان کے کُل بارہ خواص ممکن ہوں گے۔ اگر یہ تمام خواص باہمی محبت کے جذبہ سے، اپنی اپنی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے، مشترک ہو کر مرکب ہوں، تو ایک کامل خلق ہوگا جس کے لئے بے عیب، لاریب، سبحان اور مطاہر جیسے القاب روا ہونگے۔ اسے: لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّہٗ: کا مصداق ماننا واجب ہوگا۔ وہ خلق جو جامد ہو، پھر بھی نظر نہ آئے:: کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ: کی تاثیر میں تنوع کا وہ عالم رکھتا ہو کہ کائنات زبانِ حال سے پکار اٹھے، کہ آر ہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون اس کے باوجود جس محل میں جب ڈالو اس کی شکل اختیار کر لے۔ ایسے بن کا وہ نقشہ ہو کہ ہاتھ میں کنکریاں اس کے نام کا کلمہ پڑھیں، حدت ایسی کا ایک فقرہ چچا حمزہؓ کے پگھلنے کے لئے کافی ہو، ایسا ہر جائی کہ ہر صورت اس کے اسم پر خلق ہو، روشن ایسا کہ: نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: کی مثل قرار پائے اور نظر نہ آنے کا وہ عالم کہ خالق خود فرمائے، قیامت دراصل محمدؐ کے تعارف کا مقام ہے۔ اس جہان میں کسی نے ان کی اصل اور مکمل صورت نہیں دیکھی۔

Marfat.com

ابو جہل کو اطلاع ہوئی کہ تمہارا بھتیجا، ابو بکرؓ کے ہمراہ اکیلا، فلاں راستہ پر جا رہا ہے۔ وہ نعوذ باللہ قتل کے ارادہ سے گھوڑے پر سوار تعاقب میں آیا۔ کچھ فاصلہ سے اس نے آپؐ کو دیکھا اور مزید تیزی سے آگے بڑھا۔ حضورؐ، ہمراہی کے ساتھ ایک قریبی باغ میں داخل ہوئے۔ ابو جہل باغ کے گرد اگرد چکر کاٹ کر اس جگہ آ کھڑا ہوا جہاں سے دونوں حضرات کے باہر نکلنے کی گنجائش تھی۔ ننگی تلوار ہاتھ میں تھی۔ ابو بکرؓ باہر نکلے تو وہ للکار کر بولا 'ابو قحافہ کے بیٹے محمدؐ کو کہاں چھوڑ آئے ہو'۔ ابو بکرؓ نے پیچھے مڑ کر دیکھا، حضورؐ کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ابو جہل گرج کر بولا 'آج تم اسے میرے ہاتھ سے بچانے میں کامیاب ہو گئے ہو پھر موقع ملا تو اس کی گردن مار دوں گا'۔ یہ کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر چل نکلا۔ ابو بکرؓ نے ہاتھ باندھ کر عرض کی حضورؐ یہ کیا ماجرا ہے؟ آپؐ بالکل ساتھ کھڑے ہیں اور ابو جہل کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ رسالتمآبؐ نے فرمایا 'اللہ نے اپنی عصمت کے ستر ہزار پردے ہر وقت میرے گرد تان رکھے ہیں۔ وہ جس کو میرا جو روپ دکھانا چاہتا ہے، ویسا پردہ اٹھا دیتا ہے۔ ابو جہل کے لئے تمام پردوں میں چھپا دیا اور تیرے لئے دیکھنے کی صورت کر دی۔ ویسے آج تک تم نے بھی مجھے اصل حالت اور روپ میں نہیں دیکھا۔ قیامت کا روز فقط اسی کام کے لئے مخصوص ہے، جب میری اصل کُل کائنات پر آشکار کی جائے گی۔ یہ **داستانِ ششم:** ہے۔

داستانِ ہفتم: مالک و خالق کُل کائنات نے بنیادی عناصر کی تخلیق کے بعد ۱۷۹۹۹ (سترہ ہزار، نو سو، ننانوے) انواع و اجناس (Species) کو تخلیق کر لیا۔ تمام چرند، پرند، چھوٹے بڑے جانور، کیڑے مکوڑے، مکھی، مچھر حتّٰی کہ خوردبین سے نظر آنے والی مخلوقات (Unicellular organisms) تخلیق ہو چکیں، تو روایات کے مطابق جنّت سے مٹی بھجوائی گئی۔ فرشتوں کو حکم دیا کہ اس میں پانی کی آمیزش کر کے خوب گوندھیں۔ پانی ملی یک جان مٹی سے ایک بُت نما شبیہ بنوائی گئی، اور آگ کو حکم

Marfat.com

دیا کہ اس کو پختہ کر دے، تا کہ وہ سیدھا کھڑا رہ سکے۔ کہتے ہیں وہ پتلا چالیس(۴۰) برس، چار سو(۴۰۰) برس، چار ہزار(۴۰۰۰) برس یا پھر چالیس ہزار (۴۰۰۰۰)برس اسی شکل میں کھڑا رہا۔ باقی تمام مخلوقات اس کا تمسخر اڑایا کرتی تھیں۔ ایک چڑیا نے اس کے منہ میں انڈے دے دیے اور وہاں اپنا گھر بنالیا۔ چڑیا کا وہاں داخل ہونا اور باہر نکلنا نہایت مضحکہ خیزی کا باعث ہوتا۔ اچانک ایک دن ربّ العالمین نے فرشتوں کو فرمایا کہ جوں ہی 'ہوا' کا عنصر اس میں شامل کر دوں، تم اسی دم اس کے لئے سجدہ ریز ہو جانا کیونکہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ کے عمل کے بعد یہ ہمارا خلیفہ ہو چکا ہو گا۔ جس آگ کی تپش نے اسے پتلے کی شکل دے کر سیدھا کھڑا ہونے کے قابل کیا تھا وہ اس حکم سے دم بخود رہ گئی۔ کہنے لگی جس کے اثبات و قرار میں میرا گہرا ہاتھ ہے کیا اسے سجدہ کروں؟ كُلُّهُمْ مَلَآئِكَةٍ سر بسجود ہوئے جبکہ ناری مخلوق اسی عمل میں رجیم ہو گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ آدم نفخ (ہوا) کے بغیر بے حقیقت تھا اس کو سجدہ ہونا نفخ کی بدولت تھا۔ اس طرح چاروں عناصر کے مجموعہ ہونے اور حکمتِ الٰہی سے، وہ نوع معرضِ وجود میں آئی جو (۱۸۰۰۰) اٹھارہ ہزارویں بھی تھی، خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھی اور اشرف المخلوقات بھی کہلائی۔ ملائکہ نے سر بسجود ہو کر اس حقیقت کا ثبوت بھی دے دیا۔

حکمتِ الٰہی ملاحظہ ہو۔ جمود و ثقل و تنوع کو بہاؤ، گیلا پن اور محل کی شکل اپنانے کی خاصیت میں گوندھا گیا یعنی سب سے اول آدمیت کے کردار کو ولایت کے کردار سے سیر اب کیا گیا۔ ازاں بعد مٹی کے جمود اور ثقل نے ہی پختگی کی تمنا کی ہو گی جو آگ یعنی کردارِ شیطانیت کو بھڑکا کر اسے پختہ پتلے کی شکل میں ڈھالا گیا۔ تب اس مٹی کو افسوس ہوا ہو گا کہ کیوں میں نے کردارِ ولایت پر اکتفا نہ کیا اور اکڑ اور پختگی کی تمنا میں کردارِ شیطانیت سے دوچار ہوئی۔ اسی رنج اور افسوس پر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ہو گا، جو کسی چڑیا کو موقع ملا کہ اس میں اپنا گھونسلا بنائے۔ اسی حالتِ افسوس میں کیفیت شرمندگی شامل ہو گئی ہو گی کہ ندامت میں چالیس برس سے چالیس ہزار برس تک کا وقفہ گزر گیا۔ آخر مالک

Marfat.com

کائنات کو وہ شرمندگی پسند آگئی ہوگی کہ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس پتلے میں کردارِ الوہیت کی آمیزش فرمادے۔ تب اس نے اپنی روح پھونکی۔ چونکہ اس خاکی پتلے میں الوہیت آموجود ہوئی تھی اس لئے تمام مخلوقات پر لازم ہوا کہ اسے سجدہ کریں۔ کردارِ شیطانیت یعنی آگ کو تو ہَوا مزید بھڑکاؤ کا سبب ہوتی ہے کہ اس کی حدت و روشنی خوب چمکتی ہے، یقین واثق ہے کہ اسی بھڑکاؤ نے آگ کو سجدہ سے گریزاں رکھا ہوگا۔ بہر طور وہ تخلیق ہوگیا جس کو نَفَخْتُ کے عمل نے صفی اللہؑ کردیا۔ اس کے بعد، آج تک اس کی اولاد کی تخلیق میں عنصرِ ہَوا استعمال تو ہورہی ہے، مگر کسی کے زوردار اور بامعنی نفخ کی صورت میں نہیں، کہ وہ پیدائشی صفی اللہ ہو، جو صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ہَوا یعنی کردارِ الوہیت اس کے انگ انگ میں رچ بس گیا ہو۔ آج اولادِ آدم کے لئے ضروری ہے کہ وہ عنصرِ ہَوا کو خود قابو کریں، اور اپنے کُل میں اسے اس طرح سمیٹیں جیسے آدم صفی اللہؑ میں مرتب کی گئی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اس طرح اپنے مربّی کے حوالہ کردیں کہ جب اس کی پسندیدگی میں آجائے تو عملِ نَفَخْتُ کرکے بنی آدم میں ایک اور صفی اللہ پیدا کردیں۔

اب ہم تجزیہ کرتے ہیں کہ آدم کی تخلیق میں عناصر کے باہم مرکب ہونے کے دوران کیا ممکنہ نتائج مرتب ہوئے ہونگے، جس سے ایک مکمل آدم بنا جو اوّل صفی اللہؑ کہلایا اور بعد میں فقط بنی آدم رہ گیا۔ اوّل مٹی = جمود + ثقل + تنوع ☆ + + پانی سے گوندھ = بہاؤ ☆ + گیلا پن + محل کی شکل اختیار کرنا۔ مٹی، تنوع چھوڑ دے گی جبکہ پانی کا بہاؤ ختم ہو جائے گا۔ اس طرح (جمود + ثقل + گیلا پن + محل کی شکل اختیار کرنا) باقی رہے گا۔ آگ سے پختگی: (جمود + ثقل + گیلا پن ☆ + محل کی شکل ☆) + + (حدت ☆ + روشنی ☆ + اپنے جیسا کرنا ☆)۔ گیلے پن کی وجہ سے آگ کی حدت اور روشنی ختم ہو جائے گی جبکہ حدت کی وجہ سے گیلا پن اور محل میں موجود ہونا بھی نہ رہے گا۔ اسی طرح آگ کی اپنے جیسا کرنے کی صفت بھی بالکل ماند ہو جائے گی۔ آگ کی پختگی دینے کے عمل کے نتیجہ

Marfat.com

میں صرف دو خواص جمود اور ثقل باقی بچتے ہیں۔ ان خواص کی بنیاد پر ایک بُت نما پتلا ظاہر ہوا جس میں متوجہ کرنے کی کچھ صلاحیت تھی۔ گیلا پن زائل ہونے کی وجہ سے چڑیا نے منہ میں گھونسلا بنالیا۔ جامد تھا، صرف متوجہ کر سکا، گیلا پن نہ ہونے کی وجہ سے اتنا اثر پذیر نہ ہو سکا کہ چڑیا گستاخی سے پرہیز کرتی۔ پھر وہ وقت آیا کہ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ کا عمل ہوا۔ یعنی ہَوا ان خواص میں شامل کی گئی، تو مندرجِ دو ممکنہ نتائج برآمد ہوئے۔ I:(جمود + ثقل) + (ہر جائی☆ + نظر نہ آنا + تسلسل ☆) = (جمود + ثقل + نظر نہ آنا)۔ یاد رہے نفخ کرنے والے کی صفات جبّار اور قہّار ہی کافی ہیں کہ نفخ کو کُل کائنات میں اس طرح پھیلا دے کہ ہر شے پر محیط ہو جائے۔ جبر و قہرِ الٰہی کے بالمقابل کسی کو نہ دم مارنے کی مجال ہے اور نہ کوئی اس کے سامنے کھڑے ہونے کی تاب لا سکتا ہے۔ سو نفخ کی صورت میں ہَوا، جبر اور قہر کی شدت سے جمود اور ثقل میں گھس گئی اور ہر جگہ رہنے اور تسلسل والی صفات چھوڑ گئی مگر نظر نہ آنے والی صفت برقرار رہی۔ نتیجہ میں ایک ایسا آدم خلق ہوا جس میں کردارِ الوہیت اس طرح پوشیدہ ہو گیا کہ نظر نہ آتا تھا، مگر اس میں تھا۔ یہی آدم صفی اللہؑ قرار پایا۔ II:(جمود + ثقل) + + + (ہر جائی + نظر نہ آنا + تسلسل) = = = (جمود + ثقل + ہر جائی + نظر نہ آنا + تسلسل)۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا، مٹی اور ہَوا کی صفات آپس میں اشتراک کر ہی نہیں سکتیں اس لئے پانچوں صفات برقرار رہیں گی۔ ظاہر ہے اس امکان میں نفخ کی شدت منفی کرنا ہو گی اور اسی امکان کی بنیاد پر کُل بنی آدم کی تخلیق کا عمل مکمل ہو گا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ پانچ صفات اصل میں حواسِ خمسہ کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ پنجتن پاک کی طرف اشارہ ہے۔ اب تا قیامت ان حواسِ خمسہ سے بنی آدم اور باقی تمام مخلوقات معرضِ وجود میں آتی رہیں گی۔

i۔ جمود = چکھنے کی حِس = (Taste)

ii ثقل = سماعت کی حِس = (Hearing)

iii۔ ہر جائی = حِس محسوس = (Touch)

iv۔ نظر نہ آنا = حِس شامہ = (Smell)

v۔ تسلسل = حِسِ بصارت = (Sight)

Marfat.com

۳۳۔ تخلیق بشر و ذکرِ عالینؑ

سورۃ الحجر آیات ۲۸ تا ۳۰: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ: یعنی جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا تحقیق میں صلصال اور حماء مسنون سے بشر تخلیق کرنے والا ہوں۔ پس جب اسے سنوار دوں اور اپنی روح اس میں پھونک دوں، اس کے لئے سجدہ ریز ہو جانا۔ پس کُل ملائکہ نے سجدہ کیا۔

اللہ نے بشر تخلیق کیا جس کی تخلیق کا مادہ صلصال اور حماءِ مسنون تھا۔ صلصال سے مراد کھنکتی یا بجتی ہوئی مٹی لیا گیا ہے مگر غور طلب ہے کہ کیا مٹی بھی کبھی کھنکتی ہے؟ یا خود بخود بجتی ہے اور حماءِ مسنون کو بدبودار سیاہ گارا کہا گیا ہے۔ یہ خالقِ کائنات کے باب میں سوئے ادب ہو گا، کہ وہ ایسی مٹّی سے عمل تخلیق کرے۔ تمام فرشتے جو، بشر کی تخلیق میں خالقِ کائنات کے معاون ہوئے اور اسباب کے طور پر استعمال کے لیے بدبودار مٹی اور دوسرے اجزاء اکٹھے کرتے رہے، ان کے متعلق بھی ایسا خیال نامناسب ہے کہ پاکی و طہارت کی مخلوق ہونے کے ناطے ان سے ایسا فعل سرزد ہونا عبث لگتا ہے۔ سورۃ ص میں مذکور ہے کہ بشر کی تخلیق کائنات کے مالک نے اپنے ہاتھوں سے فرمائی، تو کیا اللہ کے ہاتھوں میں یہ جائز ہے؟ دراصل یہ تاثر غیر موزوں تراجم کی وجہ سے ہے۔ حقیقت میں صلصال وہ عمل ہے کہ جب ایک جزو، دوسرے جزو سے رگڑ کھاتا ہے تو اس میں سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے اور ٹکرانے اور رگڑنے کی آواز ہمیشہ سوز و گداز، آہ و بقاوالی اور غم زدہ ہوتی ہے۔ بالیقین مراد یہی ہے کہ بشر کی تخلیق کا بنیادی عنصر سوز و گداز اور دردِ دل ہے۔ کُل کائنات کی تخلیق تین بنیادی اصوات، 'آ، اِی، اُو'، کی مرہون منت ہے۔ حرف الف (ا) سیدھا کھڑا ہے۔ اگر اس کے اوپر زبر (ا)

Marfat.com

ڈال دیں تو، آ، کی آواز دیتا ہے، نیچے زیر (اِ) ڈال دیں تو، ای، کی آواز دیتا ہے اور اگر اس پر پیش (اُ) ڈال دیں تو، او، کی آواز دیتا ہے۔ غور کریں زبر کا بوجھ، الف کے اوپر، اور جھکاؤ الف کی طرف ہوتا ہے، جب کہ زیر نیچے ہوتی ہے اور جھکاؤ بھی الف سے پرے کی طرف ہوتا ہے۔ زبر، اوپر ہونے کی وجہ سے بلندی اور تکبر سے متعلق ہے اور زیر نیچے ہونے کی وجہ سے پستی اور انکسار کی طرف رجحان رکھتی ہے۔ مزید غور کریں، حرف (الف)، (زبر) اور (زیر) اصل میں ایک ہی جیسے ہیں۔ سیدھا کھڑا ہو تو الف ہے، اوپر اٹھا کر نیچے کی طرف جھکاؤ دیں تو زبر ہو جاتا ہے اور نیچے لٹا کر جھکاؤ مزید نیچے کی طرف کر دیں تو زیر نظر آنے لگتی ہے۔ زبر سے 'آ' کی جو آواز پیدا ہوتی ہے، اس میں جبر و شدت نمایاں ہے، زیر کی آواز 'اِی' درد اور سوز و گداز کی طرف اشارہ کرتی ہے جب کہ پیش سے 'او' کی آواز ترنم، مٹھاس اور موسیقی کی حامل ہے۔ کُل کائنات کی تخلیق انہی تین بنیادی اصوات کی مرہونِ منت ہے جب کہ مستند سائنسی ضابطہ کے مطابق صوت کے پیدا ہونے کے لیے خلا کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تینوں بنیادی اصوات غم کی غماز ہیں اور سوز و گداز اور درد، ان میں نمایاں ہے۔ حماء مسنون سے مراد مادہ کی رحم کا وہ پانی ہے جو صلب کے پانی سے اشتراک پذیر ہو کر عمل تخلیق شروع کرتا ہے اور پھر ایک خاص فطری عمل کے ذریعے اسے تکمیل پذیر کرتا ہے۔ شرع میں مادۂ تولید یعنی مادۂ منی، جو صلب سے وابستہ ہے، اور مادۂ تولید رحم ناپاک تصور ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے متراجم حضرات نے اسے گارے یا بدبودار پانی سے تشبیہہ دی ہے وگرنہ خالق کائنات کی نگاہ میں اور مقام حقیقت پر اس کی اہمیت کچھ مختلف ہے۔ لفظ مسنون، سنّت کے مصدر سے اخراج ہے اور سنّت اچھائی اور پاکیزگی کی طرف نشاندہی کیا کرتی ہے اس لئے مسنون کو گندا اور بدبودار کہہ کر معانی کو دوسرا رنگ دینا عبث بھی ہے اور ظلم بھی۔ لفظ صلصال، لفظ صل کو دو دفعہ اکٹھا کر کے بنتا ہے اور صل سے 'درود' معنی

Marfat.com

لیے جاتے ہیں۔ چونکہ صلوۃ کا لفظ بھی اسی مصدر سے بنتا ہے اس سے بھی صلصال کی اہمیت اور تخلیقِ بشر میں، خالقِ کائنات کے نزدیک، اس کا رتبہ و مقام ظاہر ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ تخلیقِ بشر کے لیے جو اسباب مہیا کیے گئے وہ اولاً سوزوگداز اور درد ہیں اور دوسرے مسنون پانی ہے۔ حماءِ مسنون سے مراد آگ میں سے نکلنے والا دھواں بھی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آگ کسی قسم کی ہو، اس میں سے دھواں ضرور نکلتا ہے، جو نشاندہی کرتا ہے کہ آگ موجود ہے۔ آگ یا گرمی ہر اس جگہ پر پیدا ہوتی ہے جہاں سائنسی اصول کے مطابق کوئی عمل و قوع پذیر ہوتا ہے۔ ہر سائنسی عمل (scientific action) میں یا حدّت خارج ہوتی ہے یا جذب ہوتی ہے اور جہاں حدّت ہوگی وہاں دھواں ضرور موجود ہوگا۔ یہ حدّت اس عمل میں اجزاء کے، اجزاء سے ٹکرانے کے باعث پیدا ہو رہی ہے۔ سوزوگداز اور درد بھی حدّت ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دھواں یقیناً اس میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ پھر فرمایا، جب بشر کو تخلیق کر کے مکمل طور پر ٹھیک اور تندرست کر دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو اے ملائکہ تم سب اس کے لیے سجدہ ریز ہو جانا۔ ایسا ہونے پر تمام ملائکہ سجدہ ریز ہو گئے، بجز ابلیس کے۔ سَوَّیۡتُہٗ کا مطلب یہ ہے، کہ جب میں اسے ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ کر چکوں اور اس میں سے تمام خامیاں اور عیب نکال کر اچھے برے کی پہچان کے قابل کر دوں۔ یعنی جب وہ صراطِ مستقیم کا حامل ہو جائے، اس کے تمام شکوک و شبہات یقینِ کامل میں بدل جائیں، اس کے اندر سے تمام جہالتوں اور غلاظتوں کا خاتمہ ہو جائے اور وہ نُورِ ایمان سے بھر دیا جائے، تو پھر اس کی حالت ایسے ہوگی جیسے میری روح اس میں سرایت کر گئی ہے۔ وگرنہ اللہ میں سے کسی قسم کا اخراج ممکن نہیں ہے کہ 'فَنَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ' کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں۔ اس کا مطلب یہ اخذ کیا جا سکتا کہ جب بشر، مشیّتِ الٰہی سے حاملِ صفاتِ الٰہی ہو جائے تو اس حالت میں تمام ملائکہ کے لئے سجدہ کرنا واجب و لازم ہوتا ہے۔ آج بھی اولادِ آدم میں سے، جن

Marfat.com

کے نصیب قدرت کاملہ کے فضل و کرم سے، اتنے اُولی اور علیا ہوتے ہیں کہ ان کے ہاتھ اللہ کے ہاتھ، ان کی زبان اللہ کی زبان اور ان کی آنکھیں اللہ کی آنکھیں ہو جاتی ہیں، تو وہ جب کسی سے اس طرح شفقت فرمائیں کہ اسکے اندر کی خباثتوں کو اپنی نگاہِ کرم سے دھو کر اس کا سینہ مطہر کر دیں تو یہ سَوَّیۡتُہٗ، یعنی آراستہ و پیراستہ کرنے کا عمل ہو گا۔ جس کے ساتھ سَوَّیۡتُہٗ کا عمل ہو گا، وہ عین اپنے مربی و محسن و ہادی کی تصویر ہو گا، اس کا عمل، قول، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، لیٹنا، کھانا، پینا حتیٰ کہ زندگی کے تمام فعل ہو بہو اسی کی مانند ہونگے، جس نے کرم کیا ہو گا۔

غور طلب ہے کہ ملائکہ نے بشر کو سجدہ کیوں کیا؟ کیا بشر نے اس وقت تک کوئی نماز پڑھی تھی؟ روزہ رکھا تھا یا کوئی نیک اور صالح اعمال کیے تھے؟ یا کیا اس نے بشکل لَآ اِلٰہَ، اعلان توحید کیا تھا۔ مصدق تاریخی روایات سے بھی یہ ثابت نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ بشر، جو تمام مخلوقات کے سامنے خلق ہوا، کسی بھی طرح نماز، روزہ وغیرہ عبادات کا عامل ہوا، حتیٰ کہ اس کا اعلانِ توحید بھی ثابت نہیں ہوتا، تو پھر کس فضیلت کی بنیاد پر تمام ملائکہ نے اسے سجدہ کیا؟ یہاں یہ نکتہ واضح ہو گیا کہ بشر کی، تمام مخلوقات پر فضیلت، عبادات یعنی توحید کا اقرار، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی بنیاد پر نہیں ہے!

قرآن میں کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کئی بار استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اس معبود برحق کے سوائے کوئی معبود نہیں اور وہ تمہارا خالق و مالک ہے۔ جب حضورؐ نے اعلان نبوت فرمایا تو کچھ عرصہ بعد آپؐ کو ارشاد ہوا کہ اپنے اقربین کو دعوتِ توحید دیں۔ آپؐ نے شعب ابی طالب میں ہاشمی قبیلہ کے سرکردہ چالیس افراد کو تین دن مسلسل ضیافت پر مدعو کر کے دعوت لَآ اِلٰہَ دی۔ ان سرداران سے پوچھا کہ اس جہان کا خالق کون ہے؟ انہوں نے کہا اللہ۔ کہا زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، ندی، نالے، پہاڑ، دریا، سمندر، شجر، حجر کا خالق کون ہے؟ کہنے لگے اللہ۔ آقاؐ نے فرمایا میں

Marfat.com

بھی یہی کہتا ہوں مگر میرا پیغام یہ ہے کہ وہ اللہ 'احد' یعنی یکتا و یگانہ ہے، تم بھی اس کا اقرار کرو، تو وہ سردار اس کے انکاری ہو گئے۔ وہ کہتے تھے اللہ ایک ہے، مگر عدد ایک جیسا یعنی دو نصفوں کا مجموعہ ہے جو جمع ہو کر دو ہو سکتا ہے۔ 'واحد' اللہ کو وہ سردار بھی مانتے تھے، اگر انہیں اعتراض تھا تو یہ آپ بھی ہماری طرح اس اِلٰہ کی بات کریں، جو، لات، منات، عزات کی طرح مختلف شکلیں رکھتا ہے اور مختلف کام کرتا ہے۔ حُسن کا اِلٰہ الگ، دولت کا مختلف، جاہ و حشمت کا اور، بارش کے لیے دوسرا، رزق پانی کا ذمہ اس کا، موت وحیات کی ڈیوٹی اس کی۔ حضورؐ کا پیغام تھا کہ وہ ذات احدیت، یکتا ہے، نہ کوئی مثل ہے نہ ثانی۔ کوئی آنکھ اس کو دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتی، نہ وہ حسیات میں محسوس ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اسی اختلاف کی بنیاد پر وہ سردار حضورؐ کے پیغام کے انکاری ہوئے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اوّل بشر نے لَآ اِلٰہَ نہیں کہا، تو کس نے کہا؟ کیا فرشتوں نے یا دوسری مخلوقات نے، جو آدم کی تخلیق کے وقت موجود تھیں یا کیا ابلیس نے ایسا کہا؟ سورۂ ص آیت ۷۵ میں ہے: قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ: یعنی پوچھا مالک کائنات نے اے ابلیس تجھے کس بات نے منع کیا کہ تو اس بشر کو سجدہ کرے جسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے تخلیق کیا۔ تو تکبّر کرنے لگا تھا، یا پھر تو 'عالین' میں سے ہو گیا تھا۔ اکثر مترجم حضرات نے لفظ عالین کا ترجمہ مغرور کر دیا ہے جو صریح ناانصافی اور ظلم ہے کیونکہ یہ واضح طور پر 'ع ل ی' مصدر سے ہے، جس کا مطلب بلند مرتبہ، عظمت والے اور 'اوّل' ہیں۔ بشر اوّل نہیں ہے۔ اس سے قبل تو تمام مخلوقات، فرشتے، ابلیس، جنّت، دوزخ، ارض و سماء وغیرہ سب کچھ موجود تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی عالین یعنی اوّل نہ تھا۔ تمام مخلوقات واقف تھیں کہ عالین یعنی اوّل کوئی ہیں، تب ہی تو ابلیس کو فرمایا گیا کہ کیا تو اپنے آپ کو ان میں شمار کرنے لگا ہے؟ اس مقام پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ بشر کو سجدہ 'عالین' نے نہیں کیا کیونکہ وہ اس سے مستثنٰی ہیں۔ تبھی تو ابلیس کو جتلایا گیا کہ کیا تو بھی اپنے آپ کو

Marfat.com

اس حکم سے مستثنیٰ سمجھنے لگا تھا۔ یہ عالین یقیناً پنجتن پاک ہیں۔ ارشاد لَآ اِلٰہَ ان ہی کی زبانِ اطہر پر ظاہر ہوا۔ یہ اگر فرمادیں تو قرآن ہو جاتا ہے، خاموشی اختیار کرلیں تو کتاب ہو جاتے ہیں، نگاہ اٹھالیں تو عرش کے مکین اور اشارہ فرمادیں تو لوحِ محفوظ کے راقم ہو جاتے ہیں۔ آدم کی نجات انہی اسماء الحسنیٰ کی بدولت ہوئی، نوحؑ کی کشتی انہی کی وجہ سے کنارے لگی اور یہی ابراہیمؑ کے لئے جلائی گئی آگ کی ٹھنڈک کا باعث بنے۔ لَآ اِلٰہَ، انہی اولوں نے کہا اور جب ضرورت پیش آئی تو انہی میں سے حسینؑ ابن علیؑ نے اپنی اور اپنے افراد خانہ کی 'لا' کر کے، اور جھوٹے الہ کو ہمیشہ کے لیے دفن کر کے، سچے اللہ کی بازگشت تاقیامت زندہ کردی۔ اسی نسبت سے حسینؑ، بناءِ لَآ اِلٰہَ کہلاتے ہیں۔

قرآن میں لفظ اِلٰہَ کا '۱۴۷' مرتبہ مختلف اشکال میں ورود بامعنی ہے۔ یہ ایک ہے یا ایک جمع چار پانچ ہے یا پانچ جمع سات بارہ ہیں۔ پانچ ذوات مقدسہ مراد لیں، یا بارہ ذوات مقدسہ، یا ان سب کو ایک کہہ لیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کی اصل ایک ہے، شاخیں پانچ اور پھیلاؤ میں بارہ ہیں۔

۳۴۔ داستانِ حرم

مورخین سابقہ کے مطابق آج سے پینتالیس سو (۴۵۰۰) برس قبل عراق کی سرزمین پر 'عر' نامی مقام میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام ابراہیمؑ رکھا گیا۔ اس زمانہ میں برصغیر میں راجہ رام چندر کے بعد راجہ جسرتھ کی حکومت تھی۔ ابراہیمؑ کی پیدائش جس شہر میں ہوئی وہ بابل کہلاتا تھا۔ اب اس کے کھنڈرات دریافت ہو چکے ہیں۔ یہ دنیا کا ایک عظیم شہر تھا۔ رقبہ تقریباً ڈھائی سو مربع میل تھا۔ اس کے مشہور محلوں میں غانیہ، نینوا، کربلا اور بابلہ وغیرہ تھے۔ دنیا میں موجود تمام مذاہب کے لوگ اس شہر میں آباد تھے۔ ہر مذہب کا عبادت خانہ بھی تھا اور مذہبی پیشوا بھی موجود تھے۔ انہی میں خدا پرست

Marfat.com

لوگ بھی تھے۔ بابلی زبان میں عبادت خانے کو کرب کہتے تھے۔ مختلف عبادت خانوں کے مختلف نام تھے۔ جہاں اللہ کی عبادت ہوتی تھی اسے کربِ الہٰ کہتے تھے۔ وقت کے ساتھ وہ محلہ کربلا کہلانے لگا۔ یہ قریباً اڑتالیس (۴۸) مربع میل کا علاقہ تھا۔ یہاں ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ عربی میں جھیل کو 'نے' کہتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ جھیل خشک ہو کر ریگستان میں بدل گئی۔ خشک ہونے کو جف کہتے ہیں۔ اس لیے اس جگہ کا نام (نے جف) نجف رکھ دیا گیا۔

ابراہیمؑ جب جوان ہوئے تو زمانہ کے مروجہ اصولوں سے بیزار تھے۔ بت پرستی انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی مگر مظاہرِ فطرت پر غور وخوض کرنے کے دلدادہ تھے۔ سورۃ الانعام میں تمثیلی انداز سے اس کا ذکر موجود ہے جو دراصل علم نجوم کی طرف اشارہ ہے۔ اپنی تحقیقی کاوشوں کے نتیجہ میں ابراہیمؑ کا شمار، اپنے دور میں، علم نجوم کے ماہرین میں کیا جاتا تھا۔ سورۃُ الانبیاء میں دیے گئے اشارہ کے مطابق ایک دن ابراہیمؑ علاقہ کے سب سے بڑے بت خانہ میں داخل ہوئے اور ایک مضبوط ڈنڈہ لے کر وہاں موجود تمام بت چکنا چُور کر دیے۔ حکمت کے تحت سب سے بڑے بت کو نہ توڑا، بلکہ وہ ڈنڈہ اسی بت کے پاس چھوڑ کر چلے آئے۔ لوگوں کو جب بتوں کے مسمار ہونے کی اطاع ملی تو ان کا شک ابراہیمؑ پر ہوا۔ استفسار کرنے پر ابراہیمؑ بستی والوں کو جائے وقوعہ پر لائے اور جائزہ لینے کے بعد فرمانے لگے 'ہو نہ ہو یہ فعل اس بڑے بت نے کیا ہو گا کیونکہ ڈنڈہ اسی کے پاس ہے'۔ سب بیک زبان بولے کہ پتھر کے بنے بت جو حرکت بھی نہیں کر سکتے، بھلا وہ کیونکر کسی کو توڑ سکتے ہیں۔ اس پر ابراہیمؑ نے فوراً کہا کہ تمہاری عقلوں پر افسوس ہے، یہ سمجھتے ہوئے بھی تم ان کی عبادت کرتے ہو؟ جب نمرودی جان چکے کہ بتوں کو ابراہیمؑ نے توڑا ہے تو انہوں نے آپ کو آگ میں زندہ جلا دینے کا فیصلہ کر لیا مگر حکمتِ خداوندی سے جلتی ہوئی آگ گل و گلزار بنا دی گئی۔ اس معجزہ کے نتیجہ میں شہزادی سارہ کا نکاح ابراہیمؑ سے ہوا۔ چند برس تک جب سارہ کے بطن سے اولاد کی امید نہ ہوئی تو آپ نے بی بی ہاجرہ کی

Marfat.com

طرف التفات کیا، جو سارہ کی کنیز تھیں، قدرت الٰہی سے ان کے ہاں اسماعیلؑ نے جنم لیا۔ خلیل اللہ کی حیثیت سے ابراہیمؑ کا امتحان ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ ان کو اشارہ ملا کہ اپنی بیوی ہاجرہ اور نوزائیدہ بچے اسماعیلؑ کو عراق سے لے جا کر مکہ مکرمہ کے قریب چھوڑ دیں۔ تعمیل حکم میں وہ ہاجرہؓ اور اسماعیلؑ کو جس جگہ چھوڑ گئے وہاں خانۂ کعبہ تعمیر کیا گیا۔ صحرائی علاقہ میں جب شدتِ پیاس کی وجہ سے ننھے اسماعیلؑ نے اپنی ایڑیاں رگڑیں تو قدرت و حکمتِ الٰہی سے پانی کا چشمہ اُبل پڑا اور پانی اس شدت سے بہنے لگا کہ اسے 'زم زم' کا حکم دینا پڑا۔ صحرائی علاقہ میں پانی کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جلد آبِ زم زم کی وجہ سے، اس بے آباد و گیاہ جگہ میں ایک قبیلہ آ کر آباد ہو گیا جس کا نام جرہم تھا۔ اتفاقاً اس قبیلہ کے سردار کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اسماعیلؑ کے جوان ہونے پر، اس سردار نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی اُن سے کر دی اس طرح اسماعیلؑ، بنی جرہم کے داماد ہو گئے۔ سردار خود بہت بوڑھا ہو چکا تھا اس لئے اس نے قبیلہ میں اعلان کیا کہ جو مجھے سردار مانتا ہے، میرا داماد اسماعیلؑ بھی اس کا سردار ہے۔ اس طرح شہر مکہ کی آبادی' داماد' کی سرداری کے اعلان سے ہوئی۔ جہاں جگہ کھڑے ہو کر سردار نے یہ اعلان کیا تھا، وہیں ازاں بعد خانۂ کعبہ تعمیر ہوا۔ گویا خانۂ کعبہ کی عمارت داماد کی سرداری کے اعلان کی یادگار ہے!

شہر مکہ میں خانۂ کعبہ اور چشمۂ زم زم کے چاروں اطراف بنی جرہم آباد ہو گئے تھے۔ اب ان میں نسل اسماعیلؑ بھی موجود تھی۔ مکہ کی حکومت اور کعبہ کا انتظام آل اسماعیلؑ کے پاس تھا اور بنی جرہم رعایا کے طور پر رہتے تھے۔ بلاشک آل اسماعیلؑ تعداد میں بہت کم تھے۔ اسماعیلؑ کے طبعی پردہ فرمانے سے کافی عرصہ بعد، قبیلہ والوں میں سرداری کے لئے حسد پیدا ہوا اور انہوں نے اس کے لئے بنی اسماعیلؑ سے جھگڑا کیا۔ چونکہ تعداد اور ظاہرہ قوت میں فائق تھے اس لئے نوبت یہاں تک پہنچی کہ بنی اسماعیلؑ کو مکہ سے ہجرت کرنا پڑی اور اس طرح بنی جرہم، ایک دفعہ پھر مکہ پر قابض ہو کر حکمران ہو گئے۔

Marfat.com

مشہور ہے کہ عربوں کا یہی دستور ہے کہ پہلے بیٹی دے کر داماد بناتے ہیں، پھر داماد کو اپنا سردار مان لیتے ہیں اور انجام کار سرداری تسلیم کر لینے کے باوجود ملک بدر کر دیتے ہیں۔ مکہ سے ہجرت کر کے، اولادِ اسماعیلؑ کی ایک شاخ یمن میں جا کر آباد ہو گئی۔ عرصۂ دراز کے بعد، اولادِ اسماعیلؑ میں، قصیٰ نام کا ایک شخص پیدا ہوا، جس نے اپنے بکھرے ہوئے قبیلہ داروں کو اکٹھا کیا اور اپنے جدِّ امجد کی وجہ سے آباد ہونے والے شہر مکہ کا رُخ کیا۔ بنی جرہم آڑے ضرور آئے، مگر معمولی مزاحمت کے بعد یہ متبرک شہر دوبارہ بنی اسماعیلؑ کے زیرِ تسلط آ گیا۔ قَ رَشَ کے معنی بکھرے ہوؤں کو اکٹھا کرنا ہیں، اسی بنیاد پر قصیٰ کا لقب قریش یعنی اکٹھا کرنے والا مشہور ہو گیا اور اولادِ قصیٰ قریشی کہلانے لگے۔ جب مکہ میں قریشی خاندان نے اپنے قدم مضبوط کر لئے، تو مختلف سمتوں اور علاقوں میں آباد قریباً تمام اولادِ اسماعیلؑ مکہ مکرمہ واپس لوٹ آئے، مگر جو لوگ یمن کی طرف چلے گئے تھے، انہوں نے واپس مکہ آنے کو ترجیح نہ دی۔ دراصل وہاں ان کے کاروبار اور تجارت خوب چمک کر مستحکم ہو گئے تھے اور اس بنیاد پر وہاں ان کی عزت و شہرت بن گئی تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ان لوگوں نے مذہب عیسائیت اختیار کر لیا ہوا تھا۔ اس زمانے کے عیسائی مذہب کے قانون کے مطابق جو شخص راہبانیّت اختیار کر لیتا، اس کا تمام اثاثہ اس کے قریبی اہل خانہ کو دے دیا جاتا تھا۔ جدّ الانبیاءؑ اور پیکرِ صبر و رضاؑ کے خون کی تاثیر کی وجہ سے بہت سے بنی اسماعیلؑ، راہب بن گئے تھے اور اس طرح یمن میں موجود قریب تمام بنی اسماعیلؑ کی دولت سمٹ کر، ایک شخص کے ہاتھوں میں آ گئی، جس کا نام خُوَیْلِد تھا۔ اس کو ذات نے دو بیٹیاں عطا کی تھیں، بڑی کا نام 'خدیجہ' تھا اور چھوٹی کا نام تھا 'ہالہ'۔ آخر کار خویلد بھی اپنی بیٹیوں اور تمام دولت کو سمیٹ کر مکہ مکرمہ ہجرت کر آئے تا کہ اپنی اصل یعنی بنی اسماعیلؑ میں شامل ہو سکیں۔ یہاں آ کر کچھ عرصہ بعد خویلد کا انتقال ہو گیا اور اس طرح خدیجۃُ الکبریٰؑ اس تمام دولت و جائیداد کی وارث بن گئیں۔ انہوں نے اس مال و متاع سے تجارت شروع کی اور بہت جلد ان کا شمار مکہ کے بڑے تاجروں

Marfat.com

میں ہونے لگا۔ اس قدر ترقی ہوئی کہ قریباً ۹۰ ہزار اونٹ سالانہ یمن اور ۹۰ ہزار اونٹ شام جایا کرتے تھے۔ ان کے قافلۂ تجارت کو اکثر عرب قبائل لوٹنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ جب کئی جتن کرنے کے باوجود انہیں کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے مکہ مکرمہ میں پہلے سے آباد بنی اسماعیلؑ کے سرخیل، ابو طالبؑ بن عبد المطلب سے، جو خانۂ کعبہ کے متولی تھے، درخواست کی کہ اس ڈاکہ زنی کو روکنے کا کوئی سربند کریں۔ انہوں نے کمال بصیرت سے اِیلٰاف (مشترکہ تجارت) کی بنیاد ڈالی اور خدیجہؑ کی تجارت میں عرب کے تمام بڑے قبائل کو شریک بنا کر، منافع میں ان کا مخصوص حصہ مقرر کروادیا۔ جس کی وجہ سے تمام قبائل راہزن ہونے کی بجائے ان تجارتی قافلوں کے رکھوالے ہو گئے۔ عربی زبان میں کمپنی بنا کر تجارت کرنا ایلاف کہلاتا ہے۔ قرآن کی مشہور سورۃ الایلاف اسی واقعہ کی طرف منسوب ہے!

ابو طالبؑ بن عبد المطلب نے اسی کاوش کے دوران خدیجۃُ الکبریٰ کی خوبیوں کا اندازہ کرتے ہوئے، اپنے بھتیجے محمدؐ بن عبد اللہ کو، اس مشترکہ تجارت میں عملی معاونت کے لئے شامل کیا، اور جب کہ وہ پچیس (۲۵) سال کے ہو چکے تھے تو ان کا نکاح چالیس (۴۰) سالہ خدیجہؑ سے کروادیا۔ اعلان نبوت سے ایک برس قبل ان کے ہاں فاطمۃُ الزھرآ نے جنم لیا۔ ہجرتِ نبوی کے دوسرے سال اُن کے جیون ساتھی کے طور پر ابو طالبؑ کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ علیؑ کا انتخاب کیا گیا۔ ان دونوں مطہر ذوات کے یَلْتَقِیٰنِ سے جو اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ خارج ہوئے، انکے اسماء حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔

خویلد کے کے خاندان کا ایک شخص جس کا نام امر ائالقیس تھا اور جو تب تک دو بیٹیوں کے ساتھ یمن میں مقیم تھا، خلیفۂ سوم عثمانؓ کی خلافت کے دنوں میں اپنی دونوں بیٹیوں، سلمٰی اور سلامہ کو لیکر مکہ آ گیا۔ مولا علیؑ سے ملاقات کے بعد، انہی کے ہاتھوں، اس نے دلی رغبت سے اسلام قبول کیا اور اپنی

Marfat.com

بڑی بیٹی سلمٰی کا نکاح امام حسنؑ سے کر دیا جن کے بطن سے شہزادہ قاسمؑ، شہیدِ کربلا، پیدا ہوئے۔ دوسری بیٹی سلامہ کا نکاح، ازاں بعد امام حسینؑ سے ہوا، ان کے بطن سے بی بی سکینہؑ اور علی اصغرؑ پیدا ہوئے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہیں اسماعیلؑ

۳۵۔ امام النّاس

سورۃ البقرہ آیت ۱۲۴: وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ: یعنی جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے اپنے مخصوص انداز سے ابتلا میں ڈالا اور وہ اس میں کامیاب و کامران ہوئے تو فرمایا تحقیق آپ کو لوگوں کا امام مقرر کیا گیا۔ ابراہیمؑ نے خواہش کی کہ ایسا عمل میری اولاد میں بھی جاری رکھا جائے۔ جواباً فرمایا گیا ہرگز پورا نہ کیا جائے گا میرا عہد ظالموں کے ساتھ (ہاں مظلوم کے ساتھ پورا ہوگا)۔ ابراہیمؑ وہ عالی مرتبت ہستی ہیں جنہیں قرآن کی رو سے اوّل امام النّاس مقرر کیا گیا۔ اس منصب اعلیٰ کی بنیاد ان ہی کے لئے بنائی گئی۔ لیکن منشائے ایزدی کے تحت انہیں بار بار مشکلات اور تکالیف میں مبتلا کیا گیا۔ وہ ان تمام آزمائشوں میں بفضل تعالیٰ کامیاب ہوئے۔ ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ ہوئی، حتیٰ کہ انہوں نے روح الامین جبرائیلؑ کی مدد قبول کرنے سے بھی انکار فرما دیا۔ بلاشبہ انبیائے سابقون میں ابراہیمؑ بہت خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ نبی اللہ بھی تھے۔ رسول اللہ بھی ہوئے۔ خلیل اللہ بن کر خلت سے بھی سرفراز کیے گئے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ سب سے زیادہ آزمائشوں میں مبتلا کیے گئے اور جب تمام امتحانوں میں بدرجہ اتم پورے اتر آئے تو ذاتِ احدیت نے آپ کو عوام النّاس کا امام بھی مقرر فرما دیا۔ ازروئے قرآن زمین پر یہ پہلی امامت تھی جو آپ کو تفویض ہوئی۔ دراصل یہ ان سخت تکلیف دہ

Marfat.com

آزمائشوں میں استقامت کا انعام تھا، جس کا آپ نے مظاہرہ فرمایا تھا۔ نمرود نے جد الانبیآء کے لئے بہت بڑی آگ جلائی، اور آپ کو اس میں ڈالنے کے لئے ایک منجنیق تیار کی گئی۔ وقتِ مقررہ پر آپ کو پھینکا گیا اور آگ کی طرف جاتے ہوئے جب ہوا میں معلق سفر کر رہے تھے تو بحکم الٰہی جبرائیل امین آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میری طاقت کا اندازہ آپ اس بات سے لگالیں کہ میں سدرۃ المنتہٰی پر استراحت میں تھا، مجھے حکمِ ربّی ہوا کہ ہمارا بندہ ابراہیمؑ منجنیق سے پھینکا جاچکا ہے اور آگ میں گرنے والا ہے، فوری طور پر جاکر اس کی مدد کرو اور خیال رہے اسے کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔ نبی اللہ حکم سننے کے بعد سدرۃ المنتہٰی سے آپ تک میرا یہ سفر پلک جھپکنے میں طے ہوا ہے۔ آپ فرمائیں اپنی ان تمام قوتوں سے آپ کی کیا اور کیسے مدد کروں؟ روایات میں ہے کہ جو آگ جلائی گئی تھی وہ ایک میل لمبی اور ایک میل چوڑی وادی کو گھیرے تھی اور تین میل بلندی پر اڑنے والے پرندے بھی اس آگ کی حدت سے جل کر بھسم ہو رہے تھے۔ منجنیق کے زور سے آگ کی طرف پھینکے گئے ابراہیمؑ کو اس آگ کی شدت محسوس ہو رہی تھی اور چند لمحوں بعد وہ اس میں گرنے والے ہی تھے۔ آگ میں جلنے کی بڑی دہشت ہے کیونکہ وہ ہر کسی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور بڑے بڑوں کا پتہ پانی کر دیتی ہے، مگر قربان جایئے خلیل اللہؑ مسکرائے اور جو کچھ ارشاد فرمایا وہ توکل الی اللہ کی ایسی عظیم مثال ہے کہ انبیائے سابقون میں اس کی نظیر ملنا محال ہے۔ کہا، اے جبرائیل تجھ سے کوئی حاجت نہیں، مجھے اگر حاجت ہے یا تھی تو اس ذات لم یزل سے جس کے قبضہ قدرت میں کل کائنات ہے۔ جبرائیل نے کہا تو پھر اسی بارگاہ میں التجا فرمائیں کہ میں جلد از جلد آپ کی التجا اس تک پہنچاؤں۔ آپ پھر مسکرائے اور ارشاد فرمایا: حَسْبُہٗ سُوَالِی عِلْمُہٗ بِحَالِی: یعنی اس کا میرے حال کو جاننا میرے سوال کرنے سے بہتر ہے۔ مجھے یقین کامل تھا کہ وہ جانتا ہے آگ ابراہیمؑ کے لیے جلائی گئی ہے اور وہ میری تمام کیفیات کا بھی واقف ہے۔ تیرے آنے سے قوی ثبوت مل گیا کہ وہ میرے حال سے

Marfat.com

واقعی بے خبر نہیں، تو پھر سوال کی کیا ضرورت ہے؟ مالک کائنات کو یہ توکل اتنا پسند آیا کہ سورۃ الانبیاء آیت ۶۹ میں حکم دیا: یٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ: یعنی اے آگ ابراہیمؑ کے لئے ٹھنڈی ہو کر سلامتی والی ہو جا، تاکہ میرے خلیل کو دشواری پیش نہ آئے، بلکہ جبرائیلؑ کو فرمایا کہ اسے گل و گلزار بنادو اور اپنے پروں پر بٹھا کر آپ کو اس گلزار میں جاگزیں کرو۔ ایک یہی امتحان غمازی کر سکتا ہے کہ ابراہیمؑ کو کن کن سخت دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مصائب وآلائم میں استقامت شیوۂ رسول ہوتا ہے مگر ابراہیمؑ جن مصائب سے دوچار ہوئے، وہ ان کے لئے مخصوص تھے۔ ان دشواریوں اور دقتوں پر استقامت کا انعام بشکل امامت عطا ہوا۔ آپؑ کو عوام النّاس کی جو امامتِ اوّل عطا ہوئی اس کی بنیاد اس مصدقہ آیت کی رو سے فقط مصائب و آلائم میں استقامت ہے، گویا وہ امام نہیں ہو سکتا جو شدت و سختی کے وقت چُوک جائے اور اس کے پاؤں میں لغزش آجائے۔ جوں ہی ابراہیمؑ اس انعام سے سرفراز ہوئے تو انہوں نے بارگاہ ایزدی میں ایک التجا کی۔ 'اے مالک یہ تیرا کرم ہے تو نے مجھے اس قابل سمجھ کر اتنے بڑے انعام کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیا۔ اب اولاً تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اس منصب کا صحیح حق ادا کر سکوں اور دوسرے اس منصب کو میری اولاد میں بھی جاری رکھ'۔

جد الانبیاءؑ نگاہ و بصیرت سے یہ جان چکے تھے کہ شانِ امامت کیا ہے، تبھی تو التجا کرنے لگے، و گرنہ، جب اپنی زندگی انتہائی خطرہ میں تھی، جبرائیلؑ مدد کے لیے حاضر بھی تھا، تب بھی اس اولوالعزم خلیلؑ نے نہ تو جبرائیلؑ سے مدد گوارہ کی اور نہ ہی دعا فرمائی۔ لیکن منصبِ امامت عطا ہوتے ہی التجا کرنے لگے۔ کیا ان کا وہ توکل جز وقتی مانا جائے یا کیا منصبِ امامت عطا ہونے پر توکل کے مقام سے ناآشنا ہوگئے تھے؟ جد الانبیاء کے باب میں یہ سوئے ادب ہے۔ اصل میں امامت اپنی ذات میں ایسے فضائل و مناقب سمیٹے ہوئے ہے، کہ خلیل اللہؑ پر جونہی وہ وارد ہوئے، بے اختیار آپؑ نے خواہش کی

Marfat.com

کہ یہ فضائل اس جہان میں برقرار رہیں، اور کیا ہی اچھا ہو اگر صرف اولادِ ابراہیمؑ ہی میں جاری رہیں۔ صدقِ خلیل اللہ کی بنیاد پر دعا کی قبولیت ہوئی اور ذاتِ احدیّت نے اپنے خلیل کو عہد دیا کہ تیری اولاد کے علاوہ کوئی منصبِ امامت کا حق دار نہ ہوگا مگر شرط رکھی کہ اس بارِ گراں کا اہل صرف 'مظلوم' ہوگا۔

غور طلب ہے کیا مظلوم وہ ہے جس پر مسلسل ظلم ڈھایا جائے اور وہ بزدل بن کر اسے سہتا رہے! یہ مظلومیت نہیں ہے بلکہ بزدلی کے علاوہ بے وقوفی اور بے غیرتی ہوتی ہے۔ مظلوم دراصل وہ ہے جسے اگر ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا پڑے تو وہ ہرگز یہ نہ دیکھے کہ اسباب کے جہان میں کمزور ہے اس لئے ظالم اپنی طاقت کے زور پر اسے ختم کر دے گا، بلکہ رضائے ربّی کی خاطر سینہ سپر ہو کر ظالم سے ٹکرا جائے، جیسے امام حسینؑ نے اللہ کا دین اور رسول کا کلمہ بچانے کے لئے اپنے سمیت ۱۸ ہاشمیوں اور ۵۴ صحابہ کی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور یہ بھی ان کے لیے کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا۔ امامت دراصل شہادت کے درجہ کا نام ہے، جو اللہ کے سچے مالک و خالق ہونے کی ہر حال میں گواہی دینے سے تعبیر کی جاتی ہے۔ ابراہیمؑ کو جب آزمائشوں اور ابتلا میں ڈالا گیا اور اتمام کی حد تک کامیابی سے انہوں نے جب گواہی دینے کا حق ادا کیا تو انہیں امام الناس بنایا گیا اور ان کی اولاد میں سے حسینؑ ابن علیؑ نے بھی خدائے بزرگ و برتر کی واحدانیت کی بے مثال شہادت (گواہی) پیش فرمائی۔ ایسی کامل شہادت اور ایسی کامل امامت اہلِ زمین و اہلِ آسمان نے نہ پہلے کبھی دیکھی تھی اور نہ سنی تھی۔ یہ امامت و شہادت بھی دعائے ابراہیمی کا نتیجہ تھی!

۳۶۔ اوّل بیت

سورۃ آل عمران آیات ۹۶ / ۹۷: اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۹۶
فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰہِیۡمَ ۬ۚ وَ مَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ

Marfat.com

اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا : یعنی تحقیق وہ اوّل گھر جو لوگوں کے لیے مکہ مکرمہ میں تعمیر کیا گیا وہ تمام جہان کے لیے ہدایت ہے۔ اس میں روشن اور واضح نشانیاں ہیں اور مقام ابراہیم بھی یہیں ہے۔ جو کوئی اس میں داخل ہو، اسے امن مل جاتا ہے اور جو لوگ استطاعت رکھتے ہیں ان پر اس گھر کا حج، اللہ کے لیے مقرر ہے۔

اَوَّلَ: جس سے قبل کوئی مادہ نہ ہو مگر قدیم بھی نہ ہو۔ یہ بے نمونہ ضرور ہو گا۔ اور اس سے پہلے مادہ وغیرہ نہ ہو گا۔

بَیۡتٍ: گھر، یا رہائش گاہ کو کہتے ہیں۔ جہاں سکونت اختیار کی جائے اور سکون میسر آئے۔ چونکہ تخاطبِ قرآن آدمؑ اور بنی آدم کے لیے یکساں ہے، اس لئے اوّل بیت، آدم کے لیے بھی وہی ہو گا جو آج ہمارے لیے ہے۔

وُضِعَ: اس کے معنی بناوٹ، شکل، حال، ڈھنگ، طرز وغیرہ کے ہیں جب کہ تعمیر کسی شکل میں وضع کے معنی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ لفظ اسم ہے، فعل نہیں اور اسم، مجسم نہیں ہو سکتا۔ بیت اللہ جو مکہ مکرمہ میں تعمیر کیا گیا، بالوجود، فعل کا اظہار ہے، اسم کا نہیں۔

اگر مکہ مکرمہ میں مسجدِ بیتُ الحرام کو وہ اوّل گھر تسلیم کر لیا جائے، تو کچھ قباحتیں سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کی وضع ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے کی جبکہ یہ دونوں مقتدر اور مصدق انبیاءِ کرام اوّل نہیں ہیں، ان سے قبل نوحؑ، ادریسؑ، شیثؑ اور آدمؑ کے بحیثیت انبیاء مذکور ملتے ہیں۔ کیا یہ سمجھا جائے کہ وہ اس اوّل گھر، روشن آیات اور حصولِ امن سے محروم رہے؟ چونکہ قرآن کی دلالت ہے کہ اوّل گھر تمام عوام النّاس کے لیے ان خوبیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہے، اس لئے یہ عبث لگتا ہے۔ کیا یہ مان لیا جائے کہ ابراہیمؑ سے قبل کے بنی آدم "النّاس" میں شمار نہیں ہوتے؟ یہ بھی ناانصافی ہو گی۔ بیت اللہ کو تو

Marfat.com

قرآن میں بیت العتیق کا نمونہ قرار دیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت العتیق اوّل ہو سکتا ہے۔ یوں بھی مٹی، اینٹوں اور گارے وغیرہ سے اگر کوئی عمارت بنے، تو مٹی اور اینٹیں اوّل ہونگی، عمارت نہیں۔ کیونکہ اوّل، اوّل ہونے میں کسی بھی سبب کا محتاج نہیں ہوتا۔ ایک اور اشکال "بِبَكَّةَ" کے ترجمہ میں ہو گیا کہ اسے سعودی عرب کے شہر مکہ سے تعبیر کیا گیا جب کہ اس سے مراد، برکت والا ہے اور شہر کی حیثیت سے مکہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے۔ بی بی حاجرہ اس سنگلاخ زمین میں ایک بوند پانی کے لیے تڑپتی نظر آتی ہیں، یہاں سے بنی اسماعیلؑ کو زبردستی بے دخل کیا جاتا ہے اور اعلانِ بعثت کے ساتھ ہی محمدؐ ابن عبد اللہ کے ساتھ جو سلوک اس شہر والوں نے روا رکھا، اسے کیونکر برکت شمار کیا جائے۔ موذنِ رسول بلالؓ بن رباح کے ساتھ تپتی ہوئی ریت پر جو مظالم توڑے گئے، توہینِ انسانیت میں تو شمار ہو سکتے ہیں، انہیں برکت کہنا زیادتی ہوگی۔ اگر مکہ شہر برکت والا ہے تو پھر تمام رؤسائے قریش متبرک شمار ہونگے۔ نبی صادقؐ کے نعلین مبارک کا خون سے بھر جانا اور عبد اللہ بن زبیرؓ کی بہیمانہ شہادت کو بھی اسی طرح تعبیر کرنا ہوگا۔ نو (۹) مرتبہ کعبۃ اللہ کی دیواروں کا منہدم ہونا، حرم خدا میں شراب نوشی اور اخلاق سوز حرکات، اس کے صحن میں گھوڑوں کا باندھنا، اصحابِ رسولؐ کا یہاں قتل ہونا اور غلاف کو آگ لگائی جانا، سب اسی برکت کا حصہ ماننا پڑے گا۔ عقل کی کسوٹی پر یہ باتیں برکت کے ضمن میں نہیں آسکتیں، لہٰذا ثابت ہوا بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا سے شہر مکہ مراد نہیں ہو سکتی۔

اس بیت کے متعلق قرآن فرما رہا ہے کہ وہ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے۔ اگر مذکورِ قرآن شہر مکہ والا بیت اللہ ہے تو اس کا طواف تو صرف مسلمان کرتے ہیں، کسی غیر مذہب میں اس کا طواف مقرر ہی نہیں، جب کہ ربّ العالمین کی مخلوق میں چرند، پرند اور وحوش سمیت تمام بنی نوعِ آدم شامل ہیں، صرف کلمہ گو نہیں۔ اگر بیت الحرام یہی تصور کیا جائے، تو کسی غیر مسلم کے داخلہ پر پابندی کے کیا معنی ہونگے؟ کیا یہ جبری طور پر کسی کو ہدایت سے محروم کرنا نہ ہوگا؟ اسی طرح اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ: یعنی واضح اور روشن

Marfat.com

نشانیاں اگر حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم وغیرہ کو مان لیا جائے، تو ان کو ایسا ثابت کرنا مشکل ہو گا۔ پھر فرمایا گیا کہ جو کوئی اس بیت میں داخل ہو جاتا ہے وہ امن کے گھر میں داخل ہو جاتا ہے، اس کے لیے ہمیشہ کا چین، سکون اور راحت ہے اور اسے کوئی تکلیف، رنج، غم اور خوف نہیں رہتا۔ یہ سب نہ تو شہر مکہ کے احوال میں نظر آتا ہے، اور نہ ہی بیتُ اللہ میں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا اوّل گھر ہے جو عوام الناس کے لیے وضع ہوا جس کو تمام عالم کے لیے منبع ہدایت مقرر کیا گیا اور اس میں واضح نشانیاں رکھی گئیں، جن میں مقامِ ابراہیمؑ خصوصی طور پر نمایاں ہے اور جس میں داخل ہونا امن و سلامتی کا پیغام ہے۔ اوّل، نُور محمدؐ ہے۔ اور آپؐ کا قلب ہی وہ مقام یا بیت ہے، جو اس طرح وضع کیا گیا، کہ بیتُ اللہ یعنی خالقِ کائنات کا مسکن بنا۔ وہی عالمین کے لیے سراپا ہدایت ہے اور اجزائے رسالت کی صورت میں اس میں اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ ان کرداروں کی شکل میں موجود ہیں، کہ جن کا طواف زندگی کا اصل اُلاصول ہے۔ خلتِ ابراہیمیؑ بھی ان میں سے ایک ہے۔ جو کوئی ان کرداروں کو اپنا کر، ان سے متعلق ہو کر زندگی بھر ان ہی کا طواف کرے، وہ حاملِ امن و سکون یعنی ہمیشگی کی جنت کا باسی ہو جاتا ہے۔ یہی اوّل بیت، آدمؑ سے لیکر عیسٰیؑ تک اور حضورؐ کے زمانہ کے بعد سے آج تک کے عوام الناس کے لیے مرجعِ انوار و خلائق ہے۔ رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ہونے کے ناطے اس میں تمام عالم کے لیے ہدایت موجود ہے۔ چونکہ تمام امتّوں کا وجود، جد الانبیاء ابراہیمؑ کے طفیل ہوا، اس لیے انہیں بالخصوص روشن نشانی کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے تاکہ ثابت ہو جائے کہ بلا تمیزِ مذہب، رنگ اور نسل یہی اوّل بیت ہے، جو عوام النّاس کی رشد و ہدایت کے لیے وضع فرمایا گیا۔ چونکہ ہر صفت، صفتِ محمدؐ ہے اس لیے عوامُ النّاس میں سے ہر ایک کا اپنا قلب، قلبِ محمدؐ کی تشبیہ ہے۔ ہر کسی کا قلب اسی طور پر وضع ہوا کہ اس کی اپنی ذات کے لیے وہ اس کا اوّل بیت ہے، جس میں اس کے لیے واضح اور روشن نشانیاں ہیں اور وہ اس کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ جو اپنے ہی قلب سے متعلق ہو کر، عرفانِ خودی حاصل کر لے، وہ ہمیشہ کے لئے امن

Marfat.com

اور شانتی والے گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس امن کی بنیاد، ان کرداروں کو اپنانا ہوتا ہے، جو اس گھر میں ایاتٌ بیّنٰتٌ کی شکل میں موجود ہیں۔ درحقیقت جب تک قلب مصطفیٰ سے نور ہدایت میسر نہ آئے، کوئی بھی اپنا عرفان نہیں کر سکتا۔ قلب مصطفیٰ کا نور، اب اولیاء اللہ کے قلوب میں جاگزیں ہے اور ان کے قلوب ہی ہمارے لیے اول بیت ہیں۔ اپنی اپنی پیاس، ہر صاحب استطاعت کو ان قلوب سے متعلق کرنے کا سبب بنتی ہے، جہاں تشنگی بجھنے کے علاوہ ایاتٌ بیّنٰتٌ کا عرفان ملتا ہے اور انجام کار امن کی شکل میں سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ آیت متذکرہ میں عوام الناس کی طرف نسبت اسی عمل کی مقرر کی گئی ہے!

۳۷۔ الحمدُ للہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ: یعنی سب تعریفیں اللہ کے لئے جو پالنے والا ہے سب جہانوں کا۔ مہربان، رحمت والا۔ روز جزا کا مالک۔ ہم تجھے پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ ہدایت فرما۔ ان کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا اور جو تیرے غضب اور گمراہی سے بے بہرہ ہیں۔

سورۃ الفاتحہ ابتدائے قرآن بھی ہے اور تمہید قرآن بھی۔ تمہید میں نفس مضمون، یا حاصل کتاب نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور مضمون یا کتاب کا کوئی گوشہ، پہلو یا حصہ اس سے باہر نہیں رہتا۔ گویا کُل قرآن میں جو کچھ بالتفصیل بیان کیا گیا ہے، ان تمام مضامین کو بالاختصار سورۃ فاتحہ میں سمو دیا گیا ہے۔ قرآن چھ (۶) ہزار سے زائد آیات کا مجموعہ ہے جبکہ سورۃ فاتحہ میں چھ (۶) آیات

Marfat.com

شامل ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاتحہ کی ایک آیت، قرآن کی ایک ہزار آیات کی نمائندہ ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جس طرح ایک ننھا بیج (Seed)، مستقبل میں ہونے والے مکمل درخت کو اپنے اندر سموئے ہوتا ہے۔ اس بیج کو زمین میں رکھ کر اگر اس کی فطری ضروریات پوری کر دی جائیں تو جلد وہ ایک تن آور درخت بن جاتا ہے، اسی طرح اگر سورۃ فاتحہ کی ایک آیت، حُبّ کی مانند اپنے سینے کی زمین میں بو دی جائے، اور پھر ضروری فطری تقاضے پورے کر دیے جائیں، تو یقیناً وہ حُبّ کھل کر ایک ہزار آیاتِ قرآنی کی تفہیم کا باعث بن سکے گا۔ اس کی چھاؤں میں زندگی گزارنا آسان ہو گا، اس کا پھل، خورد و نوش کا سامان ہو گا، پھول، خوشگوار زندگی کی رنگینیوں کا غماز، تنا، یقینِ کامل کا علمبردار، جڑیں، ذکر و فکر اور نسبتِ پیہم کا نشان ہوں گی اور ٹہنیاں، صالح اولاد کی طرح پھیلیں گی۔ ہر ہر پتّہ ایک آیت بن کر خود اپنے آپ کو آشکار کرے گا اور اس کی ہریالی، دل و دماغ کو تر و تازہ رکھنے کے علاوہ صفاتِ خضر کی علامت ہو گی۔ چونکہ اس خضر کو آپ نے خود اپنی حُبّ سے پروان چڑھایا ہو گا، اس لئے اس کے شناسا ہونے میں کوئی شک نہ ہو گا۔ جس طرح قرآن ایک ایسی اتھاہ گہرائی ہے جس کی حد، عقل وبساطِ آدم سے باہر ہے، اسی طرح تمہیدِ قرآن بھی، گو مختصر وقت میں مکمل تلاوت ہو جاتی ہے، مگر اس کے رازِ کُلی کو پانا آدم زاد کے لئے ناممکن حد تک مشکل ہے۔ اس کو ہر نماز کی ہر ہر رکعت میں تلاوت کرنا اسی لئے فرض کیا گیا ہو گا کہ مبادہ بار بار کی دہرائی ہی اس حُبّ کا سبب بن جائے جو اس کو آشکار کر سکتی ہے۔

i: حمد / الحمد۔ کسی مصور کی تصویر اگر اتنی دل پزیر ہو کہ واثق یقین کے ساتھ کہا جا سکے کہ ایسا شاہکار دوبارہ ممکن نہیں، تو اس مصور کے لئے کہے گئے 'تعریفی الفاظ' حمد کہلاتے ہیں۔ اس حمد کا باعث کوئی مخلوق، سبب یا شاہکار ہو گا مگر اظہار کیے گئے دلی جذبات خالق، مسبّب اور مصور کے لئے ہوں گے۔ بلاشک تعریف کی گئی مخلوق و تصویر، عالمِ شہود میں ظہور پزیر ہو گی اور دیکھے یا محسوس کئے جانے پر

Marfat.com

ہی اپنے اس خالق و مصور کی حمد کا سبب بنے گی، جس نے 'قدر' کے ساتھ شاہکار کو تخلیق کیا ہو گا۔ اس کے لئے لازم نہیں ہو گا کہ خالق یا مصور، حمد کئے جانے کے وقت، خود اس جگہ ذاتی طور پر موجود بھی ہو۔ جاننا چاہیے کہ بے قدری کے ساتھ بننے والی تصویر کبھی 'قابلِ حمد' نہیں ہو سکتی کیونکہ حمد کی نسبت دلی رغبت و پسند سے ہے۔ اسی طرح بے دلی، بے رغبتی اور جبر کے ساتھ کی جانے والی تعریف، حمد کے زمرہ میں نہیں آئے گی یعنی حمد میں منافقت اور بناوٹ کو کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ حمد خالصتاً امورِ خیر کی طرف منسوب ہوتی ہے اور فعلِ فاسدہ و شر انگیز کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مختصراً کسی شاہکار کو دیکھ کر، خالقِ شاہکار کے لئے، دل کی گہرائی سے بے اختیار نکلنے والا جذبہ و اظہار، حمد ہوتا ہے اور اَل کی اضافت اس کو مخصوص کر دیتی ہے، اس لئے کسی خاص شاہکار کو دیکھ کر، سُن کر یا محسوس کر کے، سچے دل سے اس کے مخصوص خالق کے لئے جو کچھ بے اختیار بیان ہو سکے گا، 'الحمد' کہلائے گا۔

ii: ربّ۔ یہ لفظ پرورش کرنا اور پرورش کرنے والا، دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ ماں کا اپنے بچے کی نشوونما کرنا عملِ ربوبیت ہوتا ہے جس میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے اور یہ ایک محسوساتی فعل (Physical action) ہوتا ہے۔ بچے کا پیٹ بھرنے کے لئے ماں کو اسے گود میں لے کر سینے تک اٹھانا پڑے گا، نہلانے کے لئے بھی وجودی کاوش درکار ہو گی، صرف تصور سے یہ ممکن نہ ہو گا۔ لہذا ضروری ہو گا کہ ربّ بشکلِ وجود، موجود ہو اور اس کا وجود اتنا مکمل اور توانا بھی ہو کہ عملِ ربوبیت سر انجام دے سکے۔ وجود کی طرح سوچ اور عقل و دانش کی ربوبیت بھی ہو سکتی ہے، مگر بنیادی اصول اس صورت میں بھی تسلسل اور محسوساتی عمل ہوں گے اور استاد کو بشکلِ وجود، موجود ہو کر ہی کسی کی راہنمائی کرنا ہو گی۔

iii: الرحمان و الرحیم۔ ان دونوں اسماء کا مصدر 'رحم' ہے، جس میں پرورش کے ساتھ مضر بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنا شامل ہے۔ بار بار کی جانے والی کرم نوازی الرحیم کی طرف منسوب کی جاتی ہے، جب کہ خاص موقع اور ضرورت کے تحت خصوصی اور فوری رحمت، الرحمان میں ظاہر ہے۔ اس مصدر میں قربت و اپنائیت (Intimacy) اپنی انتہا تک ہے۔

Marfat.com

iv: یومِ الدین۔ یوم، جہاں ایک دن یعنی چوبیس (۲۴) گھنٹوں کو ظاہر کرتا ہے، وہاں اس سے مراد زمانہ، دَور اور وقت بھی لئے جاتے ہیں۔ نسبت اس کی وقت (Time) ہی کے ساتھ ہے مگر تعین لازم نہیں، اس لئے صدیوں پر محیط وقت بھی یوم کہلا سکتا ہے۔ دین سے مراد منزل (Destination) ہے جو زندگی کا مطمحِ نظر ہو، جب کہ حصولِ منزلِ مقصود کی تمام راحتیں، مٹھاس اور آسانیاں اس میں شامل ہوتی ہیں۔ دین میں قرب و خلت کا مفہوم مضمر ہے، اس لئے یومِ الدین سے مراد یا تو وہ وقت ہے جس دوران منزلِ مقصود تک پہنچنے کی جدوجہد جاری رہتی ہے، یا پھر منزلِ مقصود پر پہنچ جانے کے بعد اطمینان و سکون کا وقت بھی یومِ الدین کہلا سکتا ہے۔

v: صراطِ مستقیم۔ سیدھا راستہ اس سے مراد لیا جاتا ہے مگر در حقیقت منزلِ مقصود تک بآسانی اور کم سے کم وقت میں لے جانے والے راستہ کو کہتے ہیں۔ ہر قدم کے نیچے بے شمار راستے ہو سکتے ہیں مگر جو بآسانی و بالعجل منزل تک پہنچا دے، صراطِ مستقیم وہی ہوگا۔ ایسا طریق جو کسی کام کو سہولت سے اور کم وقت میں بہترین انداز سے سرانجام دلا سکے، اسے بھی صراطِ مستقیم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

vi: نعمت۔ فراوانی، آسائش، تر و تازگی، ملائمت، کشادگی اور کرب و رنج سے دوری کے پہلو اس میں پائے جاتے ہیں اور یہ بدنی اور باطنی دونوں کیفیات پر لاگو ہو سکتی ہے۔ اردو زبان میں مستعمل 'اَنعام (Prize, Award)' اور 'اِنعام (Cattle)' دونوں میں نعمت مضمر ہے۔ چونکہ بنی آدم کو معاشرتی حیوان (Social Animal) کہا جاتا ہے اس لحاظ سے نعمت اس کے فطری تقاضے پورے کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ ظاہر و باطن میں متذکرہ بالا خصوصیات کا پایا جانا نعمتِ (خداوندی) کا نشان ہوتا ہے۔

vii: غضب مغضوب۔ چونکہ غضب میں شدت، سختی اور سرخی کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے مفعول ہونے کے ناطے مغضوب وہ افراد ہوں گے جن کی زندگی سختی اور شدت میں بمشکل تمامی گزر رہی

Marfat.com

ہو۔ محنتِ شاقہ کرتے وہ سرخ ہو جاتے ہیں مگر ان کا صلہ بہت خفیف ہوتا ہے۔ وہ ظاہری طور پر بہت بے چین رہتے ہیں۔ غضبِ خداوندی سے مراد معصیت پر 'پکڑ' ہے اس لئے مغضوب وہ ہوگا جو ہر وقت خداوندی گرفت میں ہو۔ محبت کے تحت اس کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ مغضوب وہ ہوگا جو اپنی خواہش سے کچھ نہ کر سکتا ہو بلکہ حکمت و قدرِ خداوندی اس کے افعال کا باعث ہوں۔

viii: ضالین۔ اس میں سیدھی راہ سے ہٹنے کے ساتھ ہٹنے کے عوامل اور ممکنہ نتائج و اثرات شامل ہوتے ہیں، مثلاً حیرت، نامرادی، پست حوصلگی، تباہی و بربادی، بُجھنے اور مارے مارے پھرنے کا مفہوم۔ بھٹکے ہوئے اور راہ گم کئے ہوئے لوگ اس سے مراد ہیں۔

بلاشبہ حمد اسی مالک و خالق کل کائنات کو سزاوار ہے جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے، کیونکہ اگر عمل پرورش رُک جائے تو کائنات اپنی موت آپ مر جائے۔ جہان کا ہر ذرہ، ربوبیت کا طالب ہے اور پروردگاری کے بغیر وہ اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اپنی طبعی عمر پوری کر سکے، اس لئے لازم آتا ہے کہ سب سے زیادہ باعثِ حمد، فعلِ ربوبیت ہو۔ کسی شاہکار کا ہونا ربوبیت کا مظہر ہوتا ہے اور جب شاہکار کو دیکھ کر جذبۂ حمد اجاگر ہوتا ہے تو اس کی وجہ ربوبیت ہی ہوتی ہے، جو اس کے شہود میں آنے کا سبب ہوتی ہے۔ خصوصی حمد تقاضا کرتی ہے کہ شاہکار بھی خاص الخاص ہو۔ قرآن کی ابتدائی الحمد کا موجب، کسی عظیم المرتبت شاہکار کی ربوبیتِ مخصوصہ ہی ہوگی!

ہر قسم کے ننھے بیج میں سے تناور درخت اور لہلہاتے کھیت کرنا، چاند کو منازل طے کروا کر مکمل کرنا اور سمندروں، دریاؤں کی روانی کو برقرار رکھنا یا بہت نازک اور چھوٹے بچے کی پرورش سے اُسے تنومند و جوان کرنا، ایسے عوامل ربوبیت ہیں جو ازل سے عمومی طور پر ایک خاص فطری طریق پر خود بخود ہو رہے ہیں اور قابلِ تعریف ہیں مگر مخصوص تعریف کا سبب نہیں۔ ایسی حمد، جیسی حمد پہلے کبھی بیان نہ

Marfat.com

ہوئی ہو، تقاضا کرتی ہے کہ ایسی ربوبیت ہو، جیسی ربوبیت اُس سے قبل کبھی نہ ہوئی ہو، وہی "الحمد" کہلانے کے لائق ہو گی اور وہ عملِ ربوبیت بھی اپنی مثال آپ ہو گا۔

ایسی ایک اچھوتی اور مخصوص ربوبیت کا اظہار کرتا ہوں اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہلوا سکتی ہے۔ سرورِ کونینؐ مکہ سے دُور، سفر تجارت پر تھے، ابھی اعلانِ نبوت نہ ہوا تھا، ایک صادق اور امین کی حیثیت تھی۔ بی بی خدیجہؓ کا مالِ تجارت تھا۔ مراحلِ تجارت بخوبی طے کر کے اور چند اہم واقعات کی یادیں لیے جب مکہ مکرمہ واپس تشریف لائے تو سیدھے اپنے مربّی و محسن چچا ابو طالبؑ کی خدمت میں حاظر ہوئے۔ سلام کے بعد بیتابی سے پوچھا 'چچی ماں' (فاطمہ بنتِ اسد) کہاں ہیں؟ چچا مسکرائے اور فرمایا، "بیٹا، آج قریب ڈھائی، تین دن ہوئے، اطلاع آئی تھی کہ دورانِ طوافِ خانہ کعبہ انہیں دردِ زہ ہوا، دیوارِ کعبہ شق ہوئی اور وہاں قدرتِ الٰہی سے انہوں نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ مَیں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں، جاؤ اور اپنی ماں، اور اُس کے بیٹے کی خبر تو لے آؤ۔ میں قصداً ابھی تک وہاں نہیں گیا"۔ آمنہ کے لال (لعلؐ) قریب جلدی کرتے ہوئے خانہ کعبہ پہنچے۔ دیوار شق دیکھی، آواز دی، ماں نے جواب دیا "بیٹا۔ اندر آ جاؤ، مَیں ڈھائی، تین دن سے تمہاری ہی راہ تک رہی ہوں"۔ اور سامنے ہوتے تک چچی ماں نے فرمایا "بیٹا، پیدائش سے لے کر اب تک، نہ تو اس بچے نے آنکھ کھولی ہے اور نہ ہی دودھ لیا ہے، مَیں تو پریشان ہو رہی ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟" یہ سنتے تک محمدؐ اس نو مولودِ کعبہ کے سامنے ہوئے تو اس نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے حضورؐ کا چہرۂ اطہر دیکھا۔ ان آنکھوں کے چار ہونے کی وارفتگی کھینچتی ہوئی محمدؐ کو علیؑ کے بہت قریب لے گئی اور محسوس کیا کہ دودھ وغیرہ نہ لینے کی وجہ سے ہونٹ خشک ہو رہے ہیں۔ فرطِ محبت و بے ساختگی میں اپنی زبان مبارک، علیؑ کے دہن میں ڈال دی۔ آنکھیں آنکھوں سے منطبق کیے، علیؑ نے آپؐ کی زبانِ کو چوسنا شروع کیا۔ لمحہ بعد، محمدؐ کے احساسات متغیر ہو رہے تھے۔ وہ اپنی زبان، علیؑ کے دہن سے ہرگز واپس نہیں نکالنا

Marfat.com

چاہتے تھے بلکہ ان کی خواہش ہو رہی تھی کہ اے کاش یہ اسی طرح ہی رہے۔ زبان منہ میں ڈالنا بھی میری طلب تھی، علی نے نہ چاہا تھا، اب بھی علیؑ میری زبان اپنے منہ سے باہر نہ نکالے۔ لیکن کچھ ساعتوں کے بعد وہی کچھ ہوا، جو تقدیر میں مقرر کر کے لوحِ محفوظ میں روزِ ازل لکھا گیا تھا۔ گردشِ کائنات کو رواں دواں رہنا تھا اور نظامِ ہستی کو چلنا تھا اس لیے علیؑ نے زبانِ محمدؐ اپنے دہن مبارک سے نکال دی۔ جونہی یہ زبان باہر آئی، ناطق ہوگئی اور ناطق ہوتے ہی گویا ہوئی: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: اور یہی پہلا نطق، ابتدائے قرآن ہو گیا!

عقل و دانش و شعور و خیال کی ایسی ربوبیت کی کُل کائنات میں اور کوئی مثال موجود نہیں۔ بظاہر ایک نومولود، مگر کائنات کا اکیلا مولودِ کعبہ، علیؑ، نہایت فصاحت و مبین انداز میں جانتا ہے کہ اُس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ اس جہان میں ورود کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کا نہ دودھ لیتا ہے، اور نہ ہی آنکھ کھول کر اُن کا چہرہ دیکھتا ہے، یہ غیر فطری نہیں ہے، واللہ، اسے غیر فطری کہنا ظلم و ناانصافی ہوگا۔ علیؑ کی کُل زندگی ازاں بعد اس بات کی گواہی دیتی رہی کہ وہ صرف اور صرف محمدؐ کے لیے ہوا، اس کی زندگی کا اور کوئی مقصد و منشا ہے ہی نہیں، اس شش جہت میں، ہر چھ معروف سمتوں میں، محمدؐ کا حافظ و نگہبان رہا کیونکہ اس کے علم میں تھا کہ محمدؐ کو نبی آخر الزماں ہونا ہے۔ اور محمدؐ کی سب سے بڑی پہچان وہ عظیم الشان معجزہ ہونا ہے جس کو بعد میں لوگ القرآن الحکیم کہیں گے۔ محمدؐ جس دین کی تکمیل کے لیے رسول معبوث ہوں گے اُس کی بنیاد معجزۂ وحی اور تعلیمات و احکامات قرآن ہوں گے جو: فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ: ہے۔ تب کوئی نہیں جانتا اور پہچانتا تھا کہ دیوارِ کعبہ کس کے لئے شق ہوئی ہے؟ تب تک وہ مکنون ہی تھا، اس لیے انتظار کرتا رہا کہ ہونے والے خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ تشریف لائیں تو آنکھوں اور لعابِ دہن کے راستے اس کتابِ مکنون میں سے سارا قرآن انہیں منتقل کر سکے اور ایک منفرد اور لازوال ربوبیت کی تکمیل کر دے۔ اس مخصوص ربوبیت کے نتیجہ میں وہ شاہکار مرتب ہوا، جو 'صادق و

Marfat.com

امین' القاب سے پہلے ہی ممتاز تھا، بعد میں: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ: فرما کر کُل کائنات میں سب سے عظیم مقام کا حامل ہوا۔ سو، اُس نو مولودِ کعبہ نے ربوبیت کی ایک نہایت ارفع مثال قائم کی۔ الکتاب ہونے کے ناطے، اپنی آنکھوں اور لعاب دہن کے ذریعے، القرآن، سینہ محمدِ مصطفےٰؐ میں منتقل کر دیا اور اس ربوبیتِ کے نتیجہ میں محمدؐ، سردار الانبیاء اور فخر موجودات ہو کر ایک عظیم المرتبت شاہکار ہو گئے۔

ایسی ربوبیتِ کُلی اس کائنات میں نہ اس سے قبل ہوئی تھی اور نہ کبھی دوبارہ قیامت تک ہو گی اور نہ ہی ایسا شاہکار کبھی اس کائنات میں ہو سکا۔ محمدؐ نے سب سے اول حمد اُس ربوبیتِ عُلیا کے لیے فرمائی اور ازاں بعد کُل کائنات اُس ربوبیت سے ہونے والے احمد مجتبیٰؐ کو دیکھ کر، بحیثیتِ شاہکار، اُس کے رب کی تعریف میں الحمد اللہ کہہ رہی ہے۔ ایسا کہنا، ہر نماز کی ہر رکعت میں فرض کے طور پر مقرر کر دیا گیا، تاکہ محمدؐ پر ایمان لانے والا ہر مسلمان جب نماز ادا کرے تو ہر رکعت میں اُس ربوبیتِ عُلیا کی یاد تازہ کر کے قلب و نظر میں وہی حلاوت محسوس کرے اور کوشش کرے کہ اُسی پیرائے میں الحمد اللہ ادا کر سکے جس تشکر میں محمدؐ نے یہ الفاظ ادا فرمائے تھے۔ اس میں ایک اور لطیف اشارہ بھی مضمر ہے۔ بحیثیت "الکتاب" علیؑ کا جو روپ آپؐ کے سامنے ابھرا، اس کا گمان بھی مشکل تھا۔ ایک نو مولود، جو فطری قوتوں اور قُدرتوں سے فی الحال ناآشنا و بے بہرہ ہوتا ہے، وہ قادرِ مطلق کے طور پر ظاہر ہوا۔ محمدؐ اس کے ہونٹوں کی تراوٹ کا سامان مہیا کرنے کی کوشش فرما رہے تھے مگر معاملہ بالکُل مختلف نکلا۔ وہ علیؑ، محمدؐ و آل محمدؐ و صحابؓ و عُشاقؒ و امتِ محمدؐ کی سیرابی کا باعث نکلا۔ محمدؐ کو اس طور پر سیراب کیا کہ اُس فوطہ سے بعد از قیامت بھی یہ عمل جاری رہے گا جس کا نام "کوثر" رکھا گیا ہے۔ علیؑ کو ایک ایسے شاہکار کے روپ میں دیکھ کر محمدؐ اس کے رب کی تعریف (حمد) میں محو ہو گئے ہوں گے اور فی البدیہہ فرمایا ہو گا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: خوبصورتی کا پہلو یہ ہے کہ اُس وقت تک، علیؑ کو ابھی اسم علی سے منسوب بھی نہ کیا گیا تھا اور شاید کسی کو خبر بھی نہ ہو گی کہ نو مولود، امام اوّل ہے۔ اس کے باوجود محمدؐ اس

Marfat.com

عظیم المرتبت شاہکار سے اس قدر مرعوب (impress) ہوئے کہ بے ساختگی میں یہ الفاظ ادا کر گئے۔

زبانِ محمدیؐ ، دہنِ علویؑ سے باہر آچکی تھی اور برجستہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فرما چکی تھی مگر پھر بھی دونوں کی آنکھیں بدستور ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ الحمد اللہ کی صوت سے محمدؐ کی آنکھوں کی روشنی میں ایک تغیر رونما ہوا، بے خودی سے خود آگہی کی طرف احساس، اپنے ہونے کی خبر، نومولود کی موجودگی اور چچی ماں کی قربت اجاگر ہوئی۔ اس تغیر کو بھانپ کر علیؑ نے مسکرا کر تصدیق کی کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا، کچھ دیر کا جبر، ابدی قدر میں تبدیل ہو چکا اور اسم محمدؐ، با مسمّیٰ ہو چکا۔ :نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ: قرطاسِ ابیض پر رقم ہو چکی، لوحِ محفوظ پر لکھا حقیقت کا روپ دھار چکا، قدرت کاملہ کا آدمیت پر احسانِ عظیم مکمل ہو چکا اور دعائے ابراہیمی کی استجابت کا ثبوت مہیا ہو چکا۔ محمدؐ کے وجودِ کلی میں بھی یہ احساسِ تصدیق گہرائی تک سرایت کر گیا۔: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى: کا مفہوم واضح ہو گیا۔: فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى: کا عمل شعوری حد میں سمجھ آ گیا اور: عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰى: کی عملی تفسیر ظاہر ہو گئی۔ جو کچھ ہوا، سو، ہوا مگر اب شعوری کیفیات میں ایک نیا تلاطم ابھرا کہ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ چچا ابو طالبؑ نے خصوصی ضرورت کے تحت، الرحمان کے طور پر جو کرم کیا اور چچی ماں نے الرحیم بن کر نو (۹) ماہ جس طرح اس کرم کو اپنے رحم میں پروان چڑھایا، وہ: هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى: میرے ساتھ کس طرح: فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰى: ہوا۔ فقط قرابت ہی نہیں، قرابت رحمی کا سچا مفہوم قلب کی گہرائی میں جا گزیں ہوا۔ وجود اقدس میں تقویت، تسکین کا ایک نیا باب کھلا، ہر قسم کا انجانا حزن و ملال ہمیشہ کے لئے رفع ہو گیا اور تازگی اور بالیدگی کی ایک نئی لہر سارے جسم میں دوڑ گئی۔ ہونٹوں پر پُر سکون و پُر یقین مسکراہٹ لئے محمدؐ نے علیؑ کو: لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى: کے مصداق بھر پور اور گہری آنکھوں سے دیکھا، دل میں ایقان کی حالت: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى: جیسی تھی اور اس

Marfat.com

یقینِ کامل کے صدقے پھر بے اختیار فرمایا 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' چچی ماں اس تمام واقعہ کی اکیلی گواہ ہیں۔ جب تیسری مرتبہ 'الحمد للہ' سنا تو فرطِ جذبات میں اپنا دایاں ہاتھ محمدؐ کے سر پر رکھتی ہیں، جس سے شفقت اور ٹھنڈک کا ایک عجب احساس آپؐ کو میسر آیا۔ زبان خود بخود گویا ہوگئی اور : الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ : پکار اٹھی۔ عمر بھر چچا جو مہربانیاں کرتے رہے، آنِ واحد میں آنکھوں میں گھوم گئیں حتّٰی کہ جذباتِ تشکر اس مقام پر آپہنچے کہ اس وقت کیسی کرم نوازی فرمائی ہے کہ تین دن میرا انتظار کرنا پسند کیا اور اس دوران زوجہ اور نومولود صاحبزادہ کی خیریت بھی دریافت نہ کی۔ یقیناً سب کچھ ازل سے ان کے علم میں تھا کہ ان کی آخری اولاد بیت اللہ میں جنم لے گی اور اس شان کی حامل ہوگی کہ زبان، دہن میں لے کر آنِ واحد میں تمام قرآن، سینۂ محمدؐ میں منتقل کر کے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کی پہلی عملی تفسیر بنے گا۔ چچی ماں کا دستِ شفقت الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا مفہوم واضح کرے گا اور اس طرح آشکار ہوگا کہ : مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ: کیا ہے، کون ہے اور کیسے ہے! عین اُسی وقت ایک نیا ولولہ موجزن ہوا : اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ : باقی تمام عمر تیری ہی بندگی ہوگی اور تیری ہی استعانت و مدد کی خواہش۔ آئندہ کسی اور کو ماننے اور کسی غیر کی مدد لینے کا خیال بھی محو ہوگیا۔ اوراقِ تاریخ گواہ ہیں، کہ ازاں بعد ہر حال، ہر رنگ، ہر جگہ، ہر سمت اور ہر وقت میں وہی علیؑ حافظ و حامی و نگہبانِ رسولؐ رہے۔ ابنِ عبد اللہ اور عبد المطلب کے پوتے کی چاہتِ استعانت (اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ) ہی کے صدقے میں، علیؑ نے اپنی تمام عمر اُس کے نام لگا دی اور محمدؐ نے اِیَّاكَ نَعْبُدُ اس حد تک نبھایا کہ ایک مصدقہ حدیث میں فرمایا "علیؑ کا چہرہ دیکھنا عبادت ہے"۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں جمع کا صیغہ اس بات کا غماز ہے کہ سرورِ کائناتؐ اس عمل میں اپنی امت کو شامل رکھنا چاہتے ہیں۔ سورۃ الذّٰریٰت آیت ۵۶ : وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ :

Marfat.com

کے مطابق، عبادت، غرض و غایت تخلیق آدم و جنّ ہے اور حضورؐ نے اس کا طریق نہایت آسان اور اچھوتا مرتب فرمایا کہ حالتِ ایمان میں علیؑ کے چہرہ کی زیارت کرو اور دلی تمنا کی کہ میری ساری امت بھی اس عبادت سے محروم نہ ہو۔ فرمایا کہ اگر زندگی میں کوئی کٹھن مرحلہ آن پڑے تو یاد رکھنا، میرا بھی اور تم سب کا بھی، مشکل کشا، علیؑ ہے، اس لئے استعانت صرف اسی سے چاہو۔ جب امت کا خیال شعور پر غالب ہوا تو تسلسل میں فرمایا: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ : یعنی جیسا سہل، آسان اور پلک جھپکنے کے دورانیہ میں ربوبیتِ عُلیا کا عمل میرے ساتھ ہوا، اے مالک میرے ماننے، چاہنے اور پیروی کرنے والوں کے لیے بھی وہی آسانی فرما۔ جس منزلِ مقصود کی راہنمائی میرے لیے فرمائی گئی، اُسی کا نشان ایمان والوں کو ہمیشہ ہدایت فرما تا کہ حصولِ منزلِ مقصود میری امت کے لیے بھی دشوار نہ ہو۔ مالک میری امت کو بھی ربوبیتِ عُلیا کی طرف راغب فرما، تا کہ کم سے کم وقت میں اور بآسانی وہ اسی منزل سے ہمکنار ہو، جو منزلِ مقصود تُو نے میرے لیے مرتب کی۔ مالک، اسی منزلِ مقصود نے مجھے رہنمائی کی ہے کہ تیرے انعام یافتگان کون ہیں۔ اس جہانِ رنگ و بو میں فقط اور صرف مادی اشیاء (material things) اور اسباب کی بہتات و فراوانی کو ہی تیرے انعام سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے، مگر یہ تو آج معلوم ہوا کہ بظاہر بے بس و بے حقیقت نومولود، کُل اسباب اور قدرتوں پر دسترس رکھتا ہے۔ اس کی باطنی رفعت کا یہ عالم ہے کہ مجھے قرآن الکریم جیسی نعمت لازوال سے مالا مال کر دیا، جب کہ یہ تمام عمل : كَلَمْحِ الْبَصَرِ : میں ہوا۔ میں جان گیا کہ ظاہری، وجودی اور مادی آسائشیں ہی تیری ازلی نعمت و عنایت نہیں ہیں، بلکہ نعمت خداوندی نام ہی اس کا ہے کہ باطن میں انعام ہو اور ظاہر میں انعام۔

اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ والے اپنی باطنی پرواز میں عرشِ معلّٰی تک رسائی رکھتے ہیں، اسبابِ دینوی ان کے پاؤں کی ٹھوکر میں ہوتے ہیں اور ان کو اپنے مصرف میں لانا یا نہ لانا، اُن کا اپنا اختیار ہوتا ہے۔ چاہیں تو چپچوندی لگی، جَو کی روٹیوں کے ٹکڑے کھالیں یا طیر ان بہشت کو بھوننے کی خواہش کر لیں۔ عمر بھر

Marfat.com

میں کُل تئیس (۲۳) سیر اناج استعمال کریں اور ایک وقت میں پانچ (۵) سیر مشک خالص، تقسیم فرمادیں، جس کی قیمت فی زمانہ کروڑوں روپے بنتی ہے۔ یہ انعام یافتگان غضب سے ناآشنا اور ضلالت سے بے بہرہ ہیں۔ غضب کا تصور اور گمراہی کا خیال بھی ان کے نزدیک سے نہیں گزرتا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کی یہ کدورتیں دھودی گئی ہیں بلکہ یہ ان کے مادۂ تخلیق میں شامل ہی نہیں کہ کبھی ان باتوں کا احتمال ان کی ذواتِ مقدّسہ سے ممکن ہو۔ ان ہی انعام یافتگان کی زندگیوں کے نقوش کو مشعل راہ بنانے کی استدعا اِهْدِنَا ہے اور ان کی پیروی واتباع میں کوشش اور استقامت کو الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳۸۔ ملاقات۔ حوالہ:۔ سورۃ الکہف آیات ۶۰ تا ۸۲

موسیٰؑ، کلیم اللہ، بنی اسرائیل کے ممتاز انبیاء کرام میں شمار ہوتے ہیں۔ حاملِ مقامِ تجسس ہونے کی وجہ سے مالک کو گویا ہونے پر مجبور کر دیا حتّٰی کہ سورۃ النساء، آیت ۱۶۴ میں وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا: شرفِ ہمکلامیٔ ذات واجب الوجود، کوئی معمولی بات نہیں۔ ذات کا اپنے برگزیدہ نبی پر خصوصی کرم تھا۔ اس قدر تکریم ہی کی وجہ سے، روایات کے مطابق، ایک روز موسیٰؑ نے مالک سے استفسار کیا کہ کیا مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی فضیلت والا، جناب کی مخلوق میں ہے؟ مثبت جواب سنکر موسیٰؑ کا شوق مہمیز ہوا اور عرض کی کہ کیا اُس سے ملاقات ممکن ہے؟ اذن میّسر آنے پر ملاقات کا قصد کرتے ہوئے آغازِ سفر کیا۔ سفر میں ایک لِفَتٰهُ (خادم مراد ہے) اُن کے ہمراہ ہوا۔ گرائمر کی رُو سے فتٰی سے نوجوانی کی عمر مراد لی جاتی ہے جس میں عقل کی پختگی کا عنصر پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ موسیٰؑ کے ہمراہ ان کا کوئی ذہین مگر نوجوان شاگرد ہوگا، جس پر انہیں

Marfat.com

اعتماد بھی ہو گا اور جو ان کے احکامات کو واضح طور پر سمجھ کر، ان پر صحیح طریق سے عمل بھی کر سکتا ہو گا۔ اس کی تصدیق لَآ اَبْرَحُ (کسی قیمت پر اس عزم کو نہ چھوڑوں گا) کے فرمان میں بھی ملتی ہے کہ موسیٰ کا پختہ ارادہ، جس کے لئے وہ عازمِ سفر ہوئے، ان کا خادم اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ موسیٰ نے اس عقیدت مند شاگرد کو یہ بات یقیناً اس لئے فرمادی ہو گی، مبادہ بعد میں اسے شکوہ ہو، کہ مجھے اتنے لمبے اور کٹھن سفر میں بغیر اطلاع کے مبتلا کر دیا۔ یہاں ایک سبق ملتا ہے کہ ہر شخص کو چاہیے کہ سفر میں جو بھی ہمراہی ہو، اسے اپنے پروگرام سے ضرور آگاہ کرے۔ ممکن ہو تو زندگی کا سفر بھی اسی اصول کے ساتھ کٹنا چاہیے اور شریکِ حیات کو، جس کے ساتھ زندگی کا سفر اکٹھے طے کرنے کے لئے عقد باندھا جاتا ہے، نکاح سے قبل دل کی ہر بات بتا دینا، زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ اس کا عندیہ قرآن کے اس سادہ مگر پُر مغز نکتہ سے واضح ملتا ہے۔

موسیٰ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا جیسا فیصلہ کر چکے تھے، جس کا مطلب ہے میں سالہا سال، بلکہ غیر معینہ مدت کے لئے چلتا ہی جاؤں گا۔ حُقُبًا میں صدی جتنی لمبی مدت بھی پائی جاتی ہے اور ایسا فرمانا اس بات کی دلالت ہے، کہ جو کام کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں، مرنے تک بھی اس کی تکمیل کے لئے کوشاں رہوں گا۔ ہر سفر، جس میں کچھ ہمسفر بھی ہوں، سالارِ کارواں عموماً ایک ہی ہوتا ہے اور سفر کا پروگرام اپنی واضح شکل میں اسی کے پاس ہوتا ہے۔ میر کارواں کو چاہیے کہ وہ ہمسفروں کو، سفر کے نمایاں پہلوؤں سے ضرور آگاہ کرے تاکہ وہ ہمراہی جو محسوس کرے کہ وہ ساتھ نہیں دے سکتا، ابتدا ہی لوٹ جائے، بصورت دیگر وہ ساتھی تمام قافلہ والوں کے لئے دقّت کا باعث بنتا رہے گا۔ اسی فطری تقاضا کے پیشِ نظر موسیٰ نے جب سفر کا پختہ ارادہ فرمایا اور شاگرد (لِفَتٰىهُ) نے ساتھ نہ چھوڑنے کا اشارہ دیا، تو انہوں نے اسے تنبیہ کے انداز میں واضح کر دیا کہ منزلِ مقصود تک پہنچ میں اگر صدیوں سفر بھی کرنا

Marfat.com

پڑا تو جاری رہے گا۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ اتنے لمبے اور کٹھن سفر میں میرا ساتھ نہیں دے سکتے، تو ابھی سے لوٹ جاؤ۔ یقیناً یوشعؑ بن نون کا ارادہ بھی موسیٰؑ کی طرح پختہ ہوگا جو وہ سفر میں ہمرکاب رہے اور آنے والی آیات کے مطابق منزلِ مقصود کے قریب تک بھی پہنچے۔

غور طلب ہے کہ اس سفر میں موسیٰ کی منزلِ مقصود کیا تھی؟ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ شرفِ ہمکلامی کے دوران اپنے سے فضیلت والے کی خبر ملنے پر تجسس ہوا کہ اس سے ملاقات کی جائے، تو کلیم اللہ نے ذات باری تعالیٰ سے یہی دریافت کیا ہوگا کہ وہ کون ہے؟ اور میں اسے کیسے مل سکتا ہوں؟

دستور کے مطابق اگر کسی شخص کی بابت پوچھا جائے، تو جواب میں اُس کا نام، ولدیت، خدوخال اور عمر وغیرہ بتا کر، پھر اس کا ٹھکانہ بتایا جاتا ہے۔ وگرنہ اگر ذات کا تعارف نہ دیا جائے اور فقط ٹھکانہ بتا دیا جائے، تو امکان موجود رہتا ہے کہ ٹھیک جگہ پہنچنے کے باوجود ٹھیک شخص تک نہ پہنچا جا سکے۔ لیکن قرآن میں اس فضیلت والے کے ذاتی احوال کو فی الحال بیان نہیں کیا گیا بلکہ موسیٰ کو اس جگہ کا عندیہ دے دیا گیا، جہاں اس سے ملاقات ممکن ہو سکتی تھی۔ یقیناً موسیٰؑ اس جگہ کے نام سے بھی واقف نہ تھے وگرنہ اپنے شاگرد کو وضاحت میں یہ فرماتے کہ فلاں جگہ جانا ہے، جو اتنے کوس دور ہے اور وقت کا بھی واضح تعین کرتے۔ ہرگز یہ نہ کہتے کہ صدیوں بھی سفر کرنا پڑا تو جاری رکھوں گا حتیٰ کہ ہم مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ تک پہنچ جائیں۔ دراصل موسیٰؑ کو اس جگہ پر پہنچنے کی تڑپ نہ تھی، بلکہ اس جگہ موجود ایک عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَاۤ سے نیاز حاصل کرنا مقصود تھا۔ عجب بات ہے ملاقات ایک عبد کی مطلوب ہو، سوال اس کے بارے میں پوچھا جائے اور جواب میں عبد کی بجائے ایک جگہ کا نام دیا جائے۔ عقلی طور پر صرف ایک امکانی صورت ہو سکتی ہے کہ وہ جگہ دراصل، ایک مُقام (م کی پیش کے ساتھ) ہو، جس کا مفہوم جگہ کی بجائے حال ہوتا ہے، اور وہ مُقام یعنی حال صرف اسی عبد کو حاصل

Marfat.com

ہے، دوسرا کوئی اور اس مُقام پر نہیں۔ اس لئے عبد کے اسم کو آشکار کرنے کی بجائے اس مُقام کی نشاندہی کر دی گئی اور اس طرح موسیٰؑ کو بغیر پوچھے دونوں باتیں بتادی گئیں۔ ممکن ہے عبد کا نام مل جاتا تو پالینے کے باوجود اس کے مُقام سے ناواقف رہ جاتے!

اَبلُغَ کا لفظ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس مُقام تک رسائی کی خواہش ہے۔ بَلَغ، بلاغ وغیرہ کا مطلب ہی مقصد کی انتہا تک رسائی ہے، جو حدِ مکانی (distance) اور حدِ زمانی (Era / Age) دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مقررہ مدت کی انتہاء بھی اس میں شامل ہے۔ موسیٰؑ کا مطمحِ اپنے مقصد کا حصول تھا اور ذات نے عبد کی بجائے، اس جگہ کا نام دیکر چاہا کہ وہ دونوں کی حد تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اللہ کو جوّاد کہتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ مانگنے والے کو اس کی طلب کے مطابق نہیں، اپنے ظرفِ عطا اور حکمت کے تحت نوازتا ہے۔ جب یہ سفر شروع ہوا تو موسیٰؑ اکیلے روانہ نہیں ہوئے بلکہ ایک فِتیٰہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ تڑپ اور خواہش، بظاہر ایک کی، مگر سفر دونوں کا، مقصدیت کا تجسس ایک کو ہو رہا ہے، مگر ازاں بعد منزلِ مقصود پر دونوں ہی فائز ہوئے۔ درحقیقت حصولِ منزلِ مقصود ایک کے حصہ میں رکھا ہی نہیں گیا۔ حافظ سائیں محمد اقبالؒ اوّل قادر القلندر اکثر فرمایا کرتے کہ ہدایت ایک کے نصیب میں ہی نہیں رکھی گئی۔ زبان اور زانوؤں کے درمیان موجود عضو، اکیلے ہونے کی وجہ سے ہادی نہیں ہو سکتے، جبکہ آنکھیں، کان اور حسِ شامہ دو دو ہیں اسلئے مکمل ہدایت دیتے ہیں۔ آدمؑ کے ساتھ شیثؑ کو ملایا گیا، نوحؑ کو سامؑ کا جوڑا ملا، ابراہیمؑ کو لوطؑ کی ہمراہی میسر آئی، شعیبؑ کی معاونت موسیٰؑ نے کی، موسیٰؑ کا فِتیٰہ یوشع بن نونؑ کو بننا نصیب ہوا، داؤدؑ اور سلیمانؑ کا اکٹھا ہونا بھی با مقصد تھا اور عیسیٰؑ چونکہ اکیلے تھے، اس لئے انہیں جلد رفعت عطا کر دی گئی کہ دوسرے کے ساتھ دوبارہ بھجوائیں گے۔ جبکہ محمدؐ کی معیت کیلئے علی ابنِ ابی طالبؑ کو ان کا وصی بنا کر ہدایت کاملہ کو اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی شکل دی گئی۔ اس ازلی سنت کے مطابق، کم از کم پاکیزہ سفر، اکیلے طے نہیں کرنا چاہئیں، ایک فِتیٰہ کا ساتھ لازم ہونا

Marfat.com

چاہیے۔ جیسے موسیٰ کو شعیبؑ کے پاس بحثیت ایک لِفَتٰہُ بھیجا گیا اور وہ مسلسل آٹھ برس ان کی خدمت میں رہے تو انجام کار شعیبؑ نے انہیں زوج کے انعام سے سرفراز کیا۔ اسی طرح موسیٰؑ نے مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ تک بلاغ کیلئے یوشع بن نون کو لِفَتٰہُ منتخب فرمایا اور مَجۡمَعَ بَیۡنِہِمَا تک پہنچنے میں اس کی معاونت کی۔

موسیٰ نے سفر میں زادِ راہ کے طور پر کھانے کا کچھ سامان ساتھ لینا مناسب سمجھا تھا اور قرآن میں موجود اشارہ کے مطابق وہ تلی ہوئی مچھلی تھی، جو امکان کے مطابق ایک آدھ دن کے بعد کھانے کے قابل نہ رہ سکتی تھی جبکہ سفر کا عزم صدیوں پر محیط نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ آیت ٦١ میں لکھا گیا حُوۡتَہُمَا ان دونوں کی مچھلی) کسی اور مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ حوت مصدر میں بنیادی طور پر تڑپنا اور تیزی سے رُخ بدلنا پایا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر مچھلی کو بھی حوت کہتے ہیں، کہ وہ ایک لمحہ بھی چین سے ایک جگہ برقرار نہیں رہ سکتی بلکہ مسلسل رُخ بدل کر اپنی عجیب و غریب تڑپ کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ آیت ٦١ کے مطابق: فَلَمَّا بَلَغَا مَجۡمَعَ بَیۡنِہِمَا: یعنی جب دونوں پہنچے، دونوں کے جمع ہونے کے مقام پر۔ پہنچنے کا عزم صرف موسیٰ کا تھا، جبکہ وہ منزل کو صدیوں کے فاصلہ پر دیکھتے تھے مگر لِفَتٰہُ کو ساتھ ملا لینے کی بدولت، سفر جلد بھی مکمل ہوا، وقت بھی کم ہوئی اور جہاں پہنچے وہاں دونوں کا یقین بھی ایک جیسا تھا (Consensus)۔ یہ ان دونوں حضرات کا مَجۡمَعَ بَیۡنِہِمَا تھا، جہاں: نَسِیَا حُوۡتَہُمَا: یعنی دونوں مچھلی کو بھول گئے۔ ازاں بعد مچھلی نے سمندر میں اپنی راہ بنالی بلکہ زندہ ہو کر آزادانہ تیرنے لگی: فَاتَّخَذَ سَبِیۡلَہٗ فِی الۡبَحۡرِ سَرَبًا: سَرَب مصدر میں آزادی اور خود مختاری سے بلا روک ٹوک گھومنے پھرنے کا مفہوم موجود ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک تلی ہوئی مچھلی، کسی بحر کے قریب، جہاں مَجۡمَعَ بَیۡنِہِمَا ہوتا ہے، کیونکر زندہ داخل ہو کر، اس میں آزادانہ

Marfat.com

گھومتی پھرتی ہے؟ وہ دونوں حضرات تلی مچھلی سے کس طرح غافل ہوئے کہ وہ آنکھ چرا کر ایک اچنبا کام کر گئی؟ زادِ راہ کے طور پر تو موسیٰ نے مچھلی ساتھ رکھوائی تھی، قرآن نے اسے حُوتَھُمَا (دونوں کی مچھلی) کیوں کہا؟ بلاشک کسی تلی ہوئی مچھلی کا کسی صورت میں زندہ ہو جانا اور پھر بحر میں سرب کے انداز میں راستہ بنانا ایک غیر فطری فعل ہے۔ مچھلی کو تلنے سے قبل پانی سے نکالنا ضروری ہے کیونکہ پانی کے اندر آگ نہیں جل سکتی کہ یہ فعل پانی کے اندر ہی کیا جا سکے۔ جونہی مچھلی پانی سے باہر نکالی جاتی ہے، فطرت کے مطابق اس میں زندگی کے آثار ختم ہو جاتے ہیں۔ قصہ مختصر، تلی ہوئی مچھلی کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتی چہ جائیکہ کئی عرصہ کی مسافت کے بعد، بالخصوص، مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا پر وہ نہ صرف زندہ ہو گئی بلکہ اپنے سببِ حیات یعنی پانی کے ذخیرہ (بحر) کی طرف راہ بھی تلاش کر لیتی ہے۔ دراصل تجسس اور شوق کی تڑپ، جو کسی اہم اور عظیم مقصد کے حصول کے لئے پیدا ہوتی ہے اور جو فی الواقع کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی، حُوت سے تعبیر ہو گی۔ موسیٰ کو اپنے سے فضیلت والے کی تلاش کا تجسس اور لِفَتٰہُ کو اپنے محسن اور مربی کی ہمراہی کا اشتیاق، دونوں طرف کی لگی وہ برابر آگ ہے، جسے قرآن نے صیغہ تثنیہ میں بیان کیا ہے مثلاً بَلَغَا، حُوْتَهُمَا۔ اسی طرح مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا بھی تثنیہ ہے یعنی جہاں دونوں مجتمع ہو کر ہم خیال ہو گئے، دونوں ایک مشاہدہ میں مستغرق ہو گئے اور پرواز برابر ہو کر دونوں کا حال ایک سا ہو گیا۔ موسیٰ کا تجسس قرار پذیر ہوا اور لِفَتٰہُ کا شوق، اطمینان میں بدل گیا۔ لامحالہ سکون کی یہ حالت، بے چینی کی اس حُوت والی حالت کی ضد ہے، اس لئے قرآن میں فرمایا گیا کہ مچھلی نے اپنی اصل میں ضم ہو کر اپنی حالت بدل لی۔

عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا کے ذکر سے قبل اور مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ کا اشارہ ملنے سے پہلے، موسیٰ کو کوئی خصوصی بے چینی نہ تھی اور صدیوں لمبا سفر کرنے کے عزم کا سننے سے پیشتر لِفَتٰہُ کو کوئی خصوصی ولولہ نہ تھا مگر

Marfat.com

ایک عظیم مقصد کے حصول کی تیاری نے ان میں وہ تڑپ بھر دی، جس سے راتوں کی نیند اور دن کا چین اُڑ گیا۔ منزل پانے کے لئے جو جُہد شروع کیا، وہ بمنزلہ ہر دم رُخ بدلنے کے تھا، اسی کو حوُت سے تعبیر کیا گیا اور دونوں کی طرف منسوب کیا گیا۔ جس مقام پر تجسس اور اشتیاق نے مشترکہ مقصد براری کی، اسکو مَجۡمَعَ بَيۡنِهِمَا کہا گیا۔ دونوں بیک وقت ایک ہی بات اور نتیجہ پر متفق تھے اور اس اتفاق (consensus) نے جو سکون بہم پہنچایا، وہ اپنی اصل میں ملنے کے مترادف تھا۔ اس طرح دونوں حضرات کی لگن کو نئی زندگی مل گئی، اس نئے مقام پر دونوں آزادانہ گھومنے پھرنے لگے اور اس کا حظ اٹھانے لگے: فَاتَّخَذَ سَبِيۡلَهٗ فِى الۡبَحۡرِ سَرَبًا : آیت ۶۲ کے مطابق جب ایسا ہو رہا تھا تو فرمایا گیا: فَلَمَّا جَاوَزَا: یعنی جب وہ دونوں ایک حد سے تجاوز کرنے لگے تو موسیٰؑ نے احساس کرتے ہوئے اور واضح طور پر دھیان پلٹنے کے واسطے لِفَتٰهُ کو فرمایا: اٰتِنَا غَدَآءَنَا: یعنی ہمارا ناشتہ لاؤ۔

جب جُہد مسلسل کا انعام سکون وراحت یا نئی زندگی کی صورت میں ملتا ہے، تب احتیاط لازم آتی ہے کہ امکاناتِ تجاوز موجود ہوتے ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ جب کام تکمیل پذیر ہو جاتا ہے، یا منزل مل جاتی ہے، تو اکثر سالک ضرورت سے زیادہ آزادانہ طور پر گھومنا پھرنا شروع کر دیتا ہے۔ چونکہ تمام عمر جُہدِ مسلسل کی پسندیدگی کی گئی ہے، اس لئے یہاں اشارہ دے دیا گیا کہ موسیٰؑ کے مقام کے جلیل القدر انبیاء بھی وقتی طور پر متجاوز ہو سکتے ہیں۔ اور بنی نوعِ آدم کے لئے لازوال سبق مقرر کر دیا گیا کہ جب کبھی تمہارا مقصد پورا ہو جائے، اور سکونِ قلب میّسر آجائے، تو اس حد تک تن آسان نہ ہو جانا (Relaxed)، کہ دنیا و مافیھا سے بے خبر ہو جاؤ۔ یہ خصوصی طور پر مربّی کی ذمہ داری مقرر کی گئی کہ اس وقت دھیان پلٹائے، چاہے ناشتہ ہی مانگ لے۔ موسیٰؑ نے ناشتہ مانگنے کی ایک دلیل بھی بیان فرمائی: لَقَدۡ لَقِيۡنَا مِنۡ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا : یعنی بلاشک ہمیں اس سفر میں بہت دشواری کا سامنا کرنا

Marfat.com

پڑا۔ چونکہ نصب مصدر میں گاڑھ کر سیدھا کھڑا کرنے کا مفہوم نمایاں ہے اور جو چیز اس طرح کھڑی ہو وہ سنگِ میل کا کام دیتی ہے، اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ ہمیں ہمارے سفر نے ایک خاص جگہ لا کر کھڑا کر دیا ہے (Fixed)۔ اب ہم نہ آگے جانے کے ہیں نہ پیچھے کے، اس لئے پینترہ بدلنے کو کھانا طلب کر لیا، تاکہ کچھ وقت حاصل ہو (Time gain) اور اس دوران آئندہ لائحہ عمل بھی طے ہو سکے۔ یہاں یہ پہلو نمایاں ہے کہ ابھی منزلِ مقصود نہیں آئی اس لئے کہ منزل پر پہنچ جانا، سفر کی تمام دشواریوں کو خود بخود قطع کر دیتا ہے۔ وہاں شکوہ کے انداز کی بجائے شکرانہ کی شکل ہوا کرتی ہے۔ موسیٰ جیسے اولالعزم نبی سے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ پالینے کے باوجود، شکایت کے انداز میں کچھ فرمائیں۔ ناشتہ مانگنے کی حکمت مختلف انداز میں سامنے آتی ہے۔ لِفَتٰہُ جواباً عرض کرتا ہے کہ جب ہم صخرہ کے پاس تھے تو مجھے حوت بالکُل بھول گئی تھی اور اس کا بھولنا شیطان کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ وہاں حوت نے بحر میں عجیب انداز سے اپنا راستہ بنالیا تھا۔ مزید تفصیل میں جانے سے قبل مندرج کی تفہیم مناسب ہو گی۔

i: اَرَءَيْتَ: کیا آپ نے دیکھا؟ یہ سوالیہ انداز بھی ہو سکتا ہے، حیرت کا بھی اور اس میں یقین کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ لِفَتٰہُ کو یقین کامل تھا کہ موسیٰ نے تلی ہوئی حوت کو تڑپ کر ایک نئی زندگی کے روپ میں اجاگر ہوتے ہوئے اور اپنی اصل میں ملتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جب موسیٰ ایک حکمت کے تحت پوچھتے ہیں، تو عرض کرتا ہے کہ وہ حوت صخرہ کے پاس متغیر الحال ہو گئی تھی۔

ii: اَوَيْنَآ: یعنی جب ہم نے اس جگہ پڑاؤ کیا۔ اس مادہ میں اکٹھا ہونا، رہنا، لوٹنا اور منزل کرنا، تمام معنی آتے ہیں۔ ان میں لازماً نرمی اور رحم کا پہلو پایا جاتا ہے، مشکل اور تکلیف سے اترنا اور رہنا اس مادہ میں نہیں پایا جاتا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ دوران سفر دونوں حضرات کسی جگہ پر منزل کرنے کے لئے، وقتی طور

Marfat.com

پر رکے ہونگے۔ اچنبے کی بات ہے کہ انہوں نے پڑاؤ ڈال کر آرام کیا، مگر اس دوران ان کو کھانے کی نہ طلب ہوتی ہے نہ خیال آتا ہے، حالانکہ لمبے سفر میں، مسافر جس منزل پر مقام کرتے ہیں، وہاں زادِ راہ کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے۔ اس طرح پچھلی تھکان ماند ہو جاتی ہے اور نئی تازگی میسر آتی ہے، جو مزید سفر کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ اس کے برعکس یہ دونوں حضرات آوَیْنَآ کا عمل کر چکے اور انہیں تلی مچھلی کی طلب نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں (حد سے) تجاوز کرتے ہیں، موسیٰؑ لِفَتٰہُ کو ناشتہ پیش کرنے کو کہتے ہیں۔

iii: الصَّخْرَۃِ: ناشتہ پیش کرنے کی فرمائش ایک نئے تعارف کا سبب بنتی ہے جو الصَّخْرَۃِ ہے۔ موسیٰؑ اس کا اشارہ نہیں فرمارہے، بلکہ لِفَتٰہُ یہ نشاندہی کر رہا ہے۔ غالباً موسیٰؑ کے لئے یہ کسی خصوصی اہمیت کا حامل نہ ہو گا مگر لِفَتٰہُ ایک نسبت کی وجہ سے اسے بھول نہ سکا۔ اس کی زندگی کا سب سے انوکھا مشاہدہ مقامِ الصَّخْرَۃِ پر ہوا تھا کہ تلی ہوئی مردہ مچھلی، تڑپ کر زندہ ہو گئی اور سمندر میں داخل ہو گئی۔ صخرہ ایک بڑی چٹان یا پتھر کو کہا جاتا ہے، اَل کا اضافہ اسے نکرہ سے معرفہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ چٹانیں پتھریلی ہونے کی وجہ سے بہت سخت ہوتی ہیں، انہیں اپنی جگہ سے ہلانا، توڑنا یا بدلنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ چٹان پر ہریالی کا تصور نہیں ہوتا اس لئے بیج کا چٹان میں اگنا محال ہوتا ہے۔ جو جگہ ہری بھری نہ ہو، وہاں، اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ، زندگی کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ مگر چٹان اچھی کمین گاہ ثابت ہو سکتی ہے اور وقتی طور پر پناہ دیکر محفوظ بھی کر سکتی ہے۔ اسی لئے جب وہ دونوں تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں تو ستانے کے لئے کسی صخرہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ ازاں بعد ان ہی کی نسبت سے اس صخرہ کو الصَّخْرَۃِ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

Marfat.com

جب لِفَتٰہُ، الصَّخۡرَۃِ کی طرف اشارہ کر کے مچھلی کے سمندر میں داخل ہونے کا اظہار کرتا ہے، تو موسیٰ فرماتے ہیں کہ اسی جگہ کی تلاش میں ہم گھر سے نکلے تھے: ذٰلِکَ مَا کُنَّا نَبۡغِ: یعنی یہی تو ہم چاہتے تھے۔ اس میں ایک اہم نکتہ ملتا ہے کہ موسیٰ، عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَاۤ سے ملنے کے متمنی تھے مگر ذات نے انہیں ایک انجان جگہ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ کا صرف نام بتا دیا۔ یہ اسم انہوں نے پسندیدگیٔ الٰہی کے مطابق لِفَتٰہُ کو بھی بتایا لیکن اس جگہ کی جو باقی نشانیاں ان کو بتائی گئی تھیں، اس کے علم میں نہ لائے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہمرہانِ سفر کو ضروری باتیں بتانا کافی ہوتا ہے۔ تفصیل، راہبر کارواں کو اپنے تک محدود رکھنا مناسب ہوتا ہے اور اس کا اظہار صرف وقتِ ضرورت پر واجب ہے۔ موسیٰ کے اس فرمان، کہ اسی جگہ ہمیں جانا تھا، سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں پہلے سے خبر دے دی گئی تھی کہ ایک چٹان کے قریب مچھلی زندہ ہو جائے گی اور وہ چٹان ہی اس جگہ کا سنگِ میل ہے، جہاں عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَاۤ کے ملنے کی گنجائش ہے۔ یہ معلوم ہو چکنے کے بعد کہ موسیٰ کو مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ کی دوسری نشانیاں پہلے سے معلوم تھیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے تلی ہوئی مچھلی اپنے ہاتھ میں کیوں نہ رکھی، تاکہ لِفَتٰہُ کا مرہونِ احسان نہ ہونا پڑتا، کہ وہ علم میں نہ لائے تو آپ بے خبر رہ جائیں۔ اس کا جواز یہ ہو سکتا ہے کہ سفر کے دوران میر کارواں کے ذمہ اور ایسے کئی اہم کام ہوتے ہیں، جن کی بجا آوری اس کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں وہ اپنا بوجھ کم کرنے کے لئے ذمہ داریاں، مختلف مگر اہل ساتھیوں میں تفویض کر دیتا ہے۔ اس طرح ہمراہیوں کا شوق اور ولولہ بھی بڑھ جاتا ہے اور اپنے آپ کو فعال اور اہم (Functional and Important) سمجھتے ہوئے مزید جذبہ اور لگن سے سفر میں ساتھ دیتے ہیں۔ اس کا دوسرا جواز یہ ہے کہ میر کارواں کے ذمہ یہ منصب بھی ہوتا ہے کہ وہ سفر کے دوران اگلا (Next) رہبر منتخب کر کے اس کی نشاندہی کر دے۔ اگر براہ راست اشارہ کرے، تو امکانات رہ سکتے ہیں کہ باقی ساتھی تنقید (Objection) کریں، اس لئے وہ اپنی فراست کے تحت کوئی خصوصی کام

Marfat.com

اہل ہمراہی (لِفَتٰہُ) کو سونپ دیتا ہے۔ کام پورا ہونے پر باقی تمام مسافر اس کے گرویدہ ہو کر، آئندہ اسے اپنا راہبر ماننے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جاتے ہیں۔

آیت ۶۳ کے مطابق لِفَتٰہُ کہتا ہے۔: اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ : یعنی کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ جب ہم صخرہ کے پاس رکے تھے تو تحقیق وہاں مجھے اپنی تڑپ بالکل بھول گئی تھی، میں چاہتا تھا کہ اس تبدیلی کا ذکر آپ سے کروں، مگر شیطان نے مجھے یہ ذکر بھلا دیا۔ غور طلب ہے کہ حوت کا بھولنا شیطان کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ حوت کے بھولنے کا ذکر کرنے کا عمل شیطان نے بھلایا ہے۔ بینُ السطور ثابت ہوا کہ شیطان کا عمل دخل، سچی لگن اور تڑپ تک نہیں ہوتا، اس تڑپ کے بارے میں کسی بات کا ذکر کرنا اگر بھول جائے تو یہ شیطان کی وجہ سے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا عمل دخل (Involvement)، نہایت سطحی ہے، تبھی ایک اور مقام پر قرآن نے شیطان کے داؤ کو ضعیف کہا ہے۔ آیات ۶۱ اور ۶۲ میں بالکثرت تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے، مثلاً فَلَمَّا، بَلَغَا، بَيْنِهِمَا، نَسِيَا، حُوْتَهُمَا، جَاوَزَا وغیرہ، لیکن یہیں تثنیہ، جمع میں تبدیل ہو جاتا ہے، جیسے اٰتِنَا، غَدَآءَنَا، لَقِيْنَا، سَفَرِنَا اور اَوَيْنَآ، جو آیت ۶۳ میں بھی جاری ہے۔ یہ سفر دو افراد نے کیا، ان کی آپس کی گفتگو اور واقعات و معاملات کی بابت اظہار، وحی کے ذریعہ، صیغہ تثنیہ میں ہوا ہے لیکن اچانک یہ صیغہ جمع میں بدل رہا ہے، حالانکہ بظاہر کوئی اور ان میں شامل نہیں ہوتا۔ جمع کا صیغہ جو: اٰتِنَا غَدَآءَنَا: 'ہمارا کھانا (ناشتہ) لاؤ' سے شروع ہوتا ہے اور اس کی دلیل بھی صیغہ جمع میں بیان ہوئی: لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا: 'تحقیق ہمیں پہنچی ہے ہمارے اس سفر میں تکلیف' اور لِفَتٰہُ کا جواب: اَوَيْنَآ: یعنی ہم نے پناہ لی، قابلِ غور ہیں۔ آیات ۶۲ اور ۶۳ میں اچانک جمع کے صیغہ کے بعد، آیت ۶۴ میں پھر تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا، جب فرمایا: فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا:

Marfat.com

یعنی پس لوٹے وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات پر۔ یہ بھی اس امر کو تقویت دیتا ہے کہ اچانک جمع کا صیغہ استعمال کرنے کا کوئی خصوصی راز اور مقصد ہوگا۔ صیغۂ جمع: فَلَمَّا جَاوَزَا : یعنی جب وہ دونوں (حد سے) تجاوز کر گئے، کے بعد شروع ہوتا ہے، جب تک تجاوز نہیں ہوا صیغۂ تثنیہ ہی استعمال ہوتا رہا۔ عمل تجاوز: اَرَءَيۡتَ: کے وقت سے شروع ہوا، جب پناہ لی گئی۔ شاید صدیوں چلتے رہنے اور منزلِ مقصود کا عزم کرنے والوں کو پناہ لینا مناسب نہ تھا، اسی لئے اَرَءَيۡتَ کو تجاوز کرنے سے تعبیر کیا گیا اور عملِ شیطانی کے دخل کی وجہ سے جمع کا صیغہ استعمال ہوا۔ موسیٰ اور یوشع بن نون کا پختہ عزم کرکے سفر شروع کرنا اور کرتے ہی چلے جانا، توکل الی اللہ کی نشاندہی ہے۔ تھوڑا زادِ سفر ساتھ رکھنے کے باوجود، جب تک سفر عزم و استقلال سے جاری رہتا ہے، توکل کا سایہ اسے تقویت دیے رکھتا ہے اور تب تک وہ دو (۲) ہی گنے گئے اور صیغہ تثنیہ ان کے لئے مستعمل رہا۔ لیکن جونہی تھکاوٹ کی وجہ سے آرام و استراحت کی طلب ہوئی، اور غیر کی پناہ لی، تو اس شراکت کی وجہ سے توکل میں کمی آگئی اور غلبۂ شیطانی نمایاں ہوگیا۔ اسی وسوسہ کو تیسری صنف (Entity) گردانتے ہوئے صیغہ جمع استعمال ہوا اور اسی کو حد سے تجاوز کرنے سے تعبیر کیا گیا۔ جب ان دونوں اصحاب کو تجاوز کرنے کا احساس گزرتا ہے اور وہ فَارۡتَدَّا یعنی اپنی اصل حالت پر لوٹتے ہیں، پھر سے توکل الی اللہ ان میں عود کر آتا ہے، وسوسۂ شیطانی کا شائبہ دور ہوتا ہے، تو دوبارہ صیغۂ تثنیہ استعمال ہوتا ہے۔ کسی بھی نبی کے باب میں یہ توضیح سوئے ادب ہو سکتی ہے۔ چونکہ قرآن کا اسلوب کُل بنی نوع آدم کی راہنمائی و تربیت ہے اور اس مقصد کے لئے بالعموم انبیا اور ان کی اقوام کے مختلف واقعات ہی کا سہارا لیا گیا ہے، اس لئے ایسا سمجھنا عبث نہ ہوگا کہ ایک بہت بڑی حقیقت کو آشکار کرنے کے لئے اس واقعہ میں چھپا کر رکھ دیا گیا کہ توکل الی اللہ اسی لمحے پھیکا ہو جاتا ہے، جب غیر کا خیال بھی قریب سے گزر جائے۔ ذات احدیت، متوکل کی تقویت کا باعث ہوتی ہے اور مقام توکل پر شرک کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، اس لئے

Marfat.com

متوکل کی ذات اکیلی مانی گئی، لیکن جونہی غیر یعنی وسوسۂ شیطانی درمیان میں آیا، سالک کے ہمراہ اس غیر کو الگ سے شمار کیا گیا۔ لہٰذا اس میں بین السطور یہ پیغام دیا گیا کہ بھروسے کے لئے ذات لم یزل ہی کا سہارا ہونا چاہیے، غیر کی طرف معمولی التفات بھی ناقابلِ قبول ہے۔

تلی ہوئی مچھلی کا الصَّخرَۃِ پر زندہ ہونا بظاہر بعید از قیاس ہے۔ تلی جانے سے قبل مچھلی، اپنی بنائے حیات یعنی پانی سے باہر نکالی جاتی ہے اور تیز دھار آلہ سے اس کا پیٹ صاف کیا جاتا ہے، سر اور چانے (Fins) جدا کر کے نمک اور مصالحہ جات لگا کر رکھا جاتا ہے اور پھر کڑھتے ہوئے تیل میں اسے بھونا جاتا ہے۔ لامحالہ ان تمام مراحل سے گزر کر مچھلی میں زندگی نام کی جنس باقی نہیں رہ سکتی، اور کسی مردہ کا اس جہانِ خلق میں دوبارہ زندہ ہونا کسی طرح ممکنات میں شمار نہیں ہو سکتا ہے۔ دراصل کسی دل میں جنم لینے والی سچی تڑپ، مچھلی کی تمثیل ہے۔ جب کبھی یہ سچی لگن اور تڑپ سالک کے دل میں موجزن ہو کر استوار ہو جاتی ہے تو وہ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو جاتا ہے، اسے اپنے پرائے کی خبر نہیں رہتی، دن رات اس کے لئے یکساں ہو جاتے ہیں اور وہ ایک ایسی تاریک غار (غور و فکر) میں گم ہو جاتا ہے جہاں وہ اپنی بھی ہوش بھول جاتا ہے۔ حافظ سائیںؒ اکثر فرمایا کرتے کہ اس ذہنی حالت کو قرآن میں لیل سے تعبیر کیا گیا ہے جو بجز ظلمت و اندھیرے کے اور کچھ نہیں۔ ایسی حالت کے انجام پر اگر نُورِ بصیرت اجالا کر کے سالک کو صراطِ مستقیم کی راہنمائی کر دے، تو وہ ایک نئی زندگی عطا ہونے کے مترادف ہے، جیسے بحر ظلمات اور بحر انوار ایک مقام پر جمع ہو گئے ہوں۔ اسے بھی مَجمَعَ البَحرَینِ کہہ سکتے ہیں، جہاں پرانی لگن، شوق اور تڑپ، ایک نیا ولولہ پالیتی ہے اور یہی حیاتِ نو ہے۔ اس نُورِ بصیرت کا خاصہ ہے کہ سچی لگن میں سرشار ہر شخص کو نئی زندگی عطا کرتا ہے، جس میں وہ اپنی مرضی سے آزادانہ گھومتا پھرتا ہے (فِی البَحرِ سَرَبًا۔ عَجَبًا)۔ بلاشک منزلِ مقصود تلاش کرنے والوں کا

Marfat.com

اصل زادِ راہ سچی تڑپ اور شوق ہی ہوا کرتا ہے۔ صدیوں تک سفر جاری رکھنے کا ارادہ لے کر چلنے والے موسیٰ اور لفتٰہ، ایک تلی مچھلی سے کتنے دنوں کی بھوک مٹا سکتے تھے؟ موسیٰ ایسے جید اور متجسس نبی اللہ سے ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی کہ توکل الی اللہ چھوڑ کر، زادِ راہ کچھ اور اپنائیں۔ آپ نے اپنی سچی لگن اور تڑپ ہی کو ساتھ رکھا اور قرآن نے اسی کو حوت سے تعبیر کیا۔ یہ حوت جب عملی طور پر غیر متزلزل مقام تک آجاتی ہے، لیکن سالک، مانوس محسوس کرتے ہوئے، اپنے آپ کو اس کی پناہ میں دینا چاہے، تو اس الصَّخۡرَةِ پر نورِ تجلی، شوق کو نئی تازگی کے ساتھ، نیا رخ اور زندگی عطا کر دیتی ہے۔ سالک کو کچھ دیر اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ ہو گیا؟ اس غیر متزلزل مقام (الصَّخۡرَةِ) سے تجاوز کرنے کے بعد اسے دھیرے دھیرے یاد کروایا جاتا ہے، تو سالک کو گزر چکی کیفیت محسوس کرنے کا موقع ملتا ہے (To Re-live) ۔تب وہ زبانِ حال سے کہتا ہے کہ یہاں تک وسوسۂ شیطانی نے مجھے اس کا تذکرہ کرنا بھلائے رکھا، حالانکہ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ حکمت خداوندی کا حصہ ہوتا ہے۔ ایک شوق سے دوسرے شوق میں انتقال کے دوران ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے، جو مانند قبر خواب محسوس ہوتا ہے، اس دوران منتقل ہونے والے کو کچھ یاد نہیں ہوتا، اسی کو قرآن میں: وَمَآ اَنۡسٰنِیۡهُ اِلَّا الشَّیۡطٰنُ: سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آیت ٦١ کے حوالہ سے مضمون ایک اور زاویہ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جب وہ دونوں پہنچ گئے (فَلَمَّا بَلَغَا)، جہاں دونوں آپس میں مجتمع تھے (مَجۡمَعَ بَیۡنِهِمَا) تو دونوں اپنی اپنی تڑپ اور لگن بھول گئے (نَسِیَا حُوۡتَهُمَا)۔ پھر وارد ہوتا ہے: فَاتَّخَذَ سَبِیۡلَهٗ :یعنی پکڑی اس نے اپنی راہ۔ اس میں واحد غائب کا صیغہ استعمال ہوا اور بلا شک حوت (مچھلی) ایک ہے، مگر صیغۂ غائب با معنی ہے، حالانکہ مچھلی ان کے پاس موجود ہے۔ :فَاتَّخَذَ سَبِیۡلَهٗ فِی الۡبَحۡرِ سَرَبًا: کا ترجمہ و مفہوم اس طرح کیا جا سکتا

Marfat.com

ہے کہ پکڑا (دونوں کی) مشترکہ لگن نے ان (دونوں کے) مشترکہ بحر علم وفضل میں اپناراستہ، سرنگ کی طرح چھپنے کے انداز میں، اس طرح کہ کسی اور کو خبر بھی نہ ہو۔ سَرَبًا میں نظر کے دھوکہ کا پہلو (سراب) چھپا ہے جو اشارہ دیتا ہے کہ دونوں اصحاب اپنی لگن ہی سے کام لیتے ہوئے سفر کررہے تھے، مگر نظر کے دھوکہ میں انہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ تڑپ ہمیشگی اور تازگی پاچکی ہے۔ جب دونوں اصحاب کا نقطۂ نظر یکجا ہوگیا، جو بمنزلہ قلب و نظر کے ایک ہونے کے ہے، تو اس یکجائی کو مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا سے تعبیر کیا گیا۔ قلب و نظر کی یہ یکجائی سالک کو وہ اطمینان بہم پہنچاتی ہے کہ اس کی تڑپ عملی روپ دھار کر ایک نئی زندگی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ ابتدائی حالت کی تڑپ، سالک کے اپنے ہی بحر علم میں اپنی راہ تلاش کرتی، عملی انداز میں اجاگر ہوکر فعال ہو جاتی ہے۔

آیت ۶۳ کے مطابق لِفَتٰہُ اقرار کرتا ہے: فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ: یعنی وہ اپنی تڑپ اور لگن سے بے بہرہ ہوگیا، حتیٰ کہ اپنے مربّی سے اس کا ذکر بھی کرنا بھول گیا۔ مگر موسیٰ پر یہ کیفیت وارد نہ ہوئی بلکہ بھولنے کا عمل اکیلے لِفَتٰہُ سے ہوا اور یہ صیغۂ واحد میں بیان کیا گیا۔ اسی آیت کے مطابق: وَ اتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا: کہا گیا، یعنی اس نے سمندر میں اپنی راہ لی، عجب طریق پر۔ غور طلب ہے کہ وحی کے الفاظ میں اس کو سَرَبًا فرمایا گیا، جب کہ لِفَتٰہُ کی زبان میں عَجَبًا کہلوایا گیا، جس سے ثابت ہو اوہ اپنے اکیلے کے ساتھ ہونے والے اس عمل کو عجب کہہ رہا ہے۔ یقیناً موسیٰ نے اسے ایسا مشاہدہ کروادیا کہ اس کی تڑپ، اس کے اپنے بحر علم میں گم ہوکر، ایک نئی اور فعال شکل میں اسے دکھائی دی۔ وہ اس مشاہدہ میں دیر تک مستغرق رہا یہاں تک کہ اپنے مربی کو بھی وہ واردات بیان نہ کر سکا۔ حکمتِ الٰہی کے تحت مربی ایک مختلف انداز میں اس کی بابت دریافت کرتے ہیں تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ اس نے ایسا عجب نظارہ کیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی مگر غلبۂ وسواس کی وجہ سے اس کا ذکر کرنا بھول

Marfat.com

گیا، جب کہ موسیٰ کے متعلق ایسا سوچنا کہ وہ اپنی لگن بھول گئے، (فی الحال) مناسب نہیں۔ لفظاً، تربیت کے دوران ان مراحل سے ضرور گزرا ہوگا اور اسی کی کیفیات کو قرآن میں رقم کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

بہر طور الصَّخْرَةِ کا ذکر سن کر موسیٰ فرماتے ہیں: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ: یعنی وہی تو ہماری منزل تھی۔ غیر متزلزل حالتِ یقین، جس میں سالک کی لگن اور تڑپ کو مشاہدہ کی شکل میں حیات جاودانی نصیب ہو جائے، وہی مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا ہے، لیکن وہ کسی کے لئے مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ بھی ہے۔ چونکہ وہ دونوں اصحاب الصَّخْرَةِ سے تجاوز کر چکے تھے اس لئے فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا کے مصداق منزل پر پہنچنے کے لئے، الٹا پھر کر، اپنے قدموں کے نشانات کی وساطت سے واپس الصَّخْرَةِ پر پہنچ گئے۔ ارتداد، لغت کی اصطلاح میں، کلمۂ حق کہنے کے بعد پھر سے کفر اختیار کر لینے کو کہتے ہیں۔ حافظ سائیں اکثر فرمایا کرتے کہ جس مقام پر تم ہو، وہاں سے الٹے رُخ پھر جاؤ تو حقیقت پاؤ گے۔ یہ کلیہ قرآن میں آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل بیان ہوا کہ اگر موسیٰ عملِ ارتداد نہ کرتے تو کبھی منزل پر نہ پہنچتے، بلکہ حد سے تجاوز کرتے ہی چلے جاتے جو معصیت کی شکل ہوتی۔ ارتداد اس معنی میں سالک کو ممکنہ گناہ سے محفوظ کرتا ہے اس لئے ہر صاحب فکر و شعور پر لازم آتا ہے کہ اپنی زندگیوں میں یو۔ ٹرن (U-turn) لے کر اپنی منزلوں کے قریب ہوں، چاہے ظاہر بیں انہیں مرتد ہی کہتے رہیں۔ شریعت حقہ مبارکہ کی شریعت کو چھوڑ کر، طریقت کی شریعت پر گامزن ہونا، بمنزلہ ارتداد کے ہے۔ جس کی لگن کو ابھی وہ غیر متزلزل یقین میسر نہیں آیا کہ شریعت کی شریعت کو خیرباد کہہ کر طریقت و حقیقت و معرفت کی شریعت پر قائم ہو سکے، وہ ایسا کر چکنے والے کو مرتد ہی کہے گا، جب کہ اس عمل مشاہدہ میں سے گزر چکنے والے کے لئے یہ ارتداد ہی انعام کا باعث ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر بیں لوگ، انگشت طعن و ملامت دراز کریں تو قرآن کہتا ہے: وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ: یعنی وہ ایسی ملامت کرنے والوں کی پرواہ

Marfat.com

نہیں کرتے۔ اس لئے موسیٰ کے لئے فَارْتَدَّا کا عمل نہ تو کچھ عیب ہے نہ ہی باعث ملامت، اگر ملامت ہے بھی تو وہ فخر سے اس عمل میں جلدی فرما رہے ہیں، کیونکہ یہی عملِ فَارْتَدَّا ان کے لئے وہ پھل لایا، جو کسی اور کے نصیب میں نہ ہوا: فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ: یعنی پایا ہمارے عباد میں سے ایک عبد۔

عبد ایک حال ہے جو عبادت کے صحیح مفہوم کو عملی طور پر ادا کرنے سے میّسر آتا ہے۔ سچّا عابد غلبۂ شیطان سے محفوظ اور اخلاص، شکر گزاری اور رجوع الی اللہ جیسے خواص کا پیکر ہوتا ہے، اسرار و بھید اسے عطا کئے جاتے ہیں، شانِ مصطفوی کا حامل ہونے کے ناطے نبی مرسل بھی ہو سکتا ہے۔ علم لدنّی فقط عبد ہی کو تفویض کیا جاتا ہے، یہ حالِ نفسِ مطمئنہ ہوتا ہے اور ذات لم یزل فخر سے فرماتی ہے کہ وہ اپنے عبد کے لئے کافی ہے۔ موسیٰ کلیم اللہ، حاملِ توریت ہیں اور بارگاہِ ایزدی میں ان کا درجہ بہت مخصوص ہے، مگر علم لدنی سے بے بہرہ تھے۔ اسی علم کی بابت خبر پانے کے بعد انہیں اشتیاق ہوا کہ علم لدنی کے حامل سے ملاقات کروں۔ ان کی مراد پوری ہونے کو تھی (Dream come true)، اور آیت ۶۴ کے مطابق اس مراد کی تکمیل کا آخری اور فیصلہ کن مرحلہ عملِ فَارْتَدَّا (اپنے پاؤں پر الٹا لوٹنا) تھا۔ اگر وہ دونوں اصحاب ایک خاص مقام سے تجاوز کر چکنے کے بعد واپس نہ مڑتے، تو تمام عمر سفر جاری رکھنے کے باوجود وہ منزلِ مراد پر نہ پہنچ پاتے۔ ان کا اپنے پاوں پر الٹا پھرنا ایسا دانشمندانہ اقدام تھا، جو اولاً حکمتِ خداوندی کے تحت تھا اور دوئم، مابعد کے عوام الناس کے لئے سنت قائم کرنے کے مترادف تھا۔ حکمتِ خداوندی تو یہی تھی کہ میرے پیارے نبی کی سچی تڑپ اور تکلیف دہ سفر کی کلفت رائیگاں نہ جائے، اور اسے اس کی مراد مل جائے، مگر سنت اس طرح جاری ہوئی کہ ابد تک ہر سالک کے لئے یہ کلیہ مقرر ہو گیا کہ اگر وہ اپنی لگن کا صلہ چاہتا ہے اور منزلِ مقصود کا خواہاں ہے تو اسے ہر حال میں عملِ فَارْتَدَّا کرنا پڑے گا۔ نبیؐ آخر الزماںؐ نے ارتداد کا یہ عمل برضا و رغبت کیا۔ قدرت کاملہ نے

Marfat.com

آپؐ کی دلی خواہش کو بھانپ کر سورۃ البقرہ آیت ۱۴۴ میں خود فرمایا: قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا۔ یعنی ہم (دلی تمنا کے ساتھ) آپؐ کا آسمان کی طرف دھیان کرنا دیکھ رہے ہیں، پس پھیر دیں گے آپ کے لئے وہ قبلہ جو آپ کی رضامندی میں ہے۔ موسیٰ کو ارتداد کا عمل خود کرنا پڑا اور حضورؐ کے دل کی لگن کو محسوس کرتے ہوئے چہرہ مبارک پھیرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ فَارْتَدَّا کی بجائے نُوَلِّيَ کا لفظ فرمایا گیا جس کا معنی رجوع کرنا ہے۔ یہاں یہ لطیفہ نمایاں ہوتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے ہاں رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ؐ کا مقام جدا ہے! اور یہ اصول بھی میسر آیا کہ منزل مراد پانے کے لئے فَارْتَدَّا کا عمل لازم ہے، ہر سالک کے لئے اس کی شکل مختلف ہو سکتی ہے مگر کسی کو اس سے مفر (چھٹکارا) نہیں۔ مجاہدہ اس وقت تک بار آور ہو ہی نہیں سکتا جب تک سنتِ ارتداد کو نہ اپنایا جائے۔ اگر اولاد، بیوی اور سلطنت سے ارتداد کیا جائے تو مہاتما گوتم بدھ اور ابراھیم بن ادھمؒ کا مقام ملتا ہے، کل مخلوقاتِ کائنات سے اعراض کیا جائے تو حبیبؒ بن سلیم الراعی العجمیؒ کا درجہ نصیب ہوتا ہے، ٹھگی و راہزنی سے منہ موڑا جائے تو منزل فضیلؒ بن عیاض سے کم نہیں، ظلم و ستم کرنے والوں سے تَوَلّی کیا جائے تو ذوالنونؒ المصری بن جاتا ہے اور توبہ کی بھی توبہ سے ارتداد کرنے والے کو کائنات بایزیدؒ البسطامی کے نام سے ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔ موسیٰ ایک سو اسی (۱۸۰) ڈگری پھرے تو اپنے ہی نقوشِ قدم کا پیچھا کرتے ہوئے انہیں وہ مل گیا، جس کے لئے تمام زندگی داؤ پر لگانے کا تہیہ کر چکے تھے۔

بلاشک، نصیب کے بنا اور وقت سے قبل کسی کو کچھ میسر نہیں آ سکتا، لیکن فیصلۂ قرآنی کے تحت عمل ارتداد، بامراد کرنے کا سبب ہے، یہ الگ بات ہے کہ کاتبِ تقدیر اپنی حکمت سے اس عمل کی استطاعت اسی وقت عطا کرتا ہے جب نصیب اور وقت یکجا ہونے کو ہوتے ہیں۔ تقدیر نظر نہیں آتی

Marfat.com

اور معین وقت کی بھی کسی کو خبر نہیں ہوتی، اس لئے ظاہری طور پر فقط عملِ ارتداد ہی منزلِ مقصود سے قربت کا سبب کہلاتا ہے، اس کی اہمیت شک وشبہ سے بالا ہے اور حق الیقین تلک اس کو ماننے بغیر چارہ نہیں۔ اگر کوئی سالک اپنی خواہش وارادہ سے یہ عمل کرنے سے لاچار ہے تو ایک بات نہایت وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جب بھی قضا وقدر اس سے یہ عمل کروائے، اور اسے علم ہو جائے کہ یہی ارتداد ہے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ منزلِ مقصود قدموں کے فاصلہ پر ہے، اس لئے کہ یہی سنگِ میل ہے، جسے قرآن میں حجت کے طور پر اس واقعہ میں، بین السطور، مگر فصاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

جب دونوں اصحاب نے وہ سفر شروع کیا ہو گا تو چونکہ بنیادی عزم موسیٰ کا تھا، اس لحاظ سے سالارِ کارواں وہی تھے، اس حیثیت سے چلنے میں وہ یقیناً لِفَتٰىهُ سے پیش ہونگے اور یوشع بن نونؑ ان کی تقلید میں ان کے پیچھے یعنی اتباع میں چل رہے ہونگے۔ دستورِ زمانہ کے مطابق مربی کا ادب اس سے بڑھ کر چلنے کا مانع ہے، اچھا شاگرد اور مقلد اگر اپنے استاد سے سبقت کرے تو یہ قرین از قیاس ہو گا۔ اس انداز سے سفر کرتے ہوئے، بلاشک، موسیٰؑ کے نقوشِ قدم ماند ہوتے جا رہے ہونگے اور ان کی جگہ لِفَتٰىهُ کے قدموں کے نشان زمین پر نمایاں ہوتے جا رہے ہونگے۔ یہی حالت الصَّخْرَةِ کے بعد متجاوز سفر میں بھی بدستور ہوگی کہ لِفَتٰىهُ، اتباع میں چلتے ہوئے، موسیٰؑ کے نقوشِ قدم پر اپنے قدموں کے نشان بنا رہے ہونگے۔ جب عملِ ارتداد شروع کیا ہو گا، اس وقت لِفَتٰىهُ کے قدموں کے نشان زمین پر زیادہ واضح ہونگے اور عملِ فَارْتَدَّا، قرآن کے مصداق عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا یعنی ان کے قدموں کے نشانات پر ہوا۔ اس طرح فَلَمَّا جَاوَزَا تک لِفَتٰىهُ، موسیٰؑ کے قدموں کی سیدھ میں چلتے رہے، لیکن جب فَارْتَدَّا کا عمل ہوا تو چونکہ زمین پر یوشعؑ کے قدموں کے نشان نمایاں تھے، اس لئے موسیٰؑ اس کے قدموں کے نشانات کی سمت میں چلے اور اپنی منزل پائی۔ حقیقت میں ایسا ہی ہوا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز اخذ نہیں کیا جانا چاہیے کہ خدانخواستہ نبیؑ

Marfat.com

اپنے غلام کے قدموں کی پیروی میں اپنی منزل پر پہنچے۔ دراصل عمل ارتداد صرف لِفتٰہ کے لئے مقرر ہوا تھا۔ موسیٰ نے یوشع بن نون کو محض اسی مقصد کے لئے ساتھ لیا تھا کہ جانشین کے طور پر اس کی تربیت فرمائیں، وگرنہ موسیٰ کے لئے فَارْتَدَّا کا عمل، عرصہ قبل، شعیبؑ کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہو چکا تھا۔ یہاں اگر وہ خود بھی ارتداد کرتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں تو وہ تواضع کے طور پر ہے جس کی مراد لِفتٰہ کو منزل پر پہنچانا ہے۔ سو فَارْتَدَّا کا عمل، یوشع کے لئے مقرر ہوا، اس لئے وہ اپنے ہی قدموں کے نشان پر الٹے پھر رہے ہیں، جب کہ موسیٰ، عمل تربیت میں، تواضع کے تحت اس کے ہمراہ ہیں اور وہی کارِ خیر سرانجام دے رہے ہیں جو کل شعیبؑ نے خود ان کے لئے کیا تھا۔ یہ بھی قدرت کاملہ کی طرف سے مقرر ایک فطری عمل ہے کہ ہر دور میں، ہر رنگ، ہر خوشبو، ہر مٹھاس اور ہر کردار موجود رہے، تاکہ کسی کو شکایت نہ رہے کہ وہ محروم رہ گیا۔ ویسے ہر دور میں صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ)، بوالہوس (خواہشات کی خوشبو)، شیرینیٔ کلام اور ہر کردار کی طرف عوام الناس کا رجحان ہی ان کے نیک و بد ہونے کا سبب ہوتا ہے۔

اس مقام پر عیاں ہوتا ہے کہ کیوں کسی صخرہ پر رکنے اور کچھ استراحت کے دوران موسیٰ کھانا طلب نہیں کرتے لیکن جب وہاں سے تجاوز کر جاتے ہیں تو ناشتہ مانگ لیتے ہیں۔ حقیقت ہے کہ پہلی ملاقات میں کسی کا صرف تعارف ملتا ہے، عرفان حاصل ہوتے ہوتے ہی ہوتا ہے، ایک ملاقات کے بعد مناسب وقفوں سے، پلٹ کر اسی کو ملنے جانا سبب عرفان ہوا کرتا ہے۔ مقام صخرہ پر لِفتٰہ کو مشاہدہ میسر آیا کہ کیونکر اس کی تڑپ اس کے اپنے وجود میں ایک نئی اور فعال شکل میں نمودار ہو کر جاوداں و متحرک ہو گئی جیسے زندہ مچھلی پانی میں ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بعد میں یقین سے کہتا ہے کہ آپ نے دیکھا تو تھا کہ کس طرح میری لگن کی حوت، حیات جاوداں سے ہمکنار ہو کر فعال ہو گئی تھی۔ اسی استغراق کی حالت میں موسیٰ، اس کو جان بوجھ کر ایک متجاوز مقام پر لے جاتے ہیں اور اچانک اس کا دھیان بدلنے

Marfat.com

کے لئے ناشتہ پیش کرنے کو کہتے ہیں۔ یہی اچانک پن، لِفَتٰہُ کے استغراق کو محو کرنے کا باعث ہوا، اور حالتِ صحو میں اسے اپنے مشاہدہ کی صحیح تفہیم میسر آئی۔ تبھی اس کے لئے فَارْتَدَّا وارد ہوا، تاکہ جس کی ملاقات ہوئی، اس کے عرفان کی گنجائش بن سکے۔ اس طرح لِفَتٰہُ کا اپنے قدموں کے نشانات پر لوٹنا اسی کے لئے ہے، موسیٰ کے لئے نہیں۔ مالکِ کائنات کی قدرت میں ہے کہ ایک ہی وقت، ایک ہی حال اور ایک ہی سفر کے دوران ایک سے زیادہ کو ایک ہی وسیلہ سے نواز دے، جیسے متذکرہ سفر میں یوشعؑ کو مشاہدہ و عرفان سے نواز دیا اور اس کی وساطت سے سنتِ ارتداد کو آشکار کر دیا، جب کہ موسیٰؑ کے لئے عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا تک رسائی ممکن کر دی۔ قرآن میں اس مقام کے علاوہ کہیں لِفَتٰہُ کا ذکر بھی نہیں آتا۔ یہ بھی دلیل ہے کہ یوشعؑ بن نون اپنی منزل یعنی راست الیقینی بمنزلہ الصَّخْرَۃِ پر پہنچ گئے اور موسیٰؑ، راست الیقینی سے ورا، ملاقاتِ حاملِ علم لدنی تک اپنا سفر جاری رکھتے ہیں، کیونکہ موسیٰؑ کو راست الیقینی بہت قبل صحبتِ شعیبؑ میں حاصل ہو چکی تھی۔

آیت ۶۵ کے تحت، عملِ ارتداد مکمل ہونے پر موسیٰؑ، عباد میں سے ایک عبد کو پاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عباد بہت ہیں اور ہر دور میں موجود رہتے ہیں، آج بھی ہیں اور قیامت تک زمین ان کے قدموں کی برکات سے ہری بھری اور تر و تازہ رہے گی۔ عبد کو پانے میں ایک لطیفہ پنہاں ہے کہ جب کوئی مربی اپنے لِفَتٰہُ کو راست الیقینی (الصَّخْرَۃِ) تک پہنچا دیتا ہے تو قدرت کاملہ اس کے لئے مشاہدۂ علم لدنی کا دروازہ کھول دیتی ہے اور قرآن کے مطابق علم لدنی کسی عبد ہی کی میراث ہو سکتا ہے۔ یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ مربی کو لازم ہے کہ اگر جانثار، پر عزم اور سچی تڑپ والا کوئی لِفَتٰہُ اسے مل جائے تو پہلے صدیوں لمبے کٹھن سفر کا اشارہ دے کر عملی طور پر اس کی پرکھ کر لے، پھر اسے حق الیقین کی منزل کا مشاہدہ کروانے میں عار نہ کرے، کیونکہ سچا لِفَتٰہُ وہ ہوتا ہے جو اپنی زندگی، ماں باپ، بھائی بہن

Marfat.com

اور دیگر تمام متعلقات مربی پر قربان کرنے کو تیار ہو۔ جب ایک مربی ایسا کر دیتا ہے تو مالک کائنات اس کا اجر بھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔ وہ کسی کو منزل حق الیقین پر فائز کرتا ہے تو مالک اس مربی کے لئے علم لدنی تک رسائی کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ موسیٰ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، کیونکہ مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا، ایک مرکز پر جمع ہو کر، اپنی اپنی حیثیت پر قرار رکھنے کا نام ہے۔ سورۃ البقرہ، آیت ۶۰ میں ہے: وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ: یعنی جب موسیٰ نے اپنی قوم کو سیراب کرنے کے لئے پانی مانگا، ہم نے فرمایا اپنے عصا سے پتھر پر ضرب لگاؤ، پس جاری ہوئے اس میں سے بارہ چشمے، پس ہر گروہ اپنا گھاٹ پہچانتا تھا۔ ایک ہی گھاٹ پر، ایک ہی عصا مار کر، بارہ مختلف مشرب بنا کر، ایک ہی نقطہ سے مختلف النوع قبائل کو ان کی ضرورت کے مطابق سیراب کرنا اسی ضمن میں آتا ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۱۶۰ میں ہے: وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ یعنی اولادوں کی بنیاد پر ہم نے انہیں بارہ امتوں میں بانٹ دیا اور پھر موسیٰ کو ہم نے وحی فرمائی، جب ان کی قوم نے ان سے پیاس بجھانے کو مانگا، کہ اپنے عصا سے پتھر پر مارو، پس پھوٹ نکلے اس میں سے بارہ چشمے، پس ہر گروہ اپنا گھاٹ پہچانتا تھا۔ بالا آیات اس بات کی دلالت ہیں کہ ایک ہی نقطہ سے مختلف گروہ سیراب ہو سکتے ہیں اور عین اسی نقشہ پر قدرت کاملہ نے موسیٰ اور ان کے لفتیٰ کو ایک ہی 'سفر' میں اس طرح سیراب کر دیا کہ دونوں کو ان کے مرتبہ اور مقام کے مطابق میسر آ گیا۔ یہ بھی مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا کی تفسیر ہو سکتی ہے، جس کے مطابق یوشع بن نون یا تو خود مانند الصَّخْرَةِ ہو گئے یا پھر موسیٰ انہیں وہاں قائم کر کے اس طرح آگے بڑھے، جس طرح مدین سے واپسی پر اپنی زوج کو کھڑا کر کے آگ تلاش

Marfat.com

کرنے چل دیے تھے۔ وہاں انعامِ نبوت سے سرفراز ہوئے تو یہاں عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ تک رسائی ہو گئی۔ اس عبد کی دو نمایاں خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

ا: اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا: یعنی دی ہم نے اس کو اپنی ذات سے رحمت۔ رَحْمَةً کا مصدر رَحِم ہے اور عام طور پر کسی مادہ کی بچہ دانی اس سے مراد لی جاتی ہے۔ بچہ اپنی ماں کے شکم میں لاچاری اور بے اختیاری کی حالت میں ہوتا ہے، اس میں توانائی اور صلاحیتیں اجاگر ہی نہیں ہوئی ہوتیں، تو اس حالت میں جو خول اس کی حفاظت و نگہداشت کرتا ہے، چونکہ رحم کہلاتا ہے، اس لئے بیرونی اور ممکنہ تکلیف دہ اثرات سے مکمل حفاظت کے علاوہ تکمیل تک پرورش، اس مصدر میں پائی جاتی ہے۔ سامان و اسبابِ پرورش بھی اسی میں شامل ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ ماں کے بھی اختیار کے بغیر ہو رہا ہوتا ہے، اس لئے رَحْمَةً سے ایسی ربوبیت مراد ہے جو عطا کے طور پر ہو، اس میں کسی کی محنت و کاوش بھی نہیں لگتی اور معاوضہ بھی نہیں دینا پڑتا۔ تمام ظاہری اور باطنی کمزوریاں رفع کر کے انہیں پورا کرنا بھی اس مصدر میں پایا جاتا ہے۔ ماں کے شکم میں جرثومہ (Sperm) اور انڈہ (Egg) کا ملاپ ، کئی ہفتوں تک نا قابلِ دید ہوتا ہے، مگر ہر نوع (Species) کی مادہ مختلف، لیکن مقرر وقت کے بعد اپنے جیسا بچہ جنم دیتی ہے۔ یہ تکمیل اور اس سے قبل کے مراحل و اسباب لفظ رَحْمَةً کا حصہ ہیں، جس میں محافظت کا عنصر بدستور شامل ہے۔ بدنی نشوونما کے ساتھ، فکری اور باطنی ارتقاء بھی اس کا مفہوم ہوتا ہے، اس لئے اللہ کی طرف سے عطا کردہ علم و فضل جو کشف، الہام، القاء یا وحی کے ذریعہ میسر آتا ہے وہ بھی رَحْمَةً ہی کہلائے گا۔ اس میں میں قرابت داری اور نرمی کا پہلو بھی ملتا ہے، لہٰذا ثابت ہوا عِبَادُ اللّٰہ بے اختیاری کے اس اولیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں جہاں ان کی نفسی بساط، ابتدائی حالتِ حمل کی سی ہوتی ہے، ذاتِ باری ان کی حفاظت و پرورش کر کے انہیں اپنے ہی رنگ میں ڈھال کر اپنا عبد کہہ لیتی ہے۔

Marfat.com

اس عبد کی قرابت داری، ازاں بعد صرف معبودِ برحق تک رہ جاتی ہے اور وہ باقی تمام اسبابِ ظاہرہ سے منقطع ہو جاتا ہے۔

ii: عَلَّمۡنٰہُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا: یعنی تعلیم کیا تھا ہم نے اسے علم لدنی میں سے۔ محسوساتی طور پر جاننے سے لے کر حقیقی طور پر پہچاننے کو علم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قرآن میں اس کی اقسام علمُ الکتاب (سورۃ الرعد۔۴۳)، علم من الکتاب (سورۃُ النمل۔۴۰)، علمُ الساعۃ (سورۃ لقمان۔۳۴، سورۃ الفصلت۔۴۷ اور ۸۵)، علمُ الغیب (سورۃُ النجم۔۳۵) اور علمُ الیقین (سورۃُ التکاثر۔۵) کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ بلاشک اللہ کے نزدیک علم کی بہت فضیلت ہے، سورۃُ المجادلۃ، آیت ۱۱ میں ہے: وَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ: یعنی اہلِ علم، درجہ بلند ہیں۔ بنی آدم کو جب خبر (Information) میسر آتی ہے تو وہ اپنے کو دوسروں سے ممتاز (Enlightened) محسوس کرتا ہے۔ ایسی لاتعداد خبریں جمع ہو کر ایک امکانی علم (Knowledge) کو جنم دیتی ہیں اور ایسے بے شمار امکانی علوم اکٹھے ہوں تو علم الیقین یا یقینی علم (ILM) حاصل ہونے کی توقع ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، پہلے پہل جب آدم نے نباتات کی خبر حاصل کی ہو گی تو اسے معلوم ہوا ہو گا کہ کثرت نباتات سبز رنگ ہیں، کچھ درختوں کی طرح فلک بوس ہیں، کچھ جھاڑیوں کی شکل اور کچھ زمین پر لیٹی بیل کی مانند ہیں اور ان پر پھول اور پھل اگتے ہیں جن کا رنگ، ذائقہ اور تاثیر جداگانہ ہے۔ ایسی بہت سی خبریں اکٹھی ہو کر ایک امکانی علم کی شکل میں سامنے آئیں، جس کا نام علم نباتات (Botany) رکھ لیا گیا۔ اس میں تحقیقات کے نتیجہ میں جو مزید امکانی علوم کے دروازے کھلے، انہیں یکجا کرنے پر نباتات کی ماہیت و کیفیت کے چھپے راز افشا ہوئے، حتیٰ کہ یقینی علم کی منزل آئی، جو دراصل بہت سے امکانی علوم کا اجتماع ہوتا ہے۔ خالق و مالک کی ذات واجب الوجود 'عین علم' ہے، ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ جو کچھ کہ خبر اور امکانی علم کے تحت میں آ سکتا

Marfat.com

ہے، اللہ اس سب کا پیدا کرنے والا ہے، بحیثیت خالق اس نے سب کچھ قدر (اہلیت) کی بنیاد پر خلق کیا ہے، جس کے لئے راست العلم (عین علم) ہونا لازم آتا ہے۔ سورۂ طہٰ، آیت ۹۸ میں ہے: وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا: یعنی اس کا علم کُل کو اپنے احاطۂ ادراک میں لئے ہوئے ہے۔ وہ ذات اپنے عبد کو جو علم لدنّی عطا کرتی ہے، عقلِ آدم اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ ان کو صحائف یا الواح نہیں دی گئیں، نہ ہی کچھ وحی ہوا، بلکہ معلم بن کر ذات کا عین علم یا اس کا کچھ حصہ تعلیم کیا گیا۔ یہ وہ علم نہیں جو مخلوقات خبروں اور امکانات کی بنیاد پر حفظ کرتی ہے، جس میں بھول چوک اور خطا و غلطی کی گنجائش ہوتی ہے۔ علم لدنی میں سے تعلیم کیا گیا عبد، باقی مخلوقات میں سے کسی سے متقابل (Compare) نہیں ہو سکتا، اس کی شان وراہوتی ہے، اس کا درجہ و مقام و حال، خاصوں کے لئے بھی باعثِ حیرت ہوتا ہے بلکہ حقیقت ہے کہ وقت کے انبیاء بھی ان کی صحبت میں متردد ہوئے۔

قرآن کے مطابق یہ خصوصیات، بیک وقت، کسی اور کے لئے مقرر نہیں ہوئیں بلکہ علم لدنی کسی اور کو عطا ہی نہیں ہوا۔ سورۂ طہٰ آیت ۹۹ میں یہ ضرور وارد ہے: وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا: یعنی اے محبوب تحقیق ہم نے آپ کو اپنی ذات کی طرف سے ذکر عطا کیا ہے۔ یہ انعام محمدؐ رسول اللہ کے لئے مختص ہوا، جب کہ لَّدُنَّا عِلْمًا کی عطا فقط اس عبد پر ہوئی جس کی زیارت کی تمنا لئے موسیٰ عزمِ مصمم سے کوشاں تھے۔ انہوں نے جس عَبْدًا کو پایا، ذات باری نے خود اس کی نشوونما کر کے اسے اپنے ہی رنگ میں ڈھال لیا تھا اور عین علم میں سے سیراب کر کے اتنی علمی وسعت عطا فرما دی کہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا۔ وہ عبد بھی اسی معبود کا ہو کر رہ گیا تھا اور وہ ذات بھی ہمیش کے لئے اس عبد کی حافظ و ناصر ہو گئی تھی۔ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ سے متعلق ہونے کی وجہ سے اسے بھی خضریت عطا ہو گئی اور وہ ہرا بھرا، ہر دم تازہ اور حاملِ حیاتِ جاوداں ہو گیا۔ یہ واضح نہیں ہوتا کہ موسیٰ کی اس سے ملاقات کیسے ہوئی؟ اس لحاظ سے پیچھے بیان کی گئی ایک توضیح

Marfat.com

تج ہوتی ہے کہ موسیٰ نے لفتٰہ کو مقام صخرہ (راست الیقینی) تک پہنچایا تھا، اس لئے مالک کائنات نے ان کا اجر ضائع نہ ہونے دیا، اور انہیں خود وہاں پہنچا دیا جہاں وہ عبد کو پانے میں کامیاب ہو گئے، وگرنہ متعلم ذات باری، ہر جائی تو ہو سکتا ہے، مگر جلدی سے حسیاتِ محسوسات میں نہیں آسکتا۔ یہ ذات ہی کا کرم تھا کہ موسیٰ نے اس عَبۡدًا کو پایا، اور پالینے پر آیت ۶۶ میں اس سے کہتے ہیں: هَلۡ اَتَّبِعُكَ: یعنی کیا میں آپ کی اتباع کر سکتا ہوں؟ جانوروں کے نوزائندہ بچے جس طرح اپنی ماؤں کے پیچھے پاؤں پر پاؤں رکھ کر چلتے ہیں اس کو اتباع کہتے ہیں۔ اس سے عیاں ہوتا ہے کہ موسیٰ ایک نظر دیکھتے ہی بھانپ گئے تھے کہ اس عبد کا مرتبہ و مقام 'چیز دیگر است'۔ خود کو اس کے مقابلہ میں طفل مکتب جانا، تبھی صدق سے ایسے الفاظ ادا کئے اور ساتھ ہی اس درخواست کا مدعا بھی بیان فرمایا: اَنۡ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمۡتَ رُشۡدًا: یعنی مجھے تعلیم کریں جو کچھ کہ آپ کو سکھایا گیا ہے۔ اس طرح پھر تصدیق ہو گئی کہ وہ اس سفر پر اسی لئے نکلے تھے کہ علم لدنی میں سے کچھ سیکھ اور سمجھ سکیں۔ بذریعہ وحی عطا کئے گئے احکامات کی مکمل عملی تفسیر، نبی کو مشاہدہ کروائی جاتی ہے، جس سے اس کی قلبی تصدیق کے ساتھ، تبلیغ کرتے ہوئے خود اعتمادی اور فصاحت نمایاں رہتی ہے۔ اللہ سے براہِ راست کلام کا شرف ہونے کی وجہ سے موسیٰ میں ایک خصوصی اٹھان تھی لیکن اس عبد کو پاتے ہی ان کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس کی اتباع کرنا چاہیے، تا کہ علم لدنی میں سے فیض میسر آئے۔ جو مدعا موسیٰ نے بیان فرمایا اس میں رُشۡدًا کا لفظ اعتراف ہے کہ علم لدنی، رشد و ہدایت کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے تبھی اپنے لئے اس کی تمنا کر رہے ہیں۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نبی اللہ رشد و ہدایت کے حامل نہ تھے۔ علم لدنی میں سے حاصل ہونے کی بنیاد پر جو مرتبہ رشد و ہدایت اس عبد کو میسر تھا، نور نبوت کے حامل ہونے کی وجہ سے موسیٰ اس کی منزلت سمجھ چکے تھے اور ان اسرار و رموز کی فہم کے خواہاں تھے۔

Marfat.com

نبی اللہ کی مصدق درخواست کو عبد نے پوری محبت سے سن کر آیت ٦٧ کے مطابق ادباً جواب دیا: اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا: یعنی تحقیق آپ (موسیٰؑ) ہرگز ایسی استطاعت نہیں رکھتے کہ میرے (عمل کے) ساتھ صبر کر سکیں۔ خضر کا یہ کہنا کسی بھی شکل میں توہینِ رسالت نہیں گردانا جا سکتا، کیونکہ کائنات کی کوئی مخلوق، کسی بھی حال میں وقت کے نبی مرسل سے مقدم نہیں ہو سکتی۔ وحیِ الٰہی سے تمسک، پاک صلبوں اور پاک رحموں سے پیدا ہونا، ازلی اور ابدی طور پر معصوم ہونا، وہ چند خصوصیات ہیں جو نبیٔ وقت کا امتیاز ہوتی ہیں۔ حاملِ علمِ لدنّی اس حقیقت سے کیونکر ناآشنا ہو سکتا ہے؟ اس کا محتاط جواب زمرۂ توہین میں شمار نہ ہوگا، دراصل وہ بھی یہ الہامی خبر رکھتا ہے کہ شریعتِ موسوی میں معمولات مختلف ہیں اور ذات واجب نے اس کے ذمہ جو کام لگا رکھے ہیں، وہ مختلف شریعت سے سرانجام دیے جاتے ہیں۔ چونکہ موسیٰؑ کو ابھی اس کی آگہی نہیں تھی، تبھی اس نے کہا کہ آپ ان افعال پر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں گے، لہٰذا اتباع کی تمنا موقوف کر دیں۔ خضرؑ، نبی اللہ کو اپنی صحبت میں قریب کرنے سے انکاری نہیں، بلکہ اپنی اور موسیٰؑ کی استطاعت کے فطری پہلوؤں کے فرق کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ فرض کریں دو طالبِ علم ہیں۔ ایک طبعیات (Physics) کے علم میں ماسٹر (M.Sc) ہے اور دوسرے نے اقتصادیات (Economics) میں یہی ڈگری حاصل کی ہے اور دونوں اپنے علم میں کامل مہارت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود علمِ طبعیات کا ماہر، بجٹ نہیں بنا سکے گا اور اقتصادیات والا ایٹم بم کا کلیہ نہیں سمجھ سکے گا۔ ہر شعبہ ہائے علم کی اپنی شریعت ہے، جو دوسرے علم کی شریعت سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک وزیرِ اعظم ملک کا آئینی نگران ہوتا ہے اور ایک مخصوص شریعت پر حکومت کا نظام چلا رہا ہوتا ہے، مگر ہنگامی صورت میں کمانڈر انچیف کے اقدامات اس کے لئے حیرانی کا باعث ہوتے ہیں، کیونکہ اس کی مخصوص شریعت سے وزیرِ اعظم ناواقف ہوتا ہے، اسی لئے حالتِ جنگ میں کبھی اسے اگلی صفوں (Front lines) پر نہیں لے جایا جا سکتا، جب کہ کمانڈر کی زندگی

Marfat.com

وہیں گزرتی ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال کے طور پر وقت کے کمانڈر انچیف، خضرؑ، وقت کے نگران و حاکم، موسیٰؑ کو اپنے ہمرکاب اگلی صفوں میں لے جانے سے تردد فرما رہے ہیں اور برحق اس کا جواز صبر کو بنا رہے ہیں۔ حافظ سائیںؒ فرمایا کرتے 'صبر دیے گئے حالات میں عین فطری طور پر عمل کرنا ہے (To act naturally, in given circumstance)'۔ خضرؑ، موسیٰؑ کو یہی عندیہ دے رہے تھے کہ آپ اپنی شریعت کی پیروی کا حق ادا کرتے رہیں، نئے راستہ پر گامزن ہونے سے وہ نظام متاثر ہونے کا امکان ہو سکتا ہے، لہٰذا مناسب ہے کہ ہم دونوں اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دیتے رہیں۔

اس کا اشارہ آیت ۶۸ میں ملتا ہے: وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا: یعنی کیسے صبر کریں گے اس خبر پر جس کا آپ احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جب تک کسی معاملہ کی مکمل گرفت ہاتھ میں نہ ہو، بے صبری قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ دراصل بین السطور ایک اصول بیان ہوا کہ جب اہم کام کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو محض جلد بازی میں اس کی طرف رغبت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ پہلے اس کے تمام ضروری پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا مکمل ادراک کرنا چاہیے، تاکہ تمت بالخیر لازم ہو۔ بے صبری، بے دلی پیدا کرتی ہے اور بے رغبتی سے کیا ہوا کام اکثر بے معنی و لاحاصل ہوتا ہے، اس لئے رغبت اور دلی شوق کو ابھارنے کے لئے، کام شروع کرنے سے قبل اس کے متعلق ضروری علم رکھنا پسند کیا گیا ہے۔ موسیٰؑ آیت ۶۹ میں فرماتے ہیں: سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا: یعنی آپ مجھے منشاءِ ایزدی سے صابر پائیں گے اور میں آپ کے کسی امر میں مخالفت و نافرمانی نہ کروں گا۔ کلیم اللہ واقف ہیں کہ صبر بنا گزارہ ممکن نہیں اور صبر محض عنایت الٰہی سے وابستہ ہے لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو امکان معصیت پیدا ہو سکتا ہے، لہٰذا صبر کا ذکر بامعنی انداز میں ہوا ہے۔ خضرؑ، نبیٔ وقت کی وساطت سے، کُل بنی نوعِ آدم کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اپنی شریعت چھوڑ کر دوسری شریعت پر عمل کرنے کے لئے صبر کا دامن لازماً تھامنا پڑتا ہے، وگرنہ معصیت کا امکان رہ جاتا ہے، جب کہ صبر

Marfat.com

میں پختگی اور کمال کے لئے لازم ہے کہ خبر کا مکمل ادراک ہو، جس کے حصول کے لئے منشاءِ ایزدی، علت ہے۔ اس لئے اِنْ شَآءَ اللّٰہُ سنتے ہی خضرؑ نے نرمی کا رویہ اختیار کر لیا اور ایک تجویز کے طور پر موسیٰؑ کو آیت ۷۰ میں کہا: فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰٓی اُحْدِثَ لَکَ مِنْہُ ذِکْرًا: یعنی آپ اتباع کرنا چاہتے ہیں تو کسی بھی بات کے متعلق مجھ سے سوال نہ کریں، یہاں تک کہ میں خود اس کا ذکر کروں۔ معلوم ہوا کسی امر کی تکمیل سے قبل اس کے بارے میں سوال کرنا بھی بے صبری کی عملی شکل ہے۔ کامل راہبر و راہنما کو عمل کے دوران اپنے مرید کی کیفیات کا مکمل علم ہوتا ہے، اس لئے اگر سوال میں جلد بازی نہ ہو تو کام کی تکمیل پر راہبر خود اس کی حقیقت سے پردہ اٹھا دیا کرتا ہے۔ بصورت دیگر راہنما کا عمل حرج ہونے کے علاوہ مرید کے حال سے خبر ہو جاتی ہے کہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ رہا ہے۔ اس لئے یہ کلیہ قرآن کی زینت بنایا گیا جو خضرؑ بیان کر رہے ہیں کہ جب کسی کی اتباع کا فیصلہ کرو تو اپنے راہبر پر تنقیدی انداز میں سوالات نہ کرو۔

اچھے طریق پر اپنا مطمحِ نظر سمجھا لینے کے بعد وہ دونوں، عقلی اور فکری طور پر ایک دوسرے سے آزاد ہو کر چل دیے: فَانْطَلَقَا: اسی کی طرف اشارہ ہے۔ طَلَقَ مصدر میں آزادی، روانی اور فراغت کا عنصر واضح کرتا ہے کہ دونوں اصحاب ایک دوسرے پر بوجھ نہ بننے کا فیصلہ کر چکے تھے، موسیٰؑ احکاماتِ شریعت کے تابع ہیں اور خضرؑ علم لدنّی کے حقائق پر کاربند، اور اس طرح حکمتِ الٰہی سے نبی اللہ کا مرتبہ بھی برقرار رہا اور حقائقِ علم لدنّی کو بھی نیچا نہیں ہونا پڑا۔ وہ ریل کی دو پٹڑیوں کی مانند چلے اور یہ واضح نہیں ہوتا کہ فَانْطَلَقَا کا عمل کتنی دیر رہا، لیکن آیت ۷۱ ظاہر کرتی ہے کہ یہ سفر کافی دیر جاری رہا ہو گا: حَتّٰٓی اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیْنَۃِ خَرَقَہَا: یعنی یہاں تک کہ جب سوار ہوئے بیچ کشتی کے، اسے پھاڑ دیا۔ محسوس ہوتا ہے کہ پیدل چلتے ہوئے وہ کسی ایسے مقام پر آن پہنچے، جہاں پانی کی وجہ سے مزید سفر

Marfat.com

جاری نہ رکھ سکتے تھے، اس لئے کشتی میں سوار ہوئے کہ اگلی منزل پر اتر سکیں، اس لحاظ سے وہ دونوں، یا ان میں سے ایک اسباب کا محتاج نکلتا ہے۔ جس کشتی میں وہ سفر کرتے ہیں، خضرؑ اس میں توڑ پھوڑ کا عمل کرتے ہیں حالانکہ یہ واضح نہیں کہ خرق کا عمل کس طرح کیا مگر یہ بعید از عقل فعل ہے کہ منزل پر پہنچ کر کشتی میں نقص پیدا کر دیا جائے۔ ابن زیادؒ کی مثال تاریخ میں موجود ہے کہ جب اسپین (Spain) پر حملہ کرنے کے لئے وہاں پہنچے تو بحری بیڑہ کو آگ لگانے کا حکم دیا، تعمیل کے بعد وجہ یہ بتائی کہ افواج پر واپسی کا راستہ بند ہو گیا، اسلئے وہ پوری تندہی سے دشمن کا مقابلہ کریں گی۔ اس میں واضح مقصدیت نظر آتی ہے، جب کہ خضرؑ کے فعل کی کوئی وجہ نہیں دی گئی، اس لئے موسیٰؑ نے سرزنش کے انداز میں فرمایا: اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا: یعنی تو نے اسے توڑ دیا تاکہ اس میں موجود لوگ ڈوب جائیں، بلاشک تم نے یہ ناپسندیدہ کام کیا۔ خضرؑ آیت ۷۲ میں جواباً کہتے ہیں: اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا: یعنی کیا میں نہ کہتا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر سے رہنے کی ہرگز استطاعت نہیں رکھتے۔ موسیٰؑ آیت ۷۳ میں فرمانے لگے: لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا: یعنی میری بھول پر مجھ سے مواخذہ نہ کرو اور نہ میری طاقت سے زیادہ بوجھ مجھ پر ڈالو۔ نبی اللہ غیر مشروط عہد بھول کر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے، لیکن یاد کروانے پر معذرت پیش کر رہے ہیں۔ دراصل حامل علم لدنی کے فعل میں کچھ ایسا عجب انداز تھا کہ کلیم اللہ اسے برداشت ہی نہ کر پائے اور شریعت موسوی کے تحت معترض ہو گئے لیکن یاد کروانے پر انہیں احساس ہوا کہ جلد بازی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ تُرْهِقْنِيْ کا لفظ اشارہ دے رہا ہے کہ وہ کوئی عمومی سفر نہیں تھا جو موسیٰؑ اپنی زندگی میں اکثر طے کرتے رہے ہوں، اس میں کوئی زاد راہ نہیں، مسلسل پاپیادہ، جنگلوں اور بیابانوں کا بے آرام سفر، جس کی اپنی وحشت ہی بہت بڑا بوجھ ہو گا۔ خضرؑ تو اس کے عادی تھے، مگر موسیٰؑ کے لئے مختلف تجربہ ہو گا اس لئے طاقت سے زیادہ بوجھ مان کر درخواست کر رہے ہیں کہ مجھے مشکل میں نہ ڈالیں۔

Marfat.com

اس بلیغ جواز کو خضرؑ نے بے چون وچرا قبول کر لیا اور ایک دفعہ پھر فَانْطَلَقَا یعنی نہ جانے کب تک اور کہاں تک رواں دواں ہوئے کہ: حَتّٰٓی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ: یعنی یہاں تک کہ انہیں ایک لڑکا ملا، پس اسے قتل کر دیا۔ لَقِیَا کے مفہوم کے تحت یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ لڑکا ان کے سامنے لا کر ڈال دیا گیا، جس کو دیکھتے یا پاتے ہی خضرؑ نے قتل کر دیا۔ یہ عمل بھی ہضم ہونے کے قابل نہیں تھا، اس لئے موسیٰ نے جھنجھلا کر آیت ۷۴ میں کہا: اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ط لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا: یعنی تم نے ناحق ایک نفس کو قتل کر دیا بلاشک تمہارا یہ فعل بھی بہت برا ہے۔ قتلِ عمد کسی شریعت میں پسندیدہ فعل نہیں اس لئے موسیٰؑ دنگ ہو کر اور پھر سے وعدہ کو بھلا کر، تنقیدی انداز میں پُرزور مذمت کر رہے ہیں۔ زَكِيَّةً کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ وہ لڑکا تنومند، جوان اور خوبرو ہو گا اور ایسے شخص کو بغیر کسی ظاہرہ وجہ کے قتل ہوتے دیکھنا دہشت کا باعث ہوتا ہے۔ خضرؑ آیت ۷۵ میں پہلے کہے گئے الفاظ دوہراتے ہیں: اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا: یعنی کیا میں نے نہ کہا تھا کہ آپ ہرگز استطاعت نہیں رکھتے کہ میرے ساتھ صبر کر سکیں۔ وہ پھر عندیہ دے رہے ہیں کہ عطائے علمِ لدنّی کا حاصل شریعتِ موسوی میں ناقابل فہم (Inapprehendable) ہے۔ لیکن آیت ۷۶ میں موسیٰؑ جواب کے لئے مختلف انداز اپنا رہے ہیں۔: اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا: یعنی اس کے بعد اگر کسی شے کی بابت سوال کروں تو آپ کی صحبت میں نہیں رہوں گا، تحقیق مکمل ہو گیا میری طرف سے عذر۔ موسیٰؑ واضح طور پر آخری موقع (Last chance) مانگ رہے ہیں اور عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ بھی حجت تمام کرنا چاہتے ہیں، اس لئے معذرت قبول کرتے ہوئے:

فَانْطَلَقَا: تیسری بار رواں دواں ہوئے اور آیت ۷۷ کے مطابق: حَتّٰٓی اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ اِۨسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ: یعنی جب وہ دونوں آئے

Marfat.com

ایک بستی والوں تک، تو ان سے کھانا مانگا، بستی والوں نے ان کی مہمانداری کو ناپسند کیا، پس پائی وہاں ایک دیوار جو گرنے کے قریب تھی، پس اسے تعمیر کر کے سیدھا کر دیا۔

لمبی مسافت کے بعد، بھوک پیاس کی شدت میں، کسی بستی والوں سے کچھ کھانے کو مانگا جائے اور وہ حقارت و نفرت سے دھتکار دیں، تو اس کے باوجود وہاں کسی بوسیدہ دیوار کی مرمت اور تعمیر نو میں مشغولیت، بظاہر عجب فعل تھا۔ بستی والوں کا ناپسندیدہ رویہ تو متقاضی تھا کہ ان سے بھلائی نہ کی جائے، مگر خضرؑ گرنے کے قریب ایک جِدَارًا کی مرمت میں مصروف ہو کر اسے اتنا استوار کر دیتے ہیں کہ وہ قائم و دائم نظر آنے لگتی ہے۔ یہاں بھی موسیٰؑ، منطقی طور پر کہہ اٹھتے ہیں: لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا: یعنی اگر تم چاہتے تو اس کام کی اجرت طلب کر سکتے تھے۔ گرتی دیوار کی مرمت اگر معاونت کے زمرہ میں آتی ہے تو یہ عمل وہاں زیب دیتا ہے جہاں سے کوئی خیر میسر آئی ہو، اس لئے یہ بھی مضبوط اور برحق دلیل تھی مگر خضرؑ مرعوب نہیں ہو رہے بلکہ آیت ۷۸ میں الٹ کہہ رہے ہیں: هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ: یعنی یہی فرق ہے، میرے اور آپ کے درمیان۔ اس کا یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ اس مقام سے ہم دونوں میں مفارقت ہو جائے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ رہے ہیں: سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا: یعنی جلد میں بتاؤں گا ہر اس فعل کی تاویل، جس پر صبر کرنے کی آپ میں استطاعت نہ تھی۔

اس واقعہ کے ذریعہ بنی نوع آدم کو چند اہم پیغامات دیے گئے ہیں۔ جو وحی کے راستے اور نبیٔ آخر الزمانؐ کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں۔ اولاد آدم کے طور پر ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان کو اچھی طرح سمجھیں اور اپنی انفرادی زندگیوں میں وہ تبدیلیاں لائیں جو پسند کی گئی ہیں۔ ان واقعات کو زینت قرآن بنانے میں اس کے علاوہ اور کیا حکمت کار فرما ہو سکتی ہے کہ ان میں پوشیدہ طور پر موجود بھید سمجھ کر ان سے

Marfat.com

اپنی زندگیوں کو منّور کر کے با معنی طور پر فعال بنایا جا سکے۔ ان ہی ممکنہ اسرار میں سے چند تک ذہنی رسائی میں، بحمد للہ، مجھے (محمد اویس افضل کو) بھی کامیابی ہوئی ہے۔ ان ہی کا اظہار حتی المقدور شروع کیا گیا ہے اور انشاء اللہ، مضمون کی روانی میں، ایسے ہی کچھ مزید نکات بیان میں آئیں گے، جن پر تفصیلی بحث مناسب ہو گی۔

i: حاملِ شریعت ہونے کے باوجود موسیٰ کیوں کسی کی اتباع کرنا چاہتے ہیں؟ بلا شک یہ درخواست موسیٰؑ خود کر رہے ہیں، خضرؑ راغب کرنے کی کوئی سعی نہیں کر رہے، بلکہ مانع ہیں کہ اپنا ارادہ ترک فرما دیں۔ دراصل کلیم اللہؑ حاملِ کردارِ تجسّس ہونے کی وجہ سے ہر معاملہ کی انتہا تک جا کر اس کا کھوج لگانے والے ہیں، یہاں تک کہ یا تو وہ ان پر واضح ہو جائے یا محسوس کر لیں کہ اس کی رسائی ان کے لئے ناممکن ہے۔ ایسا شوق خاص عنایتِ الٰہی کا حصہ ہوتا ہے، جو موسیٰؑ کو بدرجہ اتم عطا کیا گیا تھا اور یہی تجسّس ان کے سفر اور بعد میں خضرؑ کی اچھوتی ذات سے ملاقات، علم لدنّی تک رسائی کی کوشش اور اتباع کی خواہش کا باعث ہوتا ہے۔

ii: خضرؑ کیونکر جانتے ہیں کہ موسیٰ صبر نہ کر سکیں گے؟ چونکہ خضرؑ کو مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا سے سرفراز کیا گیا تھا، اس لئے اولاً ان کو اپنی بصیرت سے یہ سمجھنا مشکل کام نہ تھا کہ تجسّسِ موسیٰ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا اور دوسرے ان کی دلیل یعنی کَیۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰی مَا لَمۡ تُحِطۡ بِهٖ خُبۡرًا بہت مضبوط بھی ہے اور پُر یقین بھی۔ ایسی دلیل دے ہی وہی سکتا ہے جسے عین علم میں سے عطا کیا گیا ہو۔ حقیقت ہے جہاں تک علم کی رسائی نہ ہو وہاں احاطہ ناممکن ہوتا ہے اور جب گرفت اور قابو نہ رہے تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانا منطقی نتیجہ ہے۔ انبیاء کو وحی کے ذریعہ جو کچھ ارسال ہوتا ہے وہ مجملہ احکاماتِ اوامر و نہی ہوتے ہیں جس سے اس مخصوص دور کے لوگوں کو زندگی گزارنے کا طریق بتایا جاتا ہے۔ ان احکامات کی

Marfat.com

مکمل تفہیم، عین الیقین کی حد تک نبیؑ کو کروائی جاتی ہے، لیکن ان کی وجوہ (Reasons/causes) ہر نبی کو نہیں بتائی جاتیں۔ مثال کے طور پر فجر کی نماز میں دو فرض مقرر ہونا، نبیؑ کو حق الیقین تک معلوم ہو گا، لیکن دو کی بجائے چار کیوں نہیں یا مغرب کے وقت تین فرض کیوں؟ یہ لازماً ہر نبیؑ نہیں جانتا۔ قدرت کاملہ نے اپنی حکمت کے تحت، اس کے لئے رسالت و نبوت سے الگ، مگر ہمیشہ اسی سے پیوستہ و منسلک، شعبۂ ولایت مقرر کیا ہے جو عملی طور پر نبیؑ وقت کے تابع ہوتا ہے۔ نبی اللہ کے ذمہ احکاماتِ خداوندی کی تبلیغ ہوتی ہے، جبکہ ولی ان کی تشریح کرنے والا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ولیؑ کامل ہر 'کیوں؟(Why)' کا جواب اور اس جواب کی وجہ بھی جاننے والا ہوتا ہے، خضرؑ، انہی اولیاء اللہ میں شامل ہیں۔ اس مقام پر درجہ اور شعبۂ رسالت و نبوت کے اظہار (Projection) کے ساتھ درجہ و شعبۂ ولایت کو متعارف (Introduce) کروایا جارہا ہے، یعنی یا تو نبی اللہ کی وساطت سے ولی اللہ کا تعارف کروانا مقصود ہے، یا پھر نبیؑ کو وقت کے ولیؓ کے سامنے لاکر دونوں کی مستند حیثیت نمایاں کی گئی ہے۔ دونوں صورتوں میں نبی اللہ، ولی کے ظاہری احوال سے بھی ناواقف معلوم ہوتے ہیں، جبکہ ولی اللہ، نبیؑ کے باطنی حال سے بھی مکمل طور پر آشنا ہے۔

iii: جس کشتی میں خضرؑ توڑ پھوڑ کرتے ہیں وہ واقعتاً کیوں نہ ڈوب گئی؟ متذکرہ کشتی میں موسیٰؑ اور خضرؑ، کم از کم دو کامل و بالغ افراد ضرور سوار تھے اور نقص کے بعد احتمال ہونا چاہیے تھا کہ وہ ڈوب جاتی۔ چونکہ ایسا نہیں ہوا اس لئے ممکن ہے منزل پر اترنے کے بعد نقصان پہنچایا ہو یا سوراخ اتنا چھوٹا کیا ہو یا اس کے پیندے کی بجائے بالائی حصہ کو توڑا ہو کہ وہ بخیریت کنارے لگ گئی ہو۔ بہر حال میں کشتی کے مالک کی بجائے موسیٰؑ اعتراض کر رہے ہیں۔ ایک ممکنہ تاویل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دراصل یہ واقعاتی (Narrative) انداز نہ ہو بلکہ تمثیلی (Symbolic) رنگ ہو یعنی ظاہر میں جو کچھ کہا جارہا ہے، عملی طور پر اس شکل میں سرزد ہی نہ ہوا ہو، بلکہ مماثلت کی بنیاد پر بیان کیا گیا ہو۔ اس صورت

Marfat.com

میں تلاش کرنا پڑے گا کہ کشتی کس چیز کا اظہار (Denotation) ہے۔ عموماً کشتی پانی پر سواری کے کام آتی ہے، صحراؤں، میدانوں اور پہاڑوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کائنات میں پانی کی اتھاہ گہرائی، آفاقی تسلسل اور روانی جیسی خوبیوں کی بنیاد پر ہر کوئی اسے اپنی ہمت سے عبور نہیں کر سکتا اس کے لئے کشتی کی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ وہ اپنے آپ کو پانی کی سطح پر قائم رکھ سکتی ہے اور تھوڑی محنت کے ساتھ سفر باآسانی طے کروا دیتی ہے۔ پانی یعنی کردارِ ولایت کی گہرائی، تسلسل اور قوت کو سہنے کے لئے جس سبب کی ضرورت ہوتی ہے، اسے مربّی، مرشد یا راہبر کہتے ہیں اور قرآن میں اسے ہی کشتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر خضرؑ وقتی طور پر کردارِ ولایت میں ردوبدل کر رہے ہیں تو اس میں الگ حکمت ہوگی، ڈوبنے سے اس کا تعلق ہی نہ ہوگا۔

۱۷: مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا میں کس مشکل کی طرف اشارہ ہے؟ ایک کشتی میں سوراخ ہو جانا کسی بھی طرح طاقت سے زیادہ بوجھ کا باعث نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے یہ کوئی عامیانہ عمل نہیں ہوا بلکہ تمثیلی انداز میں انوکھا اشارہ ہے، جس کے لئے نبی اللہ اپنی استطاعت کو چھوٹا مان رہے ہیں۔ کشتی اس ہادی و راہبر کی مانند ہے، جس کے کندھوں پر سوار ہو کر سالک دریائے ولایت کو عبور کرتے ہوئے اس کے رازوں سے بھی واقف ہو جاتا ہے اور اس کی گہرائی میں ڈوبنے سے بھی بچ جاتا ہے۔ خضرؑ نے موسیٰؑ کو جس سفینہ میں رکب کروایا وہ ایک کشتی بھی ہو سکتی ہے مگر چونکہ اصل مراد بحرِ ولایت کی سیر تھی اس لئے نبوت کو علمِ لدنّی کے دوش پر سوار کر لیا۔ دورانِ سفر طے کروانے والے سبب یعنی اپنی ذات میں توڑ پھوڑ کا عمل اس انداز سے کیا کہ موسیٰؑ کو بھلا محسوس نہیں ہوا، اس مشاہدہ سے ان کے دل میں جو گھٹن کا احساس ہوا، اس کی وجہ سے کہہ رہے ہیں کہ مجھ پر میری استطاعت و ہمت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ ولی کامل ہونے کے ناطے خضرؑ جانتے ہیں کہ بنیادی اہمیت، بحرِ ولایت کی ہے، سیر کروانے والے اسباب اس کے مقابلہ میں رائی کے دانہ برابر ہیں اس لئے ان میں ردوبدل ہو بھی جائے تو کم از کم ان کے

Marfat.com

لئے بے معنی ہے۔ لیکن شریعتِ موسوی میں اسباب کی اہمیت منفی نہیں ہو سکتی اس لئے خوف کا اظہار اس شکل میں کیا کہ یہ میری استطاعت سے بعید ہے کہ ایسا نظارہ کر کے اپنے آپ کو مربوط رکھ سکوں۔

v: جس غُلٰمًا کو خضرؑ قتل کرتے ہیں، کیا دورانِ سفر ان کے سامنے آنے والا وہ اکیلا اور پہلا شخص تھا؟ غلم مصدر میں نفسانی خواہشات کی بھرمار اور جذبات کا تلاطم پایا جاتا ہے، اس لئے غلام اس نوجوان کو کہا جاتا ہے جو بالغ (Mature) ہو چکا ہو، اور غلبۂ شہوت سے متعارف ہو۔ یہ ایک ایسا امتحان ہے جس میں کامیابی کی علت نصرت و تائید ایزدی ہے وگرنہ اس جذبہ کا زور بڑے بڑوں کو مغلوب کر لیتا ہے۔ اسی طرح لقاء میں آمنے سامنے ہونے کے علاوہ بصیرت سے ادراک کرنا، یا دل میں کسی خیال کا براہِ راست اترنا بھی پایا جاتا ہے۔ غلام بمعنی لڑکا، بصیرت اور خیال دونوں سے متعلق نہیں ہو سکتا اس لئے اغلب ہے کہ غُلٰمًا بھی یہاں جنسی جذبہ کی بھرمار کی تمثیل کے طور پر استعمال ہوا ہو، جو نہ غیر معمولی ہے نہ غیر فطری، بلکہ عام زندگی میں ہر کوئی اس سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ قتل سے مراد جہاں کسی آلہ کی ضرب یا زہر سے جان لینا ہے، وہاں ذلیل و حقیر کرنا، مغلوب ہونا، حتیٰ کہ سوچ کا دھارا بدلنا بھی ہوتا ہے، کیونکہ اس میں بھی حالت کی تبدیلی نمایاں ہے۔ سو جن بھی معنوں میں وہ غلبہ ان دونوں یا کسی ایک پر القاء ہوا، خضرؑ نے نہایت سرعت کے ساتھ اس کو مغلوب کر کے اس کی حالت ایسے بدل دی جیسے قتل کے عام مفہوم میں، زندگی موت سے بدل جاتی ہے۔

vi: وہ کون سی جِدَارًا (دیوار) ہے جو ارادہ (یُّرِیْدُ) کرتی ہے؟ جدار عموماً اونچی دیوار کو کہتے ہیں جو روک اور ڈھال کا کام کر کے تحفظ اور اوٹ کے معنی دیتی ہے۔ دیوار، اینٹ یا پتھر کے ٹکڑوں کو ایک خاص ترکیب سے جوڑ کر سیدھی کھڑی کی جاتی ہے اور اونچائی کی وجہ سے دیوار پھلانگ کر پار جانا آسان کام نہیں ہوتا۔ ویسے جدر میں لیاقت اور قابلیت بھی پائی جاتی ہے اور اسی طرح وجد کا مفہوم پا

Marfat.com

لینے کے علاوہ، کسی چیز کا علم ہونا اور جاننا بھی ہے۔ واقعہ کے مطابق، فقراء نمایہ دونوں مسافر ایک بستی میں آئے اور میزبانی کے متمنی ہوئے، بستی والوں نے دھتکار کر نکال دیا اور جب وہ بستی سے باہر آئے تو انہوں نے ایک قد آور، معزز شخصیت کو پایا، جو اسی بستی کا باشندہ ہوگا مگر سوچ کے لحاظ سے ان سے مختلف تھا۔ بستی والوں کے ناروا سلوک اور اخلاق سے گری حرکتوں سے اپنے اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ محسوس کر رہا تھا۔ ان دو اصحاب سے ہونے والے سلوک کو دیکھ کر اور بھی دل برداشتہ ہوا ہوگا اور تب ارادہ (یُّرِیۡدُ) کرتا ہوگا کہ اس بستی کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے یا پھر زندگی سے ہی منہ موڑ لے۔ خضرؑ کی نگاہ اس کی باطنی کیفیت پر پڑی، یہ احساس کرتے ہوئے کہ قلبی طور پر عمدہ و نیک خصلت کا مالک ہے، مگر زمانہ کے تھپیڑوں سے گھبرا کر انتہائی اقدام کا ارادہ رکھتا ہے، خضرؑ نے اُسے سمجھانے اور قائم کرنے کے لئے دلائل و براہین استعمال کئے اور حقائق کے علم سے اسے باطنی پختگی عطا کی۔ نتیجتاً وہ شخص جو زندگی سے بیزار ہو کر ارادہ کر چکا تھا کہ خود کو اجل کے حوالہ کر دے، قائم ہو گیا۔ موسیٰؑ کو اس پر یہی اعتراض ہوا کہ ہونے کو وہ شخص اسی بستی والوں میں سے تھا، جب انہوں نے برا سلوک کیا تو اس ایک شخص سے اچھائی کرنے کی کیا ضرورت تھی، اور اگر نیکی کرنا ہی تھی تو اس شخص کو پابند کیا جانا چاہیے تھا کہ بشکلِ اجرت کچھ کھانے پینے کو دیتا۔

vii: بستی والوں نے جِدَارًا (دیوار) کی تعمیرِ نو کی اجازت اور اسباب کیونکر مہیا کئے؟ دراصل خضرؑ نے کسی اینٹ اور پتھر کی دیوار کی مرمت نہیں کی تھی بلکہ ایک معزز، صاحبِ حیثیت اور قد آور شخصیت کو باطنی طور پر مسمار ہونے سے بچایا تھا۔ ایسے ہی شخص کو جِدَارًا (دیوار) سے تعبیر کیا گیا اور ارادہ اسی سے منسوب کیا جا رہا ہے۔ اس عمل میں ظاہرہ اسباب اصل میں استعمال ہی نہیں ہوئے، کہ بستی والوں سے اجازت و اسباب مانگنے کی ضرورت پیش آتی۔ باطنی طور پر شکستہ لوگ، علم لدّنی کے دلائل و براہین سمجھ کر تنومند، توانا اور مستقیم الحال ہو جاتے ہیں!

Marfat.com

اشکال کے ان ممکنہ جوابات کے بعد خضر کی دی ہوئی تاویلیں سمجھنا آسان ہو گا، جنہیں من و عن درج ذیل کیا جاتا ہے۔

i: آیت ۷۹ :اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا: یعنی وہ کشتی مساکین کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے پس میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں اور ان سے پرے ایک حاکم تھا جو ہر کشتی زبردستی چھین لیتا ہے۔

ii: آیات ۸۰/۸۱: اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا: یعنی اس لڑکے کے ماں اور باپ مومن تھے پس ہمیں خوف ہوا کہ وہ انہیں سرکشی اور کفر کی طرف مائل نہ کر دے، سو ہم نے ارادہ کیا کہ رب کے فضل سے دونوں کو اس کا بدل دیا جائے جو اس سے بہتر، پاکیزہ اور نسبت میں قریب ہو۔

iii: آیت ۸۲ : وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا: یعنی وہ دیوار دو یتیموں کی تھی جو شہر میں رہتے تھے، اس کے نیچے ان کے لئے خزانہ تھا اور ان کا باپ صالح آدمی تھا، پس آپ کے رب نے ارادہ کیا کہ وہ دونوں اپنی ہوش مندی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔

یہ تینوں تاویلیں بیان کر کے خضر اضافی طور پر کہہ رہے ہیں: رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا: یعنی یہ سب آپ کے رب کی رحمت ہے اور میں نے کچھ بھی اپنی مرضی سے نہ کیا، یہی تاویل ہے اس کی جس پر آپ صبر نہ کر سکے۔ بالا تاویلیں ظاہرہ طور پر اتنی قوی اور مدلل محسوس نہیں ہو رہیں کہ عقلی تشفی کا باعث بن سکیں۔ کشتی توڑنے کا جواز کہ کوئی ظالم

Marfat.com

حاکم اسے چھین سکتا تھا، کسی طرح تسلی نہیں کروا سکتا کہ وہ حاکم ٹوٹی کشتی بھی چھین کر، اسے مرمت کروا کر اپنے استعمال میں نہ لے آئے گا۔ دوسرے خضرؑ اس مَلِكٌ کی بھی کوئی پہچان نہیں کروا رہے کہ وہ کون تھا؟ وگرنہ تاریخی حقائق کی بنیاد پر ثابت ہونے کا امکان ہوتا کہ واقعتاً ایسا ہوا تھا۔ لیکن موسیٰؑ ایسے پُر تجسّس نبی اس جواز کو بظاہر قبول کر رہے ہیں کیونکہ مزید تنقید نہیں فرما رہے۔ الْغُلٰمُ کے قتل کا جواز یہ دیا کہ اس کے ماں باپ مومن تھے، ہمیں خوف ہوا کہ اس کی وجہ سے وہ سرکشی کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ یہ کوئی مصدق دعویٰ نہیں بلکہ خوف (فَخَشِيْنَآ) کے انداز میں کہہ رہے ہیں، جس میں یقین نہیں ہوتا۔ بے یقینی میں ایک شخص کا قتل کسی طرح قابلِ ستائش نہیں۔ یہاں بھی ماں باپ کا تعارف مفقود ہے کہ يُّبْدِلَهُمَا (ممکنہ بدل) کی خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا کے طور پر تصدیق ہو سکتی۔ اس مبہم جواز پر بھی موسیٰؑ کے تجسّس سے لبریز کردار میں ہلچل نہیں ہوئی۔ قتل ہوتا دیکھ کر انہوں نے تنقید کی تھی، مگر تاویل سن کر خاموش رہتے ہیں۔ تعمیرِ دیوار کا جواز ایک خزانہ بتاتے ہیں کہ وہ دو یتیم بچوں کا تھا جن کا باپ صالح شخص تھا۔ دیوار گرنے پر خزانہ عیاں ہونے اور کسی 'نا اہل' کے قبضہ میں چلے جانے کا احتمال تھا، اس لئے خضرؑ نے اس کو نئے سرے سے تعمیر کر دیا۔ مگر قرآن میں یہ ثابت نہیں ہو رہا کہ وہ دونوں یتیم سنِ بلوغت کو پہنچے اور اپنا خزانہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ بہر حال موسیٰؑ اب بھی خاموش رہتے ہیں۔

تینوں تاویلات سن کر موسیٰؑ نے کوئی تنقید نہیں کی، جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پیش کئے گئے جواز بہت ٹھوس، بامعنی اور قابلِ اعتماد ہونگے۔ مگر ان کے حقیقی معنی صرف تمثیلی انداز میں ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس نظر سے ہر تاویل کی ممکنہ تشریح، بشرطِ زندگی و بفضلِ تعالیٰ، جلد مرتّب کی جائے گی۔

Marfat.com

۳۹۔ رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ اور رحمت

سورۃ الزمر آیت ۵۳: لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ: یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس و ناامید نہ ہو یا خود کو اللہ کی رحمت سے قطع نہ کرو۔ 'قنط' کے مفہوم میں روکنا اور اس بنیاد پر مایوسی پائی جاتی ہے۔ عموماً یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مخصوص ناامیدی اور رکاوٹ کی طرف اشارہ کرتا ہے جبکہ عمومی ناامیدی 'یئس' کے لفظ میں پائی جاتی ہے۔ ایسی مایوسی و ناامیدی جس کا سبب روکنا، رکنا یا رکاوٹ ہو اس کے لیے بالخصوص لفظ 'قنط' استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ متذکرہ آیت میں اسی مادہ سے کام لیا گیا ہے اس لئے یہاں محض عمومی ناامیدی مراد نہیں۔ اصل مفہوم یہ ہوا کہ 'اے گروہ جن وانس' جب تم اللہ کی رحمت سے روکے جاتے ہو، کوئی رکاوٹ تمہیں رحمت الٰہی تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہے یا تم خود اپنے تئیں اللہ کی رحمت سے رُکے (منقطع) رہتے ہو تو مایوسی اور ناامیدی اس کا فطری نتیجہ ہے۔ اور ایسی مایوسی چونکہ تمہاری خود پیدا کردہ ہے اس لیے تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم خود ہی اس کا حل بھی تلاش کرو تاکہ تمہیں اس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آیت اس بات کی ترغیب دے رہی ہے کہ رحمت الٰہی سے کبھی بھی اپنے آپ کو روکے نہ رکھو، یا رحمت الٰہی سے کبھی بھی منقطع نہ ہو، کیونکہ اس طرح مایوسی اور ناامیدی منطقی نتیجہ کے طور پر تم پر وارد ہو جاتی ہے۔ غور طلب ہے کہ ذات الٰہی سے انقطاع و رکاوٹ کی طرف اشارہ نہیں بلکہ واضح حکم ہے کہ رحمت الٰہی سے ناامید نہ ہونا۔ جیسے ذات باری اور صفات باری تعالیٰ ایک دوسرے سے جدا، دو مختلف اصناف ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح صفی اللہؑ، خلیل اللہؑ، کلیم اللہؑ، خلیفۃ اللہؑ، روح اللہؑ اور حبیب اللہؐ ذات باری تعالیٰ سے جدا ہیں۔ ان سب کی اپنی اپنی مستند اور جدا گانہ حیثیت ہے، کسی ایک کا کسی دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے اللہ اور اللہ کا خلیل جدا جدا دو حیثیتیں ہیں، اسی طرح اللہ اور اللہ کی رحمت بھی دو الگ ذوات ہوں گی اور ہمیں تلاش کرنا ہے کہ اللہ

Marfat.com

کی رحمت کیا ہے؟ اللہ کی رحمت، اللہ کی ذات نہیں ہو سکتی مگر یقیناً اللہ (کی ذات) کی مقرر کردہ کوئی ہستی ہو گی جسے اس نے یا تو اپنی تمام رحمت تفویض کی ہو گی یا پھر بجز اُس کے رحمتِ الٰہی کا اظہار اور کسی سے ممکن نہ ہو گا!

علی الہجویریؒ سمیت تمام اصفیاء و اولیاء اللہ اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ ذاتِ توحید سے کسی فعل کا سرزد ہونا عبث ہے، کیونکہ فعل کرنے کے لئے لازم ہے کہ فاعل، آلاتِ فعل رکھتا ہو، علاوہ ازیں فعل کرنے میں ہمیشہ قوت صرف ہوتی ہے، جو دراصل زیاں کی نشاندہی ہے۔ ذات واجب الوجود میں کمی بیشی کا تصور بھی کفر ہے۔ مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ رحمت ایک باضابطہ فعل ہے جس سے کُل کائنات کا قرار وابسطہ ہے اور اس فعل کو ہر لحہ کار فرما رہنا ہے، تاکہ کائنات برقرار رہے۔ چونکہ ذاتِ الٰہی کسی طرح فاعل نہیں، اور چونکہ کائنات ازل سے بدستور و برقرار ہے اور یہ قرار، فعلِ رحمت ہی کی وجہ سے ہے اس لیے ماننا پڑے گا فعلِ رحمت، مخلوق میں سے کسی کو تفویض ہے۔ سورۃُ الانبیاء آیت ۱۰۷ میں فرمایا جارہاہے: وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ: یعنی ہم نے آپؐ کو دو جہانوں کی رحمت مقرر کر کے مبعوث فرمایا ہے۔ رحمت بقا چاہتی ہے جبکہ اس کی ضد زحمت فنا کی متقاضی ہے۔ اس نصِ قرآن سے ہماری بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ کُل کائنات کا قرار اور بقا اس رحمت سے وابسطہ ہے جو ذات باری کی طرف سے ارسال شدہ ہے۔ تمام مفسّرین حضرات کا اس آیت کے بارے میں اتفاق ہے کہ یہ حضورِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں ہے، جن کی ذات کو اللہ نے اپنی رحمت تفویض کی ہے۔

سورۃُ انعام آیات ۱۲ اور ۵۴ میں بالترتیب ارشاد ہے: كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ :اور: كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ : جس کا مجموعی مفہوم یہ بنتا ہے کہ تمہارے ربّ نے اپنے نفس کے ذمہ رحمت مقرر کر دی ہے۔ ذاتِ الٰہی نے ذاتِ مصطفویؐ کو رحمت بنا کر بھیجا اور رحمتِ دو عالمؐ نے رحمتِ کُلی کو فقط اپنے

Marfat.com

نفس کے لیے مخصوص کر دیا۔ سورۃ آل عمران آیت ۶۱، آیتِ مباہلہ کے طور پر زبان زدِ خاص و عام ہے: فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ: یعنی علم میسر آ جانے کے بعد جو کوئی بھی آپ سے معارضہ کرتا ہے تو آپؐ فرما دیں کہ ہم اپنے بیٹوں، گھر کی خواتین اور نفوس کو بلاتے ہیں اور تم لوگ اپنے بیٹوں، عورتوں اور نفوس کو بلاؤ، پھر مباہلہ ہو گا اور جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہو گی۔ محمد الرّسول اللہؐ نجران کے عیسائیوں سے مباہلہ کے وقت علیؑ کو پیش کر کے ثابت کرتے ہیں کہ وہ نفسِ رسول ہیں۔ جب رسولؐ نے رحمتِ کُلی اپنے نفس کے سپرد کر دی تو واضح ہو گیا کہ اب اللہ کی رحمت صرف علیؑ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہیں اس رحمت میں سے عطا کریں! اگر ہم کردارِ علویؑ سے دور ہو کر اس سے منقطع ہو جائیں تو یہ مایوسی اور نااُمیدی کا باعث ہو گا۔ آج بھی جو لوگ اپنے آپ کو کردارِ علوی سے منسلک رکھتے ہیں، وہ سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۷ کی تصویر ہیں: اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ: یعنی وہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے رحمت اور برکات ہوتی ہیں اور وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ سلمان الفارسیؓ، ابو ذر غفاریؓ، بلال حبشیؓ، مقداد بن الاسودؓ، عمار بن یاسرؓ، حبیب العجمیؒ، معروف کرخیؒ، جنید البغدادیؒ، ابو الحسن الخلقانیؒ، علی الہجویریؒ، غوث الاعظمؒ، معین الدین چشتیؒ، قطب الدین بختیار کاکیؒ اور سلطان باہوؒ جیسی ہستیاں محبتِ علوی میں سرشار ہو کر رحمتِ خداوندی سے سیراب ہوئے اور ان کے نام و نشان صدیاں گزرنے کے بعد بھی زندہ ہیں اور قیامت تک بھی موجود رہیں گے، اسی طرح سید غلام علی شاہؒ، سید غلام محمدؒ، بابا سائیں حسن الدینؒ اور حافظ سائیں محمد اقبالؒ اسی رحمت کے منبع سے لبریز، موجودہ زمانہ میں وہی تاثیر لئے ہمارے درمیان رہے ہیں۔ سورۃ الاعراف آیت ۵۶ میں آتا ہے: اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ: یعنی یاد رکھو اللہ کی رحمت ہمیشہ محسنوں کے قریب ہوا کرتی

Marfat.com

ہے۔ کردارِ علوی اپنانے اور زندگی بھر اُسے نبھانے والوں کو قرآن محسن تسلیم کرتا ہے اور عندیہ دیتا ہے کہ وہ ہر زمانے میں رحمت اپنے جلو میں لیے پھریں گے۔

حضورؐ کی ایک حدیث ہے: اِخْتِلَافُ اُمَّتِی رَحْمَةٌ: یعنی امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اس کے ترجمہ اور تشریح میں سطحی سوچ کے حامل محدثین کو مغالطہ ہوا ہے اور انہوں نے سادہ لوح لوگوں کو اس سے گمراہ کر کے اپنے مسالک کے لیے حجت بنا لیا ہے۔ دراصل اس حدیث میں مختلف جماعتوں، مسلکوں اور ظاہری علماء کے اختلاف کی بات نہیں کی گئی ہے۔ سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ آیت ۱۹ کے مطابق اللہ کے نزدیک دین، اسلام ہی ہے۔ غور کریں کہ دینِ اسلام میں اختلاف کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ کسی بھی مسلک والے سے پوچھیں کہ تمہارا دین کیا ہے؟ کہے گا اسلام، پوچھیں یہ کس کی وساطت سے تمہارے پاس پہنچا؟ لا محالہ کہے گا محمدؐ رسول اللہ کی وساطت سے۔ دینِ اسلام میں سنّی اور شیعہ دو بنیادی مذاہب ہیں۔ مذہب وہ راستہ ہوتا ہے جو دین (منزل) تک لے جائے، راستے الگ الگ ہو سکتے ہیں مگر منزل تو ایک ہی ہوتی ہے اور وہ دینِ اسلام ہے۔ اگر تمام مسلمان ایک وصیؑ رسولؐ اور ایک امامؑ برحق پر متفق ہو جاتے تو راستہ بھی ایک ہی رہتا اور منزل بھی دینِ اسلام ہی ہوتی۔ دین میں کسی کو اختلاف نہیں ہوا کرتا، دین سے بنتی ہے قوم اور مذہب سے بنتا ہے فرقہ، جب کہ مذہب بنتا ہے امام سے اور دین بنتا ہے نبی سے۔ اس سے ثابت ہوا ہم قوم تو ایک ہیں مگر مذاہب اور فرقے الگ الگ ہیں، اسی لیے حضور نے ایک اور جگہ فرمایا میری امت میں بہتر یا تہتر فرقے ہونگے یہ نہ فرمایا اتنی قومیں ہونگی۔ شہنشاہِ ولائتؑ نے بالا حدیث کی تاویل میں فرمایا ہے کہ امت کا اختلاف اگر باعثِ رحمت ہے تو کیا اتفاق کو عذاب مانیں گے؟ دراصل، لفظ اختلاف کا مادہ خلف ہے، جس کے معنی ہیں کسی کے پیچھے یا بعد میں آنا، اسی لئے باپ کا بیٹا اس کا خلف کہلاتا ہے اور خلیفہ بھی اسی سے نکلا ہے۔ سورۂ یونس آیت ۶ میں ہے: اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ: یعنی اللہ کی پہچان رات اور دن کے اختلاف سے کرو، تو کیا یہاں یہ مراد لی جائے کہ رات اور دن کوئی جھگڑا کرتے ہیں، نہیں اصل میں ان کا ایک دوسرے

Marfat.com

کے بعد متواتر آنا اختلاف ہے۔ اسی طرح حضورؐ کی مراد بھی یہی ہے کہ میری امت کا یکے بعد دیگرے آنا رحمت ہے! رحمت، غضب کی ضد ہے۔ غضب فنا چاہتا ہے، جبکہ رحمت بقا چاہتی ہے۔ رحمت سے شے کا وجود برقرار ہوگا اور غضب فنائے اشیاء کا موجب ہے۔ حضورؐ کو رحمت اللعالمین فرمانے میں یہی حکمت ہے کہ کُل کائنات یہ جان لے کہ وجودِ عالمین آپؐ ہی کی وجہ سے ہے۔ حضورؐ رحمت ہیں اور رحمت کے اجزا، آلِ رسول ہیں۔ آل اس کو کہتے ہیں کہ جب رجوع کرے تو اسی مرکز کا جزو بنے جہاں سے نکلا تھا۔ آلِ محمدؐ اجزائے محمدؐ ہی ہیں اور اجزائے رحمت بھی ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں رحمت کے معنی بتائے ہیں: اَلرَّحْمَةُ حَلُّ الْمُشْكِلَاتِ وَالْحَاجَاتِ یعنی مشکلوں کا حل ہونا اور حاجات کا پورا ہونا رحمت ہے۔ وگرنہ بارانِ رحمت، ٹھنڈی ہوا رحمت، ٹھنڈا پانی رحمت، حقیقی مفہوم نہیں۔ بنی نوعِ آدم کو سکون و اطمینان تب ہی میسر آتا ہے اگر اس کی تکالیف ومشکلات حل ہو جائیں اور اس کی حاجات پوری ہو جائیں۔ اس اصول کے تحت، جو بھی رحمت بنے گا وہ مشکل کشا بھی ہوگا، حاجت روا بھی۔ اب جہاں کہیں بھی مشکل کشائی اور حاجت روائی میسر آئے وہ رحمت اللعالمین یعنی محمدؐ و آلِ محمدؐ ہو گا!

۴۰۔ رسولِ عزیز و حریص

سورۃ التوبہ آیت ۱۲۸: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: یعنی تحقیق تمہاری طرف رسولؐ تشریف لائے جو تمہارے نفوس میں سے ہیں، انہیں تمہاری تکالیف بڑی شاق گزرتی ہیں، وہ تمہارے لیے بہت کچھ چاہتے ہیں اور مومنین کے لیے رؤف و رحیم ہیں۔ چند تشریح طلب الفاظ مندرج بیان کئے گئے ہیں۔

جَآءَ: آنا یا بھیجنا دونوں مفہوم نکلتے ہیں۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی سا رہتا ہے۔

Marfat.com

عَزِیزٌ:۔ اس کے عام معنی پسندیدہ، دل پسند، اچھا، قوی، مضبوط وغیرہ ہیں۔ یہ اسمائے باری تعالیٰ میں سے ایک اسم ہے اور قرآن میں اسماء الحسنیٰ کے طور پر بھی بیان ہوا ہے۔ اس کا مفہوم اس شے یا شخص سے واضح ہو سکتا ہے جو خود اپنے آپ میں قائم ہو اور بیرونی اثرات اور دباؤ سے اپنی حالت نہ بدلے یعنی اتنی شدّت اور مضبوطی سے اپنی ذات میں قائم ہو، کہ خارجی اثرات اس میں ذرّہ برابر فرق نہ ڈال سکیں۔ ایسی شخصیت رکھنے والا وجود ہمیشہ غالب رہتا ہے، کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے عزیز ایک ایسے کُشن (Cushion) یا شاک ابزاربر (Shock Absorber) کی مانند ہو گا، جس پر جتنا بھی مرضی بوجھ اور تکلیف اور دکھ وغیرہ ڈال دیا جائے، تو اوّل تو اس کی اپنی ساخت اور حالت میں فرق نہ آئے، اور دوسرے اپنے ارد گرد والوں کو بھی مکمل محفوظ رکھے۔

حَرِیْصٌ:۔ عمومی طور پر اس لفظ کے معنی لالچی کیے جاتے ہیں اور بالکثرت اس لفظ کا استعمال ایک جانور کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ یہ قطعی طور پر غلط ہے۔ اس لفظ کے بنیادی مادہ میں اجتماعی شکل کا مثبت پہلو مضمر ہے جب کہ اس مخصوص جانور کی صفت لالچ، منفی اور انفرادی عمل ہوتا ہے۔ اس لفظ کی حقیقی وسعت اور پھر قرآنِ کریم میں حضورؐ کی ذات سے اس کی نسبت کی بنیاد پر، بغض رکھنے والوں نے قلم کے زور سے ایسا مفہوم اس سے منسلک کر دیا جو دراصل شانِ رسالتمآبؐ کو داغدار کرنے کی ایک مذموم کوشش تھی۔ حریص کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ عرب کے بے آب و گیاہ ریگستانوں میں ایک ماں اپنے معصوم اور ننھے بیٹے کے ساتھ چھوڑ دی گئی۔ شدت پیاس سے جب بیٹا پریشان ہوا، تو پانی کی تلاش میں، بی بی حاجرہؓ نے صفا اور مروہ کی پہاڑیوں میں سات چکر اس تیزی سے لگائے کہ کوئی صحت مند نوجوان بھی ایسا کرنے سے قاصر ہو۔ اُس ماں کو اپنی ذات کی پرواہ بھی نہ تھی، بلکہ وہ فقط بیٹے کو ایک گھونٹ پانی پلانے کی متمنّی تھی۔ ماں کی وہ سعی، حرص ہے اور اتنی پسندیدۂ خداوندی ہوئی کہ مناسک حج میں لازم طور پر مقرر کر دی گئی

Marfat.com

اور اسی کی نسبت سے صفا و مروہ کو شعائر اللہ کہا گیا۔ سو اپنی ذات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، اور صلہ کی تمنا کے بغیر، کسی دوسرے کے لیے بہتری کی کوشش، حرص کہلاتی ہے اور ایسی صفت کا حامل حریص کہلاتا ہے۔ یقیناً یہ انبیاء و مرسلین و مقربین الٰہی کی صفت ہے۔

رَءُوْفٌ اس ذات کو کہتے ہیں جو منفی اثرات کی حامل باتوں کو دور کرنے کا سامان کرے اور رَّحِیْمٌ اس ذات کو کہتے ہیں جو مثبت اثرات کی حامل باتوں کا از سرِ خود سامان کرے۔

قرآن فرما رہا ہے کہ بلاشک ہم نے تمہارے نفوس میں سے ایک رسول تمہاری طرف بھیجا ہے۔ یعنی وہ رسول کریمؐ جو تمہاری طرف آئے ہیں یا بھیجے گئے ہیں وہ تمہارے نفوس ہی میں سے آئے ہیں، کسی دوسری جنس سے انہیں مبعوث نہیں کیا گیا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ تم میں سے ہی ایک کو رسول بنا کر تمہاری طرف بھیج دیا گیا۔ اگر تم تمام نفوس آدم زاد ہو تو وہ بھی بشکل آدم تشریف لائے، صرف اتنا فرق ہے کہ تم پر وحی کا نزول نہیں ہوتا اور وہ وحی کے بغیر نطق بھی نہیں فرماتے۔ تم مانندِ رسول بھی نہیں جبکہ وہ مبعوث ہی رسولؐ ہوئے ہیں۔ یقیناً اگر چند مخصوص نفوس میں سے ایک نفس کو رسول منتخب کیا گیا ہے اور پھر اس منتخب رسولؐ کو انہی چند نفوس کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے تو بات اور بھی با مقصد ہو گی۔ مالک و خالق کل کائنات کا اس کے پیچھے واضح مطمح نظر ہو گا کیونکہ کوئی ایسا فعل، فعل الٰہی نہیں ہو سکتا جو بے مقصد ہو۔ اسی بات کو ایک دوسرے زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمارا وجود ایک محدود (Miniature) کائنات کی مانند ہے، جس میں بہتر (۷۲) اعضاء نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً دل، دماغ، آنکھ، کان، ناک، زبان، معدہ، جگر، پھیپھڑے، تلی، لبلبہ، ہاتھ، پاؤں اور مخصوص اعضاء وغیرہ، جب کہ ان کُل اعضاء میں سے ہر ایک عضو ایک خاص حس کا محل ہے۔ آنکھ بصارت کا، کان شنوائی کا، تالو ذائقہ کا، زبان گفتار کا، دل جذبہ کا، اور اسی طرح دماغ عقل کا محل ہے۔ عقل عین فطرت ہے، عقل کا فیصلہ شریعت کے عین مطابق اور شریعت کا فیصلہ ہمیشہ عقل کے عین مطابق ہوتا

Marfat.com

ہے۔ جب ایسا ہے تو ماننا پڑے گا کہ شریعت و عقل باہم ایک جیسے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ شریعت ظاہر ہے اور عقل باطنِ وجود میں ہوتی ہے۔ جیسے شریعت، ظاہری طور پر رسول سے متعلق ہے اسی طرح عقل بھی رسول ہی کا باطنی مظہر ہوتی ہے۔ مختصراً ظاہر ہو جائے تو رسول اور اگر باطن میں چلی جائے تو اسے عقل کا نام دیتے ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وجود کے ہم آہنگ اعضاء میں سے ایک عضو کو شانِ رسالت عطا کر کے، اسی وجود میں بھیج دیا گیا کہ ان اعضاء کی راہنمائی کرے۔ یقیناً اس کی راہنمائی کُل وجود کے لیے بمنزلہ اسی طرح ہے جس طرح کُل کائنات کے لیے رسول کی راہنمائی مقرر کی گئی تھی۔ وحی کی شکل میں جو رشد و ہدایت کی باتیں رسول کو میّسر ہوتی ہیں، وہ ان کی تبلیغ کُل عالم کے لیے کرتا ہے۔ اگر اہلِ کائنات ان باتوں کو من و عن تسلیم کر کے، سرِ تسلیم خم کر دیں تو کائنات نمونۂ بہشت ہو جائے۔ بالکُل اسی طرح اگر وجود کے کُل اعضاء عقل کی راہنمائی سے ہدایت پا کر اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیں تو کائناتِ وجود بھی چلتی پھرتی جنّت ہو گی۔ اسی بات کو ایک اور انداز سے بھی غور کرتے ہیں۔ رسولِ آخر الزماںؐ نے اپنی تمام حیات طیبہ، عرب کے صرف دو شہروں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں گزار دیں۔ اپنے پیغامِ شریعت کی تبلیغ و ترویج کے لیے ساری دنیا کے قریہ قریہ، بستی بستی، محلے اور علاقوں میں تشریف نہیں لے گئے، چہ جائیکہ براعظموں کا سفر کیا ہو۔ جن براعظموں، ملکوں، شہروں اور علاقوں میں حضورؐ نے قدم رنجہ نہیں فرمایا، کیا وہ آج یہ شکوہ کریں کہ ہمیں تو انسانیت کا پیغام کامل، مخبر صادق کی وساطت براہ راست ملا ہی نہیں، ہم پر اس کی تعزیر کیونکر لگائی جا سکتی ہے؟ ان دو شہروں میں بھی سلسلۂ تبلیغ، باآواز بلند (through Loud Speaker) نہیں کیا گیا، بلکہ باندازِ تواضع آپؐ آواز کو دھیما رکھنا پسند فرمایا کرتے۔ عام روایات ہیں کہ آقائے نامدار صحابہؓ کے ہمراہ مسجدِ نبوی میں بیٹھے ہوتے تو باہر سے آنے والے نئے لوگوں کو پوچھنا پڑتا کہ تمہارے نبی کون ہیں۔ اس بنیاد پر غور کیا

Marfat.com

جائے تو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے باسی تو بجا طور پر پیغام لازوال سے محروم مانیں جائیں گے، حالانکہ یہ ان کی دلی خواہش بھی نہیں ہوگی۔ اگر وہ شکایت کریں کہ ہم تک تو رسولؐ کی آواز مبارک بھی کبھی نہیں پہنچی، تو بلاشبہ یہ غلط نہ ہوگا۔ خالق و مالکِ کُل کائنات نے وہ ممکنہ شکوہ و شکایات اسی طرح دور کیے کہ بنی نوع آدم میں رسول بمنزلہ عقل، مجملہ ہر آدم کو عطا فرمادی، اور پسند فرما کر ترغیب دی کہ اپنی جزوی عقلوں کو استعمال کرو۔ یہ عقل تمہاری جزوی کائنات میں اسی طرح راہنمائی فرمائے گی، جس طرح میری کُل کائنات میں میرا رسول کرتا ہے۔

مالک کائنات نے اپنی فطرت میں حکیمانہ انداز سے اس انعام کو ایک اور شکل میں بھی برقرار اور جاری رکھا ہے۔ محمد الرسول اللہؐ کی حیات ظاہری کو جب طبعی پردہ نے ڈھانپ لیا تو رسالت کی تاثیر اور خوشبو، اولیاء اللہ میں منتقل کر دی گئی، تاکہ ان کی وساطت سے کائنات کے ہر گوشہ تک اس کے پھیلنے کا سبب بن جائے۔ ۔ آج کے دور میں کوئی اس باب میں زبانِ شکایت دراز کرنا چاہے، تو اسے فطرت خداوندی میں مقرر، سلسلہ ولائیت، کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ کل تک رسولؐ، حامل رسالت تھے، اور رسالت آج، اولیاء اللہ کی شکل میں ہمیشہ کی طرح تروتازہ بھی ہے اور رہبر و راہنما بھی۔ منشائے ایزدی کے تحت کوئی دور اور کوئی وقت پیغام رسالت و شریعت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس پیغام کے حامل کل نبی پیغمبر تھے تو حضورؐ کے طبعی پردہ کے بعد آج وہ بشکل عاشقان و محبانِ رسولؐ ہیں، انہیں ہی اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ وہ آج بھی وہی پیغام اسی تاثیر سے طالبانِ حق کو سنا رہے ہیں۔ عین اسی طرح جیسے رسول اللہؐ اس بات پر شاکی تھے کہ کُل آدمیت کو بالعموم اور امت مرحومہ کو بالخصوص کوئی تکلیف نہ آئے۔ سابقہ امتوں کی طرح ان کی امت پر پتھر نہ برسائے جائیں، انہیں پانی کی طغیانیوں سے محفوظ رکھا جائے، ان پر خون اور مینڈکوں کی بارش نہ برسائی جائے اور ان پر ٹڈی دل کے طوفان نہ مقرر رکئے جائیں۔ آپؐ کو اپنی امت کا اس قدر خیال تھا کہ خالق کائنات سے دین کی تکمیل تک کروالی،

Marfat.com

تاکہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔ زندگی کا مقصد پانے کی وہ تڑپ جو صدیوں سے آدمیت کے سینہ میں اُبل رہی تھی اس کی پیاس بجھانے کے لیے قرآن کی شکل میں مکمل ضابطہ حیات (Code of ethics) عنایت فرمایا۔ اسی طرح آپؐ کے سچے عشاق اولیاء اللہؒ اس پیغام کو آج تک لوگوں میں پہنچا رہے ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ (انشاء اللہ) جاری و ساری رہیگا۔ حریص ہونے کے ناطے رسول کریمؐ اپنی کُل امت کے لیے ایک ایسا سائبان بنے کہ خود تمام رنجشیں اور تکالیف سہہ کر امت کے تمام راستے ہموار کردیے۔ آج کا مسلمان نہایت خوش قسمت ہے کہ اُسے بنی بنائی مل رہی ہے۔ اسے فقط صراطِ مستقیم پر پاؤں رکھنا اور چلنا ہے، جبکہ ماضی میں کئی امتیں صراط مستقیم کی تلاش میں اپنی زندگیاں بے سود گنوا چکی ہیں۔ محبّانِ رسولؐ بھی آج اپنے چاہنے والوں کے لیے اسی طرح حریص ہو کر گلابانی کر رہے ہیں۔ تمام اولیاء اللہ، رحمۃ للعالمینؐ کے نورِ رحمت کی کرنیں ہی ہیں۔ یہ بھی خود سراپا رحمت ہیں۔

اور جہاں تک رؤف و رحیم ہونے کا ذکر ہے یہ اصلاً صفاتِ خداوندی ہیں، جو ذات نے خود اپنے حبیبؐ کو تفویض کردی ہیں۔ کم از کم مومنین کے لیے رسالتمآبؐ خود ہی رؤف بھی ہیں اور رحیم بھی!

۴۱۔ معراج

معراجِ نبویؐ، ایک ایسا موضوع ہے جس پر صدیوں سے بڑے بڑے مفکّروں، دانشوروں اور علماء نے بہت کچھ کہا ہے، لکھا ہے اور کہتے رہیں گے، لکھتے رہیں گے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ نبی آخرالزماںؐ اوّل ہیں اور تب بھی نبی تھے، جب آدمؑ مٹی اور خاک میں بھی نہ تھے۔ ایک لاکھ تقریباً چوبیس ہزار انبیاء و مرسلین کے بعد، جب آپؐ کی بعثت ہوئی اور خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کا لقب سرفراز ہو گیا، اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کی نعمت سے بھی مالامال کر دیا، اور اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ کا انعام بھی دے دیا، تو سوال ابھرتا ہے کہ مزید کیا دکھانا مقصود ہو سکتا تھا جو عرش پر مدعو کیا گیا۔ اگر ملاقات

Marfat.com

مقصود تھی تو حضور خدا کو ملنے کے لئے کہاں گئے؟ مالک و خالق کُل کائنات جس کی شان یہ ہے کہ اس کے امر کو کُن بھی نہیں کہنا پڑتا اور فیکُون ہو چکا ہوتا ہے، معراج نبویؐ کے لیے اسباب کا پابند کیوں ہو گیا؟ اور روایات کے مطابق جانور کی قسم اور عورت کے چہرے والا براق، جبرائیل کی معیّت میں بھیجنے پر مجبور ہو گیا۔ اس مالکِ کائنات کی سنّت پہلے بھی موجود ہے کہ وہ بنا اسباب کر گزرتا ہے، تو سردارُ الانبیاءؐ کی دفعہ اسباب کا مقیّد کیوں ہو گیا؟ یہ کام بہت خصوصی تھا اور چونکہ کائنات میں فقط ایک ہی مرتبہ ہونا مقصود تھا، تو کیوں نہ عیسیٰؑ کی طرح بن باپ اور آدمؑ کی طرح بن ماں باپ، یعنی اسبابِ ظاہری کے بغیر ہو گیا۔ بظاہر یہی بات ممکن ہے کہ یا تو جو واقعہ ٔمعراج ہمیں بتایا جاتا ہے وہ اُس طرح نہیں یا پھر یہ کہ بغیر اسباب اس کائنات میں نہ تو کچھ ہوا ہے اور نہ ہی کچھ ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت میں ہمیں ماننا پڑے گا کہ عیسیٰؑ، بن باپ اور آدمؑ، بن ماں باپ پیدا نہیں ہوئے۔

سورۃ بنی اسرائیل آیت ا میں ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ: یعنی پاکی اسی ذات کو سزاوار ہے جس نے اپنے بندہ کو رات میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سیر کروائی، جسے برکتوں نے گھیر رکھا ہے، تاکہ اسے اپنی نشانیوں میں سے دکھائے، تحقیق وہی سننے دیکھنے والا ہے۔ جس کا واضح مطلب ہے کہ غایتِ معراج دیدارِ آیاتِ الٰہی ہے، دیدارِ الٰہی نہیں۔ آیات سے مراد نشانیاں ہوتی ہیں، جس ذریعہ اور وسیلہ سے اللہ کی معرفت ممکن ہو گی وہ ہی اللہ کی آیت ہو گی، آیتُ اللہ کے لیے لازم ہے کہ وہ معصوم ہو اور نجس کی مجال نہ ہو کہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے۔ حضورؑ فرماتے ہیں: نَحْنُ آیَاتُ اللہِ: یعنی ہم ہی اللہ کی آیات ہیں۔ اللہ کی دوسری نشانیوں میں ارض و سماء، نباتات اور جمادات وغیرہ بھی شامل ہیں، مگر یہ فقط موجودگیٔ خدا کی دلیل ہیں ذات کی نہیں۔ معرفت خدا کی آیت کا مفہوم کچھ مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معراج میں حضورؐ نے عرش نہ دیکھا، وہ تو ان کے سامنے بنا تھا، لوح و قلم

Marfat.com

نہ دیکھی، وہ خود ان کی ذاتِ مقدسہ ہی ہے، ارض و سماء کو نہیں دیکھا، یہ ان ہی کی بدولت بلکہ ان کے ہاتھوں سے بنے۔ حضورؐ نے تو سورۃ النجم آیت ۱۸ کی روشنی میں: لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی: یعنی اللہ کی سب سے بڑی نشانی دیکھی اور آیت ۱۷ کے مطابق: مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَ مَا طَغٰی: یعنی آنکھوں نے دیکھنے میں کوئی غلطی بھی نہ کی اور واضح طور پر پہچان لیا کہ یہ تو وہی ہے اور پھر آیت ۱۱: مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی: یعنی جس کو دیکھا اسے دل نے بھی نہ جھٹلایا بلکہ دل نے مان کر مزید تصدیق کر دی کہ یہی معرفتِ خدا کی سب سے بڑی نشانی اور دلیل ہے۔ غور طلب ہے کہ آپؐ سے بڑھ کر اور کون سی افضل ذات ہے جو معرفتِ خدا کرواسکتی ہے کیونکہ آیت الکبرٰی تو خود حضورؐ کی اپنی ذاتِ گرامی ہے، مگر اس کے باوجود قرآن کہتا ہے اس آیت الکبرٰی نے ایک اور، آیت الکبرٰی کو دیکھا۔ یہ نبی رسولؐ ہو نہیں سکتے کیونکہ وہ طور پر غش کھا کر بے ہوش گرتے نظر آتے ہیں، فرشتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ سدرۃ المنتہٰی پر حیران کھڑا رہ گیا تھا، امتی ہونے کا بھی امکان نہیں ہو سکتا کہ ان کے لئے بیّن حکم ہے آپؐ سے ورا آواز بلند نہ کریں اور نہ ہی قدم آپؐ سے آگے رکھنے کی کوشش کریں۔ دراصل آقائے نامدارؐ، ازل سے حاملِ معراج ہیں۔ آپؐ تھے، جب کائنات میں کچھ اور نہ تھا، آپؐ ہیں، اور بظاہر دنیوی پردہ کے باوجود حاضر و ناظر ہیں، مخلوق تو ہیں، مگر اوّل مخلوق ہیں۔ لا محالہ آپؐ کی تخلیق کا کوئی سانچہ موجود نہیں اس لیے یہ کہنا کہ آپؐ کی بعثت آدمؑ کے روپ میں ہوئی، صریح ناانصافی اور غلطی ہے۔ حقیقت میں خالقِ کائنات کو آپؐ اتنے عزیز ہیں کہ اس نے خلافت کے لیے مقرر کی جانے والی مخلوق کو، جسے اشرف المخلوقات بھی کہا جاتا تھا، اسی سانچہ میں ڈھال دیا۔

اوّل ہونے کے ناطے آپ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ ایک مثال پیش ہے، جو ممکن ہے شایانِ شان نہ ہو مگر عقلی دلالت کر سکتی ہے۔ کہ ایک ازلی ماں، جب پہلے پہل جنم دیتی ہے، چونکہ اس ماں کے علاوہ اور کوئی ہے ہی نہیں، تو اس اوّل بچہ کی نگہداشت اور پرورش اسے خود اپنی گود میں اور اپنے ہاتھوں ہی

Marfat.com

میں کرنی پڑے گی کیونکہ اور تو کوئی ہے ہی نہیں جو یہ ذمہ داری نباہ سکے۔ تو اوّل کو مکمل طور پر اپنے ہاتھوں اور گود میں پرورش کرنے والا، کیا اس سے پوشیدہ ہو گا؟ خلق کرنے والا اور اوّل مخلوق دو ہی تو ہیں، مکمل طور پر مانوس ضرور ہوں گے، ایک دوسرے کے تمام تر خواص مشترک ضرور رکھتے ہوں گے، ایک دوسرے سے کوئی حجاب نہ ہو گا۔ خالق، اپنا سینہ کھولنے پر مجبور اور اوّل، بے حجاب اس کی گود میں۔ جب ذات کو ذات سے، ازل کی ازل سے بھی قبل، بے حجاب ہونے کا موقع مل چکا ہو تو اب اور کیا ایٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى دکھانا مقصود ہو سکتا ہے؟ جو ازلی بے حجابی آپؐ کو میسر آئی تھی اس جہان میں مبعوث ہونے کے بعد اُس بے حجابی کی یاد منانے کے لیے نبی کریمؐ نے جو اعلان فرمایا، اسے آج معراجِ نبویؐ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یقیناً آپؐ ہی جانتے ہیں کہ اگر چاند کی تاریخوں کو ماضی میں لے جایا جائے، تو وہ کونسا دن، مہینہ اور سال بنے گا! اس لحاظ سے اعلانِ معراج، اس ازلی بے حجابی کے واقعہ کی پہلی یاد تھی اور حضورؐ کے ماننے والوں کے لیے اس عمل کو سمجھنے کی پہلی ترغیب و کاوش!

بیان کیا جانے والا معراج کا واقعہ اس جہانِ فانی میں کئی لحاظ سے غیر فطری محسوس ہوتا ہے اور یاد رکھنا چاہیے کہ اس کائنات میں کوئی عمل فطرت کے مدارج سے گزرے بغیر ناممکن ہے۔ ماننے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ معراج کا سفر ایک غیر فطری انداز میں بیان کر کے کر شانِ رسالتؐ بڑھائی نہیں جارہی بلکہ نہ ماننے والوں کو مواقع فراہم کیے جارہے ہیں، کہ معاذ اللہ، وہ مضحکہ بنائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں، کہ 'نہ ماننے والے' 'واقعہ معراج' کی مثال سامنے رکھ کر 'ماننے والوں' سے ایسے سوالات کر سکتے ہیں کہ ان کی عقلیں دنگ رہ جائیں۔ اس طرح ماننے والے تو رسوا و خوار ہو ہی رہے ہیں، بات اس ہستیٔ اعظمؐ تک بھی پہنچتی ہے جس کی نسبت اس واقعہ سے ہے۔ ایک غیر مذہب والے نے ایک دفعہ یہ سوال کیا کہ سائنسی اصولوں اور عام مشاہدہ کے مطابق زمین پر حرکت دینے کے لیے جب کسی بھی شے پر طاقت صرف کی جاتی ہے تو اس کی حرکت ہمیشہ ایک وقت میں ایک ہی سمت میں

Marfat.com

ہو سکتی ہے، تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ براق جب نبیؐ کو لے کر معراج کے لئے روانہ ہوا، اس کی پرواز کس سمت میں تھی؟ اس سوال، اور اس سوال میں چھپے سوالوں کا مطلب واضح ہے۔ عموماً چھ معروف سمتوں کو تسلیم کیا جاتا ہے یعنی اوپر نیچے، دائیں بائیں اور آگے پیچھے۔ فرض کریں آپ جواباً کہتے ہیں کہ براق اوپر کی طرف روانہ ہوا تھا تو اس کے نتیجہ میں لازم آئے گا کہ معاذ اللہ وہ ذات باری تعالیٰ صرف اسی مخصوص سمت میں مقید ہے اور باقی تمام سمتوں میں وہ خود بھی موجود نہیں اور اس کی راج دہانی بھی نہیں۔ چونکہ بیان کئے جانے والے واقعہ کے مطابق اس سوال کا جواب مشکل ہے اور اگر کوئی فرضی جواب بنا بھی دیا جائے تو اس سے شانِ رسالتمآبؐ پر ضرب آتی ہے اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ہم سمجھیں کہ اصل میں معراج کیا ہے؟ واقعاتی انداز کو اگر مدِ نظر رکھا جائے تو اس میں چند نکات بہت اہم ہیں۔ اوّل یہ کہ معراج صرف رسالت کی نہیں ہے، عین اسی وقت الوہیت کی بھی ہوئی، دوم یہ کہ معراج اگر مقام ہے تو اس مقام پر عاشق و معشوق اکٹھے ہوئے ہیں اور معراج اگر حال ہے تو محل بھی عین وہی حال ہے۔ اس لیے معراج کا تصور ایک کے ساتھ مکمل نہیں ہو سکتا، فریق ثانی کے لیے بھی صادق آتا ہے۔ تیسرا قابل غور نکتہ یہ ہے کہ وہ حادثہ، فعل یا عمل جس کا کوئی گواہ نہ ہو، اس کی تصدیق ناممکن ہو جاتی ہے۔ گواہی تو وقوعہ کی تصدیق کرتا ہے، مگر گواہ کے لیے لازم ہے کہ اس نے وقوعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو کیونکہ کان سے سننے والا شہادتی نہیں مانا جاتا۔ یہ قانونِ شہادت کی بنیادی شق ہے۔ اس لحاظ سے گواہ کا وقوعہ کے وقت سے بھی پہلے موقع پر موجود ہونا لازم ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر وقوعہ سے قبل موقع پر نہ ہو گا تو اس کا آنکھوں سے دیکھنا محال ہو گا۔ جب وقوعہ دیکھنے والا، اس موقع کا آنکھوں دیکھا حال سناتا ہے تو اس واقعہ کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے اور تفصیلات بھی پتہ چل جاتی ہیں، وگرنہ جن دو کے درمیان واقعہ گزرا ہوتا ہے ان کے علاوہ اور کوئی اس واقعہ کو سچ کیسے جانے گا۔ ممکن ہے جس پر واقعہ گزرا ہو، اس پر واقعہ کے دوران کوئی ایسی کیفیت و حالت وارد ہو

Marfat.com

گئی ہو کہ اسے کوئی بات یاد ہی نہ رہی ہو، اس مقصد کے لیے بھی گواہ نہایت ضروری ہے۔ دو گاڑیوں کے تصادم کی مثال لیجیے۔ واقعہ کے بعد دونوں ڈرائیور جھگڑیں گے اور اپنا اپنا موقف بیان کریں گے، دونوں کی کوشش ہو گی کہ ان کی سچائی ثابت ہو، تاکہ وقوعہ کی ذمہ داری سے بچ سکیں۔ اب ان کا تصفیہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایک تیسرا یعنی گواہ لایا جائے، جو تصادم کے وقت جائے وقوعہ پہ پہلے سے موجود ہوگا اور دیکھ رہا ہوگا کونسی گاڑی کس طرف سے آئی، کون سی جگہ کس ڈرائیور سے کیا غلطی ہوئی اور کیوں کر نتیجتاً وہ حادثہ رونما ہوا۔ یعنی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی گواہ ہی کرتا ہے۔ اگر حادثہ سے قبل، یا حادثہ کے دوران ایک فریق بے ہوش ہو گیا ہو، تو اس بات کی تصدیق بھی گواہ ہی کرے گا۔ مختصراً، کسی بھی وقوعہ کی تصدیق اصل میں گواہ ہی کرتا ہے تو خالق و مالکِ کُل کائنات کیا اس فطری قانون کو نہیں سمجھتا؟ معراج النبیؐ ایسا عظیم الشان اور اچھوتا واقعہ رونما ہونا ہو، جبرائیلؑ کو حکماً سدرۃ المنتہٰی پر رکنے کا اشارہ دے دیا جائے اور موقع پر کسی گواہ کا بندوبست بھی نہ کرے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کا بھی گواہ ہے اور واقع ہونے سے قبل وہ موقعہ پر موجود بھی تھا اور اس کی چشم بینا نے وہ سب کچھ مشاہدہ بھی کیا اور من و عن بھی کیا جو کچھ کہ: فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی: کی مد میں آتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ کوئی عامیانہ اور معمولی واقعہ نہیں ہے، وقوعہ رسالت و الوہیت کے درمیان مقرر ہے، غیر معمولی بھی ہے اور اولیٰ ترین بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ طے شدہ پروگرام کے تحت ہو رہا ہے، اس لیے فریقین نے باہمی مشاورت سے گواہی کے لیے اسی پائے کا کوئی فریق مقرر کیا۔ یہ ولائیت و امامت تھی جو رسالت و الوہیت کے مابین معراج کے واقعہ کی گواہ بنی۔ ولیٔ کُل اور امام اوّل، مولا علیؑ اس معراج کے گواہ ہیں جو محمدؐ رسول اللہ اور اللہ بادشاہ کے درمیان واقع ہوئی۔

یہ گواہ یقیناً ہو بھی وہی ہو سکتا ہے جس کے متعلق خود حضورؐ فرمائیں: جِسْمُکَ جِسْمِیْ، رُوْحُکَ رُوْحِیْ، لَحْمُکَ لَحْمِیْ، بَدَنُکَ بَدَنِیْ، دَمُکَ دَمِیْ: یعنی یہ میرا ہم جنس ہے، میرا اور اس کا جسم، روح، گوشت، بدن

Marfat.com

اور خون ایک ہے۔ یہ ولایتِ مطلق کی بات ہے اور یہ ولیٔ مطلق کا ذکر ہے۔ سو معراج، ختمِ نبوت و ولایتِ کُلی کا تعارف اور پہچان نکلی! رسولِ آخر الزمانؐ اور شہنشاہِ ولایتؑ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خوب دیکھا، دونوں نے ایک دوسرے کو دکھایا اور خوب دکھایا، دونوں میں گفتگو ہوئی اور خوب ہوئی۔ دراصل خدا نے دونوں کو ایک دوسرے کو دکھا کر، اپنا کوئی خاص فیصلہ فرمایا ہے۔ اگر شریعت کا فیصلہ ہوتا، تو نبوت ورسالت کی وساطت سے وحی کے ذریعے ہوتا، بلانے کی ضرورت نہ پڑتی، فرشتے الگ نہ ہوتے اور امت سے جدا نہ کیا جاتا۔ یہ اللہ کا ذاتی فیصلہ معلوم ہوتا ہے اور اس سے کائنات کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ خدا نے نبوت کا فیصلہ نہیں کیا کیونکہ خدا نبی ہے ہی نہیں، رسالت کا فیصلہ نہیں کیا کیونکہ اللہ رسول بھی نہیں، خلافت کا فیصلہ بھی نہیں کیا کیونکہ خدا، خلیفہ بھی نہیں ہے۔ خدا نے ولایت کا فیصلہ کیا، کیونکہ سورۃ المائدہ آیت ۵۵: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ : کے مطابق وہ ولی ہونے پر فخر کرتا ہے۔ یہ ولایتِ مطلق کا فیصلہ ہوا ہے کہ اے محمد ﷺ آپ بھی اس صنفِ ولایت کے اختیارات لے لیں اور اے علیؑ آپ بھی اس ولایت و امامت کے مُقام پر فائز ہو جائیں، جس کا حامل ہونے پر اللہ خود نازاں ہے۔ فیصلہ ولایت کے لئے ہوا، تعتم ولایت پر ہوتی ہے، کیونکہ رسالت کے صرف ۲۳ برس ہیں، جس میں صرف شریعت مکمل کی گئی، لیکن قیامت تک اس نبوت کے تحفظ وبقا کی ضمانت، ولایت کا کام ہے! بادیٔ النظر سے غور کریں تو معراج (م + ع + راج) میم اور عین کا مشترکہ راج ہے۔ کسی وجود کی کُلیت میں میم، محمد الرسول اللہؐ اور عین، علیؑ الولی اللہ، کے مکمل راج کا نام ہی دراصل اس کی بھی معراج تصور ہو سکتا ہے۔ وجودی معراج کے لیے یہ بالخصوص بہترین تعریف ہے۔ کشف المحجوب کے مطابق عرفانِ خداوندی کی وہ منازل جن میں مسافت شرط نہیں ہے، وجود کے اندر ہی خیال کے تابع ہوتی ہیں۔ ان منازل کو اگر درجاتِ معراجِ ذات کی طرف منسوب کیا جائے تو لازم آئے گا کہ یہ عرفانِ الوہیت میں تلاش نہ کیا جائے، بلکہ میم اور عین کے راج کے ساتھ اس کی تفہیم کی جائے۔

Marfat.com

مقامِ رفعت پر اپنی کلیت (Totality) اور اپنی اکائی کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کا عمل ہی وہ معراج ہے جو وجود میں ممکن ہے۔ کُل کی تعریف، رفعت کے مقام پر، خود اپنے آپ کو آشکار کر لے، تو بھی وجود کی معراج ہو جاتی ہے۔ اکائی تو ہر جائی ہے، جہاں کہیں بھی عرفان ہو گا، ضرور موجود ہو گی۔ پستی میں عرفان ہو تو قرآن دلالت کرتا ہے کہ ولی تو ہو گا مگر طاغوت کا اور رفعت و انتہا میں عرفان میّسر آئے تو فقط ذات واجب الوجود کی ولائیت میّسر آئے گی۔ حافظ سائیںؒ فرمایا کرتے "تیرے کُل کی تعریف تیرا محمد ہے، تیری انتہا ہی تیرا اعلیٰ ہے اور تیری اکائی بمنزلہ تیری، توحید کے ہے۔ تیری عقل رسالت کے مترادف ہے، تیرا خیال بمنزلہ ولائیت کے ہے جب کہ تُو خود بمنزلہ توحید کے ہے۔ اپنے خیال کو اپنی عقل کے تابع کر کے اپنی اکائی میں اس طرح گم کر دے کہ دوئی کا شائبہ تک نہ رہے، یہی دین ہے اور یہی معراج ہے!" جب کوئی اپنے وجود کے جہان میں عقل کو بمنزلہ رسالت مان کر اور خیال کو بمنزلہ ولائیت جان کر، عقل و خیال کے آگے خود سپردگی کرتا ہے تو یہ عقل و خیال کا راج ہو گا، دوسرے الفاظ میں رسالت و ولائیت کا راج ہو گا، یعنی میم اور عین کا راج، مکمل معراج!

مقامِ رفعت پر جمع ہونا عین حقیقت ہے اور مقامِ رفعت میں الوہیت کے ساتھ جمع ہونا معراج ہے۔ حالانکہ ولائیت واقعہ معراج میں بمنزلہ گواہ کے نظر آتی ہے لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ گواہ کی حیثیت مدعا اور مدعا الیہ دونوں سے بڑھ جاتی ہے، وقوعہ کے بعد بالخصوص صرف اور صرف گواہ کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی بھی قانونِ عدل میں مدعا اور مدعا الیہ کی سچائی کا ثبوت صرف گواہ ہوتا ہے۔ اس لیے آج واقعۂ معراج برپا ہو جانے کے بعد ضروری ہے کہ ہم، اس واقعہ کی تفصیلات جاننے کے لئے فقط گواہ سے اپنا تعلق استوار کریں۔ صرف اسی سے نسبت پر موقوف ہے کہ ہم معراج النبیؐ کتنی اور کیسے سمجھ سکتے ہیں یا پھر بشرط نصیب خود معراج کی منازل طے کر سکتے ہیں!

Marfat.com

۴۲۔ مرکز

ایک ایٹم (Atom) کی مثال مدِ نظر رکھیں، سائنس کی زبان میں یہ کسی بھی عنصر کا چھوٹے سے چھوٹا ممکنہ ذرّہ ہوتا ہے۔ سادہ ترین ماڈل کے مطابق ایٹم کا ایک مرکز ہوتا ہے اور اس مرکز کے گرد، باہر کی طرف، سیّارگان کی مانند، کچھ ذرّات گردش کر رہے ہوتے ہیں، جنہیں الیکٹرون (Electron) کا نام دیا جاتا ہے اور سائنسی طور پر یہ حقیقت مستند ہے کہ وہ منفی برقی اثرات کے حامل ہیں۔ مرکز میں بھی دو اقسام کے ذرّات ہیں۔ ایک پروٹون (Proton)، جو تعداد میں اتنے ہی ہوتے ہیں، جتنے باہر گردش میں الیکٹرون، فرق یہ ہے کہ یہ مثبت برقی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ چونکہ الیکٹران اور پروٹان تعداد میں برابر ہوتے ہیں، اس لئے ہر ایٹم میں منفی اور مثبت اثرات کی قوت بھی برابر ہوتی ہے۔ یہی قوت کی برابری اس بات کا سبب بنتی ہے کہ الیکٹرون ایٹم کے گرد اور ساتھ بندھے رہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ منفی برقی اثرات کے حامل الیکٹرون، اپنے مرکز سے باہر بھی رہتے ہیں، اور نہایت تیز رفتاری سے اس کے گرداگرد گھومتے بھی رہتے ہیں لیکن وہ مرکز کے ساتھ اپنے فاصلہ میں ردّوبدل نہیں کر سکتے اور نہ ہی مرکز سے کہیں دور جا سکتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ باہر گردش کرنے والے الیکٹرون، جو اپنی حد تجاوز کرتے ہوئے مرکز سے دور نہیں جا سکتے تو یہ اس برابر مقدار کی مثبت برقی قوت کا نتیجہ ہے، جو پروٹون کو حاصل ہے۔ اس بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروٹونز، الیکٹرونز کو باندھ کر رکھنے کا سبّب ہیں اور انہی کی بدولت الیکٹران حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ دوسری قسم کے ذرّات کو نیوٹرون (Neutron) کہتے ہیں، ان پر کسی قسم کا کوئی برقی اثر نہیں ہوتا اور ان کی تعداد ہمیشہ پراٹونز سے ایک کم ہوا کرتی ہے۔ یہ دونوں اقسام کے ذرّات یعنی پراٹونز اور نیوٹرونز، جو مرکز میں موجود ہوتے ہیں، ہر قسم کی حرکت سے بے بہرہ ہیں، لیکن الیکٹرون کی حرکت انہی کے

Marfat.com

سبب سے ہے۔ ہر ایک ایٹم کے پروٹونز، الیکٹرونز کو ایسے باندھ کر رکھتے ہیں، جیسے قطبِ زماں اپنے وقت کو باندھ کر رکھتا ہے۔ وہ بھی مرکز میں ساکت و غیر متحرک رہ کر، اپنی مثبت برقی قوت کے اثر سے، وقت کے تمام گردش کرنے والے سیارگان کو باندھ کر قابو میں رکھتا ہے، حتٰی کہ وہ اپنی گردش میں حد سے تجاوز نہیں کر سکتے۔

الیکٹرانز کی حرکت کے لئے، سائنس کی زبان میں، عموماً پنکھے کی مثال دی جاتی ہے جس کے پَر پوری تیزی سے گھوم رہے ہوں، تو وہ جدا جدا نظر نہیں آتے، بلکہ ایک ہیولا سا بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح ہر ایٹم میں الیکٹرون اس کے گرد اپنی تیز گردش کی وجہ سے ہیولا کی طرح نظر آتے ہیں، جسے الیکٹرون کلاوڈ (Electron cloud) کہا جاتا ہے۔ پنکھے کے پَروں کا تیز رفتاری سے چلنا صرف مرکزی مشین کا کمال ہوتا ہے، گھومنے کی قوت اسی مرکز سے ملتی ہے اور اپنے سے جدا نہ ہونے کی طاقت بھی اسی مشین سے مہیا ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح ہر پنکھے کے پَر مختلف سائز کے ہوتے ہیں، اور اسی سائز کی بنیاد پر اس کا ہیولا بھی اتنے ہی قطر میں نظر آتا ہے، بالکل اسی طرح مختلف قسم کے عناصر کے ایٹم کے گرد گھومنے والے الیکٹرونز کی تعداد بھی مخصوص ہوتی ہے اور ان کا پھیلاؤ بھی ان کی تعداد کے مطابق ہوتا ہے اور یہ ہر عنصر کے لئے ہمیشہ مخصوص ہوتا ہے۔

محققین کے نزدیک ایک آدم کی مکمل ترکیب تین چیزوں سے ہوتی ہے، روح، نفس اور جسم۔ روح، بمنزلہ تحریک کے ہے، نفس، قوت کا سرچشمہ ہے اور جسم، عرصات یعنی قیامت کے میدان کے پھیلاؤ کی مانند ہے۔ ہر جسم کی عرصات کی ایک حد مقرر ہے جو اسی جسم کے لئے مخصوص ہے، جب کہ مختلف عرصات کی حدیں مختلف ہیں، کوئی دو عرصات ایک جیسی حد کی مالک نہیں۔ جسم کو سمجھنا بہت مشکل ہے، ظاہری وجود سے کچھ پتہ نہیں ملتا، اس کو ایٹم کی طرح اس کے مرکز ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ سورۂ حٰم سجدہ آیت ۵۳ میں ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ

Marfat.com

الحَقُّ : یعنی جلد ہم تمہیں اپنے نشانات آفاق اور تمہارے نفوس میں دکھائیں گے، یہاں تک کہ حق ان کے لئے ظاہر ہو جائے۔ اور سورۃ الذاریت آیات ۲۰، ۲۱ ولالت کرتی ہیں: وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۞ وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ: یعنی اہلِ یقین کے لئے زمین میں اور ان کے نفوس میں نشانیاں موجود ہیں، تو بھلا انہیں کیوں نہیں دیکھتے؟ مراد یہ کہ اگر اس تمام نظامِ کائنات کو سمجھنے کے خواہش مند ہو تو اپنے مرکز میں جاکر، اپنے نفس کو سمجھ لو، نفس کی حقیقت پر غور و فکر کرنے سے ہی اپنی کُل کائنات کی بابت عقدہ کشائی ہو گی کیونکہ اہل یقین کے لیے نشانیاں، ان کے نفوس ہی میں رکھی گئیں ہیں۔

وجودِ آدم میں نفس، بمنزلہ ایٹم کے مرکز میں موجود مثبت برقی اثرات والے ذرّات (پروٹون) کے ہے، جو مرکزی رول ادا کرتا ہے اور تمام وجود کو اپنے گرد باندھ کر رکھتا ہے۔ روح باعثِ تحریک ہونے کی وجہ سے وجود کی حرکات و سکنات کا سبب ہوتی ہے، خون کی گردش سے لیکر تمام اعضاء کے افعال اسی کی بدولت ہیں۔ جب کہ جسم کی بناوٹ حواسِ خمسہ سے ہے، جو خبر اور احساس کا محل ہے۔ نفس طاقت کا سرچشمہ ہے، اپنی طاقت سے اپنے اردِ گرد پھیلے وجود کے اجزا کو، اپنے ساتھ باندھے رکھتا ہے، کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو پاتے اور ایک اکائی کی طرح فعال رہتے ہیں۔ روح کی وجہ سے وجود میں زندگی، ارادہ اور تحریک میّسر آتی ہے، لیکن کئے گئے ارادہ پر عمل در آمد کرنے کے لیے جو قوت درکار ہوتی ہے، وہ روح سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ نفس مہیا کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص میں ارادہ و تحریک ہوئی کہ وہ کوئی کام کرے، یہ احساس اس فعل کو سرانجام دینے کے لیے کافی نہیں ہے، مقصد براری کے لیے اسے قوت درکار ہو گیا اور وہ قوت ہمیشہ نفس مہیا کرتا ہے، جو کسی ایٹم کے مرکز میں موجود پروٹونز کی مثبت قوت کے مترادف ہے۔ سورۃ آلِ عمران آیت ٦١ (آیتِ مباہلہ) کے مطابق علیؑ کو حضورؐ کا نفس قرار دیا گیا ہے، جس سے اشارہ ملتا ہے کہ رسولِؐ، احساس و

Marfat.com

تحریک کی شکل میں، کائنات کو بالعموم اور امت کو بالخصوص، گائیڈ لائن ہی مہیا کرتے ہیں۔ لیکن اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے جو قوت درکار ہے، وہ نفسِ رسولؐ، اسد اللہ الغالبؑ سے ملے گی۔

بلاشک نیوٹرونز بھی پروٹونز کے ساتھ مرکز ہی کا حصہ ہوتے ہیں مگر چونکہ ان پر کوئی برقی اثر نہیں ہوتا، اس لیے وہ مرنجاں مرنج خاصیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ جہانِ رنگ و بو میں ان کی مثال رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْن کے مصداق ہے، وہ ہمیشہ اچھائی کی انتہا کے لیے احساس و تحریک مہیا کرتے رہتے ہیں، نجس ان کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا اور وہ کُل کائنات کی خیر خواہی کے پاسدار ہوتے ہیں۔ اس خیر خواہی پر عملدرآمد کے لئے جو قوت درکار ہوتی ہے وہ ان کی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ یہ مرکز میں موجود مثبت برقی اثرات والے ذرات، پروٹانز کا کام ہے۔ نیوٹران کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ کوئی مرکز سے قطع تعلق نہ کر بیٹھے، کہ اس میں موجود پروٹان ہی قوت کا اصل سرچشمہ ہیں۔ ان پروٹانز سے روگردانی کل مرکز سے منہ موڑنے کے مترادف شمار ہوگی۔

وجود کا ظاہر اور باطن ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ باطن، مرکز کا دوسرا نام ہے جو نفس اور روح کے اشتراک کو کہتے ہیں اور جس میں مثبت برقی قوت ہوتی ہے۔ جبکہ ظاہر، جسم، منفی برقی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ جب تک جسم اور نفس، دو، یعنی ضدین ہوں گے، تو لامحالہ نفس میں بمنزلہ مرکزی پروٹون، مثبت برقی اثرات ہوں گے جب کہ جسم میں الیکٹران کی مانند، منفی برقی اثرات پائے جائیں گے۔ وجودِ ظاہر میں آگ، ہوا، پانی اور مٹی کا مجموعہ ہے اور باطن میں روح اور نفس کا۔ روح بغیر کسی برقی اثر کے ہوتی ہے، نفس مثبت اثرات رکھتا ہے اور جسم منفی برقی اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد پر ظاہر اور باطن کے احوال بھی ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں، اگر باہر خوشی ہو تو اندر بیزاری ہوتی ہے، جو نغمہ و ساز آنسو جاری کر دے وہ باطن کی آبادی کا باعث ہوتا ہے۔ جس تھاپ اور آواز

Marfat.com

پر وجود دھمال ڈالنا چاہے، اس کی ترک اس لیے اچھی، کہ وہ باطن کو برباد کر سکتا ہے۔ بلاشک وجد کی حالت میں مشاہدہ ممکن ہوتا ہے، مگر دوئی اور ضد کے مقام پر ہونے کی وجہ سے باطن کا مشاہدہ، ظاہر کے لیے بے فائدہ ہو جاتا ہے۔

۴۳۔ بحرین

سورۃ الرحمان آیت ۱۹ میں ہے: مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ : یعنی دو بحر جاری کیے۔ اس میں اگر بحر کا ترجمہ سمندر کریں تو ظلم ہوگا کیونکہ سمندر جاری نہیں ہوتے، اور نہ ہی ان میں بہاؤ پایا جاتا بلکہ وہ تو ایک ٹھہری ہوئی چیز کا نام ہے۔ یہ کوئی ایسے بحر ہیں جو جاری کئے گئے ہیں اور جو بہاؤ میں ہیں۔ ان کی شان اس طرح بیان ہوئی ہے: يَلْتَقِيٰنِ: یعنی اصل میں ایک دوسرے سے پیوست ہیں، مگر آیت ۲۰ کے مصداق: بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ: یعنی ان کے درمیان پردہ ہے، ایک دوسرے کی حد نہیں توڑتے، حقیقت میں یہ ایک دوسرے سے متصل ہیں مگر ایک پردہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ بھی ظاہر کر رہا ہے۔ اور آخر کار جب یہ باہم مل جاتے ہیں تو آیت ۲۲ کی روشنی میں: يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْمَرْجَانُ: یعنی ان سے اخراج ہوتا ہے موتی اور مونگے کا۔ ان بحور کی تشریح میں علماء اور مفسرین کرام نے بہت مختلف النوع آراء کا اظہار کیا ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس کی سیر حاصل بحث کی ہے مگر پھر بھی من کو راضی نہ کر سکے، کچھ نے اس کا ترجمہ فرات کیا ہے، مولوی ثناء اللہ پانی پتی اسے گنگا اور جمنا سے تعبیر کرتے رہے ، مصر میں اس کا ترجمہ نیل ہوا اور بنگال والوں نے خلیج بنگال مراد لی۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے امام جعفر صادقؑ کے حوالہ سے بحر کا ترجمہ کیا ہے بَحْرُ الْهِدَايَةُ" یعنی ہمیشہ کی ہدایت کے رواں دواں سمندر۔ اس حوالہ کے بعد 'بحرین' بہتر سمجھ میں آئے گی۔ ابراہیمؑ اس بحرین کا نقطہ آغاز ہیں جو عراق میں پیدا ہوئے۔ جس راستہ پر چل کر ابراہیمؑ اپنی

Marfat.com

زوجہ بی بی ہاجرۃ اور بیٹے اسماعیلؑ کو مکہ چھوڑ گئے تھے، حکمتِ الٰہی سے اس راستہ کو عوام النّاس کے لئے اس طرح بند کر دیا گیا تھا، کہ وہ ایک سنگلاخ زمین بن گئی اور قریباً تین ہزار برس تک اسی حالت میں رہی۔ صدیوں بعد امام حسینؑ، اپنا قافلہ لیکر، اس راستہ سے کربلا کو چلے تھے۔

منبع بحرین سے ایک بحر بنی اسرائیلؑ کہلائی اور دوسری بنی اسماعیلؑ۔ بنی اسرائیلؑ مصر و شام کی آبادیوں کو سیراب کرتے رہے اور بحر اسماعیلؑ عرب کے ریگستانوں کو سرسبز کرتا رہا۔ بحر یعقوبؑ میں دو نمایاں شاخیں بنیں، ایک شعیبؑ کی شاخ دوسری عمرانؑ کی اور ان کا یَلۡتَقِیٰنِ اس طرح ہوا کہ ایک کے گھر بیٹی ہوئی دوسرے کے گھر بیٹا یعنی موسیٰؑ پیدا ہوئے۔ یہ سنّتِ الٰہی نکلی کہ جب یَلۡتَقِیٰنِ چاہتا ہے، ایک کے گھر لڑکی پیدا کر دیتا ہے دوسرے کے گھر لڑکا اور پھر ان کی شادی کروا دیتا ہے۔ جس شاخ کو روکنا مقصود ہو وہاں بیٹی جنم لیتی ہے اور جس شاخ کو چلانا مقصود ہو وہاں بیٹا پیدا ہو جاتا ہے۔ نسل اسماعیلؑ کی ایک شاخ عبد اللہؓ کی طرف پہنچی اور دوسری ابو طالبؓ کے گھر اور دونوں کے یہاں بیٹے ہوئے۔ عبد اللہؓ کے بیٹے کو بحر نبوت عطا ہوئی مگر، منشاءِ ایزدی کے تحت اس کو ختم ہونا تھا۔

یہاں ایک مثال کا سمجھنا ضروری ہے۔ ایک شخص کے گھر میں آم کا ایک صدیوں پرانا درخت اگا ہوا تھا جس کے آم بہت رسیلے، میٹھے اور خوشبو والے تھے۔ قدرتی طور پر وہ درخت اور اس کا پھل گھر والے کو بہت پسند تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آم کا درخت بوڑھا ہو رہا تھا، جس وجہ سے مالک فکر مند رہنے لگا کہ کہیں اس کا پھل بالکل سوکھ ہی نہ جائے۔ اس نے تگ و دو شروع کی کہ وہ اس آم کے پھل کی خوبی کو کس طرح برقرار رکھ سکتا ہے؟ آخر کار اس نے ایک طریقہ دریافت کیا کہ اسی نسل کے کسی دوسرے آم کی گٹھلی ایک گملے میں لگا دی اور اس گملے کا پودا جب ذرا بڑھا ہوا، تو اسے بوڑھے ہونے والے درخت کے نیچے رکھ دیا۔ جب اس کی آب و ہوا میں وہ مزید تر و تازہ ہوا تو اس گملے کی ایک شاخ اس بوڑھے درخت سے قلمبند کر دی۔ جب یہ اچھی طرح قلمبند ہو کر اس کے

Marfat.com

ساتھ یکجان ہو گیا، تو وہ شاخ درخت سے اتار لی۔ اب یہ نیا پودا، یعنی گملے کے پودے اور پرانے درخت کے اتصال کی شاخ، جب نئے سرے سے زمین میں لگائی گئی تو وہ ایک تن آور درخت بن گیا، جس میں پرانے درخت کی تمام تر خصوصیات موجود تھیں۔ شجرِ نبوت سوالاکھ فصلیں دیکر، حضور سرورِ عالمؐ پر مکمل ہو رہا تھا۔ اللہ پاک نے چاہا کہ اس شجر کے ذائقہ کو برقرار رکھے، اس لیے اس نے بالا مثال کی طرح، ایک ہم جنس پودا یعنی شجرِ ولایت اپنے گھر میں لگا دیا۔ یہ پودا کچھ زیادہ ہی زور دار تھا اس لیے گملے میں شگاف آ گیا، یعنی دیوارِ کعبہ شق ہو گئی۔ جب یہ پودا تھوڑا بڑا ہوا، تو شجرِ نبوت کے سایہ میں آ گیا اور پھر اس کی ہری بھری شاخ کا اس پودے سے قلمبند کیا گیا۔ قلمبند ہو چکنے اور شجرِ نبوت کی مکمل تاثیر اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد وہ پودا اس طرح اپنے گھر آ گیا کہ ختم ہونے والے پودے کی تاثیر ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئی۔ یوں یہ یَلۡتَقِیٰنِ بھی مکمل ہوا۔ سیّدہ طاہرہ کریمہ "مکمل شجرۂ نبوت کی وہ ہری بھری شاخ تھیں جس کی قلمبندی ہم جنسِ نبوت یعنی امامِ ولایت، علیؑ سے ہوئی اور اسطرح شجرۂ نبوت کا ذائقہ قیامت تک کے لئے قائم و دائم ہو گیا۔ حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو میری لختِ جگرؑ کی شادی ہی نہ ہوتی۔ گویا پودا ہم جنس نہ ہوتا تو قلمبندی بھی ممکن نہ ہوتی۔ معلوم ہوا کہ بحرین سے مراد، بحرِ نبوت و بحرِ ولایت ہے اور ان بحور کے یَلۡتَقِیٰنِ سے، جو مرجان اور موتی جنم لیتے ہیں، وہ حسنؑ و حسینؑ ہیں!

یہ اللہ کی سنت ہے کہ ہدایت کا کام لینے کے لئے ہمیشہ دو کو منتخب کرتا ہے کیونکہ ایک کے نصیب میں ہدایت دینا مقرر ہی نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً آنکھ، کان، ناک، ہاتھ، پاؤں وغیرہ ہادی ہیں، اس لیے جوڑا ہیں، زبان چونکہ اکیلی ہے اور جھول کھا جاتی ہے اس لیے ہادی نہیں بنائی گئی، بلکہ اس کو قابو میں رکھنے کے لیے بتیس دانتوں کا پہرہ اور ہونٹوں کا پھاٹک لگا دیا گیا، حتیٰ کہ دہن کا قفل اس کی نگرانی کرتا ہے۔ حالانکہ دیکھنے میں نازک معلوم ہوتی ہے مگر یہ خطرناک ہے، اس لئے کہ اپنے گھر سے نکل آئے تو وہ

Marfat.com

فساد و جھگڑا کرواتی ہے کہ الامان والحفیظ۔ شکر ہے اللہ نے ہدایت کا کام اس کے ذمہ نہیں رکھا، وگرنہ اسے لگام دینا مشکل ہو جاتا۔ دل و دماغ دونوں مل کے ہادی ہیں، آدمؑ اس وقت تک ہادی نہ بنے جب تک شیثؑ ساتھ نہ ہوئے، نوحؑ اس وقت تک ہادی نہ بنے جب تک سامؑ ہمراہ نہ ہوئے، ابراہیمؑ ہادی نہ بنے جب تک اسماعیلؑ کی قربت نہ ہوئی، موسیٰؑ ہادی نہ ہوئے جب تک ہارونؑ کا تقرر نہ کروایا، لیکن عیسیٰؑ چونکہ اکیلے رہ گئے اس لیے ہدایت چھڑوا کر انہیں رفعت عطا کر دی گئی۔ خاتم النبیینؐ تشریف لائے تو علیؑ ساتھ ہوئے، علیؑ ہادی بنے تو حسنؑ ہمراہ تھے، حتیٰ کہ اولادِ رسالتمآبؐ میں جب بارہواں آیا اور اکیلا رہ گیا تو اللہ نے اس کے لئے بھی غیبت مقرر کر دی، کیونکہ یہ سنت الٰہی نہیں کہ اکیلے سے ہدایت کا کام لیا جائے۔ اب تمام مسلمانانِ اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ بارہویں امام مہدیؑ آئیں گے جب کہ ان کے ہمراہ عیسیٰؑ ہونگے اور اللہ ان دونوں سے ہدایت کا کام لے گا۔ اکثر عیسائی کہتے ہیں کہ ہمارا عیسیٰ آسمان میں غائب ہے اور مسلمانو! تمہارا مہدی زمین میں رُکا ہوا ہے۔ ہمارے اور تمہارے 'غائبوں' میں زمین آسمان کا فرق ہے! لیکن جب دونوں اکٹھے ہوں گے تو چونکہ امام مہدیؑ زمین والے یعنی دخیل کار ہونگے اس لیے امامت وہ ہی کروائیں گے اور عیسیٰؑ چونکہ بے دخل ہیں اس لیے وہ اقتداء میں نماز پیش کریں گے۔ اس وقت دونوں ازلی بحرین ایک دفعہ پھر مل جائیں گے، گو بحرِ بنی اسماعیل کی نمائندگی امامت میں پیش ہو گی اور بحرِ بنی اسرائیل کی روحانیت مقتدیوں کی صف میں ہو گی!

۴۴۔ شکر

جد الانبیاء ابراہیمؑ کے دور میں لوگ آدم زاد کی قربانی کے قائل تھے اور ہبل زحل بت کے نام پر ہر سال ایک فرد کی جان، قربانی کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ عام خیال یہی تھا کہ اگر یہ قربانی پیش نہ کی جائے تو نجانے کیا ہو جائے گا؟ جب ابراہیمؑ نے لوگوں کو فرمانِ خداوندی سے روشناس کروایا

Marfat.com

اور سمجھایا کہ تمہاری جان انمول ہے اور اس طرح زیاں قبیح ظلم، تو وہ ماننے سے انکاری ہو گئے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ میں اپنے بڑے بیٹے اسماعیل کو قربانی کے لیے پیش کرتا ہوں، اگر اس کی قبولیت ہو گئی تو مان لیں گے کہ ایسی قربانی اس کے ہاں مقبول ہے اور اگر نتیجہ اس کے مخالف ہوا تو آپ لوگوں کو یہ رواج ختم کرنا ہو گا۔ اسی مقصد کے لیے ابراہیمؑ نے اپنی زوجہ بی بی ہاجرہؓ کو کہا کہ بیٹے کو تیار کر دیں کیونکہ ہمیں ایک دعوت پر مدعو کیا گیا ہے۔ ماں کی ممتا نے اسماعیلؑ کو خوب صاف ستھرے کپڑے پہنائے، آنکھوں میں سرمہ لگایا، سیر ہو کر کھانا بھی کھلایا کہ مبادا دعوت میں دیر ہو جائے اور میرا بیٹا بھوک کی شدت کی وجہ سے پریشان ہو۔ ایک ممتا اُمِ لیلیٰ ہے جو میدانِ کربلا میں بھیجتے وقت اپنے شیر خوار علی اصغرؑ کو تیار بھی نہیں کروا سکیں، کھانا کھلانا تو کجا، ایک گھونٹ پانی بھی نہ دے سکیں۔ اس ممتا پر کیا بیتی ہو گی؟ اسماعیلؑ تو حکمت الٰہی سے کامران ہو کر، زندہ سلامت گھر آ پہنچے تھے، علی اصغرؑ کی تو لاش بھی اُم لیلیٰ تک نہیں آ سکی۔ کیا عظمت اور شان ہو سکتی ہے ایسے عالی حوصلہ کردار کی!

سورۃ البقرہ آیت ۱۵۲ میں ہے: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ: یعنی پس ذکر کرو میرا میں تمہارا ذکر کرونگا اور شکر کرو میرا اور مت ہو جاؤ ان میں جو جھٹلانے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس کا ذکر ہی اس کا شکر ہے اور اگر اس مالک کو جھٹلایا جائے تو نہ ذکر قبول ہو گا اور نہ ہی شکر تسلیم کیا جائے گا۔ کسی بیتی ہوئی سرگزشت کا بیان ذکر کی مد میں آتا ہے۔ ہر بنی آدم کے ساتھ مالک کائنات کا کوئی ایسا حادثہ اور واقعہ، لازماً پیش ہی نہیں آیا، جس کو بیان کر کے اس کا ذاکر ہو، تاکہ پھر وہ ربِ ذوالجلال اس شخص کا ذکر کرے۔ ایک ہی ممکنہ صورت نظر آتی ہے کہ اس کا شکر ادا کرنے کو ہرگز نہ جھٹلایا جائے یہ شکر ہی اس کا ذکر ہو گا۔ اسی شکر کے بدلے میں وہ تمہارا ذکر کرے گا۔ جیسا سورۃ ابراہیم آیت ۷ میں بھی ہے۔: لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ: یعنی تم میرا شکر ادا کرو، میں تمہیں مزید عطا کروں گا۔ اللہ کے دیے ہوئے اناج میں سے کسی نے آج دال کھائی اور کھانے کے بعد زبان سے الحمد للہ کہا، تو کیا ادا شدہ

Marfat.com

الفاظ اس کا شکر بن گئے؟ شکر، دراصل یہ ہوگا کہ اس اناج سے جو قوت میرے جسم میں آتی ہے اس تمام تر قوت کو عطا کرنے والے کی راہ میں صرف کردوں تو وہ اس سے بہتر مجھے عطا کرے گا، وگرنہ خالی اور زبانی شکرانہ مقبول نہیں ہوتا۔ علی ھذا القیاس لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ کا صیغہ متقاضی ہے کہ مقبول شکر پر پہلے سے بہتر عطا ہو۔ رسالتمآبؐ پر بے شمار عنایاتِ خداوندی ہوئیں۔ مثلاً آپ کو رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ بنایا گیا، خاتم المرسلین کہا گیا، حبیب خدا مانا گیا، وجہ تخلیقِ کائنات فرمایا گیا۔ آپؐ بلاشک ان گوناگوں اور عظیم نعمتوں کا شکر مسلسل ادا کرتے رہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے ختم المرسلین ورحمۃ للعالمین سے بڑھ کر اور کیا انعام ہو سکتا ہے؟ جو آپؐ کو لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ کے طور پر عنایت ہو۔ مالکِ کائنات غیر منصف نہیں اس لئے حضورؐ کو بھی صحیح شکر ادا کرنے پر بہتر عطا کرنے کا پابند ہے۔ لہذا شکرانہ کے انعام میں پہلے آپ کو وصیٔ رسول، علی المرتضیٰؑ عطا ہوئے۔۔ اس عطا کے شکرانہ میں عترتِ رسول سلام اللہ عنایت ہوئیں۔۔۔ اس عطا کے شکرانہ میں حسنؑ عطا ہوئے۔۔۔ اس عطا کے شکرانہ میں ماں باپ کی زینت، زینب سلام اللہ عطا ہوئیں۔۔۔۔ اور اس شکرانہ کے صلہ میں لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ حسینؑ تک پہنچا۔ یہ انعام، رحمۃ للعالمینی سے مزید اس طرح ہے کہ سورۃ الدھر کی اوّل آیت: ھَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّھۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡرًا: گواہی دے رہی ہے کہ وہ انسان ہے کبھی دھر میں، مگر شے نہیں بلکہ لا شیٔ ہے۔ دوسری جگہ سورۃ الرحمٰن آیات ۱ تا ۴ میں ہے: اَلرَّحۡمٰنُ ۙ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ ؕ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ ۙ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ: اس عظیم المرتبت انسان کی شان ہے کہ اسے قرآن کریم کا علم پہلے عطا ہوا، بحیثیت انسان اس کی تخلیق بعد میں ہوئی اور انسان ہونے پر اسے نطق یعنی بیان کی قوت عطا ہوئی۔ یہ علیؑ کی بابت ذکر ہے جس کی پیدائش حرم کعبہ میں ہوئی۔ اس ولائیت کلی کو، رسالت کلی کی لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ کہنا عبث نہیں۔ حیائے کلی اور فطرت کی اصل فاطمۃ الزہرا سلام اللہ کو ولائیت کلی کی لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ ماننا بھی

Marfat.com

برحق ہے۔ جب: مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ: ہو جائے تو: يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ: کی شکل میں جو حُسنِ کُلی، شجاعتِ کُلی اور زینتِ کُلی ہو، وہ بھی لَاَزِیْدَنَّکُمْ ہی کا راز ہو گی۔ یہ لَاَزِیْدَنَّکُمْ کا عمل اولادِ رسول میں جاری و ساری ہے اور ہر امام پاکؑ اسی کا مصداق ہے!

انہی عظیم المرتبت اور فخر موجودات ہستیوں کی بابت سورۃ الاحزاب آیت ۳۳ میں ہے: اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا: کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارادہ فرمایا ہے کہ ان ہستیوں (اہل بیتؑ) سے نجس کو دور کر دے۔ اور انہیں ایسا پاک و مطہر کر دے جیسا کہ مطہر کرنے کا حق ہے۔ حافظ سائیںؒ فرمایا کرتے کہ جب نجس کو ان کے پاس بھی پھٹکنے کی اجازت نہیں، تو جو نجس ان سے دور رہنے پر مجبور رہے، اسے دور ہی رہنے دو۔ تم اس بات پر شکر کرو کہ تمہیں اس مالک نے اپنی عنایت خاص سے ان ہستیوں سے دور نہیں فرمایا اور ان سے محبت کرنے کی سعادت بخشی ہے۔ قریب ہے کہ تم ان کی مودۃ کے لائق بھی ہو جاؤ۔ یہ شکر کی بنیاد پر تمہاری لَاَزِیْدَنَّکُمْ ہو گی۔

۴۵۔ ولیٔ امین

اللہ پاک بادشاہ سلامت مالک و خالقِ کُل کائنات، خالقِ وحی بھی ہیں۔ تخلیقِ وحی کا کام فقط اسی ذات واجب الوجود سے متعین ہے۔ پہلے پہل یہ وحی ابراہیمؑ کیلئے خلق ہوئی پھر روایات کے مطابق موسیٰؑ، داوٗدؑ اور عیسیٰؑ کیلئے مرتب ہوئی اور آخری اور تصدیقاً مکمل وحی محمد الرسول اللہؐ کیلئے ارسال ہوئی۔ لیکن ہر دفعہ یہ عملِ تخلیقِ وحی اسی ذات عزاسمہٗ تعالیٰ نے کیا۔ بلا شک وحی کا خالق وہ اللہ ہے۔ لیکن اُس وحی کو اپنے رسولوں تک پہنچانے کا کام اللہ خود نہیں کرتا، مراد یہ ہے کہ وحی تخلیق فرما کر وہ خود اپنے رسولوں تک رسائی نہیں کرتا کہ مرتب شدہ وحی اُن کو پہنچا آوے، بلکہ وحی کی ترسیل کیلئے

Marfat.com

اُس نے ایک مقرب فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جس کو 'جبرائیلؑ' کہتے ہیں۔ اِس فرشتہ کے ذمّہ ہمیشہ سے ایک ہی ڈیوٹی ہے کہ وہ وحیِ الٰہی کو ذاتِ باری سے لیکر اُس رسول تک پہنچادے جس کیلئے وہ وحی تشکیل دی گئی ہوتی ہے۔ نصِ قرآن سے ثابت ہے کہ جبرائیلؑ، امین ہیں۔ امین وہ ہوتا ہے جو امانت میں خیانت نہ کرے یعنی اُسے امانت کے طور پر جو شے اور جیسی دی جائے وہ اُسے من و عن اور مکمل حفاظت کے ساتھ سنبھالے اور اُسی مکمل حالت میں لوٹانے یا پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔ علاوہ ازیں، تحریف و تبدّل کے بغیر اُس کا دیندار رہو۔ سو امین ہونے کے ناطے جبرائیلؑ، وحیِ الٰہی کو ہو بہو اُسی شکل اور حالت میں متعلقہ رسول تک لاتے رہے جس طرح اسے عطا کی جاتی تھی۔ اُس میں کمی بیشی اور تبدیلی کا شائبہ بھی ناممکن ہوتا۔ ابراھیمؑ کی طرف بھیجی گئی وحی کو قرآن نے صحائف فرمایا ہے، موسیٰؑ کو تورات بشکلِ الواح عطا ہوئی۔ ان میں کسی ردوبدل کا امکان موجود نہیں تھا کیونکہ ان کے لانے اور پہنچانے والا 'امین' تھا۔ داؤدؑ کو زبور کی شکل میں وحی بھی جبرائیلؑ امین کے ذریعے میسر آئی۔ ازاں بعد قابلِ ذکر وحی عیسیٰؑ کی طرف بھیجی گئی جس کو قرآن میں انجیل کہہ کر پکارا گیا، اُسے بھی جبرائیلؑ امین ہی عیسیٰؑ تک لائے۔ روایات کے مطابق مختلف لوگوں نے مختلف موقعوں پر انجیل کے مختلف حصے سنے اور عیسیٰؑ کی رفعت کے بعد اسے اپنے اپنے انداز میں تحریر کیا۔ گو بد قسمتی سے آج سابقہ زمانوں میں ارسال کی گئی وحی کی مستند تحریری شکلیں موجود نہیں مگر یہ قرآنی تصدیق موجود ہے کہ اُن انبیاءؑ کی طرف اُن ناموں کی کتب وحی کی گئیں۔ آخری مستند وحی جو اللہ پاک نے جبرائیلؑ امین کی وساطت سے بھجوائی وہ نبی آخر الزمان حضرت محمدؐ کی طرف تھی۔ وحی لانے والے جبرائیلؑ تو امین ہیں ہی، یہ حبیبِ کبریاؐ بھی صادق و امین ملقب ہیں۔ اپنے خصائل اور اخلاقِ حمیدہ کی وجہ سے وہؐ اوائل عمر سے ہی ان القاب سے مشہور تھے۔ جب ایک امین فرشتہ وحیِ الٰہی کو صدق و امانت کے ساتھ محمد الرسول اللہؐ تک لے آتا، تو وہ بھی امین ہونے کے ناطے اُس وحی میں ذرہ برابر ردّوبدل نہ فرماتے بلکہ

Marfat.com

پوری لگن، توجہ اور دلجمعی کے ساتھ اس کو قرآت فرماتے کہ اُس میں کسی تحریف کے احتمال کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

یہاں ایک نکتہ بیان کرنا مناسب ہو گا۔ ایک صنف ہے پڑھنا یعنی (reading) جس کیلئے ضروری ہے کہ کتاب وغیرہ کی شکل میں کوئی ماڈل سامنے ہو اور اُسے قوتِ بصارت (sense of sight) سے دیکھ کر پڑھا جائے جس سے مراد یہ ہے کہ پڑھنے کے لئے کسی ماڈل اور قوتِ بصارت، دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ اِس کے علاوہ ایک لفظ استعمال ہوتا ہے تلاوت یعنی (recitation)، اِس کے لئے بھی ضروری ہے کہ پڑھی جانے والی شے کی شکل میں ماڈل موجود ہو، ازاں بعد قوتِ بصارت سے اُسے دیکھا جائے اور پھر قوتِ گویائی یعنی (Speech/ voice) سے اُس کا اظہار کیا جائے۔ مختصراً تلاوت کے لئے ضروری ہے کہ ماڈل موجود ہو اور قوتِ بصارت کے ساتھ قوتِ گویائی بھی استعمال ہو، لیکن اس میں یہ شرط نہیں کہ اسے کوئی سننے والا لازماً موجود ہو۔ ایک صنف اور ہے جس کا نام ہے قرآت۔ یاد رہے قرآت ہمیشہ ماڈل کے بغیر ہوتی ہے یعنی تحریری شکل میں کوئی چیز سامنے نہیں ہوتی، لہذا اس کے لئے قوتِ بصارت کے استعمال کی چنداں ضرورت نہیں۔ لہذا قرآت، بغیر کسی ماڈل کی موجودگی کے، اپنی قوتِ گویائی سے براہِ راست اظہار کو کہتے ہیں۔ لیکن اس میں یہ شرط لازم ہے کہ اسکا سامع موجود ہو اور قرآت کرنے والا بامعنی انداز میں سامع یا سامعین کو سنا رہا ہو۔ جبرائیل آمین کی طرف سے لائی گئی وحی کبھی کسی کو نظر نہیں آئی اور نہ ہی کبھی ایسا ہوا کہ کسی نے محمد الرسول اللہ ؐ کو کوئی نامہ و مکتوب پڑھتے دیکھا ہو کہ اسے وحی کہا جا سکے۔ لیکن ایسا ضرور ہے کہ یہ وحی ہمیشہ کاتب/ کاتبانِ وحی کی موجودگی میں سنائی گئی۔ اس لحاظ سے ثابت ہوا کہ حضورؐ عملِ قرآت فرمایا کرتے تھے۔

عام مشاہدہ کی بات ہے کہ قرآت کو سننے والا، اپنی قوتِ سماعت (Sense of hearing) کو استعمال کرے گا، لیکن اگر اس کی قوتِ سماعت میں کمی ہو، یا، پوری توجہ سے سُن نہ سکے تو یقیناً قرآت کی گئی

Marfat.com

وحی کو مکمل طور پر سمجھنے سے معذور ہو گا۔ اور جو خود سننے یا سمجھنے سے قاصر ہو، اُس کے لئے محال ہے کہ وہ قرآت کی گئی بات کسی دوسرے کو سُنا اور سمجھا سکے، چہ جائیکہ اُسے تحریری شکل دے سکے کہ وہ قرآت ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآت سننے، سمجھنے، سمجھانے اور بوقتِ ضرورت لکھنے کے لئے لازم ہے کہ قرآت کا سامع یا مخاطب بھی 'امین' ہو۔ سماعت کا امین ہو گا تو خود مکمل طور پر سُن اور سمجھ سکے گا، عقل کا امین ہو گا تو مکمل طور پر ذہن میں محفوظ رکھ سکے گا اور قلب کا امین ہو گا تو مکمل طور پر سمجھا بھی سکے گا اور تحریر کر کے قرآن کی شکل بھی دے سکے گا۔ یہ بات تاریخ کا حصہ ہے کہ نبی آخر الزمانؐ نے کبھی بھی وحی کو اپنے ہاتھ سے تحریر کر کے پیش نہیں کیا اور نہ ہی کوئی صحیفہ یا لوح اس امین فرشتہ کی وساطت سے آپؐ کو ملی۔ آپؐ نے ہمیشہ وحی کو قرآت کیا اور یہ عمل ابتدائے نبوت سے حجتہ الوداع تک مسلسل، مگر وقفوں سے بائیس (۲۲) برس سے زائد عرصہ تک جاری رہا۔

اس تمام تر قرآت کی گئی وحی کو ایک مخصوص تحریری ترتیب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ترتیب دینے والا ہر وحی کے نزول اور قرآت کئے جانے کے وقت پر وہاں موجود ہو، تبھی اُس کیلئے تمام قرآت کی گئی وحی کو مکمل طور پر تحریر کرنا ممکن ہو گا۔ پورے انصاف سے غور کیا جائے تو فقط ایک ہی شخصیت نظر آتی ہے جو وقتِ اعلانِ نبوت سے شروع ہو کر، شعبِ ابی طالب سے گزرتے ہوئے، ہجرتِ مکہ کے موقع پر، بدر، احد، خندق اور معرکہ خیبر کے بعد فتح مکہ سے لیکر دنیا سے ظاہری پردہ فرمانے تک اپنے آقاؐ کے ساتھ سایہ کی طرح ہمراہ رہی۔ وہ ہے داماد و وصیِ رسولؐ، علی ابنِ ابی طالبؑ، جو گرمی سردی، سفر و حضر، تنگی و کشادگی، امن و جنگ حتی کہ ہر حال میں اپنے مربی و آقاؐ کے ساتھ رہے۔ اس لئے فقط انہی کے لئے ممکن ہوا کہ وہ ہر قرآت کی گئی وحی کے سامع بن سکے، پیکرِ عقل و فہم کی حیثیت سے سمجھ سکے، اور قالب امین ہونے کی وجہ سے بالآخر اُسے تحریر کا روپ دے سکے، تاکہ وہ

Marfat.com

قیامت تک محفوظ ہو سکے۔ اُس تحریر کردہ روپ وحی کا نام ہے ' القرآن '، جو تب تک یہ شکل اختیار ہی نہیں کر سکتا جب تک کاتبِ قرآتِ وحی، 'امین' نہ ہو۔ اس حاصل کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ:۔

وحی لانے والے، جبرائیلؑ امین............................وحی قرآت کرنے والے، صادقؐ و امین

قرآت کی گئی وحی کو کتابت کرنے والے............................ولی امینؑ

اللہ صاحب خالقِ وحی ہیں............................جبرائیل امین پیغمبرِ وحی ہیں

صادق وامین قاریٔ وحی ہیں............................جب کہ ولیٔ امین خالقِ قرآن ہیں!

۴۶۔ ضربُ المثل

سورۃ الکھف آیات ۳۲تا۴۴: وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۞ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۞ وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ۞ وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۞ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۞ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۞ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ۞ وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ۞ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۞ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۞ وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَ هِيَ

Marfat.com

خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا: یعنی بیان کریں مثال دو مردوں کی، کئے ہم نے ان میں سے ایک کے لیے انگور کے دو باغ اور ڈھانپ دیا ہم نے ان کو کھجوروں سے اور کر دی ہم نے ان دونوں کے درمیان کھیتی۔ دونوں باغ اپنے پھل لائے اور ان میں کچھ کمی نہ رہی اور ہم نے جاری کی ان دونوں کے درمیان نہر۔ اور اس ایک کے لیے پھل کیے، پس اس نے اپنے صاحب سے کہا اور وہ محاورتاًبات کرتا تھا کہ میں مال اور آدمی تم سے زیادہ رکھتا ہوں۔ اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اور اپنی جان پر ظلم کیا جب کہنے لگا مجھے کوئی وہم نہیں، یہ کبھی ختم نہ ہو گا اور مجھے موت کا بھی گمان نہیں اور اگر اپنے ربّ کی طرف لوٹا تو یقیناً اس سے بہتر پاؤں گا۔ اس کے صاحب نے محاورتاً جواب دیا کہ اس سے کفر کرتے ہو جس نے تمہیں تراب سے تخلیق کیا، پھر نطفہ کیا پھر مکمل مرد کیا۔ لیکن ضرور وہی اللہ میرا ربّ ہے اور میں اپنے ربّ کا شریک نہیں ٹھہراتا۔ اور کیوں نہ ہوا کہ جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو ماشاءاللہ کہتا، کیونکہ اللہ کے سوا حقیقی قوت واختیار کسی کے پاس نہیں۔ اگر تجھے یوں دکھائی دیتا ہے کہ میں مال اور اولاد میں تجھ سے کم ہوں تو ممکن ہے میرا ربّ مجھے تیرے باغ سے اچھا دے اور تیرے باغ کو آسمانی بجلی سے اجاڑ دے یا وہاں پانی کی قلت کر دے۔ اور اسکے پھل مرجھا گئے اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا کہ ساری پونجی گئی اور کہتا تھا کاش میں شرک نہ کرتا۔ اب وہ بے یارو مددگار تھا۔ سچ ہے اختیار اللہ کا ہے اور اسی کی طرف سے ثواب اور انجام بہتر ہے۔

جیسے کُل قرآن تمثیل کی مانند بیان ہوا ہے ویسے ہی مذکورہ بالا رکوع میں بالخصوص ایک مثال بیان کی گئی ہے۔ جس طرح ایک ضرب المثل تب تک سمجھ نہیں آتی جب تک اس کی 'وجہ تسمیہ' کو مکمل طور پر نہ سمجھ لیا جائے، اسی طرح قرآن کے فہم (decoding) کے لیے بھی ہر تمثیل کو بخوبی سمجھنا ضروری ہے۔ ضرب المثل دراصل مکمل داستان کی مانند ہوتی ہے، جسے چند الفاظ میں بیان کیا گیا ہوتا

Marfat.com

ہے۔ دوسری بڑی خوبی اس میں یہ ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت آفاقی ہوتی ہے، یعنی کہ جہاں کہیں ضرب المثل بولی جائے اس کا مفہوم وہی لیا جاتا ہے جو دنیا کے کسی اور خطے میں سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے وحیُ الٰہی میں تمثیلی انداز اپنا کر دونوں فوائد لیے گئے ہیں۔ اولاً یہ کہ صرف چھ ہزار (۶۰۰۰) سے کچھ زائد آیات میں ازل سے پہلے اور ابد کے بعد تک کے تمام احوال، راز اور بھید، تمثیل کے انداز میں وحی کر کے قرآن میں وارد کر دیے گئے ہیں اور دوئم یہ کہ ان تماثیل کا مفہوم آفاقی ہونے کی بنیاد پر، یہ ہر جگہ اور ہر دور کے بنی نوعِ آدم کے لئے ایک ہی طرح سمجھی جانے کے قابل ہیں۔ بالا ضرب المثل بھی اسی ہمہ گیر شان کی حامل ہے۔ دو مردوں (رَّجُلَيْنِ) کا ذکر ہے، جن میں سے ایک کو دو باغات عطا ہوئے اور دونوں ایک ہی میوہ یعنی انگور کے ہیں۔ ان دونوں باغوں پر کھجور کے درختوں نے جھنڈ کر رکھا ہے، ان دونوں کے درمیان کھیتی ہے اور وہاں ایک نہر جاری کی گئی ہے۔ باغات میں بالکثرت پھل ہوئے جنہیں دیکھ کر اُن کا مالک اِترا گیا۔ وہ ایک باغ میں داخل ہوا اور ایسے کلمات کہے جن میں تکبرانہ انداز محسوس ہوتا تھا۔ مثال کے مطابق دونوں کی حیثیت صاحب اور مصاحب کی ہے۔ صاحب نے تکبرانہ انداز کو ٹوکا اور باور کروایا کہ مالک و خالقِ کُل کائنات کے حضور یہ انداز، ناپسندیدہ ہے، وہ اس پر پکڑ بھی کر سکتا ہے، اور ایسا ہی ہوا کہ آسمانی بجلی کی آفت اور پانی کی قلت کے باعث وہ دونوں باغ اجڑ گئے۔ جس پر وہ مصاحب افسوس کرتا تھا اور زبان حال سے کہتا تھا کہ سب کچھ سچے اللہ کی ملک ہے اور وہ ہی تمام خوبیوں اور اچھائیوں کا بھی مالک ہے۔

رَجُل عربی زبان میں عموماً مَرد کو کہتے ہیں جب کہ رِجل کے معنی پاؤں کے ہوتے ہیں۔ خیال یہی کیا جاتا ہے کہ پاؤں پر چلنے کی وجہ سے اسکا مفہوم مَرد ہو گیا حالانکہ پاؤں پر عورتیں، بچے اور بوڑھے بھی چلتے ہیں، حتّٰی کہ اور بہت سی مخلوقات بھی اپنے پاؤں پر ہی چلتی ہیں۔ بظاہر اس انداز سے رَجُل کا معنی صرف مَرد لینا بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ سورۃ الاحزاب آیت ۴۰ میں ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ

Marfat.com

رِجَالِکُمْ: یعنی محمدؐ تم میں سے کسی مذکر یا مرد کے باپ نہیں ہیں۔ اس میں رَجُل، مرد کی بجائے مذکر کے معنوں میں بہتر لگتا ہے اور اس ترجمہ کی بنیاد پر مفہوم نسبتاً وسیع ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو مذکر افراد کا ذکر کیا جا رہا ہے، جن کی آپس میں صاحب اور صحابی جیسی نسبت ہے۔ ان دونوں میں سے صحابی کو دو باغات انگور کے عطا ہوئے جن کو کھجوروں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ضرب المثل کے مطابق یہ مثال صاحب (محمد الرسول اللہؐ) اور صحابی (علی ولی اللہ) کی بھی ہو سکتی ہے۔ صحابی (علی) کو بیٹوں کی شکل میں دو باغات عنایت کیے گئے اور دونوں ہی انگور کے ہیں۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں ایک ہی منصب یعنی امامت کے حامل ہیں، اس لئے ہم جنس ہونے کی وجہ سے دونوں باغات کو ایک ہی قسم کے میوہ یعنی انگور سے تشبیہ دی گئی۔ ضرب المثل کے مطابق دونوں باغات کو صرف کھجور کے پھل نے ڈھانپ رکھا تھا، جو تمثیلِ ولائیت کی طرح لیا جا سکتا ہے، کیونکہ بلاشک دونوں امامینؑ میں صفتِ ولائیت بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ من حیث الکل یہ مثل شانِ امامت کو خوبیٔ ولایت سے متمتع کرنے کے مترادف ہے۔ ان دونوں باغات یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے درمیان ایک کھیتی کا تذکرہ بمعنی بی بی زینب ہیں۔ چونکہ کھیتی کا لفظ مونث ہے، اس وجہ سے بھی یہ معنی نہایت موزوں لگتا ہے اور ان کے درمیانی خلال (gap) میں جس نہر کے اجراء کا اشارہ ہے وہ بمعنی عباسؑ ہیں۔

صحابی کسی روز دونوں میں سے اپنے ایک باغ میں داخل ہوتے ہیں، چونکہ یہ تخصیص نہیں کی گئی کہ کونسے باغ میں داخل ہوئے، اس لیے واضح اشارہ ملتا ہے کہ دونوں باغوں میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں ہوگا۔ دونوں میں سے کسی ایک میں داخل ہونا، دونوں ہی میں داخل ہونے کے مترادف مانا جائے گا۔ اس لحاظ سے بھی ہماری بات قرین از قیاس ثابت ہوتی ہے کہ امامین کریمین ہی کی بابت اشارہ ہے، اس لیے کہ بلا شک وشبہ ہر دو (۲) امامینؑ مکمل طور پر ہم جنس ہیں کہ 'کچھ فرق نہیں ان دونوں میں' سچ اور برحق ہے۔ بہر طور جب صحابی (علی) ان میں سے ایک میں داخل ہوئے تو انگور کے باغ پر چھائی

Marfat.com

کھجور کے جھنڈ کا مشاہدہ کر کے یعنی امامت وولائیت میں گُندھی ہستی دیکھ کر کچھ دیر کو یقیناً اِترا گئے اور خیال کیا کہ جیسا یہ انعام مالک کائنات نے مجھ پر کیا ہے نہ پہلے کبھی کسی پر ہوا نہ آئندہ امکان ہو گا۔ ویسے یہ شبہ سے بالا حقیقت ہے کہ کُل کائنات میں اور کوئی ایسا باپ نہ ہوا ہے نہ ہی ہو گا جس کے دو پسران شانِ امامت کے بھی حامل ہوں اور ولایت بھی ان کی گھٹی میں شامل ہو۔ مگر ہوا یوں کہ صحابی نے ایسا سوچتے ہوئے اپنے صاحب کو جتلایا کہ 'مالک نے مجھے جس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا ہے وہ آپؐ کے حصّہ میں نہیں آئی۔ دو ہم جنس بیٹوں کی شکل کے دو باغات عطا کیے گئے جو انگور (صفتِ امامت) کے حامل ہیں اور کھجور (شانِ ولائیت) سے ڈھکے ہیں۔ ان کے درمیان زینب سلام اللہ علیہا کی شکل میں کھیتی ہے اور ان دونوں کے خلال میں عباسؑ، نہر کی طرح جاری ہیں۔ مجھے یہ انعام بطور خاص عطا ہوا ہے۔ ازل سے لیکر اب تک اور یقیناً اب سے لیکر ابد تک اور کوئی اتنا خوش نصیب نہ ہو گا جتنا مجھے کیا گیا ہے۔ اور تو اور یہ نعمتیں آپ کو بھی عطا نہیں ہوئیں۔ اب اوّل تو میں یقینی گمان سے کہتا ہوں کہ یہ مجھ سے کبھی نہ چھینی جائیں گی اور اگر ایسا ہوا کہ مجھے موت کا ذائقہ چکھنے کے لئے اس کے شکنجہ میں آنا پڑے تو بھی میرا پختہ گمان ہے مجھے اس طرح کی نعمتیں پھر بھی مل جائیں گی'۔

صاحب نے اس محبّ صحابی کے وقتی طور پر اترانے کو بھانپ لیا اور اسے اشارتاً بتایا کہ یہ مناسب بات نہیں ہے، تمہیں ہر حالت میں اپنے مالک کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے اور جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے اُسے مالک کی عطا سمجھنا چاہیے۔ ایسے فقرات بہر طور کسی قیمت پر منہ سے نہ نکالیں، کیا معلوم وہ مالک جس کی یہ عطا ہے وہ کب آسمانی بجلی سے ان باغات کو اجاڑ ڈالے، یا پھر پانی زمین میں دھنسانے کے عذاب میں مبتلا کر کے ان باغات کو سکھا دے۔ اس حالت میں تمہیں کوئی اختیار نہ رہے گا اور بے اختیاری میں تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ وہ تمام پھل (نعمتیں) جو تمہیں ان باغات سے میّسر آتے ہیں وہ مرجھا سکتے ہیں اور تم اس وقت کوئی مدوا بھی نہ کر سکو گے۔ اس لیے سچے مالک کا اختیار ہمیشہ مانو اور اپنے

Marfat.com

آپ کو اس کی سپردگی میں دیے رکھو! جلد ایسا ہی ہوا۔ کوئی شک نہیں صاحب (محمد الرسول اللہؐ) کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اور صحابی (علیؑ) اترانے کے قابل اس دولت سے سرفراز تھے، بلکہ مالکِ کائنات نے جیسی اولاد علیؑ کو عطا کی تھی، اس کی مثل نہ قرونِ اولیٰ میں دستیاب ہے اور نہ ہی زمانہ مابعد میں اس کا کوئی ثانی ہوا ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے سانچہ میں اور کسی کو ڈھالا ہی نہیں گیا۔

مگر علیؑ کی شہادت کے کچھ ہی عرصہ بعد آسمانی بجلی کی شکل میں زہر نے پہلا باغ (امام حسنؑ) اجاڑ دیا اور ازاں بعد پانی زمین میں بہت گہرا چلا گیا اور فرات کے کنارے مقام کربلا پر ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کو دوسرا باغ (امام حسینؑ) بھی کملا کر سوکھ گیا۔ وہیں نہر (عباسؑ) بھی خشک ہو گئی اور کھیتی کی حرمت اس طرح پامال کی گئی کہ تاریخ کے اوراق میں اس سے المناک داستان ملنا محال ہے۔

تب مولائے کائنات علیؑ صرف ہاتھ ہی مل سکے ہونگے۔ خود اپنے پھلوں، پھولوں کو مرجھانے سے روکنا ان کے بس میں نہ رہا ہوگا!

۴۷۔ حُسن، حَسِین، حُسَینؑ

سورۃ النور آیت ۳۵ میں وارد ہے: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: یعنی اللہ پاک آسمانوں اور زمین کا نُور ہیں۔ لغوی طور پر اس کا مفہوم سمجھنا اور سمجھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ رات کو جب سورج ڈوب جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں چھا جانے والا اندھیرا متذکرہ آیت کی نفی کر دیتا ہے۔ ویسے نُور صرف روشنی اور اجالے کا نام نہیں ہے بلکہ اصطلاحی لفظوں میں نور کے سادہ ترین معنی ہیں 'حَسِین'۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حَسِین کے معنی بھی آج تک متعین نہیں ہو سکے۔ ہر شخص کے لئے حَسِین کا معیار الگ ہوا کرتا ہے، مجنوں کے لیے کالی آنکھوں والی لیلیٰ حَسِین تھی، ایران کے رہنے والوں کا حَسِین اور

Marfat.com

طرح کا ہے، جب کہ افغانستان کے باشندوں کا ان سے مختلف نظر آئے گا۔ حبشیوں کا حَسِینٗ خصوصی طور پر کچھ انوکھا ہے، تو برصغیر میں بسنے والوں کا ان سے بالکل جدا محسوس ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں سب سے نرالا حَسِینٗ شاعروں کا ہوا کرتا ہے، جس کا قد سرو کی مانند، گردن صراحی جیسی، رخسار دو انگاروں کی طرح، آنکھیں ہرنی کے نینوں سے مشابہ، پلکیں تیر کی شکل، بھنویں تلوار کی کاٹ رکھنے والی، زلفیں کالے ناگ کی مشابہ، دانت موتیوں کے مترادف، انگلیاں رواں کی پھلیوں کی مثل، ناک الف حسینی اور سینہ کا ابھار کشمیری سیب جیسا مقرر کیا جاتا ہے۔ ان تصورات کو من حیثُ الکُل اگر تصویر کا روپ دیا جائے تو سوائے ایک 'بَلاَ' کے اور کچھ نہ بن پائے گی مگر شاعر پھر بھی اسے حَسِینٗ کہنے پر مُصر ہوتے ہے۔ جسے اولادِ آدم بنانا چاہے اور اپنی طرف سے حَسِینٗ بنانے کی کوشش کرے تو وہ دراصل 'بَلاَ' بن جاتی ہے۔

حَسِینٗ، کے قریب ترین معنی 'بے عیب' ہوسکتے ہیں، گویا جو جس کو بے عیب سمجھے وہ اس کا حَسِینٗ ہوگا۔ جہان میں اللہ سے بڑھ کر کوئی بے عیب نہیں اس لیے وہ حَسِینٗ بھی ہے اور نُور بھی۔ اللہ کا رسول، بے عیب تو ہے مگر حادث ہونے کا عیب بہر طور اس میں موجود ہے۔ ہر حَسِینٗ فطری طور پر تقاضا کرتا ہے کہ اس کا کوئی چاہنے والا ہو، وگرنہ عام مشاہدہ کے تحت، ایسا نہ ہونے کی صورت میں، حُسن اداس و غمگین ہو جاتا ہے۔ گویا فطرتاً حُسن اپنی حیثیت کا چاہنے والا طلب کرتا ہے اور لامحالہ اللہ کی بھی چاہت ہوگی کہ جس حیثیت کا میں حَسِینٗ ہوں اسی حیثیت کا عاشق مجھے ملے۔ اس اصول کے مطابق ہم محسوس کرسکتے ہیں کہ اللہ کا حُسن اس وقت تک بے تاب رہا ہوگا جب تک اللہ جیسے حَسِینٗ کے حُسن کے مطابق، اسے عشق کرنے والا عاشق نہ مل گیا ہوگا۔ اللہ کا پہلا عاشق بنا آدمؑ۔ معشوق نے شرط رکھی کہ تین سمتوں میں بلا روک ٹوک جاسکتے ہو مگر چوتھے کونے میں نہ جانا۔ وہ صفتِ ٹھہراؤ کو چھوڑ کر بہاؤ کا شکار ہوا اور اسطرح خطا کھا گیا۔ عشق کا دوسرا امتحان نوحؑ نے دیا۔ نو سو برس

Marfat.com

تک اپنے قبیلہ والوں سے پتھر کھائے، کئی قسم کی مختلف تکالیف برداشت کیں، لیکن جب کشتی میں سوار ہونے کا وقت آیا، تو باوجودیکہ اللہ نے واضح الفاظ میں کہا کہ دیکھنا کسی نالائق کو آواز نہ دینا، وہ نالائق بیٹے کو اپنا سمجھ کر آواز دے بیٹھے اور اس طرح ان کی ناکامی پر، زمین شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ اگلا امتحان 'بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق' تھا، ابراہیمؑ منجنیق سے پھینکے جا چکے تھے، زمین سے اوپر اور آسماں کے نیچے کی درمیانی فضا میں معلق تھے اور آسمان کی بلندی کو چھوتی آگ کے شعلوں میں گرنے کے بالکل قریب تھے۔ یہ اتنا قوی عشق تھا کہ جب جبرائیلؑ مدد کرنے کو آئے تو اسے جواب دے دیا 'میری حاجت تجھ سے نہیں۔ میرا حامی و مددگار وہی ہے جس کے حُسن کا میں دیوانہ ہوں۔ اس پختگی کے نتیجہ میں آتشِ عشق نے آتشِ نمرود کو گُل و گلزار بنا دیا مگر ایسے نُجِل عاشق کو جب بیٹے کی قربانی کا حکم ملا تو اس کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔ اللہ نے کہا تم خلیل تو ہو، میرے حُسن کے مکمل عاشق نہیں۔ اُدھر فرعون، دعویٰ خدائی کر کے، موسیٰ کے محبوب کا تمسخر اڑا رہا تھا، وہ بھی زوردار عاشق تھے، ڈنڈا لیکر پہنچ گئے اور دریائے نیل میں ایسے غوطے دیے کہ وہ مصری تھا گھُل کے رہ گیا، لیکن طور پر تجلّیٔ الٰہی میں ایسے محو ہوگئے کہ ہوش جاتے رہے۔ عیسیٰ نے بھی امتحانِ عشق سے بہت جلد ہاتھ اٹھا لیا اور رفعت پسند کر لی۔ پھر جب باری آئی محمدؐ کی، فرمانے لگے میں پانچ کا مجموعہ ہوں، اگر وقت کی مناسبت سے ہر ہر جگہ عشق کا امتحان نہ دے سکا تو اپنا کلمہ پڑھوانا چھوڑ دوں گا۔ اور اگر تیرے حُسن کے مطابق اپنا عشق پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر اے مالک، تجھے بھی میرا کلمہ پڑھنا ہو گا۔ روزِ میثاق جب اللہ نے کہا تھا، ہے کوئی جو میرے عشق کا امتحان دے، تو چند ایسے بھی تھے جنہوں نے کہا کہ جب جب وقت ہو گا، تیری شہادت بھی دیں گے، تیرا امتحان بھی دیں گے اور اپنے عشق کا کمال بھی ظاہر کریں گے۔ آلِ محمدؐ میں سے ایک معصوم نے وقت آنے پر کہا، میرا نام ہے حُسینؑ اور تُو ہے حسین۔ حُسن میں اگر تجھے کمال ہے تو عشق میں مَیں بھی کامل ہوں۔ تُو حُسن کی انتہا ہے تو میں عشق کا انجام ہوں۔ اللہ نے کہا: حُسینؑ میں ہوں مالکُ الملک، تو میرا ملک ہے، ملک میں حکومت تو تیری ہو گی مگر ملکیت مالک کی

Marfat.com

ہو گی۔ اگر میرے ملک پر کوئی غاصبانہ قبضہ کرنا چاہے تو، حُسَینؑ کیا میری گواہی کے لیے ثبوتِ ملکیت پیش کرو گے؟

دیکھو حُسَینؑ اس کے لیے وطن چھوڑنا پڑیگا۔ نانا رسولؐ کی قبر چھوڑنی ہو گی۔ پانی سامنے ہو گا مگر معصوم بچوں کو بھی پیاسا رہنا پڑے گا۔ لاشیں بے گور و کفن ہو نگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!

۴۸۔ کرب، نجات اور کربلا

قرآن میں لفظ 'کرب' مندرج چار آیات میں استعمال ہوا ہے۔

i: سورۃُ الانعام آیات ۶۳۔۶۴: قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً ۚ لَىِٕنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۞ قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ: یعنی آپؐ فرما دیں کہ تمہیں خشکی اور تری کی تکالیف سے کون نجات دیتا ہے، جسے چھپ کر حالتِ زاری میں پکارتے ہو، کہ اگر تمہیں نجات دے تو تم اس کے شکر گزار بنو گے۔ ہاں اللہ ہی کی ذات تمہیں اس سے اور ہر قسم کے مصائب اور تکالیف سے نجات دلاتی ہے۔ حالانکہ تم پھر شرک کرتے ہو۔

ii: سورۃُ الانبیاء آیت ۷۶: وَ نُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ: یعنی نوحؑ نے اس سے قبل ہمیں ندا دی تو ہم نے اس کی پکار کو سنا، پس ہم نے اسے اور اسکے گھر والوں کو کربِ عظیم سے نجات دی۔

iii: سورۃُ الصّٰفّٰت آیات ۷۵۔۷۶: وَ لَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ ۞ وَ نَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ: یعنی ہم نے ندا دی نوحؑ کو، پس ہم پکار کا فوری جواب دینے والے ہیں۔ اور ہم نے اسے اور اسکے گھر والوں کو کربِ عظیم سے نجات دی۔

Marfat.com

١٧: سورۃ الصّٰفّٰت آیات ١١۴۔١١۵: وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ۚ وَ نَجَّیْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ: یعنی تحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارونؑ پر احسان کیا۔ اور ان دونوں کو اور ان کی قوموں کو کربِ عظیم سے نجات دلائی۔

بالا آیات میں چند الفاظ مشترک ہیں۔ ان کی حسبِ ضرورت تشریح کے بعد، آیات کی ترتیب وار تشریح درج ذیل ہے۔

کرب:۔ شدید غم کی وہ حالت جب تمام آسرے ٹوٹتے محسوس ہوں، کرب کہلاتی ہے۔ ویسے کسی شے کا الٹ پلٹ ہو جانا، بوجھ لاد دیا جانا اور جلد گل سڑ جانا بھی انہی معنوں میں ہے۔ عربی زبان میں رسّی بانٹنا بھی کرب کہلاتا ہے۔ پنجابی میں اسے 'کُنجل' کہتے ہیں۔ سورج غروب ہونے اور زمین میں ہل چلانے کے لئے بھی مستعمل ہے۔ بنیادی مفہوم شدت اور تکلیف ہی کا ہے۔

نجات:۔ کسی خطرہ سے محفوظ ہو کر الگ ہو جانا، بلند جگہ پر پہنچ جانا، تیز چل کر آگے نکل جانا اور مشکل سے بچ جانا اس کا مفہوم ہے۔ اس میں انعام کا پہلو نہیں پایا جاتا بلکہ وارد ہونے والی تکلیف کا فقط رفع ہو جانا اور اس سے قبل کی حالت میں واپس پہنچا دینا نجات ہے۔ مثلاً کنویں میں گرے شخص کو وہاں سے صرف باہر نکالنا نجات ہے، گرنے سے آنے والے زخموں کا علاج اس میں شامل نہ ہو گا۔

ظلم:۔ کسی کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا اور حق غصب کرنا، کسی کو اس کے مخصوص مقام سے ہٹانا یعنی اہل کو نااہل کہنا اور نااہل کو اہل گردانا، اندھیرا، تاریکی اور پردہ اسی معنوں میں مستعمل ہے۔ ظلمت یا ظلمات، ان مشکلوں کو کہتے ہیں جن کا حل سجھائی نہ دے۔

برّ:۔ بے آب و گیاہ اور بنجر زمین، جیسے صحرا، اس لئے اس میں وسعت اور کشادگی پائی جاتی ہے۔

بحر:۔ پانی ملی زمین یا سمندر کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ نمی، زرخیزی اور آبادی کا موجب ہے اس لئے یہ مفہوم اس میں شامل ہیں۔

Marfat.com

ضرع:۔ گائے اور بکری کے تھن کو کہتے ہیں۔ اس لئے اس میں نرمی، گدازی، کمزوری اور لاچاری کا پہلو پایا جاتا ہے۔

مَنّ:۔ محنت کے بغیر میّسر آنے والا احسانِ الٰہی، التجا اور درخواست کے بغیر عطا کرنا۔ جس پر احسان کیا جاتا ہے وہ اسے احساسِ ذمہ داری کی طرح یاد رکھتا ہے کہ موقع ملنے پر هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ کے مصداق یہ بوجھ اتار سکے۔ چونکہ یہ بوجھ جب تک سر پر رہتا ہے، تھکاتا رہتا ہے، اس لئے تھکا دینے اور کمزور کر دینے کا عنصر بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ منّان، اسمائے الٰہی میں سے ہے۔

تشریح آیت i۔ صیغہ 'قُلْ' کہنے کے معنوں میں نہیں بلکہ پوچھنے کے انداز میں ہے۔ ویسے دونوں صورتوں میں تاکید کا پہلو اس میں ضرور پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس کو پوچھنے کے لئے کہا جارہا ہے وہ نہیں جانتا کہ نجات دہندہ کون ہے۔ آیت کی اٹھان واضح کر رہی ہے کہ محبوبؐ کو مکمل خبر ہے، پوچھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ پوچھے جانے والے بھی خبر کو جان لیں۔ اس میں عام بنی آدم کی سرشت اور نفسیات کی نشاندہی ہے کہ جب کسی ایسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے کہ چھٹکارا کی صورت نظر نہ آئے، تو اپنی بے ثباتی اور کم مائیگی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، عاجزی اور لاچاری سے دل ہی دل میں التجا کرتا ہے، کہ اگر نجات کی گنجائش بن جائے تو شکریہ ضرور ادا کروں گا۔ یہ اس بات کی تسلیم بھی ہوتی ہے کہ کوئی ذات ہے جو اس کرب سے نجات دلا سکتی ہے کیونکہ کائنات میں اسی عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ کا راج اور قدرت کارفرما ہے اور وہ پکار سن کر دادرسی کرنے والا ہے۔ اس ذات کا تعارف حضورؐ کی طرف منسوب کیا گیا کہ اللہ عزّوجل ہی اپنی مخلوقات کو ہر کرب سے نجات دیتا ہے۔ ساتھ ہی ایک اور نفسیات کی طرف بھی اشارہ دے دیا گیا کہ نجات پانے کے بعد، شکر کرنا تو درکنار، الٹ شرک کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ یہ آیت کُل بنی آدم سے وابستہ ہے اور ان کی ایک مخصوص نفسیات سے متعلق ہے۔ مالک و خالق کُل کائنات آدم اور بنی آدم کی جبلّت اور طینت کا بھی

Marfat.com

خالق ہے اس لیے ازلی طور پر جانتا ہے کہ بنی آدم جب کسی کرب میں مبتلا ہوں اور بچنے سے نااُمید ہو جائیں، تو عاجز ہو کر اسے وسیلہ پکڑتے ہیں۔ ذاتِ الٰہی مشکل کشائی کر تو دیتی ہے، حالانکہ وہ ازلی طور پر یہ بھی جانتی ہے کہ بالکثرت لوگ شُکر کی بجائے، شرک کا راستہ اختیار کریں گے۔ اس آیت میں شُکر اور شرک کی تعریف بھی مل سکتی ہے، یعنی کرب سے نجات پا کر اُس ذات کو پہچان لینا اور ہمیشہ یاد رکھنا، شُکر ہوا جبکہ کرب سے نجات کے بعد اُس کو بھول جانا شرک ہو گا۔ ایک شخص کھجور کے درخت پر چڑھتا گیا۔ انتہا پر پہنچ کر نیچے کی طرف دیکھا تو خوفزدہ ہوا کہ اتنی بلندی پر آ گیا ہوں، واپس کیسے پہنچ پاؤں گا، اگر پھسل گیا تو جان چلی جائے گی۔ دل ہی دل میں گڑگڑایا کہ اگر نیچے اترنے کی سبیل ہو جائے تو ایک روپیہ نیاز دوں گا۔ آدھے راستہ تک آیا تو آٹھ آنے نیاز کا عہد کیا، مزید قریب ہو کر چار آنے کی پکار دی اور جب زمین پر پاؤں لگ گیا تو کہنے لگا اپنی ہمت سے اوپر چڑھا تھا، اپنی کوشش اور محنت سے نیچے اترا ہوں نیاز کس بات کی؟ یہ مثال اس آیت میں بیان ہونے والی نفسیاتِ بنی آدم کی تصویر ہے۔

تشریح آیات ii اور iii ۔ یہ دونوں آیات نوحؑ سے متعلق ہیں۔ وہ پہلے نبی ہیں جن کا ذکر قرآن میں کسی تمدّن اور قوم کے ساتھ آیا ہے لیکن آپ سے قبل آدمؑ کا تذکرہ تمدّنی معاشرت کے طور پر نہیں ہوا۔ نوحؑ کی قوم کے افراد کی تعداد تک قرآن میں بتائی گئی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ جب آدمیت کو معاشرہ بننے کی گنجائش میسّر آئی تو نوحؑ ان کی طرف پہلے نبی کے طور پر بھیجے گئے کیونکہ ان آیات میں تہذیب و تمدّن کا آغاز اور معاشرت کے اصولوں کا رواج نظر آتا ہے۔ 'مِنْ قَبْلُ' کا لفظ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ روایات کے مطابق نوحؑ کو نو سو پچاس (۹۵۰) برس اپنی قوم میں تبلیغ کا موقع ملا مگر اتنے لمبے عرصہ کے باوجود بھی وہ اپنی قوم کے افراد میں خاطر خواہ تبدیلیاں نہ لا سکے۔ قوم کی ایذا رسانی اور افعالِ رزیلہ سے جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ اس کربِ عظیم سے نجات کے طالب ہو کر دعا گو ہوئے۔ یہ طلب اور پکار آدمیت کی اسی نفسیات کے تحت تھی، جس کا ذکر آیت نمبر ا کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ چونکہ دلی مراد ایک نبیؑ سے منسوب تھی اس لئے فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ اور فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ کہہ

Marfat.com

کر اس کی عزت افزائی کی گئی اور یہ درجہ بلند بات ہے۔ آیت نمبر ا میں صرف پکارنے والے کو نجات کا مژدہ سنایا جارہا ہے، جب کہ یہاں نبیؐ کی خواہش کے احترام میں اس کے ساتھ، اس کی بات سمجھنے کے اہل افراد کو بھی نجات کی خوشخبری دی جارہی ہے۔ اور نبی ہی کی دعا کا نتیجہ ہے کہ قوم میں بدی اور شر پھیلانے والے عناصر کی بیخ کنی آنِ واحد میں کر دی گئی، حالانکہ نوحؑ اپنی التجا میں ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کر رہے۔ یہ اس ذات کی شانِ کریمی ہے کہ اپنے نبی کی عزت کی ہر طرح لاج رکھی۔ اس کے معتمد ساتھیوں کو بھی نجات دی اور ایذا دینے والی قوتوں کو بھی یکسر پامال کر کے پانی میں غرق کر دیا۔

تشریح آیت iv ۔ اس آیت میں ایک کی بجائے دو اولوالعزم انبیاءؑ کا ذکر ہے۔ موسیٰؑ حاملِ تورات اور صاحبِ شریعت ہیں جب کہ ہارونؑ نبی ہونے کے علاوہ بھائی کے وزیر بھی مقرر ہوئے تھے۔ تمدّن و معاشرت کے لحاظ سے دونوں مستند مقام رکھتے تھے، اس لئے مذکورہ بالا نفسیاتِ بنی آدم کا تذکرہ ایک مختلف انداز سے کیا گیا ہے۔ وہ دونوں انبیاءؑ بھی کربِ عظیم سے دوچار ہوئے، مگر انہوں نے عمومی طریقۂ آدمیت اور نوحؑ کی طرح پکار اور حالتِ کربِ عظیم کا شکوہ نہیں کیا، جیسا کہ پچھلی تینوں آیات میں نمایاں ہے۔ واضح طور پر محسوس ہو رہا ہے کہ دل میں التجا کرنے اور نجات طلب کرنے سے قبل ہی، بن مانگے، ان پر احسان کیا گیا، التجا کی شرمندگی سے محفوظ رکھا گیا اور از خود بشارتِ نجات کا مژدہ دیا گیا۔ حالانکہ پچھلی تینوں آیات کے مطابق عوام النّاس اور نوحؑ کو گڑگڑا کر نجات کی درخواست کرنا پڑی۔ نوحؑ کے صرف ہم خیال اہل ساتھیوں کو نجات دی گئی تھی جبکہ موسیٰؑ اور ہارونؑ، دونوں کی قوموں کو بھی نجات کی خوشخبری دی گئی۔ نوحؑ کی قوم کے بد عناصر کو غرق کر دیا گیا تھا، لیکن یہاں سب کو نجات ہوئی۔

نبیٔ آخر الزمانؐ کا فرمان ہے کہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کی مثال ویسی ہے جیسی میری اور میرے 'وصی' علیؑ کی مثال ہے۔ اُن دونوں بھائیوں کی بہت سی قدریں ہم دونوں 'بھائیوں' سے مشترک ہیں۔ فقط ایک فرق ہے کہ مجھ پر نبوت مکمل ہو گئی اور علیؑ منصبِ نبوت کے حامل نہیں ہیں۔ ہارونؑ نبی بھی تھے اور موسیٰؑ کے وزیر بھی جب کہ علیؑ کا منصب 'وصیٔ رسول' ہے۔ اس انطباق کی بنیاد پر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ دونوں بھائی یعنی محمدؐ اور علیؑ بھی کربِ عظیم سے دوچار ہوئے ہونگے، مگر زبانِ حال سے التجا

Marfat.com

اور شکوہ ان کی طرف سے بھی نہیں ہوا ہو گا۔ استاذی حافظ سائیںؒ فرمایا کرتے کہ ہدایت ہمیشہ دو سے منسلک ہوتی ہے، ایک اکیلا کبھی مکمل ہدایت نہیں کر سکتا۔ ہاتھ دو ہیں، ہادی بن کر کام مکمل کروا دیتے ہیں، پاؤں دو ہیں، سفر طے کروا دیتے ہیں، دل و دماغ دونوں مِل کر کُل وجود کا نظام چلاتے ہیں۔ آنکھیں، دونوں کان اور ناک کے دو نتھنے بھی ہادی بن کر اپنا فعل بخوبی سر انجام دیتے ہیں۔ زبان اکیلی ہونے کی وجہ سے اکثر جھول کھا جاتی ہے اور زانوؤں کے درمیان عضو بھی اکیلا ہونے کی وجہ سے ناقابلِ اعتماد ہے۔ آدمؑ کا جوڑا شیثؑ تھے، نوحؑ کے ساتھ سامؑ شریک ہوئے، ابراہیمؑ کا مان اسماعیلؑ نے بڑھایا، موسیٰؑ کو ہارونؑ کی ہمراہی ملی، چونکہ عیسیٰؑ اکیلے رہ گئے تھے اس لئے اللہ نے ان کو رفعت عطا کر کے، ہدایت کا کام وقتی طور پر ان کے ذمہ سے واپس لے لیا۔ محمدؐ کے لئے وصی کی شکل میں علی ابنِ ابی طالبؑ کو منتخب فرما کر وہ ازلی ہدایت :اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ: کے مقام تک پہنچادی۔ ہدایت دینے والا خود لازماً ہدایت یافتہ ہوتا ہے۔ چونکہ ہدایت دینا، دو کا نصیب ہوتا ہے اس لئے آیت ۱۷ میں دو انبیاء کا مذکور ظاہر کرتا ہے کہ وہ دونوں حامل ہدایتِ الٰہی ہیں، لہذا اپکار اور التجا انہیں زیب ہی نہیں دیتی۔ کربِ عظیم سے دوچار ہونا فطری اور منطقی تقاضہ ہو سکتا ہے، مگر ہدایت یافتگان ،بنی آدم کی عمومی سرشت کے مطابق واویلا نہیں کرتے۔ ذات خود ان پر اس طرح احسان کرتی ہے کہ ان کی قوموں کو بھی نجات مل جاتی ہے۔ لیکن بلا شک وہ اس احسان کا بوجھ اپنے اوپر ہر وقت محسوس کرتے رہتے ہیں اور حتیّ المقدور اس کا حق ادا کرنے میں مشغول رہتے ہیں، بلکہ زندگی بھر اس احسان کا بوجھ اتارتے ہوئے ان کے پاؤں اتنے متورّم ہو جایا کرتے ہیں کہ ان سے خون رسنے لگتا ہے، یہاں تک کہ سورۂ طٰہٰ آیت ۲ میں وارد ہوتا ہے: مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی: یعنی ہم نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ کو شقاوت میں مبتلا کریں۔ چونکہ ان انبیاء کی قوموں پر بھی نجات کا احسان طلب کے بغیر ہوتا ہے اس لئے وہ قومیں بھی اپنے انبیاء کے نقشِ قدم پر اس احسان کے بوجھ کو اتارنے اور حتیّ المقدور اس کا شکریہ ادا کرنے میں مشغول رہتی ہیں۔ نجات کا یہ مفہوم محمدِ مصطفیٰؐ اور ان کی قوم کے لئے کتنا دلفریب ہے کہ اس کی تشریح کے لئے ایک الگ مضمون چاہیے۔ رحمۃ اللعالمینؐ کے قدموں کی خیرات، ان کی قوم کو ابتدا ہی سے ہر کربِ عظیم سے پاک کر دیا گیا۔ مینڈکوں اور خون کی بارش جیسی آفاتِ آسمانی اب ہر گز دیکھنے میں نہ آئیں گی، یہ اسی نجات

Marfat.com

کی طرف اشارہ ہے۔ بیان کیا گیا مضمون بالا اختصار اس طرح ہو گا۔ (نقشہ۔۱)

عوام الناس	نوحؑ	موسیٰؑ وہارونؑ۔۔ محمدؐ وعلیؑ
ظلمتِ بَرّ وبحر جیسے عام کرب میں مبتلا۔	کرب عظیم میں مبتلا ہیں۔	کرب عظیم سے سامنا ہوا۔
تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً پکارتے ہیں۔	پکار لازماً سنی جاتی ہے۔	پکارنے کا تصور ہی نہیں ہے۔
شکر کی بجائے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔	کوئی دعویٰ نہیں۔ ذات پکارتی ہے۔	ذات خود احسان کر کے فخر کرتی ہے۔
تعارفِ ذاتِ الٰہی نہیں ہے۔	تعارف ہے، عرفان کی کمی ہے	کامل عرفان کی نشاندہی ہے۔
کُل آدمیت کی نفسیات کا ذکر ہے	ایک نبی کی طرف اشارہ ہے	دو انبیاء کا ذکر ایک کی طرح ہے
ایک ایک کی نجات کا ذکر ہے	اپنی اور اہل کی نجات کی بشارت ہے۔	اپنی اور تمام قوم کی نجات کا مژدہ ہے۔
نجات کی شدید طلب موجود ہے	طلبِ نجات موجود ہے۔	طلب ہی سے عاری ہیں۔

آیت نمبر ا میں اَلْبَرِّ وَ الْبَحْرِ دراصل ضدین کی طرف اشارہ ہے۔ کُل کائنات مِن حیث الکُل چونکہ ضدین کا مجموعہ ہے اس لئے واضح محسوس ہوتا ہے کہ عوام النّاس خیر اور شر دونوں کو مکمل نہیں سمجھ سکتے، اچھائی کے مفہوم اور برائی کی حقیقت سے ناآشنا ہیں، اہل کی اہلیت اور نااہل کی نااہلی بھی ان پر عیاں نہیں۔ وہ ظالم اور مظلوم دونوں کو ایک ہی پلڑہ میں تولنے کا ظلم کرتے ہیں۔ وہ مردار کھانے والے جانوروں کی طرح ہوتے ہیں، لیکن اگر زندہ شکار ہاتھ آجائے تو اسے بھی ہضم کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اسی لئے جن مشکلات میں وہ مبتلا ہوتے ہیں انہیں صرف کرب کہا گیا ہے۔ جب کہ نوحؑ کے مذکور میں 'اَلْکَرْبِ الْعَظِیْمِ' کا لفظ استعمال کیا گیا، جو اشارہ دیتا ہے کہ نبی ضدین کے جھنجھٹ سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ صرف عرفان کے راستے میں حائل ظلمات کی وجہ سے پکارتے ہیں۔ نوحؑ، بالکثرت نوحہ وگریہ کے عادی تھے اس لئے آیات ۲ اور ۳ میں، بین السطور، یہ اشارہ ہے کہ اگر ندامت کے

Marfat.com

آنسو بہائے جائیں تو تہذیب و تمدّن و معاشرت کی آسائش مہیا کی جاتی ہے۔ نوحہ و گریہ کرنے والے بلند بانگ دعوے نہیں کیا کرتے، انہیں اگر طلبِ نجات ہو تو ہم ان کی پکار سن کر جواب دیتے ہیں، ان کے ہم خیال ساتھیوں کو بھی نجات دیتے ہیں، اور بد عناصر کو غرق کر دیتے ہیں۔ مگر صرف نوحہ و گریہ کرنا، مکمل ہدایت یافتہ ہونے کی ضمانت نہیں ہے، اس لئے نوحہ کرنے والا بوقتِ ضرورت پکار تا ضرور ہے۔ بلاشک ہر قسم کی پکار 'دوئی' اور غیریت کی نشاندہی ہے۔ (نقشہ۔ ۲) ملاحظہ کریں اور اس کا تقابل (نقشہ۔ ۱) سے کریں۔

نوحہ و گریہ سے عاری۔	نوحہ و گریہ کرنے والے۔	جن کے لیے نوحہ و گریہ کیا جاتا ہے۔
عوام الناس کا احوال ہے۔	تہذیب یافتگان کے احوال ہیں	ہدایت یافتہ کی بات ہے۔
ضدین کا بھی عرفان نہیں ہے	مقامِ عرفان پر کمی کا شکار ہیں	عرفان اپنی تکمیل پر ہے۔
ہر حال میں طالبِ نجات ہیں	پکار مانندِ سوال ہے جو کمی کی نشاندہی ہے۔	طلب کا شائبہ بھی نہیں ہے۔
طلبِ نجات ہر ایک کی غرض ہے۔	اہل کو بھی نجات مل جاتی ہے۔	کُل قوم نجات پا لیتی ہے۔
شکر کا دعویٰ کر کے شرک کرتے ہیں۔	دعویٰ نہیں، درخواست کرتے ہیں۔	نہ دعویٰ، نہ درخواست ہے۔
اپنے رب کو جانتے ہی نہیں ہیں	رب کو جانتے ہیں۔	رب کو پہچانتے بھی ہیں۔
ہر حال میں بکھرے رہتے ہیں۔	ذات کے احوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔	یکّی نسبت بنا کر ایک کے تعلق میں دو ہوتے ہوئے بھی ایک ہو کر رہتے ہیں۔

Marfat.com

بلا شک نقشہ ۔ ۲ کے مطابق، جن کے لیے نوحہ و گریہ مقرر ہے، وہ عظیم المرتبت ہستیاں ہیں اور ان کی شان وراہے۔ آیت iv کی روشنی میں واضح اشارہ ملتا ہے کہ ہدایت یافتہ بندگان الٰہی، عرفان میں کامل ہونے کے باعث، ہر طرح کی طلب سے فارغ ہوتے ہیں اور ان کا مکمل رجوع اپنے رب کی طرف ہوتا ہے۔ غیر کا خیال بھی ان کے نزدیک نہیں پھٹکتا اور جیسا کہ نقشہ ۔ ا سے واضح ہو سکتا ہے، یہ صاحبانِ حامل شریعت اور اللہ کے رسولوں کا درجہ ہے۔ رسولِ آخر الزماںؐ بھی اسی درجہ میں شامل ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ وہ ہستیاں بھی کربِ عظیم سے دوچار ہو سکتی ہیں، مگر وہ نجات کے طالب نہیں ہوتے بلکہ مالک ان کو اپنے احسان سے خود نوازتا ہے۔ یہاں تک کہ کربِ عظیم ان سے بھی جدا ہو جاتا ہے اور ان کی تمام قوم کو بھی اُس سے نجات مل جاتی ہے۔ لیکن کرب ان کی زندگیوں میں موجود رہنے کا عندیہ قرآن کی نص سے ثابت ہے۔

آج تک یہ اہم حقیقت کسی کی نگاہ سے نہیں گزری، اور نہ یہ خیال کسی قلب سے گزرا ہے۔ زمانہ بھر کو اس سے روشناس کروایا جانا چاہیے تاکہ نسلیں یہ جان لیں کہ امام حسینؑ کا ذکر 'کربلا' سے وابستہ ہے۔ آپؑ کا 'حَقّ کَہٗ بِنَاءِ لَا اِلٰہ اَستْ حُسَیْنؑ' ہونا کربلا ہی کی نسبت سے ہے۔ امامؑ کے مکمل کردار اور اصل روپ کا اظہار، کربلا ہی میں ہوتا ہے۔ اور کربلا، دراصل کَرَب ۔ لَا ۔ ہے۔ جہاں ہر کربِ عظیم 'لا' ہو جائے وہاں ذکرِ امام حسینؑ شروع ہوتا ہے۔ مولا حسینؑ کبھی کسی کرب یا کربِ عظیم سے نہ روشناس ہوئے نہ ہی واقف۔ وہ تو مقامِ کرب ۔ لا ۔ کے مکین ہیں۔ ہم نوحہ و گریہ امام حسینؑ کے لئے نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں، وہ تو مقامِ کرب سے بے بہرہ ہیں۔

اب صرف ایک ہی صورت ممکن ہے کہ پکار سننے والی ذات، نجات دینے والی ذات، احسان کرنے والی ذات ۔۔۔۔۔ یہ سب ذوات اصل میں ایک ہی ہیں، اور وہ ہے مولا حسینؑ ابنِ علیؑ کی ذات!

Marfat.com

۴۹۔ مظلومین کے لیے رونا

i۔ سورۃ النساء آیت ۱۴۸: لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ: یعنی اللہ ہر گز پسند نہیں کرتا کہ قول میں برائی کا اظہار کیا جائے، مگر یہ کہ جب کسی پر ظلم ہو۔ مراد یہ ہے کہ مظلوم، اگر اپنے اوپر کئے گئے ظلم کی داستان، با آوازِ بلند اور چیخ و پکار سے کرلے، تو وہ پسندیدگیٔ خدا ہو گی۔ چونکہ ظالم کی چیخ و پکار اور فریاد و نالہ اللہ کی ناپسندیدگی کا موجب ہے اس لیے اس کو منع فرمایا گیا کہ وہ کھلے عام ایسا پرچار کریں۔ ایسا کرنا ان کے لیے برائی اور گناہ گردانا گیا ہے لیکن مظلوم کے لیے اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کا اعلان، با آواز بلند اور سرِ عام، روا رکھا گیا ہے۔ مظلوم یہ حق محفوظ رکھتا ہے کہ ہونے والے ستم کو آہ و بکا کی شکل میں پکار کر اور علی الاعلان اظہار میں لائے، خداوند قدوس اس کو ناپسند نہیں کرتا بلکہ اگر آیت مذکورہ کا مفہوم پلٹا کر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اللہ اس کو پسند فرماتا ہے۔ اسی میں یہ نکتہ بھی ہے کہ مظلوم کے حق میں، اگر حب داران آہ و بکا و گریہ و زاری کریں، تو یہ بھی روا ہے۔ میدان کربلا میں جو سانحہ برپا ہوا، جس طرح معصومینؑ اور عالینؑ کو بے دردی سے شہید کیا گیا اور اٹھارہ (۱۸) بنی ہاشم اور چوّن (۵۴) اصحاب جس ظالمانہ طریق سے قتل کئے گئے، اور ازاں بعد ان شہدا کی لاشوں کی جو بے حرمتی ہوئی، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ بظاہر اسلامی حکومت، اس کا کلمہ گو حاکم اور فوج کے تمام کلمہ گو سپہ سالار اور فوجی، اپنے رسولؐ کی اولاد کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں، اس کی نظیر کسی اور مذہب کے پیروکاروں میں نہیں ملتی۔ مردوں کی شہادت کے بعد آلِ رسولؐ کی مطہر خواتین اور بچیوں سے جو بے رحم سلوک کیا گیا، وہ بھی بیان میں لانا ممکن نہیں۔ تاریخ میں کسی جگہ ایسا دردناک ظلم دیکھنے میں نہیں آتا، جو اولادِ بتولؑ کی شہزادیوں اور گلشنِ رسولؐ کی ننھی کلیوں نے جھیلا۔ انگریز مؤرخ نکلسن لکھتا ہے کہ ظلم کی وہ داستان، جو کربلا میں، اولادِ رسولؐ کے ساتھ

Marfat.com

،اسی رسول کا کلمہ پڑھنے والوں نے رقم کی ہے، وہ رہتی دنیا تک کے لیے مثال ہے۔ ایسا سانحہ اس زمین پر دوبارہ برپا نہ ہو گا! کیا اگر ایسے مظلومین یا ان کے حُب داران، غم میں آہ و بکا کر لیں تو خدا، اسے ناپسند کرے گا؟

ii۔ سورۃ المائدہ آیت ۸۳: وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّۚ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ: یعنی جب سنتے ہیں جو کچھ رسولؐ کی طرف نازل ہوا تو ان کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑتے ہیں کہ انہیں حق کا عرفان ہو گیا۔ کہتے ہیں ہمارے رب ہم ایمان لائے، پس ہمیں گواہوں میں لکھ لے۔ جب محبت کرنے والے حضورؐ سے ایسی وحی سنتے ہیں، جو انہیں عرفانِ حق عطا فرمادے، تو ان کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا اور پھر اللہ سے استدعا کرتے ہیں کہ یہ گواہی قبول فرما کہ ہم نے حق کو پالیا۔ عمومی خیال یہی ہے کہ یہ قرآن کی آیات کے نزول کی طرف اشارہ ہے مگر نزول قرآن تو قریب ۲۳ برس میں مکمل ہوا۔ اگر یہ نزولِ قرآنی کی بات ہوگی، تو ثابت کرنا پڑے گا کہ اصحاب رسولؐ، ۲۳ برس مسلسل روتے رہے اور ہر آیتِ قرآنی ان کے لیے عرفانِ حق کا سبب تھی۔ چونکہ مشاہدہ میں ایسا نہیں ہے اس لیے تفکر کرکے سمجھنا ہو گا کہ حق کیا ہے؟ جس کے عرفان کی بدولت حُب دار کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آتے ہیں۔

iii۔ سورۃ الذّٰریٰت آیت ۲۹: فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِیْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ: یعنی کہ وہ بی بی نہایت حیرت زدہ ہو گئی اور اپنا ماتھا پیٹنے لگی اور بولی میں تو بانجھ بھی ہوں اور عاجز بھی۔ یہ واقعہ ابراہیمؑ کی زوجہ بی بی سارہ کا ہے۔ وہ بانجھ بھی تھیں اور ضعیف بھی ہو گئیں تھیں، انہیں اولاد کی توقع نہ رہی تھی گو ابراہیمؑ دعا گو رہا کرتے تھے۔ ایک روز فرشتوں نے بشارت دی کہ اللہ آپ کی بی بی کو

Marfat.com

تندرست کرے گا اور ان کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوگا۔ جب یہ خبر ابراہیمؑ نے بی بی سارہ کو دی تو وہ حیرت زدہ ہوگئیں اور وارفتگی کے عالم میں اپنا ماتھا پیٹنے لگیں۔ ثابت ہوا کہ اگر وارفتگی کے عالم میں ماتھا پیٹ لیا جائے یا بال نوچ لیے جائیں تو یہ عبث نہیں ہے۔ مظلومینِ کربلا کی عزاداری میں بھی یہ جائز ہوگا۔ وہاں صرف ایک انہونی خبر تھی۔ نہایت بے دردی سے رونما ہونے والے بہتر (۷۲) انہونے واقعات کی داستان کا منظر سامنے آئے، تو حیرت کا کیا حال ہوگا؟ حیرت خود بھی حیران ہو جاتی۔ اس حالت میں صرف پیٹ لینا کچھ معنی نہیں رکھتا، مگر جو ماتھا پیٹنے کی بھی توفیق نہیں رکھتا وہ سانحۂ کربلا کا، وارفتہ ہی نہیں!

۱۷۔ سورۂ یوسف آیت ۸۴: وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ: یعنی کہ یعقوبؑ نے فراقِ یوسفؑ میں رو رو کر اپنی آنکھیں سفید کر لیں۔ حالانکہ یعقوبؑ علمِ نبوت کی بنیاد پر یقین رکھتے تھے کہ یوسفؑ زندہ ہیں، لیکن فقط جدائی و فراق میں اس طرح نوحہ خواں ہوئے کہ ان کی آنکھیں بصیر ہوگئیں۔ ہجر کے غم میں اتنا رونا کہ آنکھیں سفید ہو جائیں، نصِ قرآن سے ثابت ہے۔ اس لئے مظلومینِ کربلا و عالینؑ کے ساتھ ہونے والے مظالم پر اگر کوئی آنکھ اشکبار ہو تو کیسے ناجائز ہے؟ فراق و جدائی میں نوحہ خواں ہونا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہونا عین فطرت ہے۔ اس فطری عمل میں اگر کوئی شہیدانِ کربلا کی یاد میں دو آنسو بہا لے، تو یہ نعمت ہے۔ معصومینؑ کربلا کے غم میں جو آنکھ پُرنم نہیں ہوتی، اسے مودۃ کی خبر نہیں۔ اس کا اسلام ناقص ہے، اس کا دین ناقص ہے اور وہ خود بھی ناقص ہے!

۱۸۔ سورۂ النجم آیت ۶۰: وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ: یعنی کم ہنسو اور زیادہ رویا کرو۔ ثابت ہوا، رونا پسندیدگیٔ الٰہی ہے

Marfat.com

vi۔ دو مصدقہ احادیث پیش ہیں: اَلْعَلِیُّ مَعَ الْقُرْآنُ وَالْقُرْآنُ مَعَ الْعَلِیِّ: اور: اَلْعَلِیُّ مَعَ الْحَقُّ وَالْحَقُّ مَعَ الْعَلِیِّ: یعنی علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔ اسی طرح حق علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ حق کے ساتھ ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآنِ ناطق، دراصل خود علیؑ کی ذات ہے اور اگر حق، مجسم ہو سکتا ہے تو وہ بھی علیؑ (عالینؑ) کی شکل میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ اس بنیاد پر، جن کو عالینؑ کا عرفان ہو گا، ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا جاری ہونا منشاءِ الٰہی ہو گا۔ بالفاظ دیگر جہاں رسولؐ پر نازل ہونے والا، پر نم آنکھوں کا سبب ہو جائے، وہاں محبت و عرفانِ حق کی دلیل موجود ہو گی۔ سانحۂ کربلا پر جو بھی نوحہ خواں ہو اور اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں ہوں، تو یہ بھی اسی عرفان کا ثبوت ہو گا۔ آج بھی امام حسینؑ اور شہیدانِ کربلا پر ظلم کی یاد میں کوئی آنکھ پر نم ہو، تو یہ عرفانِ حق کا نشان ہے۔ حافظ سائیںؒ جوشِ محبت میں فرمایا کرتے، ان معصومین و عالینؑ پر جو ظلم روا رکھا گیا، اس کی یاد میں ایک آنسو بھی آنکھ سے ٹپک کر گال کو گیلا کر دے تو وہ چہرہ جہنم کی آگ سے محفوظ ہو گا۔ وہی عرفانِ حق والے ہیں، جو آج آنسوؤں سے اپنی شہادت (گواہی) بارگاہِ الٰہی میں رقم کروا رہے ہیں۔ معصومینِ کربلا کے غم میں نوحہ کیونکر عبث ہو سکتا ہے جب کہ قرآن ان کی شان میں رطب اللسان نظر آتا ہے اور اسے عین عرفانِ حق کی دلیل گردان رہا ہے۔

۵۰۔ اللہ کا مُلک

قرآن سورۃ آل عمران آیت ۲۶ میں کہتا ہے: قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِیَدِکَ الْخَیْرُ ؕ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: یعنی آپؐ فرمائیں ہمارے اللہ، تو ملک کا مالک ہے، اپنی مشیّت سے ملک عطا کرتا اور چھین لیتا ہے، عزت اور ذلت تیری مشیّت کے تابع ہے، کُل خیر کا تُو ہی مالک ہے اور ہر شے پر تیری قدرت ہے۔ دنیا کے نقشے

Marfat.com

پر قریباً دو سو ممالک موجود ہیں۔ جن میں سے ہر ملک کی اپنی جغرافیائی حدیں، افواج اور کرنسی وغیرہ الگ الگ ہے۔ کیا ہم انہیں خدا کے ملک تصور کریں؟ عقل و ادراک کی کسوٹی پر یہ ناقابل عمل لگتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان جغرافیائی حدود کے مرتب و مقرر کرنے میں خدا کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان زمینی ممالک کے نقشے مسلسل تغیر پزیر رہے ہیں اور اس کے باسیوں نے ہمیشہ طاقت کے زور پر اس میں ردّ و بدل کا عمل جاری رکھا ہے۔ قانونِ فطرت کے تحت جس میں مسلسل تبدیلی رونما ہو، اس کا ذات باری تعالیٰ سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ دراصل ہر آدم زاد کا بدن اللہ کا ملک ہے۔ جس میں بالوں کی شکل میں جنگل، جوف کی مانند صحرا، خون کی نالیوں کی مثل دریا، ہڈیوں کے پہاڑ، غرض شہود کے جہان کی ہر علامت موجود ہے۔ اس میں مختلف قومیں اپنی اپنی مستقل اور مستند جغرافیائی حد بندی میں آباد ہیں۔ مثلاً ایک قوم ہاتھ ہے، تو دوسری پاؤں، جب کہ سر، منہ، آنکھ کان، ناک، معدہ، جگر، تلی، گردہ وغیرہ بھی اقوام ہی ہیں۔ یہ قومیں زندگی کے مختلف عوامل میں عموماً ایک دوسرے کی معاونت کرتی ہیں مگر کبھی کبھی لڑتی بھی ہیں۔ لڑائی زندگی کی علامت ہے، اس کے بغیر گذارہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پیر زمین سے لڑتے ہیں تو راستہ طے ہوتا ہے، نظامِ انہضام خوراک سے لڑتا ہے تو پیٹ بھی بھرتا ہے، اور کُل وجود کو قوت بھی ملتی ہے، پانی سے لڑائی پیاس بجھاتی ہے، کھیت میں ہل چل مچے تو فصل اُگتی ہے، تالو سے زبان لڑے تو الفاظ بنتے ہیں، لب سے لب لڑے تو بات بنتی ہے اور آنکھ سے آنکھ لڑے تو ایک انوکھا 'سواد' ملتا ہے۔ پاؤں وجود میں سب سے کثیر ہیں، مگر ان کے حصے میں جوتی آتی ہے۔ ہاتھ کبھی غلط کام کر بیٹھیں تو بغلوں میں منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ اس ملک کا ایک صوبہ سینہ ہے۔ جس کے پایۂ تخت یعنی دل میں ملک کا بادشاہ، قلب، رہتا ہے۔ یہ ہر دم ہر لحظہ مسلسل اپنا عمل کرتا رہتا ہے، چاہے رعایا خوابیدہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی حرکت بند ہو جائے تو رعایا بھی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ اسی کی بدولت اس مملکت میں زندگی ہے۔ اس کا وزیر اعظم

Marfat.com

دماغ ہے جو مشاورت کا کام کرتا ہے۔ بادشاہ اسے منظور کرتا ہے اور پھر ساری قومیں اس کے مطابق عمل درآمد کرتی ہیں۔ یہ الگ بات کہ بادشاہ کا مسکن ظاہری طور پر نیچے ہے اور وزیرِ اعظم، عرش پر اُستوٰی کرتا ہے۔ معدہ اس ملک میں وزیرِ خزانہ کے مترادف ہے۔ کھائی گئی خوراک کو معدہ چار اجزاء میں تقسیم کرتا ہے۔ بلغم، جو تھوکنے کے قابل ہے، صفراء، جو نکال دینے کے قابل ہے، سودا، جو جلانے کے قابل ہے اور خون، جو رکھنے کے قابل ہے۔ خون، خون ہے بلغم، بلغم۔ جگر، جگر ہے دگر، دگر۔ مخلوقات کی سیرت، عادات، اور مزاج میں خون کا اثر سب سے گہرا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی مولوی صاحب کو ایمر جنسی کی حالت میں کسی ہیجڑے کا خون لگا دیا گیا۔ آپریشن کے بعد، ہوش میں آکر، اس نے معالج کا شکریہ تالی بجا کر کیا۔ اسی ملک میں ایک قوم آنکھ ہے، یہ اقلیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے اس کی قسمت میں 'نوُر' اور 'رونا' ہے۔ معلوم ہوتا ہے، نوُر صرف اقلیت کی قسمت میں مقرر کیا گیا ہے جب کہ رونا، اسی نوُر کا ثمر ہے۔ یہ اقلیت، وجود کی کُلیت کو راستہ دکھا کر اس کی راہنمائی کرتی ہے۔ اللہ نے اس معشوقہ نوُر کو سات پردوں کے پیچھے بٹھا کر، سامنے پپوٹوں کی شکل میں مسہری کے پردے لگا دیے اور پھر پلکوں کی چلمن لٹکا دی۔ آنکھ دیکھنا چاہے تو پلکیں چھو کر پہلے آئینہ صاف کرتی ہیں، پھر معشوقہ نوُر اس ادا سے آنکھ سے باہر نکلتی ہے کہ آہٹ و خراش تک نہیں ہوتی۔ یہ نوُر ہی کی تاثیر اور رفتار ہے کہ بستر گرم رہتا ہے، پانی بہتا رہتا ہے، کُنڈی ہلتی رہتی ہے اور یہ عرش کی سیر کر کے واپس بھی آجاتا ہے۔ نوُر کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں کالی کالی پتلیاں بھی ہیں۔ تمام عمر نوُر کے ساتھ رہ کر بھی یہ کالی کی کالی رہتی ہیں بلکہ وقت پڑنے پر یہ پلٹ بھی جاتی ہیں۔ ان پتلیوں کے اندر اللہ نے پانی کا حوض سجا رکھا ہے۔ اگر کوئی بیرونی ذرّہ آنکھ میں آجائے تو یہ فوراً پانی بہا کر اسے صاف کر دیتی ہیں۔ چونکہ نازک اندام ہے، اس وجہ سے بُرے سے نفرت کرتی ہے اور اچھے کی طرف رغبت رکھتی ہے۔ پھر چونکہ نوُر ہے اور سنت الٰہی ہے کہ نوُر اکیلا نہ ہو، اس لیے آنکھیں بھی دو بنا دیں۔ ان کی حقیقی

Marfat.com

قوت کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر کہیں لڑ جائیں، تو سارے ملک میں ہلچل مچا دیتی ہیں۔ مومن کی آنکھ کی شان ہی ورا ہے۔ میاں محمدؒ فرماتے ہیں:

مرد نگاہ کرن جس ویلے مشکل رہے نہ کائی (پنجابی)

علمائے اخلاقیات کے نزدیک ہر فردِ واحد 'انسان صغیر' کہلاتا ہے اور تمام افراد کا مجموعہ، ماسوا اللہ، 'انسان کبیر' کہلاتا ہے۔ ہر انسان صغیر کی روح جو اس میں کار فرما ہے، روح جزوی قرار پائے گی، جب کہ انسان کبیر کا تعلق روحِ کُلی سے ہے۔ انسان صغیر میں کُل عالم کا نمونہ جزوی حیثیت میں موجود ہے اور اس کی نسبت و مقدار بالکل ویسی ہے جیسی انسان کبیر میں ہے۔ بالفاظ دیگر انسان صغیر میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہ کچھ اور ویسے ہی انسان کبیر میں پایا جاتا ہے۔ خداوندِ عالم نے اس چھوٹے سے جسم میں ایک عالم اکبر آباد کر دیا ہے۔ ہر شخص کو ان چیزوں کا علم بخوبی ہو سکتا ہے جن کی مناسبت اس کے اندر موجود ہے اور جن کی مناسبت اس کے اندر موجود نہیں ہے ان سے بے بہرہ رہتا ہے۔ مثلاً مادرزاد اندھا کبھی رنگوں کی پہچان نہ کر سکے گا اور پیدائشی بہرہ بچہ کبھی بول نہ سکے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے حواس، جزئیات کو معلوم کر کے عقل تک پہنچاتے ہیں، تا کہ ہر شے کی حالت و کیفیت معلوم ہو سکے۔ حواس خارجیہ معطل ہو جائیں اور عقل موجود بھی رہے، تب بھی یہ ممکن نہیں کہ حالت و کیفیت کا تعین کیا جا سکے۔ جو حاسہ معطل ہو گا اس سے متعلق تمام علوم سے وہ انسان صغیر، جاہل رہے گا۔ آدم کو حقائق کی تعلیم دیکر بھیجا گیا اور مناسبت کی بنیاد پر اس نے اس علم کو سیکھا۔ ہر آدم انسان صغیر کہلایا جس میں ایک عالم اکبر پوشیدہ ہے۔ آدم کے جسم میں آنکھ، ناک، کان، بمنزلہ رعیت ہیں اور دل ان کے حکمران کی مانند ہے۔ رعیت مسخر ہو سکتی ہے مگر حکمران فاعل بالتسخیر ہوتا ہے۔ جس کی مراد یہ ہے کہ اس حکمران کو حکم دینے کی ضرورت محسوس نہ ہو، ادھر ارادہ ہو، اُدھر اعضاء اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں۔ دل کبھی کسی عضو کو عمل کا حکم بھیجتا نظر نہیں آتا۔ وہ جوں ہی ارادہ

Marfat.com

کرتا ہے حرکت شروع ہو جاتی ہے، یعنی ارادہ و حرکت میں فصل نہیں ہے۔ جب انسان صغیر میں ایسی مطیع رعیّت موجود ہے تو لازم آتا ہے اس حاکمِ مطلق کی بھی ایسی رعیّت ہو کہ وہ ارادہ کرے اور اس نص کا ظہور اسکی رعیّت سے فوراً ہو۔ چونکہ بنی آدم ہی اشرفُ المخلوقات یا مجموعۂ المخلوقات ہے اس لیے اس حاکمِ مطلق کی رعیت انہی میں ہو گی۔ انسان صغیر کی رعیّت اس وقت تک اطاعت کرتی ہے جب تک عادت کے خلاف نہ ہو۔ سحر خیز کی آنکھ تو صبح کے وقت ہوشیار ہو جائے گی مگر رات دیر سے سونے والے کو جلد جاگ نہ آئے گی۔ لیکن چونکہ اس میں کیفیات کو بھی دخل ہے، اس لیے ایک جلدی سونے والے بچے کو اگر دانت درد ہو جائے تو اس کیفیت سے اس کی نیند بھی اڑ جائے گی۔ ایک انسان کامل ایسا ہے کہ ایک ہزار رکعت نوافل ادا کیے بغیر لیٹتا ہی نہیں، مگر ایک دفعہ اطاعت، خوف اور محبت کی کیفیات کے درمیان اسے سونے کا حکم ملتا ہے۔ علیؑ سو جاتے ہیں اور کہتے ہیں ایسی نیند کبھی میسر نہ آئی۔ ایسی بلند پایہ رعیت ہی فرما سکتی ہے: اَنَا اَمْرُ اللّٰہِ: یعنی ہم ہی اللہ کا امر ہیں۔ خدا جونہی ارادہ کرے تو فعل کا ظہور ان کے ذریعے سے ہو جائے!

عالمِ صغیر میں جہاں روحِ جزوی ضروری ہے ویسے ہی عالمِ کبیر کی بقا، روحِ کُلی ہونی چاہیے جو کائنات سے قبل تخلیق کی گئی ہو۔ وہ عالم کے ہر ذرہ سے باخبر ہو۔ انسان صغیر میں، پیدائش کے بعد، قوتِ تجسس سے عقل بالملکہ پیدا ہوتی ہے، جس میں معلوم کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے، اور عقلِ کُلی، جو خود معلوم ہے وہ عقلِ مصطفیؐ ہے، جہاں غور و فکر اور سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی لیے مولائے کائنات علیؑ فرماتے ہیں جیسے تیرے ہاتھ کی پانچ انگلیاں تیرے سامنے ہیں اسی طرح کائنات کے تمام حقائق میرے سامنے ہیں۔ یقیناً یہ آخری منزل ہے۔ اور یہ کمال و بلندی رسالتمآبؐ اور آپ کے اجزاءِ رسالتؑ کو میسر آئی۔ آدمؑ کو ابتدائی منزل میں حقائق عالم سجدہ کرتے ہیں، مگر محمدؐ و آل محمدؐ کی منزل ہمارے ظاہر و خیال کی پرواز سے ورا ہے۔ خیال تو وقت کی پیداوار ہے! سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ کے

Marfat.com

پردہ فرمانے کے بعد روح کُلی کیسے قائم ہے۔ اگر حقیقتِ محمدیہ باقی نہ ہوتی، تو کائنات لازماً فنا ہو چکی ہوتی۔ محمد رسول اللہ کے بعد آپ کے اہل بیت طہار میں روح کلی موجود ہے۔ اب عالم کے لیے وہ لنگر ہیں۔ اللہ کا دین فطرت ہے اور فطرت کی روح کُلی ہیں اہل بیتِ رسول مصطفیٰ، اب یہی مراد ہیں!

ہم مخلوقات، عالم بننے کے لئے علم حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ حصول شدہ علم، ہم سے الگ ہوتا ہے اور ہم اس سے الگ۔ اس علم کو بھول جانے پر ہم پھر جاہل بن سکتے ہیں۔ لیکن جن بزرگوار ہستیوں کو اس نے اپنی معرفت کا نشان بنایا ہے، علم ان کی خلقت میں گوندھ دیا ہے۔ علامہ حلّی شرح تجرید میں کہتے ہیں کہ کسی چیز کے نہ جاننے کا سبب مادہ ہے، یعنی مادہ کشف کو روکتا ہے۔ ان ہستیوں کو اللہ نے مادہ سے قبل بنایا ہے اور مادہ سے قبل سب کچھ منکشف و عیاں تھا، یعنی عین علم تھا۔ ہم اصطلاحاً ان ہستیوں کو عالم کہہ سکتے ہیں، وگرنہ دراصل یہ خود عین علم ہیں۔ اور جاننا چاہیئے کہ علم نہ کبھی بدلتا ہے اور نہ ہی پرانا ہوتا ہے۔ علم ہوگا تو جہل نہ ہوگا اور جہاں جہل ہوگا وہاں علم نہ ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ علم کبھی جہل نہیں بن سکتا! ہم اللہ کو عالمُ الغیب کہتے ہیں۔ عجب بات ہے اللہ خود کُل کائنات کا خالق و مالک ہے اس لئے اس سے کسی چیز کا چھپنا عبث ہے۔ پھر اس کے لیے کیا غیب ہوگا جس کا اس کو عالم ثابت کر کے عالمُ الغیب کہا جائے۔ اصل میں اللہ ہر شے کا بالذات عالم ہے۔ جو ہمارے لیے غیب ہے وہ اس کے لیے تبین و عیاں ہے۔ یعنی عالم الغیب وہ ہوتا ہے، جو اُس شے کو بھی جانتا ہو جو کسی دوسرے سے پوشیدہ ہو۔ اللہ بے مثل اور غیب الغیوب ہے، بلکہ مبداء غیب الغیوب ہے۔ جب کہ قیامت معاد غیب الغیوب ہے۔ نبی ہمیں مبداو معاد دونوں کی خبر دیتا ہے۔ نبی کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ بنی نوع آدم کو بالعموم اور اپنی امت کو بالخصوص ہر پوشیدہ کی خبر بھی دے اور اس کا راز بھی افشا کرے۔ اگر بالفرض خود مبدا اور معاد کو نہ جانتا ہو تو کسی اور کو کیا خبر دے گا۔ معلوم ہوا کہ جو مبدا و معاد کو جانے، وہ نبی ہوتا ہے۔ لیکن جو ازل کے رازوں کو مادہ سے بے نیاز ہو کر جانے، اسے ولی

Marfat.com

کہتے ہیں۔ اُس کا سارا جسم اللہ کا مُلک ہے اور وہ خود اس کا مسمیٰ ہے۔ اس کا قلب خالقُ الخلائق ہے جو حکومت کرنے والا ہوتا ہے! جن کے چہرے وجہہُ اللہ ہیں انہیں اللہ نے مُلک عطا کیے ہیں اور وہ اپنے مُلک کے حاکم ہیں۔ حاکم وہ ہوتا ہے جو اپنی رعایا کے ادنیٰ سے ادنیٰ مسائل سے بھی واقف ہو اور انہیں حل کرنے کی قدرت و استطاعت بھی رکھتا ہو۔ اُن ممالک اور ان کے حاکموں کو سمجھنے کے لیے اور پھر یہ جاننے کے لئے کہ ان کی قدرت و استطاعت کیا ہے، لازم ہے کہ پہلے کسی صاحبِ عشق سے اصولِ قربت کا درس لیا جائے۔ کیونکہ اس صاحبِ حال پر جو کچھ وارد ہوگا، وہی عمل نمونہ کے لیے پیش کرنے کے علاوہ، اسے وارد کرنے کی تمام کیفیات سے آگاہ بھی کر سکے گا۔

۵۱۔ دِین۔ ضابطۂ حیات

سورۃ آل عمران آیت ۱۹ میں ارشاد ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ: یعنی تحقیق اللہ کے نزدیک دین، فقط اسلام ہے۔

یاد رہے دین کو بنانے والا کام اللہ نے کیا ہے، یعنی مقننّہ کی ذمہ داری اللہ نے خود سر انجام دی ہے۔ اسلام، دینِ فطرت کہلاتا ہی اسی سبب سے ہے کہ کُل کائنات کے فاطر نے خود اس کو پسند کیا ہے۔ تخلیق اس نے اور ادیان بھی کیے ہیں مگر چونکہ اس کی پسند دینِ اسلام ہے اس لیے یہی دین فطرت کہلانے کا حقدار ہے۔ اس دین کو بنانے والا خود اللہ ہے اور اس دین کو بنا کر اس کی تکمیل کا اعلان سورۃ المائدہ آیت ۳ میں خود ہی کرتا ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا: یعنی آج کے دن ہم نے تم پر تمہارہ دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی طرف سے نعمت کا اتمام کر دیا اور اللہ نے تمہارے لیے جس دین کو پسند کیا ہے وہ ہے اسلام۔ اسلام وہ دین

Marfat.com

ہے، جو اللہ قدّوس نے ذاتی طور پر پسند کیا ہے اور پھر اسے پسند کر کے اپنانے کی ترغیب و ہدایت دی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے تمام سابقہ مذاہب کو پسِ پشت ڈال کر صرف مذہب اسلام کو دین کے طور پر چُن لیا ہے اور اسے اپنانے اور پسند کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

اللہ اس دین کی تکمیل فرما کر جب یہ کہتا ہے کہ یہ تم پر ایک عظیم نعمت ہے جو ہم نے مکمل کی تو معلوم ہوا دین نعمت بھی ہے اور تکمیل یافتہ بھی ہے۔ دینِ اسلام حضورؐ کے لیے نعمت ہوا کیونکہ: اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ: کا پہلا خطاب انہی کے لیے ہے اور خود رسالتمآبؐ تمام کائنات کے لیے نعمت ہیں۔ نہ تو اللہ نے اپنے پسندیدہ دین جیسا کوئی اور دین بنایا اور نہ ہی شاہِ دو جہان جیسا کوئی اور نبی مرسل پیدا فرمایا۔ یہ دین کوئی لکھی ہوئی کتاب نہیں کہ الفاظ کی تکمیل اس دین کی تکمیل کی نشاندہی کرے اور جب الفاظ مکمل طور پر رقم ہو جائیں تو اسے نعمتِ عظمٰی سے تعبیر کیا جائے اور کہا جائے کہ اس مکمل طور پر لکھی ہوئی اور جِلد کی ہوئی کتاب کو ہم نے تمہارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی پسند کر لیا ہے۔ اگر اس کو ایسا ہی مان لیا جائے تو یہ گمان ہو گا کہ معاذاللہ خود خالق کتاب بھی الفاظ کی تکمیل سے قبل اس کی آخری شکل سے واقف نہ تھا، اور یہ کہ آخری چند الفاظ جو کتاب کی تکمیل کا باعث ہوئے وہ ہی نعمتِ کبریٰ کے حامل ہیں۔ اس سے قبل ۲۳ برس کی وحی کے الفاظ نہ تو تکمیل تھے، اور نہ ہی باعث تکمیل، نہ تو ان میں نعمت کا عنصر تھا، اور نہ ہی وہ باعث نعمت تھے، اور نہ ہی اللہ نے انہیں اپنے لیے پسند کیا تھا، نہ ہی اپنے رسول کو پسندیدگی کی ترغیب دی، بلکہ آخری وحی کے الفاظ ہی میں یہ تاثیر و خوبی تھی کہ وہ کتاب کو دین بنانے کا سبب ہوئے اور ان ہی کی بدولت نعمتِ خداوندی مکمل ہوئی۔ وہی آخری الفاظ اللہ کے پسندیدہ تھے اور انہیں ہی پسندیدہ رکھنے کا حکم آیا۔ تدبر کرنے سے معلوم ہو گا یہ دین کوئی ایسا ہے جو

Marfat.com

کسی خاص دن (اَلْیَوْمَ) میں مکمل طور پر ظاہر ہوتا ہے، اسے نعمتِ عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اسے پسند فرمایا ہے اس لئے آپ بھی اسے عزیز رکھیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ دین کا بنانے والا یعنی مقننہ اللہ ہے اور دین کا پہنچانے والا اور تبلیغ کرنے والا رسول ہوتا ہے۔ اللہ دین کو لوگوں تک پہنچانے کا کام نہیں کر سکتا اور جس طرح اللہ تبلیغ کرنے سے معذور ہوتا ہے اسی طرح رسول دین کو بنانے کا کام کرنے سے عاری ہوتا ہے، اور جیسے رسول دین کو بنانے کا کام نہیں کر سکتا، اسی طرح رسول کے ذمہ دین کی حفاظت کا کام بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ صرف دین بنانے ہی کا کام کرتا ہے، دین بچانے کا کام اس نے اپنے ذمہ بھی نہیں لیا۔ دین بچانے کا کام کرتا ہے صرف اور صرف "امام"۔ امام نہ تو دین بنانے کا کام کرتا ہے اور نہ ہی دین پہنچانے کا، بلکہ اس کی ذمہ داری دین کا تحفظ ہے، چاہے اس کے لیے اس کی اپنی ذات تو کیا تمام کنبہ، تمام خاندان ہی برباد کیوں نہ ہو جائے۔ تحفّظِ دین، کام ہی، امام کا ہے۔

بلاشک وہ دین جو پسندیدۂ الٰہی ہے، بنی نوعِ آدم کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے، اُسے (constitution) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اسے (code of ethics) یا (code of life) بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ضابطہ یا قانون یا لائحہ عمل کا اجرا، ہمیشہ مرکز سے ہوتا ہے۔ کوئی بھی حکومت بطریق احسن صرف اسی صورت میں کام کر سکتی ہے جب کہ ضابطۂ قوانین (constitution) اس کے مرکز سے جاری ہوں۔ تمام باقی ادارے، محکمے اور افراد اس پر عمل پیرا ہو کر ایک ہم آہنگ زندگی گزاریں۔ یقیناً کسی بھی حکومتِ وقت کے لیے یہی سب سے زیادہ پسندیدہ طریقۂ کار ہو سکتا ہے۔ بعینہٖ آیتِ بالا میں اللہ پاک نے جس دین کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے، لازم ہے کہ اس کا اجراء بھی اس کے مرکز سے ہو۔ اگر ہمیں معلوم کرنا ہو کہ اللہ کا پسندیدہ ضابطۂ حیات، جسے دین کہا گیا ہے، وہ کیا ہے؟ تو ہم پر لازم آئے گا کہ ہم مرکز سے رجوع کریں اور دیکھیں وہاں سے کس قانون یا ضابطہ کا

Marfat.com

اجراء ہوتا ہے، تاکہ اس پر عمل درآمد کر کے ہم پسندیدۂ الٰہی زندگی گزار سکیں۔ تلاشِ مرکز کے لیے قرآنِ کریم کی سورۂ آلِ عمران آیت ۹۶ کا سہارا لینا مناسب رہے گا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ: یہ فرمان واضح طور پر مکہ مکرمہ میں بیتُ الحرام کو تمام عالمین کا مرکز ثابت کر رہا ہے اور اس سے اگلی آیت میں وارد ہے: فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ: یعنی اس میں روشن اور واضح آیات ہیں، جو اس (code of life) کی طرف اشارہ ہیں جن پر عمل پیرا ہونا خود خالق کائنات کے لیے پسندیدہ ہے۔ لامحالہ وہی ضابطۂ حیات اللہ کا من پسند ہو گا، جو اس مرکز سے متعلق ہو گا، اس سے جدا کچھ بھی نہ ہو گا۔

اب غور طلب مقام ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جو فقط اس مرکز سے منسلک ہیں۔ اور اس کی افادیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کا جواب مذہب اسلام کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیئے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ میں ہے، کہ براستہ اسلام جو ضابطۂ حیات مرکز سے جاری ہو گا وہی پسندیدۂ الٰہی ہو گا وگرنہ کفر و شرک و معصیت کے دور کے قوانین اور ضوابط، جن کا کئی عرصہ اس مرکز پر قبضہ رہا، وہ ہرگز پسندیدگی کے حامل نہیں ہیں۔ شرعی طور دینِ اسلام کے بنیادی ارکان توحید، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج بیت اللہ ہیں۔ توحید کے اقرار کی لازم شرط نہیں کہ وہ مرکز سے متعلق ہو، یعنی یہ کہ بندہ اقرارِ توحید و واحدانیتِ الٰہی کے وقت خانۂ کعبہ میں ہو، بلکہ اس کی طرف رخ کرنا بھی ضروری نہیں۔ زکوۃ کے لیے بھی ایسی کوئی بندش نہیں۔ روزہ بھی اس سے مستثنیٰ ہے۔ نماز کے لیے اس مرکز کی طرف رخ کرنا فرض ٹھہرا، مگر یہ رکن بھی ایسا نہیں جو فقط مرکز ہی میں فرض ہو، اس کی ادائیگی جہان کے ہر خطہ میں فرض کی گئی ہے۔ ہاں بیتُ اللہ کا حج ایک ایسا عمل ہے جو مرکز کی اصل افادیت کا، اور ایک مکمل ضابطۂ کا اظہار ہے۔ جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت ۹۷ میں ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا: یعنی بر بنیادِ استطاعت، بیتُ اللہ کا حج لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

مختصر یہ کہ حج بیتُ اللہ میں غور کرنے سے یقیناً ہمیں اس راستہ کا تعین ہو جائے گا جس پر چل کر ہم اس منزل پر پہنچ جائیں جسے اللہ تعالیٰ نے منتخب اور پسندیدہ فرمایا ہے۔

اسلام میں حج بیتُ اللہ کی اولین شرط یہ ہے کہ اللہ کے لیے یہ عبادت پیش کرنے کی نیت کی جائے۔ دوئم یہ کہ دو چادروں پر مشتمل ایک لباس زیب تن کرے جو قریب بشکل کفن ہوتا ہے، ایک چادر زیر ناف اور دوسری ناف سے اوپر سینہ ڈھانپنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ حج کے دوران سر کا ڈھانپنا ناجائز ہوتا ہے۔ اللہ کے پسندیدہ دین میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں، کہ رنگ برنگ کے لباس مختلفُ النوع طریق سے سلوا کر پہنیں جائیں۔ سادگی اس کی بنیاد ہے، استعمال کی آسانی اس کی اثاث ہے اور کم سے کم کپڑے میں زیادہ سے زیادہ جسم ڈھانپنے کا کام اس کا فلسفہ ہے۔ مالک کے لئے یہ ہرگز قابلِ قبول نہیں کہ لوگ دکھاوے کی خاطر اعلیٰ ترین نسل کا کپڑا بہترین ڈیزائن میں سلوا کر زیب تن کریں۔ بالخصوص وہ لوگ جو محبتِ الٰہی کا دعویٰ رکھتے ہیں، جو قرآن کی تفہیم کا دم بھرتے ہیں اور اس دین کی خواہش کرتے ہیں جو اللہ کے نزدیک ہے، ان کے لئے بعید از امکان ہے کہ وہ ایسی غلطی کے مرتکب ہوں۔ وگرنہ عام مشاہدہ کے مطابق آج تو ہر دعویٰ دار کا پہناوا اس کے منافی ہو رہا ہے۔ سر کی پگڑی، ٹوپی اور کلاہ وغیرہ غرور اور تکبر کی نشاندہی ہے۔ عام دنیاوی فہم میں اونچا شملا سرداری اور بڑائی کا علمبردار ہوتا ہے، جب کہ دین اصل میں عجز و انکساری کا طلب گار ہے۔ لہذا سر سے بڑائی اور تکبر کے ہر نشان کو اتارنا، پسندیدگیٔ الٰہی کی بنیاد ہے۔ حج بیتُ اللہ میں سر سے ننگا ہونا اور دو چادروں کا لباس پہننا، جسے احرام کہتے ہیں، حدودِ میقات میں فرض ہوتا ہے۔ میقات وہ حد ہے، جہاں سے اول حرمِ کعبۃُ اللہ نظر آنا شروع ہو جائے۔ تو جہاں بنی آدم اپنے اندر آثارِ حرمتِ کعبہ کی جھلک محسوس کرتا ہے، احرام باندھنا اور سر سے کلاہِ کج اتارنا، اس پر لازم آتا ہے!

Marfat.com

حرمِ کعبہ کے اندر داخل ہونے کے بعد طوافِ کعبۃُ اللہ ضروری ہے۔ خانۂ کعبہ کی چار دیواریں ہیں، تین دیواروں کے گرد صرف گھومنا ہی مقصود ہے، مگر چوتھی، ایک منتخب اور مخصوص دیوار کے ساتھ اپنے جسم کو مَس کرنا ضروری ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اس دیوار سے علیؑ المرتضیٰ کی پیدائش کی نسبت ہے۔ کسے معلوم نہیں کہ خانۂ کعبہ، علیؑ کا زچہ خانہ ہے۔ جب مولا کی پیدائش کا وقت قریب آیا اور ان کی والدہ فاطمہؓ بنت اسد حزقیل زوجۂ ابو طالبؑ کو دردِ زہ ہوا۔ تو حضرت مریمؑ کی طرح ان کو مسجد سے دور جانے کا حکم نہیں ہوا، بلکہ ہاطفِ غیبی نے ندا دی کہ مسجد حرام سے حرمِ کعبہ میں داخل ہو جائیں۔ اس طرح حرمتِ پردہ قائم رہنے کا سبب کر دیا گیا۔ بی بی کریمہؓ نے اپنا پیٹ مبارک کعبہ کی اس مخصوص دیوار سے چھوا، تو وہ دیوار شق ہوگئی۔ آپ حرم کے اندر داخل ہوئیں تو حکم خداوندی سے وہ دیوار پھر مل گئی۔ حرمِ کعبہ کے اندر، وصیِ رسول خدا اور حاملِ رموزِ کائنات، اسد اللہ علیؑ نے جنم لیا۔ اس مخصوص دیوار سے حج کرنے والے ہر شخص کے جسم کا مس اسی نسبت کی وجہ سے ہے۔ جس کی ظاہری مراد تو تعظیم خاندانِ علیؑ ہے مگر باطنی طور پر اس کی فرضیت کی اوّلین وجہ اصحابِ اہل بیتؑ سے اپنے آپ کو منسلک رکھنے کی ترغیب ہے۔ خالق کائنات پسندیدہ ضابطۂ حیات میں اس بات کا متمنی ہے کہ گھرانۂ آلِ رسول سے ہمیشہ نسبت قائم رکھی جائے، چاہے باقی تینوں 'دیواروں' کو نظر انداز ہی کرنا پڑے یا ان کے گرد صرف گھوم کر ہی گزارہ کر لیا جائے۔

خانۂ کعبہ میں حج کے دوران مقامِ ابراہیمؑ کو مصلّٰی بنانے کا حکم ہے۔ یہ مقام جدُّ الانبیاء ابراہیمؑ کے پاؤں کی شبیہ ہے، جس کی تعظیم اس طریق پر کروائی گئی کہ تمام حاجیوں کو یہاں دو رکعت نماز نوافل کا ادا کرنا فرض کیا گیا۔ ثابت ہوا کہ مناسکِ حج میں شبیہ کی نسبت سے کیا گیا عمل بھی پسندیدۂ الٰہی ہے۔ سو اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین فطرت اپنے ضابطۂ حیات (constitution) میں صرف اسی صورت میں مکمل ہوتا ہے کہ تمام خواہش نفسانی کو ترک کر کے اور کفن کی مانند لباس پہن کر ہر وقت واپسی کا منتظر رہے۔

Marfat.com

اس جہان میں ہر بڑائی اور تکبّر سے اجتناب کرے۔ اپنے آپ کو غیر ضروری آلائشوں سے پاک رکھے اور حتیٰ الامکان کوشش کرے کہ ہر لمحہ ان پاک اور مطاہر ہستیوں کی یاد میں گزرے، جنہیں آلِ رسولؐ اور اہلِ بیتؑ کہتے ہیں۔ ان جیسا ہونا ممکن نہ ہو تو کم از کم ان کی طاہر اور روشن زندگیوں اور نقوشِ حیات کی پیروی لازم ہو!

۵۲۔ انونٹری (inventory)

انگریزی لفظ انونٹری (inventory) کسی بھی سٹاک کی بنائی ہوئی فہرست کو کہتے ہیں۔ جس میں، موجود اشیاء کا اس نظر سے اندراج کیا جاتا ہے، کہ جب اس کی تفصیلات جاننا ضروری ہوں، تو وہ تمام ممکنہ باتیں انونٹری میں دیکھی جا سکیں۔ مثلاً کسی فیکٹری میں سوڈا ایش منگوایا گیا۔ سال بعد اگر معلوم کرنا ہو کہ فلاں وقت میں کتنا سوڈا ایش منگوایا گیا تھا، اس کی قیمتِ خرید کیا تھی، کس کمپنی سے منگوایا گیا تھا، یا اُسے کس گڈز کمپنی کی معرفت وصول کیا گیا تھا؟ تو اس تاریخ کی متعلقہ انونٹری کھولی جائے گی۔ تمام تفصیلات اس میں درج اور محفوظ ہوں گی اور وہاں سے بآسانی معلوم کی جا سکیں گی۔ اس لحاظ سے ہر لمحہ کی محفوظ کیئیں باتوں، یا عوامل کو بھی انونٹری کہا جائے گا۔

یقیناً انونٹری (inventory) محفوظ کی گئی یا محفوظ کیے جانے کے قابل ہوتی ہے۔ اس کا فیزیکل بیلنس (physical balance) اسی طرح ریکارڈ یا ریکارڈیبل (recordable) ہو گا۔ ہر وہ جو محفوظ یا ریکارڈ نہ کی گئی ہو اسے انونٹری نہیں کہہ سکیں گے۔ مثلاً آپ کمپیوٹر پر کئی گھنٹے کام کریں، جو کچھ آپ نے ٹائپ وغیرہ کیا، اگر آخر کار اسے محفوظ کرنے کی کمانڈ نہ دیں تو وہ کمپیوٹر کی انونٹری نہیں بن سکے گی۔ بلکہ جب کمپوٹر آف کریں گے وہ تمام ڈیٹا ضائع ہو جائے گا، محفوظ نہ رہ سکے گا اور جو محفوظ نہ ہو سکا، وہ کمپیوٹر کی انونٹری بھی نہیں کہلا سکے گا۔ پس انونٹری کے لیے لازم ہوا کہ وہ محفوظ کی گئی

Marfat.com

ہو۔ کمپیوٹر کی جو مثال دی گئی ہے، یہ آدمی کے دماغ کی ایجاد ہے۔ حالانکہ آدم کا دماغ بھی اسی طرح کام کرتا ہے لیکن وہ خود کسی دوسرے آدم کا پیدا شدہ نہیں ہے بلکہ اس کا خالق کوئی اور ہے۔ سادہ لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کا دماغ کسی کا ایجاد کردہ یا خالق کردہ کمپیوٹر ہی ہے۔ جیسے کمپیوٹر میں انونٹریز لینے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، اسی طرح ہر بنی آدم کا دماغ بھی یہی کام کر رہا ہے۔ دونوں میں ایک نمایاں فرق بہر طور موجود ہے۔ جو اختیار (option) اور بے اختیاری (compulsion) کا ہے۔ آدمی کے دماغ کی پیداوار، کمپیوٹر اختیاری بنیادوں پر کام کرتا ہے جب کہ کسی کا بنایا آدمی کا دماغ بے اختیاری سے انونٹری لینے کا کام کر رہا ہے۔ اس بات کو آسانی سے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ کمپیوٹر چاہے آن ہی کیوں نہ ہو اور اس میں کسی مخصوص پروگرام پر کام ہی کیوں نہ ہو رہا ہو، وہ خود بخود کسی پروگرام کی انونٹری نہیں بنا سکتا، اس کے لئے کمپیوٹر استعمال کرنے والا ایک مخصوص کمانڈ دینے کا پابند ہوگا۔ حالانکہ کمپیوٹر کا آن ہونا کسی آدمی میں زندگی کے مترادف ہے، مگر ایک زندہ شخص انونٹری لینے کے عمل کو کسی قیمت پر روک ہی نہیں سکتا، جب کہ کمپیوٹر خود انونٹری لینے کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتا۔ آدمی کا دماغ ہر حال میں مسلسل انونٹری لئے چلا جا رہا ہے، غالباً زندگی کے کسی ایک لمحہ میں بھی اسے یہ اختیار نہیں کہ وہ اس عمل کو روک سکے۔ آدمی اس معاملہ میں بے اختیار محض ہے۔ جب تک آنکھ کھلی ہے، اس کے پردہ پر تصویر کی شکل میں انونٹری مسلسل بنتی چلی جا رہی ہے۔ آنکھ بند کر لی جائے، تو کان سنی گئی آوازوں کی شکل میں انونٹری لیتے رہتے ہیں۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں تو ناک کی قوت شامہ یہ عمل کرتی رہتی ہے۔ اسے بھی بند کر لیں تو حس محسوس کسی قیمت پر انونٹری لینے سے نہیں روکی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا دماغ آنکھ جھپکنے سے کم وقفہ میں بھی مسلسل انونٹری لینے کا کام کر رہا ہے۔

Marfat.com

ان میں دوسرا فرق یہ ہے، کہ کمپیوٹر میں آپشن (Option) موجود ہے کہ محفوظ کی گئی انونٹری کو اپنی مرضی سے مٹا دیا جائے یعنی ڈیلیٹ (Delete) کر دیا جائے، جب کہ آدمی کا دماغ ایک دفعہ جو انونٹری لے لیتا ہے، وہ ان مٹ ہو جاتی ہے۔ کوئی اپنے اختیار سے اسے ڈیلیٹ نہیں کر سکتا، بلکہ اسے ہمیشہ اپنے پاس محفوظ رکھنے کا پابند ہوتا ہے۔ یہاں ایک حقیقت کا اظہار بہت ضروری ہے۔ آدمی کے دماغ کو بنانے والا خود انونٹری لینے کے عمل سے ورا ہے۔ وہ نہ کسی قسم کی انونٹری لیتا ہے اور نہ ہی کوئی انونٹری اس کا حصہ بنائی جاسکتی ہے۔ کمپیوٹر اور آدمی کے دماغ میں تیسرا فرق یہ ہے، کہ کمپیوٹر کی انونٹری لینے کی صلاحیت آخر کار محدود ہے، جب کہ دماغ میں یہ صلاحیت لامحدود ہے۔ دماغ کسی شکل میں انونٹری لینے سے انکاری نہیں ہو سکتا اور نہ ہی تردّد کر سکتا ہے۔ کمپیوٹر میں کام کرنے کے لئے ایک مخصوص طریق کار فرما ہے جسے بائنری لینگوئج (Binary language) کہتے ہیں۔ یہ دو بنیادی حروف ایک (۱) اور صفر (0) کا اشتراک ہے۔ کمپیوٹر کی وہ تمام صلاحیت جس کے ذریعے اس میں انونٹری لی جاتی ہے، اسی طریق پر کام کرتی ہے۔ مثال کے طور پر 6 کا ہندسہ، کمپیوٹر کی زبان میں، ایک صفر (0) اور دو دفعہ ایک (۱) کے اشتراک سے بنے گا۔ اگر غور کریں تو صفر (0) چار دفعہ ایک (۱) کے استعمال سے بنا ہے۔ کُل کائنات کی ساخت اور بناوٹ پر غور کرنے والوں کا خیال ہے کہ یہ ایک گول دائرہ اور اس کے اندر موجود قطر، یعنی ریڈیس (Radius) کے اشتراک سے قرار پذیر ہے۔ یہ گول دائرہ، صفر (0) ہے تو قطر، ایک (۱) ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کی اپنی طبعی بناوٹ بھی بائنری لینگوئج ہی پر منحصر ہے۔

دماغ کے مختلف خانے ہیں اور ہر خانے کا ایک مختلف مگر مخصوص کام ہے جسے صرف وہی خانہ کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح کمپیوٹر کے مختلف حصّے بھی اپنا اپنا مخصوص کام کرتے ہیں، کوئی اور کام اس کے بس میں ہی نہیں ہے۔ دماغ کے مخصوص خانوں کو اگر زندگی میں بالکل استعمال ہی نہ کیا جائے تو وہ تمام

Marfat.com

عمر خالی ہی رہ جاتے ہیں۔ اگر آدمی کوئی ایسا طریق وضع کر لے کہ اس کے دماغ میں انونٹری لینے کا عمل بند ہو جائے یا پہلے سے لی گئی انونٹری ڈیلیٹ ہو جائے، تو اسے کشف المحجوب کہیں گے۔ آدمی کا دماغ انونٹری لینے پر مجبور ہے، لیکن اگر ارادتاً اس عمل کو روک دیا جائے، تو یہ بھی کشف کی قسم میں سے ہو گا۔ اس ضمن میں حافظ سائیںؒ، بابا سائیںؒ کی وساطت سے فرمایا کرتے۔

(Humor is the only source 2 stop human brain 2 take inventories)

دماغ کو تخلیق کرنے والا خود مکشوفِ اعظم ہے۔ اُس کے پاس ارادہ ہوتا ہے اور اس کے تمام عوامل اس کے ارادہ ہی سے تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ اس کا امر ابھی کُن کہتا بھی نہیں اور فیکون ہو چکا ہوتا ہے۔ مگر کائنات کا ذرّہ ذرّہ انونٹری لینے پر مجبور و پابند ہے۔ تخلیق امر کے جہان کی ہو یا خلق کے جہان کی، یہ تمام اصل میں انونٹری ہی کا پھیلاؤ ہے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا، آدمی کا دماغ بے اختیاری میں انونٹری لیتا چلا جا رہا ہے اور اس کی یہ صلاحیت لا محدود ہے، جب کہ کمپیوٹر میں یہ عمل اختیاری ہے، اور آخر کار اس کی ایک حد ہے۔ آدمی کا دماغ جو انونٹری لیتا ہے، وہ سب کچھ وجود میں پہلے سے موجود ایک چِپ (Chip) میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اپنے سمجھنے کے لیے اس چپ کو ہم روح (Spirit) کہہ لیتے ہیں۔ موت کے وقت وہ چپ، روح کی شکل میں قبض ہو کر، اپنے ازلی ٹھکانے میں منتقل ہو جاتی ہے، جس میں تمام انونٹریز کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔ جیسے CCTV میں فلم بن کر محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے، جو ہر قسم کے ثبوت کے لئے کافی ہوتی ہے، اسی طرح کل قیامت کے روز وجود کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہئے، روح میں موجود انونٹریز کا ریکارڈ گواہی کا کام دے سکے گا۔

آدمی کے دماغ کا گرے میٹر (Grey matter) جو انونٹریز لینے کا کام کر رہا ہے، موت کے بعد سب سے زیادہ سبک رفتاری میں مایہ اور سیال بن کر پگھل جاتا ہے بلکہ ابتدائی چند گھنٹوں میں ہی گرے میٹر تباہ ہو جاتا

Marfat.com

ہے۔ دماغ کے گرے میٹر کے انونٹری لینے کا عمل الیکٹر و میگنیٹک شعاعوں سے متعلق ہے۔ ایک آدم کی دوسرے آدم سے کشش کا بنیادی سبب یہی شعائیں ہیں ۔ اگر ان الیکٹر و میگنیٹک شعاعوں کی فریکوئنسی (Frequency) بالکل ایک جیسی ہو جائے تو دو افراد کے درمیان کشش، خصوصی توجہ میں بدل جاتی ہے، جسے دلی رغبت، انس اور محبت کہا جاتا ہے۔ جب ایک آدم مر جاتا ہے تو اس کا گرے میٹر بہت جلد ختم ہو جاتا ہے، اس لیے اس کا دماغ مزید انونٹری نہیں لے سکتا۔ چونکہ الیکٹر و میگنیٹک شعائیں پیدا ہی نہیں ہوتیں، تبھی وہ مردہ، کسی زندہ کی طرف کشش کا باعث نہیں بنتا اور نہ ہی زندہ کو اس کی طرف رغبت ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ سڑکوں، بازاروں، مارکیٹوں وغیرہ سے گزرتے ہوئے ہزاروں لوگ نظر پڑتے ہیں، لیکن کشش و رغبت ہر کسی سے نہیں ہوتی۔ اُس کے برخلاف کبھی کسی سے آنکھیں چار ہوتے ہی دلی مسرت و فرحت ملتی ہے۔ یہ دراصل الیکٹر و میگنیٹک شعاؤں کی فریکونسی ملنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ خوش قسمت بندگان جو محبتِ الٰہی میں سرشار ہو جاتے ہیں، طبعی موت کے باوجود ان کا گرے میٹر ختم نہیں ہوتا اور الیکٹر و میگنیٹک شعائیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان کی قبر پر آکر ایک خاص کشش و رغبت محسوس ہوتی ہے، حالانکہ عام طور پر ماں باپ کی قبروں پر بھی ایسی کشش میسر نہیں آتی۔ اس لیے کہ ماں باپ کا گرے میٹر ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ اللہ کے ولی، طبعی موت کے بعد بھی لامحدود انداز میں انونٹری لیتے رہتے ہیں۔ ظاہری پردہ کے بعد ان سے تعلق رکھنے کے لئے ان کی الیکٹر و میگنیٹک شعاعوں سے ہم آہنگی ضروری ہے۔ جتنی مضبوط ہم آہنگی ہوگی اتنی ہی والہانہ ان کی محبت ہوگی۔

وہ چِپ جو انونٹریز کو محفوظ کر کے اس کا مستقل (Permanent) ریکارڈ رکھ رہی ہے اگر وہ چِپ موجود ہی نہ ہو تو لامحالہ ریکارڈ بنایا ہی نہیں جا سکے گی۔ اس بات کو سمجھتے ہوئے ایک نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کی چِپ chip اس کی طبعی زندگی میں ہی قبض ہو جائے، بالکل اسی طرح جیسے وہ موت

Marfat.com

کے وقت قبض ہو گی، تو اس اختیاری قبض کے بعد وہ اپنی زندگی ہی میں inventory انونٹری لیے جانے کے عذاب سے محفوظ ہو سکتا ہوں۔ اسی معنی کو بلّھے شاہؒ نے ایک شعر میں کہا ہے:

'جے نہ مر سیں بااختیار تاں وی مر سیں بے اختیار' (پنجابی)

ہر سالک کو اپنی چپ chip بااختیار طریق سے قبض کرنے کی جدوجہد کرنا چاہیے۔ جب کبھی بھی یہ انعام میسر آجائے، یہ ہی 'مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُ' ہو گا۔ ٹھیک اس لمحہ کے بعد اس کی انونٹری کا record نہیں بن سکے گا۔ اصل میں یہ انعام ہے اس لیے جس پر وارد ہو تا ہے، وہ زندگی میں کوئی ایسا عمل کرتا ہی نہیں، جو اس کے لیے شرمندگی کا باعث ہو۔ اسے محفوظ کر دیا جاتا ہے وگرنا ایسا نہیں کہ اس کا مواخذہ ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ زندگی کی وجہ سے گرے میٹر، انونٹری لینے کا کام کرتا رہتا ہے۔ چپ (chip) نہ ہونے کی وجہ سے اس کا مستقل ریکارڈ نہیں بنتا۔ جو لوگ زندگی میں، اپنے اختیار کے ساتھ اپنی چپ (chip) قبض کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، طبعی موت ان کے لئے حقیقی موت نہیں ہوتی۔

چونکہ وہ اپنی اصل بچا لینے میں کامیاب ہو چکے ہوتے ہیں، اس لئے قدرت کاملہ کے کرم سے ان کی نقل بھی محفوظ کر دی جاتی ہے۔ ان کا گرے میٹر بھی کبھی فنا نہیں ہوتا۔ طبعی موت کے بعد زیرِ زمین زندہ ہوتے ہیں۔ عام لوگ ان کی زندگیوں کا شعور کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ ہستیاں الیکٹرو میگنیٹک (Electromagnetic) شعاعوں کی وساطت سے قید حیات میں پابند لوگوں کو متوجہ بھی کرتے ہیں، اور ان کی کشش کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ جب تک چپ (chip) کسی شخص میں موجود ہے اور اس کی انونٹری کا record مستقل بنیادوں پر بن رہا ہے، وہ حالت حجاب میں ہے۔ جوں ہی چپ قبض ہو جاتی ہے اور یہ مستقل ریکارڈ بننے کا عمل رُک جاتا ہے اس کو کشف کہا جاتا ہے۔ جو مکشوف ہے یقیناً محجوب نہیں اور جو حجاب میں ہے، اسے حالت کشف کا دعویٰ زیبا نہیں۔

Marfat.com

آدمی کے وجود میں انونٹری لینے کا عمل ایک مشین کی طرح کام کر رہا ہے۔ گرے مَیٹر ہر آدمی میں انونٹری لینے کا پابند ہے جب کہ الیکٹرو میگنیٹک شعاعیں وہ طاقت ہیں، جو اس مشین کے کام کو مکمل کرتی ہیں اور لی جانے والی انونٹری کو چِپ میں منتقل کرتی ہیں۔ الیکٹرو میگنیٹک شعاعیں، غیر مادی (Un-tangible) قوت ہیں اور آدمی کے سارے وجود کی بناوٹ مادی (tangible) ہے۔ بعد از موت، حشر کے روز، جسم سے سوال جواب کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ چِپ میں موجود ریکارڈ، سوال وجواب کے مترادف ہو گا۔ سب کچھ چِپ میں عیاں ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ انونٹری ہر وجود کے لئے بذاتِ خود سوال بھی ہے اور جواب بھی۔

جو زندگی میں بااختیار طریقہ سے حالتِ کشف حاصل کر لیتا ہے، وہ روزِ قیامت خود بھی انعام یافتگان میں سے ہو گا اور انعام بانٹنے والوں میں بھی ہو گا۔ باذن اللہ شفاعت کا حقدار ہو گا۔ جو شخص زندگی میں اپنی چِپ بااختیار طریق سے قبض کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، وہ وقت اور زماں کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ بالکُل موت کے مترادف حالت ہے۔ جب زماں و مکان اور وقت کی قید سے آزادی میسّر آتی ہے تو انونٹری لینے کا عمل بھی ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔ ایسا 'مکشوف' شخص، قطب شمال سے قطب جنوبی تک اور عرش معلیٰ سے تحت الثریٰ تک کی تمام کیفیات کو بیک وقت، انونٹری کی طرح حاصل کرتا ہے۔ جیسے کیمرہ کی آنکھ میں تمام منظر محفوظ ہو جاتا ہے (Scene captured)، حالانکہ مرکوز (focus) کسی ایک شے (object) کو کرنا مراد ہوتا ہے۔

ہر کسی کی مَیں، اس کی اپنی چِپ میں قید ہے۔ بالفاظِ دیگر ہر مَیں خود اپنی ہی انونٹری کی قیدی ہوتی ہے، جب کہ ولی اللہ اس قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ چمڑہ ایک دفعہ دباغت کے عمل سے گزر جائے تو عمر بھر، بلکہ تا قیامت خراب نہیں ہوتا۔ جو ایک دفعہ آزاد ہو جائے، اس کے لیے دوبارہ قید کا تصور عبث ہو گا۔ ایسے اولیاء اللہ طبعی موت کے وقت اپنی چِپ بذاتِ خود اپنے ربّ کے سپرد کرتے ہیں۔

Marfat.com

ملک الموت عزرائیل کی مجال نہیں کہ ان کی جان کنی کرے کیونکہ اصل کے ساتھ ان کی نقل کی بھی خیر ہوتی ہے۔ اس جہانِ فانی سے پردہ کے بعد اپنے ابدی نشان یعنی قبر سے باہر بھی نکل سکتے ہیں! کشف المحجوب میں رقم ہے، کسی نے حضرت بایزید بُسطامیؒ سے ان کی عمر کی بابت دریافت کیا، فرمانے لگے، پانچ برس کا ہوں۔ پوچھنے والا ہنس پڑا۔ اصل میں بُسطامیؒ یہی اشارہ دے رہے تھے کہ مجھے آزاد ہوئے اتنے برس ہوئے ہیں۔

اولیاء اللہ میں یہ سنّت قائم ہے کہ اس جہانِ کو خیر باد کہتے وقت اپنے جانشین کو اپنی کُل کی انونٹری عطا کر جاتے ہیں۔ اُس کا مکمل نقش جب جانشین کی چِپ پر منتقل ہو جاتا ہے تو اس کی ذاتی انونٹری کا ایسے حصّہ بن جاتا ہے جیسے خود اُس کے ساتھ وارد ہوا ہو۔ ایک کی انونٹری دوسرے اور تیسرے سے ہوتی ہوتی آج کے زمانہ میں جس کے پاس محفوظ ہو گی وہ گزشتہ چودہ صدیوں کے تمام رازوں کا قدرتی طور پر واقف اور عارف ہو گا۔ گو آج کا ولی اللہ، کَل گزرے زمانہ میں موجود نہ تھا مگر اس شفقت کی بنیاد پر وہ گزرے ہوئے تمام زمانوں سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ہم نے حافظ سائیںؒ کو ماضی کے کئی واقعات اس طرح بیان کرتے سنا ہے کہ حیرت ہوتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ آنکھوں دیکھا حال بیان فرما رہے ہیں۔ ماضی میں رونما ہونے والے حالات، واقعات اور مشاہدات انونٹری کے انتقال کی بنیاد پر ان کو باباسائیں حسن الدینؒ کی معرفت منتقل ہوئے تھے۔ دراصل اولیاء اللہ کی انونٹری Inventory ان کے پہلے سانس سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ ازل سے لیکر ابد تک محیط ہوتی ہے۔ یہ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ کے درجہ میں ہوتے ہیں۔

۵۳۔ نُورِ حیات

قدرت کاملہ نے تخلیق فرماکر ہر بنی آدم کو اپنی طرف سے ایک نُور عطا فرمایا ہے۔ جو قرآنی فیصلہ: وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ: کے تحت میں بھی آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ کے لئے نفس، روح اور

Marfat.com

جسم مقرر کرنا کفر ہو گا۔ اس لئے روحِ خداوندی ، کو بمنزلہ نُورِ کُلی کے تسلیم کرنا مناسب ہے، جس میں سے نفخ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ اولادِ آدم کو اُسی نُورِ کُلی میں سے، نفخ کی شکل میں حصّہ یسّر آتا ہے۔ بظاہر اسکی تصدیق کسی طرح نہیں ہو سکتی، کہ آیا ہر بنی آدم کو یکساں نُور ملتا ہے یا اس تقسیم میں کوئی تفریق کی جاتی ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کی بنیادی علامت اسی نُور کے سبّب سے ہے۔ روح، وجود کے لیے، باعث تحریک ہوتی ہے۔ روح کُلی میں سے جو 'نُور' اولادِ آدم کو ملتا ہے، وہ اسکی زندگی کا باعث ہو جاتا ہے۔ اوّل صوت یا حرکت جو بچے کی زندگی پر دلالت کرتی ہے، وہ روح کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نُورِ حیات (Glow of Life) جب تک پیدا ہونے والے جاندار کو نہیں ملتا اس کی تحریک اور زندگی ناممکن ہوتی ہے۔ اسی طرح حرکت اور بڑھنا (Growth) بھی اس بات کی ضمانت ہوتی ہے کہ نُورِ حیات عطا ہو چکا ہے۔ یہ دیے کی لَو (Flame of Candle) کی طرح دونوں آنکھوں کے درمیان میں، ماتھا کے نچلے حصّہ میں ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص کا وجود، زمین کے ساتھ زاویہ قائمہ بنائے سیدھا کھڑا ہو، تو یہ بھی بالکُل سیدھی ہوا کرتی ہے۔ لیکن کمر کے بل سیدھا لیٹنے کی صورت میں یہ لَو، آگ کی بنیادی خصوصیت کے طور پر، اپنے آپ کو آسمان کی طرف مرکوز رکھتی ہے۔ یہ اسکی لازم صفت ہے۔ سر آسمان کی طرف ہو تو یہ دَماغ کو حدّت (Warmth) مہیا کرتی رہتی ہے، جس کی وجہ سے وہ خوب لگن اور جذبہ سے اپنے فرائض سرانجام دیتا رہتا ہے۔ جسم کے مختلف اعضاء کو متوازن طریق سے چلانے کے ساتھ ساتھ عقل و دانش کے متوازن استعمال اور سوچ و فکر میں ہم آہنگی کا باعث بھی یہی حدّت بنتی ہے۔ لیکن جب آدمی لیٹ جاتا ہے تو، وہ لَو، اپنی فطری سرشت کے مطابق آسمان کی طرف بلند رہتی ہے۔ اس صورت میں حدّت دماغ کو براہِ راست نہیں مل سکتی، جس وجہ سے وہ ٹھنڈا ہوتا ہوا، آخر کار، کُل وجود کو بھی ٹھنڈا کر دیتا ہے، حتّٰی کہ موت کی بہن یعنی نیند وارد ہو جاتی ہے۔ ان اوقات میں عقل و دانش اور سوچ و فکر بالکُل مفقود ہو جاتے ہیں۔ یہ لَو

Marfat.com

اپنے درست مقام (Posture) کی بنیاد پر وجود آدم پر اثرات مرتب کرتی ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ غور و فکر کے دوران آدمی اپنے ماتھے کے نچلے، بالخصوص آنکھوں کے درمیانی حصّہ کو سکیڑتا ہے، جیسے اپنی پوری قوت صرف کر کے اُس لَو کو تیز کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کیونکہ جتنی یہ لَو زیادہ روشن ہو گی اتنی ہی وجود میں فہم کی قوت تیز (Sharp) ہو جائے گی۔ جس کی وجہ سے ایسا آدم طاقتور اعصاب (Strong Reflexes) کا مالک ہوتا ہے۔ جبکہ وہ لوگ جن کے اعصاب کمزور (Reflexes Poor) محسوس ہوتے ہیں، ان کے متعلق خود بخود قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُنکی لَو پھیکی یا مدھم (Fade) ہے۔ اسی لَو (Glow) کی وجہ سے کائناتِ وجود میں تحریک، بڑھنا (Growth) اور پھر اپنے جیسا کرنا (Reproduction) ممکن ہوتا ہے۔ جتنی یہ لَو مضبوط اور طاقتور ہو گی اتنی ہی وجود کی یہ خصوصیات (Faculties) نمایاں اور موثر (Effective) ہوں گی۔ جب کہ اگر معاملہ الٹ ہو تو تحریکِ وجود، اسکا بڑھنا اور اپنے جیسا کرنا جیسی خصوصیات بہت خفیف ہونگی، حتیٰ کہ غیر موثر (Ineffective) شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔

یہی لَو وجودِ کائنات میں :نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: کا رول (Role) ادا کرتی ہے۔ وجودِ آدم کی تمام جگمگاہٹ اسی کی مرہون منت ہے۔ سورۃ النّور آیت ۳۵ کے الفاظ میں: مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ: یعنی اس نور کی مثال اس طرح ہے جیسے ایک طاق، جس میں چراغ رکھا ہو، چراغ فانوس میں ہو اور فانوس موتی کی طرح چمکتا ستارہ ہو، جسے مبارک شجر زیتون سے روشن کیا جاتا ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ اور از خود جلا ہی چاہتا ہے حالانکہ اسے نار نے مَس بھی نہیں کیا۔ یہ نور کے اوپر نور کی مثال ہے۔ حقیقتاً یہ لَو طاق میں رکھے ایک ایسے

Marfat.com

چراغ کی مانند ہے جو روشن ہو کر سارے فانوس کو ستارہ کی مانند چمکا دیتا ہے۔ مگر عین اُسی وقت یہ بھی سمجھ نہیں آتی کہ مسلسل جلنے والی یہ لَو اپنی روشنی (نُور) کے لیے کس منبع کی مرہونِ احسان ہے؟ ایک ایسا مبارک شجر زیتون جو نہ شرقی ہے نہ غربی اور اس کا "زیت" از خود جلا ہی چاہتا ہے بنا کسی اور شعلہ کے۔ یہی دوہرے نُور کی مثال ہے۔ نُور کبھی روشن ہونے کے لیے نار کا مرہونِ منّت نہیں ہو سکتا۔ نُور کی لَو نُور ہی سے جگمگاتی ہے اسی کو: نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ: سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وجودِ آدم فانوس کی مثال ہے۔ چہرہ طاق کی طرح اور دو آنکھوں کے درمیان کا حصہ (3rd Eye / Retinal Chiasma) اس چراغ کی مانند ہے جس کے روشن ہونے کے لیے مہیا ہونے والا زَیۡتُ کسی سمت کا پابند نہیں۔ مگر وہ چھوٹا سا چراغ یا لَو (glow) کُل فانوس کو ایسا روشن کرتا ہے گویا وہ ستارہ ہو کسی موتی کی مانند جگمگاتا ہوا۔ کُل وجود کی زندگی اور قرارِ مقررہ اسی کے سبّب سے ہے۔ عمومی طور پر ستارہ کی پانچ سمتّیں (corners) ہوتی ہیں۔ وجود آدم میں عطائی پانچ حسیات چونکہ اس مماثلت میں آتی ہیں شاید اسی لیے اسے ستارہ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ یہ حسیات یعنی، بینائی، گویائی، شنوائی، شامہ اور لمس اور انکے آلات و مقامات یعنی آنکھ، تالو، زبان، کان، ناک، اور جسم اپنے تمام عوامل و افعال کے لیے اُسی لَو سے تقویت پاتے ہیں۔ شجرہ مبارکہ زیتونہ، ذکر فکر، شعور و خیال اور عمل و مجاہدہ کی وہ پاکیزگی ہے جس کی کوئی متعین سمت نہیں مگر یہ ہر دم اپنے ہونے کی وجہ سے اُس لَو کو ایسی خوبصورتی سے برقرار رکھتی ہے کہ اس کی تازگی اور حسن، مسلسل جوان اور متوازن رہتے ہیں۔ یعنی جو لوگ جتنا زیادہ اور پاکیزہ ذکر و فکر اور عمل و مجاہدہ کرتے ہیں ان کی لَو اتنی زیادہ استقامت پذیر ہوتی ہے۔ عمر کا بڑھنا ان کے وجود کے ظاہری اعضاء و جوارح پر تو اثر انداز ہو سکتا ہے مگر ان کی لَو (glow of life) ہر دم جوان رہتی ہے۔

ان کے جذبات و احساسات اس طرح تازہ دم ہوتے ہیں گویا ابھی ماں کے پیٹ سے برآمد ہوئے ہیں۔

Marfat.com

گو قدرت کاملہ نے فَنَفَخْتُ کے وقت ہی ہر روح کے قیام کا ایک متعین فیصلہ فرما دیا تھا اور مقرر قضاء کے مطابق ہر روح کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہونا ہے۔ اس تعین شدہ اوقات میں تغیر و تبدل ناممکن ہے اس لیے اس لمحہ کسی نہ کسی بہانے سے اُس لَو کو ماند کر کے بجھا دیا جاتا ہے اور اُس کا بُجھنا ہی موت کا نشان بن جاتا ہے۔ حیات بعد از ممات اور ابدی حیات کے حاملان جو بَلْ اَحْیَاءٌ کے زمرہ میں آتے ہیں انہوں نے اپنی زندگی کے ممکنہ اوقات میں شجرۃ مبارکہ زیتونہ کو اس قدر ضیاء بخش دی ہوتی ہے کہ قضاء الٰہی اور ملک الموت بھی ان کی اِس لَو (glow of life) کو بجھانے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ تقدیر الٰہی کے تحت خود اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وگرنہ ان کی لَو قیامت تک ان کے زمینی نشانوں کو بھی زندہ رکھتی ہے اور ان عشّاق اور محبّان کے درجات میں روز افزوں ترقی کا باعث بھی بنتی ہے۔

۵۴۔ محاسبۂ ذات

ذات کا محاسبہ اتنا آسان عمل نہیں جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ نفس کُشی کا لفظ، جو یوں تو زبان زدِ خاص و عام ہے اور کئی لحاظ سے ذات کے محاسبہ کا مترادف مانا جاتا ہے مگر اس کا مفہوم یا عملی مظاہرہ شاید کسی کے بس کا روگ ہو۔ محاسبہ یقیناً نفس کُشی سے بہت قبل کا فعل ہے اور اس سے بہت ہلکا بھی ہے۔ محاسبہ کا سب سے سادہ طریقہ یہ ہے کہ آدم زاد، دن کے اختتام پر تمام دن کے افعال پر ایک طائرانہ نظر دوڑائے۔ اور اسی حالت میں ان تمام افعال کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے غور کر کے دیکھے کہ ان میں کہاں اور کیا خامی رہ گئی، کہاں زاغ تھا اور کس زاویے سے کوئی فعل معیار سے گرا ہوا تھا۔ اور پھر اسی وقت بقائم ہوش و حواس یہ فیصلہ کرے کہ دوبارہ کبھی ان افعال کا اس زاویہ سے مرتکب نہ ہونگا۔ اور پھر تمام عمر کے لیے اس فیصلہ پر کاربند رہنے کا تہیہ کر لے۔ ممکن ہے زندگی میں چند فعل

Marfat.com

ایسے ہوں جو اگر روزانہ سرزد نہ ہوتے ہوں تو اکثر تو سرزد ہوتے ہی ہونگے۔ اور جب غور کرنے کا یہ فعل کیا جائے گا تو چند ہی روز میں ایک ہی قسم کے کچھ ایسے افعال منظر عام پر آئیں گے جن کے متعلق اپنے ہی ضمیر کا یہ فیصلہ ہو گا کہ یہ یقیناً غیر معیاری افعال ہیں۔ اس تعیّن کے بعد ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا قطعی اور یقینی فیصلہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے ایک دن کا مصمّم ارادہ ان افعال سے خلاصی کے لیے کافی نہ ہو، بلکہ شاید بار بار کا اعادہ بھی بعید از قیاس نہ ہو، مگر ہمت نہ ہارنی چاہیے۔ اگر کوئی خطا روزانہ یا بالکثرت اور تسلسل کے ساتھ سرزد ہوتی محسوس ہو، تو بھی باقاعدگی سے اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کرتا رہے یہاں تک کہ یہ پختہ ارادہ وجود کی چھپی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس خطا پر حاوی ہو جائے اور آئندہ زندگی میں ارادتاً یا غیر ارادی طور پر بھی وہ غیر معیاری فعل کبھی سرزد نہ ہو۔

دن کے اختتام تک کی یہ عادت جب پختگی پکڑ جائے اور یقین ہو جائے کہ اس میں ناغہ بھی نہیں ہو رہا اور نہ ہی یہ احساس باقی ہے کہ غور و خوض کے باوجود زندگی کے عوامل میں نمایاں تبدیلی موجود نہیں، تو پھر چاہیے کہ اس عملِ محاسبہ کا درمیانی وقفہ کم کرنا شروع کرے۔ اصفیاءِ کرامؒ اس کے لیے ایک نماز سے دوسری نماز کے درمیانی وقفہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی اس طرح محاسبہ کا یہ عمل دن میں کم از کم پانچ مرتبہ ہو سکے گا اور یہ یقینی فائدہ بھی ہو گا کہ درمیانی وقفہ پورے دن کے وقفہ سے بہت کم ہونے کی وجہ سے اپنے افعال پر بہتر اور بھرپور نگاہ ڈالی جا سکے گی۔ قدرتی طور پر نماز کے لیے رکنا پڑے گا، اس ٹھہراؤ کی وجہ سے کاروبارِ زندگی کے عوامل میں رکاوٹ آئے گی، تو یہ موقع خود بخود فراہم ہو جائے گا۔ باوضو ہونے اور جائے نماز کے صاف ستھرے ماحول کی وجہ سے سوچ اور بھی احسن طریق سے اس فعل میں مدد دے گی۔ منطقی طور پر محاسبہ دن میں صرف ایک مرتبہ کی بجائے پانچ مرتبہ ہونا شروع ہو تو نتائج بالیقین نسبتاً بہتر حاصل ہوں گے۔ مزید بہتری کے لئے اس پنج وقتہ محاسبہ کو بڑھا کر لحہ بہ لحہ محاسبہ کے عمل تک بھی لایا جا سکتا ہے۔ اس کی بہترین شکل یہ ہے کہ آدمی ہر

Marfat.com

لمحہ جو کچھ بھی کر رہا ہوتا ہے، ایمان کی حد تک محسوس کرے کہ میرا عمل دیکھا جا رہا ہے اور یقیناً مجھ سے اس کی جواب دہی ہو گی۔ اولیاءِ عظامؒ فرماتے ہیں کہ وقت کا ہر لمحہ بنی آدم کے وجود سے مَس کرتا ہوا گزرتا ہے۔ پھر جب اپنی اصل پر لوٹتا ہے تو وہاں گواہی دیتا ہے کہ فلاں ابنِ فلاں اس لمحہ یہ فعل کر رہا ہے۔ ہر لمحہ کی گواہی، بالترتیب، اسی طرح جمع کر لی جاتی ہے جیسے کیمرہ کی فلم ہو، اور افعال کی یہی مجتمع گواہی روزِ جزا جب ہمارے سامنے پیش کی جائے گی تو اس سے انکار کی گنجائش نہ ہو سکے گی۔ اس وقت کوئی ان حقیقتوں کو جھٹلا نہ سکے گا، بلکہ کثرت سے لوگ اپنے نامۂ اعمال کے مشاہدہ کے بعد خود ہی اپنی منزل کا تعین کر کے اس طرف چل پڑیں گے۔ اور صدق دل سے گواہی دیں گے کہ اے مالک تو نے ہم پر کوئی ظلم نہ کیا، بلکہ ظلم تو خود ہم نے اپنے نفوس پر کیا اور یہ بھولے رہے کہ ہم دیکھے جا رہے ہیں اور تمام اعمال واپس لوٹا کر ہمارے سامنے پیش کیے جائیں گے۔

جب یہاں تک بات سمجھ آ گئی تو ہمیں چاہیے کہ ہر لمحہ اپنا محاسبہ جاری رکھیں کہ جو لمحہ بھی ہماری کمر کو مَس کر کے اپنی اصل کو لوٹے، وہاں یہی گواہی دے کہ اِس کو مَیں نے غافل نہیں پایا۔ یہ دھیان کا وضو کئے، وقت کی صلوٰۃ ادا کرنے میں مصروف تھا!

۵۵۔ تعیّنِ منزل

علم ریاضی (Mathematics) بہت وسیع علم بھی ہے اور اتنی ہی بڑی سائنس بھی ہے۔ ریاضی کے علم کی واقفیت کسی بھی شخص کو نہایت ممتاز کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اس کے عملی نفاذ (Practical application) میں بھی مہارت حاصل کر لے۔ سائنس کی تقریباً تمام شاخوں پر علم ریاضی محیط ہے، بلکہ کوئی بھی ایسا مضمون جو سائنس سے متعلق ہے، وہ ریاضی کے علم کے بغیر ادھورا ہوتا ہے۔ ہم اس وقت اس حقیقت کو ثابت کرنے کی طرف نہیں جا رہے، بلکہ علم ریاضی کی ایک شاخ جیومیٹری (Geometry) کے ایک سادہ سے نکتہ کو اپنا موضوع بنانے جا رہے ہیں۔

Marfat.com

علم جیومیٹری کے مطابق ایک نقطہ (Dot) کی سادہ ترین تعریف یہ ہے کہ اس میں سے لاتعداد (Infinite) لکیریں (Lines) گزر سکتی ہیں یا گزاری جا سکتی ہیں۔ کسی بھی کاغذ پر پنسل کے ساتھ ایک نقطہ لگائیں اور پھر اس نقطہ میں سے گزرتی ہوئی سیدھی لکیریں کھینچتے جائیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس میں سے لاتعداد سیدھی لکیریں مختلف سمتوں میں گزر سکتی ہیں۔ لیکن اگر آپ اس نقطہ سے کچھ پرے ایک اور نقطہ لگائیں، تو آپ دیکھیں گے کہ ان دو نقطوں میں سے صرف ایک ہی سیدھی لکیر (Straight line) گزر سکتی ہے۔ اس ایک سیدھی لکیر کے علاوہ ہزار کوشش کے باوجود آپ کوئی دوسری سیدھی لکیر نہ کھینچ سکیں گے۔ مثال بالا میں اگر سیدھی لکیروں کو راستہ، صراط یا طریقہ وغیرہ کے مترادف مان لیں اور نقطہ اوّل کو اپنی ذات تصوّر کر لیا جائے، تو یہ واضح طور پر محسوس ہو گا کہ جب تک ہم ایک نقطہ کی طرح اکیلے ہوتے ہیں، ہم میں سے لاتعداد سیدھی لکیریں گزر رہی ہوتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ہم لاتعداد طریقوں اور راستوں سے دوچار (Expose) ہوتے ہیں۔ کچھ راستے اور طریقے ہمارے اپنے اندر سے گزر رہے ہوتے ہیں اور ہم ان کے بارے میں بے بس و بے اختیار ہوتے ہیں۔ جب کہ کچھ راستے اور طریق ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر سے شروع ہو رہے ہیں اور ان کے متعلق ہمیں کچھ کچھ گمان ہوتا ہے کہ وہ ہمارے اختیار میں ہیں۔ لیکن ان بے شمار، مختلف النوع اور مختلف السّمت راستوں اور طریقوں کی موجودگی میں ہمیں کبھی بھی سکون اور ٹھہراؤ میسّر نہیں آتا۔ ہم ہر وقت ایک مخمصہ (Chaos) کا شکار رہتے ہیں کہ کس راستہ کو ٹھیک کہیں اور کسے غلط گردانیں؟ کس راستے اور طریق پر قدم رکھ کر سفر شروع کریں اور کس راستے اور طریق سے منہ موڑ لیں؟ گومگو اور شک کی یہ کیفیت ہمیں ہر دم بچھو کی طرح ڈستی رہتی ہے اور ہر وقت بے چین اور سرگرداں رکھتی ہے اور یقینی طور پر کوئی بھی حل سجھائی نہیں دیتا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان لاتعداد اور ان گنت راستوں اور طریقوں میں سے کوئی شخص

Marfat.com

اتفاقیہ (At random) ایک طریقہ اختیار کر لے تو وہ طریقہ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے مگر من حیث الکل یہ اتفاق (Probability) ناممکن حد تک مشکل ہو گا۔

درج بالا مثال میں اگر نقطۂ اوّل کو اپنے ذات ہی مانا جائے، مگر نقطۂ دوم کو اپنی منزل کے طور پر تسلیم کر لیا جائے، تو یکلخت سب کچھ بدل جائے گا۔ ہم حیران ہو کر دیکھیں گے کہ اب ہمارے سامنے صرف ایک سیدھا راستہ ہے، صرف اور صرف ایک، جسے قرآنِ پاک نے صراطِ مستقیم کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اور جس کے لئے رسولِ کریمؐ ہر نماز کی ہر رکعت میں ہدایت کی استدعا کرتے رہے اور تمام امتیوں کو ایسا ہی کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ فرض نماز ہو یا نوافل، سورۃ الفاتحہ کی تلاوت اس کی ہر رکعت میں لازم ہے اور جب اس سورۃ کو پڑھا جائے گا تو صراطِ مستقیم کے پانے کی التجا اس میں لازماً آ جائے گی۔ اس صراطِ مستقیم کو عملی طور پر پانے کے لئے ایک منزل کا انتخاب ضروری ہے۔ سو اگر ہم چاہتے ہیں کہ شکوک و شبہات ہماری زندگی سے زائل ہو جائیں، بے سکونی اور بے چینی کی علامات ہمارے اندر معدوم ہو جائیں اور ہمیں یقین اور صحت کے ساتھ صراطِ مستقیم کا علم و ادراک ہو جائے تو صرف تعیّنِ منزل کی ضرورت ہو گی!

۵۶۔ کاملاں را راہنما

ایک پلازہ نما دفتر کی مثال مدِ نظر رکھیں۔ جس کا تمام عملہ اور مرکزی افسران اسی دفتر میں بیٹھتے ہوں۔ اس دفتر کی عمارت سات منزلہ ہو۔ عمومی تقسیم کے مطابق پہلی منزل پر حفاظتی عملہ، صفائی کا عملہ، ہر قسم کا معاون عملہ مثلاً دفتری، چوکیدار، بجلی کا کام کرنے والے، ایر کنڈیشننگ کی نگرانی کرنے والے، پلمبر اور ڈاک تقسیم کرنے والوں کے کمرہ جات ہوں گے۔ دوسری منزل پر عام انتظامی عملہ کے لوگ ہوں گے۔ جن میں مختلف نوعیت کے کام نمٹانے کے لئے کلرک، ان کی نگرانی کے لئے اسسٹنٹ حضرات

Marfat.com

اور ہیڈ کلرک یا سینیئر اسسٹنٹس شامل ہوں گے۔ تیسری منزل پر مالیاتی شعبہ (Finance wing) سے متعلق افراد بیٹھتے ہوں گے۔ جن میں تنخواہوں کا حساب رکھنے والے، بجٹ بنانے والے، آڈٹ کرنے والے اور مختلف النوع محکمانہ فنڈز کے گوشواروں کی ترتیب دینے والا عملہ موجود ہوگا۔ چوتھی منزل اسسٹنٹ ڈائریکٹرز (Assistant directors) کے درجہ کے لوگوں سے وابسطہ ہوگی۔ پانچویں منزل پر ڈپٹی ڈائریکٹرز (Deputy directors) کے دفاتر ہوں گے۔ چھٹی منزل ڈائریکٹرز (Directors) کے لئے مخصوص ہوگی، جبکہ ساتویں اور آخری منزل پر چیف ایگزیکٹیو آفیسر (CEO) رونق افروز ہوں گے۔ عمومی مشاہدہ کے مطابق ایسے دفاتر میں پہلی اور دوسری منزل کے عملہ کے لوگوں کو بلاوجہ اوپر والی منازل میں جانے کی اجازت اور جرأت نہیں ہوتی۔ صرف ضروری کاموں کے لیے بلائے جانے پر ہی وہاں جاتے ہیں اور جوں ہی کام مکمل کر لیتے ہیں، اپنے کمرۂ دفتر میں واپس آجاتے ہیں۔ اوپر والی منازل میں ان کا غیر ضروری ٹھہرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ حتّٰی کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی زیادہ سے زیادہ ڈپٹی ڈائریکٹر کی منزل پر جایا کرتا ہے۔ اور جب ان سے احکامات لے لیتا ہے تو جلد اپنی منزل پر لوٹ کر آجاتا ہے۔ اسی طرح ڈپٹی ڈائریکٹرز کو اگر کسی ڈائریکٹر کے پاس میٹنگ وغیرہ کے لیے جانا مقصود ہو تو وہ بھی مقصد پورا ہونے کے بعد غیر ضروری وہاں نہیں رکتے۔ فوری طور پر واپس اپنے مقام پر آکر دیے گئے احکامات پر عملدرآمد کرواتے ہیں۔ اور چیف ایگزیکٹیو آفیسر (CEO) کے مقام و منزل پر تو کوئی بغیر بلائے جا ہی نہیں سکتا۔ وہ صرف اپنی مرضی سے جس کسی کو جس کام کے لیے چاہتا ہے بلواتا ہے۔ کھڑے کھڑے حکم صادر کرتا ہے اور فارغ کیے جاتا ہے۔ اس کے دفتر میں تو عموماً کسی کو بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی ڈائریکٹر وغیرہ کو یہ شرف حاصل ہو بھی جائے تو اس کا وقت بہت معمولی ہوتا ہے۔ اور یہ بیٹھنا بھی خوش گپیوں وغیرہ کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ صرف کام کے ضروری احکامات کے لیے ہوتا ہے۔

Marfat.com

مختصراً یہ کہ ہر نچلے درجہ والا اپنے سے اوپر والی منزل تک بلا وجہ یا بغیر مقصد کے پہنچ نہیں رکھتا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ڈائریکٹر بھی کئی کئی دن چیف ایگزیکٹیو آفیسر (CEO) کی منزل میں جانے سے قاصر رہتا ہے۔ چاہے اس کے دل میں یہ خواہش چٹکیاں بھی بھرتی ہو۔ اس کے مقابلے میں اگر اوپر والی منزل کے افسر، کسی بھی وقت اور کسی بھی مقصد کے لیے، اپنے سے نچلی منزل میں چلے جائیں تو ان کے لیے کبھی کوئی بندش مانع نہیں ہوتی۔ بلکہ نچلی منزل پر موجود عملہ، ان کو اٹھ کر ادباً سلام کرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی سچ ہے کہ نچلی منازل میں موجود سب افراد اور ان کے ذمہ کرنے کو دیے گئے تمام کام افسرانِ بالا کے مکمل علم میں ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ہر کام کے شروع کرنے کا حکم منازلِ بالا ہی سے صادر ہوتا ہے۔ لیکن منازلِ بالا میں کیا ہو رہا ہوتا ہے، یہ نچلی منزل والوں کے علم میں صرف اسی قدر آتا ہے جتنا ان کو کبھی بتایا جائے۔ وگرنہ وہ عملی طور پر اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ سب سے نچلی منزل پر موجود کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جن کو کبھی چیف ایگزیکٹیو آفیسر (CEO) کی منزل پر پہنچنا نصیب ہی نہ ہو۔ وہ اسی حالت میں ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی اس منزل پر جا ہی نہیں پاتے، چہ جائیکہ وہ جان سکیں اس منزل پر کیا ہوتا ہے۔

اولیاء اللہ کے بھی مدارج و مقامات ہوتے ہیں۔ ان درجات کو متذکرہ بالا مثال کی منازل کے مترادف مان لیا جائے، تو ظاہر ہو گا کہ نچلے درجہ کے ولی، درجۂ اعلیٰ کی منازل کے احوال سے عموماً بے بہرہ رہیں گے۔ انہیں صرف اسی قدر علم ہونے کا امکان ہو گا، جتنا ان کو درجۂ اعلیٰ سے خبر اور پیغام میسر آئے گا۔ ان درجات میں اعلیٰ ترین درجہ قطب یا غوث کا مقرر کیا گیا ہے۔ ایک عام ولی، قطب اور غوث کے درجہ کی بات مکمل طور پر سمجھنے سے قاصر ہو سکتا ہے۔ وہ 'داتا' کے درجہ سے متعلق تمام امور کیسے جان سکتا ہے؟ ویسے کائنات میں لقب داتا صرف علی الہجویریؒ ہی کے نصیب میں ہوا۔

Marfat.com

جیسے الوہیت،، رسالت اور امامت مخصوص مقامات ہیں، اسی طرح ولائیت میں قطبیت و غوثیت ایسے درجات ہیں جو اپنی ذات میں خاص الخاص ہیں۔ مگر بلاشک، درجہ ُداتا یکتا ہے۔ قطب ہر دور میں موجود رہتا ہے۔ کوئی زمانہ قطب کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا۔ ایک قطب صاحب جب طبعی پردہ کر جاتے ہیں تو فوری طور پر متبادل قطب صاحب کا تقرر کر دیا جاتا ہے۔ روایات کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و مرسلین بنی نوعِ آدم کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے، جو اپنے اپنے وقت میں تبلیغ کا کام کرتے رہے۔ گو خصوصیات میں ان رسولوں کا ایک دوسرے پر امتیاز ممکن ہے، مگر من حیث الکُل وہ پیغامِ خداوندی کا پرچار کرتے رہے۔ منصبِ امامت بھی مخصوص ضرور ہے مگر یہ کردار بارہ (۱۲) جگہ پر منقسم ہے۔ لیکن درجہ ُداتا صرف ایک ہی ذات یا فردِ واحد کے لیے مقرر کیا گیا۔

شانِ الوہیت کی کئی صفات ایسی ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف لوگوں میں منقسم اور ظاہر نظر آتی ہیں۔ اَلْکَرِیْمُ، اَلرَّحْمٰنُ، اَلرَّحِیْمُ، اَلْمُؤْمِنُ، اَلْمُهَیْمِنُ، اَلْغَفَّارُ وغیرہ صفات کا اظہار بندگانِ الٰہی کے ہاتھوں سرزد ہوتا بالکثرت نظر آجاتا ہے۔ مگر 'شانِ صفتِ داتا' ایسی مخصوص ہے کہ نہ تو علی الہجویریؒ غریب نواز کے علاوہ اور کسی کو عطا کی گئی اور نہ ہی اب اس کا امکان موجود ہے۔ کُل کائنات میں اور کسی رسول، امام اور ولی کے لیے یہ تخصیص نہ ہوئی۔ یہ ایک ایسی وراثت ہے جو اور کسی مخلوق کا حصہ نہ بن سکی۔

۵۷۔ احادیثِ قُدسی

بعثت اور اعلانِ نبوّت کے بعد رسول اللہ نے کبھی اپنی خواہش سے گفتگو نہیں فرمائی۔ سورۃ النجم آیات ۳،۴ میں بالفصاحت وارد ہے: وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی: یعنی وہ اپنی خواہش سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ وہ ان کی طرف کی گئی وحی ہوتی ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کا ہر فرمان، دراصل فرمانِ الٰہی ہے۔ حضورؐ جو وحی تلاوت فرمائیں وہ قرآن بنتا ہے۔ اس قرآن کی تفسیر و تشریح میں جو کچھ آپؐ سے صادر ہوا، وہ حدیث کہلایا۔ مگر حدیث قدسی وہ فرمانِ رسولؐ ہے، جو ذات

Marfat.com

احدیت کی طرف سے تو ہے، مگر کسی خاص مصلحت کے تحت حصہٗ قرآن نہیں بنایا گیا۔ درج ذیل احادیثِ قدسی اسی مد میں شمار ہوتی ہیں۔

i: كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ:

یعنی مَیں ایک چھپا خزانہ تھا۔ مجھے چاہت ہوئی کہ مَیں پہچانا جاؤں۔ اس لیے مَیں نے خلق کو تخلیق کیا: در حقیقت یہ فرمانِ الٰہی ہے مگر اس کی ادائیگی کے لئے زبانِ مصطفٰیؐ منتخب فرمائی گئی۔ جس تخلیق کی طرف اشارہ ہے اگر اس کا مفہوم مچھر مکھی، گدھے گھوڑے سور سانپ، یا قاتل، زانی، شرابی مانا جائے، تو انصاف کریں کہ کیا یہ اس کی پہچان کا سبب ہو سکتے ہیں؟ کیونکہ تخلیق کا مقصد چھپے ہوئے خزانہ کی تلاش اور پہچان ہے۔ ظاہر ہے یہ بہت اعلیٰ اور ارفع مقصد ہے۔ اس لئے ناممکن ہے کہ ذات احدیت کی پہچان اور معرفت رکھنے والی مخلوق کسی کو ڈنگ یا دولتی مارے۔ وہ قتل و عصمت دری کی مرتکب بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ ذاتِ احدیت نے جنہیں صرف اپنی پہچان کے لیے پیدا فرمایا وہ اس کی خاص مخلوق ہے۔ جو ازلی عارفِ الٰہی ہے۔

جب ذات لَم یَزَل وَلاَ یَزَال یہ فرمائے کہ مَیں ایک چھپا خزانہ تھا، تو غور طلب امر ہے کہ چھپنا تو تب ہوتا ہے جب کوئی ڈھونڈ رہا ہو۔ تعاقب و تلاش و جستجو میں ہو۔ ثابت ہوا کہ 'کوئی' ہمیشہ سے ذات احدیت کی تلاش میں اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ تبھی تو اسے چھپنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب ڈھونڈنے والے کی صادق سعی اور پیہم استقلال سے اس ذات کی اپنی تڑپ اور اشتیاق بڑھا، تو اسے چاہت ہوئی کہ مَیں اس کو دیکھوں، ملوں، جانوں اور چاہوں، جو میری جستجو میں سرگرداں ہے۔ چونکہ ذات احدیت نہ مجسم ہو سکتی ہے نہ زمان و مکان کی مقید۔ اس لئے اپنے چاہنے والے کا عرفان کرنے کے لیے اس نے ایسی مجسم مخلوق کر دی، جس میں اس کی تمام صفات پائی جاتی تھیں۔ وہ مجسم

Marfat.com

مخلوق، اللہ کی آنکھوں سے، اس عاشقِ صادق کو دیکھے گی۔ اللہ کی زبان سے، اس طالبِ حق کی تعریف کرے گی۔ قلبِ خدا سے، اس مستقیمُ الحال کا عرفان کرے گی۔ دیکھنا اور تعریف و عرفان کرنا، عمل ہیں۔ ذات احدیت سے سرزد ہوں تو کفر ہو گا۔ یہ عمل وہ مخلوق کرے گی اور تسلیم کیا جائے گا کہ خود ذات احدیّت نے کیے۔ وہ ایسی مخلوق ہے۔ جو اللہ نے اپنی چاہت، امر اور ارادہ سے کی۔ چونکہ اس کی چاہت، اَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ تھا، اس لیے وہ مخلوق فقط اسی کام کے لیے ہو کر رہ گئی۔ اللہ عزوجل وقت کا پابند نہیں، وقت تو اسکی ایک ادنی مخلوق ہے۔ وہ مخلوق جو اس نے چاہت و ارادہ سے کی، وہ بھی وقت کی پابند نہیں، زمان و مکان کی قید کا تو ذکر ہی کیا۔

جو ذات چھپ رہی تھی، وہ "احد" تھی۔ تعاقب کرنے والے کا نام اسی نسبت سے "احمد" ہو گیا یعنی احد کی حمد کی انتہا۔ جب احمد نے حمد کی انتہا کر دی، تو احد میں تڑپ پیدا ہوئی کہ احمد کی پہچان ہو۔ اسی چاہت میں اس نے اپنے ارادہ سے ۱۴ معصومین خلق کر دیے۔ یہ کام بر بنیادِ اَحْبَبْتُ ہوا اور مقصدیت فقط اَنْ اُعْرَفَ ہے۔ ثابت ہوا، احمد المرسلینؐ کی پہچان اور عرفان ہی، ذات احدیت کی پہچان و عرفان ہے۔ اس کا حق صرف معصومین و عالینؑ نے ادا کیا۔ اب جو، ان معصومین و عالینؑ سے نسبتِ صادق رکھے گا، ان ہی کے قدموں کی طفیل، اسے عرفانِ محمدؐ عطا ہو گا، جو عرفانِ ذاتِ احدیت ہے۔

ii: اَلْعَلِیُّ مِنِّی وَاَنَا مِنَ الْعَلِیّ اور اَلْحُسَیْنُ مِنِّی وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنُ :

بیٹا تو باپ سے ہو سکتا ہے، باپ بیٹے سے کیسے ہو سکتا ہے؟ ظاہری طور پر عمر، رشتہ اور نسبت کے لحاظ سے مولا علیؑ اور امام حسینؑ حضور پاکؐ سے چھوٹے ہیں۔ اس لئے یہ حضورؐ میں سے ہو سکتے ہیں، کسی طور پر سمجھ نہ آتا تھا کہ حضور کریمؐ ان دونوں حضرات یعنی علیؑ اور حسینؑ سے کیسے ہو سکتے ہیں۔ حافظ سائیںؒ نے یہ عقدہ صرف ایک اشارہ میں وا کر دیا۔ فرمایا ۱۳ رجب ۲۱ قبل ہجری سے لیکر ۲۱ رمضان

Marfat.com

المبارک ۴۰ ہجری تک اَلْعَلِیُّ مِنِّی تھا۔ اس کے بعد قیامت تک اَنَا مِنَ الْعَلِیِّ کا عمل جاری و ساری ہے۔ ۳ شعبان المعظم ۴ ہجری سے لیکر وقت عصر بروز جمعہ عشرہ محرم الحرام ۶۰ ہجری تک اَلْحُسَیْنُ مِنِّی تھا اور بعد از مغرب ۱۰ محرم الحرام ۶۰ ہجری سے لیکر قیامت تک اب اَنَا مِنَ الْحُسَیْنُ جاری رہیگا۔

ان ہر دو ذواتِ مقدسہ، علیؑ اور حسینؑ نے اپنی ظاہری حیات طیبہ میں ہر فعل، عمل اور کام اتباعِ رسولؐ کے عین مطابق کیا۔ یعنی ظاہری صورت تو علیؑ اور حسینؑ کی تھی مگر عملی طور پر وہ تفسیرِ ذاتِ محمدؐ تھے۔ اس مصداق سے اَلْعَلِیُّ مِنِّی وَالْحُسَیْنُ مِنِّی تھے۔ لیکن طبعی پردہ فرمانے کے بعد کُل عالم میں محمدؐ رسول اللہ کی پہچان اور شناخت، علیؑ اور امام حسینؑ کی وساطت سے ہو گی۔ یوں یہ اَنَا مِنَ الْعَلِیِّ اور اَنَا مِنَ الْحُسَیْنُ کی تفسیر بنی۔ مراد یہ ہے کہ اپنی ظاہرہ زندگی میں رسالتمآبؐ ان دونوں کی پہچان تھے اور شہود کی طبعی زندگی کے بعد آقا کریمؐ کی پہچان علیؑ اور حسینؑ سے ہے۔

۵۸۔ شب برات

شب، فارسی زبان کا لفظ ہے اور رات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جبکہ برات کا لفظ بھی فارسی ہے جس کے معنی فرمان کے ہیں۔ یہ اس تحریر یا حکم نامہ کو بھی کہتے ہیں جس کی بنیاد پر تنخواہ وصول کی جاتی ہے۔ یہی لفظ برات یا بارات ہندی زبان میں دولہا کی سواری کے جلوس کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ شب اور برات عربی زبان سے ماخوذ ہی نہیں، جب کہ شبِ برات ایک رسم کے طور پر منائی جاتی ہے، اور اس کی نسبت ایک آیت قرآنی سے جوڑ کر، ثابت کیا جاتا ہے کہ یہ رسم دورِ نبویؐ سے جاری ہے۔ اگر یہ رسم عرب کے خطہ سے شروع ہوئی ہوتی اور دورِ نبویؐ سے اس کی کوئی نسبت بھی ہوتی، تو کم از کم اس کا نام تو عربی الفاظ پر مبنی ہوتا۔ چونکہ شب اور برات دونوں الفاظ عربی

Marfat.com

نہیں، بلکہ فارسی اور ہندی ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسمِ شبِ برات عرب کے خطّہ میں شروع نہیں ہوئی ہوگی اور نہ ہی دورِ نبویؐ سے اس کا کوئی ظاہری تعلق ہو سکتا ہے۔ عربی زبان میں رات کے لیے لیل کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جو سیاہی، تاریکی اور چھپانے کے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ اور برات کے ہم وزن عربی میں بَرَآءَةٌ کا لفظ ہے۔ قرآن میں اس نام کی سورۃ بھی موجود ہے، جسے عموماً سُوْرَةُ التَّوْبَةِ کہتے ہیں۔ یہ بَرَآءَةٌ ، بری ہونا یا بری الذمّہ ہونے کے معنوں میں مستعمل ہے۔ جس قرآنی حوالہ سے شبِ برات کی نسبت بتائی جاتی ہے، وہ درج ذیل ہے۔ شبِ برات یا لیلۃ البراءۃ کی تراکیب اس سورۃ میں نہیں ہیں مگر ایک لفظ 'لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ' اس میں وارد ہے۔ نجانے لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ سے لیلۃ البراءۃ یا شبِ برات کیونکر بنی ہوگی؟ سورۃ الدّخان آیات ۱ تا ۵: حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ: یعنی اس مخصوص روشن کتاب کی قسم ہے تحقیق ہم اس کو مبارک رات میں نازل کرتے ہیں، تحقیق ہم ہی ڈرانے والے ہیں۔ اس رات میں ہماری طرف سے ہر حکمت والا کام فرق کیا جاتا ہے۔ تحقیق ہم ہی ارسال کرنے والے ہیں۔

وَ: قسمیہ صیغہ ہے۔ قسم ہمیشہ تصدیق کے لئے یا کسی بات پر زور دینے کے لیے کھائی جاتی ہے۔ قرآن میں کتاب کی جن چند قسموں کا ذکر موجود ہیں ان میں سے ایک سورۃ الدخان کی بھی ہے۔ قسم کسی عام کتاب کی نہیں بلکہ ایک مخصوص کتاب کی ہے اور اس کتاب کی صفت مبین بھی عامیانہ نہیں بلکہ مخصوص مبین ہے۔ یعنی ایک خاص کتاب کے کسی بیّن اور نمایاں حصّہ کی قسم کھائی جارہی ہے۔

اِنَّآ: یہ لفظ اِنَّ اور نا کا مخفف ہے، جس کے معنی ہیں بلاشک ہم نے۔ یہاں اپنی طرف منسوب کرنے پر زور دیا جارہا ہے۔

Marfat.com

اَنْزَلْنٰہُ: اَنزَلَ امر کا صیغہ ہے یعنی نازل کیا۔نا بمعنی ہم نے اور ہٗ واحد مذکر غائب کی ضمیر ہے۔ اس طرح ترجمہ یوں ہو گا، ہم نے نازل کیا اس کو، جبکہ ،وہ، جس کو نازل کیا واحد غائب مذکر ہے۔ جب ایک ہی ہو گا تو مخصوص خود بخود ہو جائے گا۔ پھر مذکر ہے، مونث ہر گز نہیں۔ کوئی ایک مخصوص فردِ واحد جو موقع پر تو موجود نہیں مگر زمانہ سے باہر بھی نہیں۔

اس بنیاد پر مفہوم یوں مناسب لگتا ہے کہ تحقیق ہم نے اُس مذکر فردِ واحد غائب کو مبارک رات میں نازل کیا۔ وہ فرد واحد شہودی طور پر اس جگہ سے غائب ضرور ہے، مگر وجودی طور پر اس زمانہ یا دَور میں ہی موجود ہے۔ اور واضح محسوس ہوتا ہے رات کی برکات اسی کے نزول کی وجہ سے ہیں۔ لیل کو مبارک صرف اس لیے کہا جا رہا ہے کہ وہ فردِ واحد غائب اس میں نازل کیا گیا۔ نزول، لطافت سے کثافت میں آنے کا نام ہے۔ لیکن جو نازل ہو رہا ہے اسکے لئے غائب مکانی کا اظہار کیا جا رہا ہے غائب زمانی کا نہیں۔ مراد یہ کہ جہاں جہاں اس رات کی برکات محسوس ہو رہی ہیں، وہ وہاں سے وجودی طور پر غائب ہے۔ لیکن اگر شہودی طور پر وہ اس زمانہ میں موجود نہ ہو تو صیغہٗ غائب بے معنی ہو جائے گا۔ مگر یہ لازم ہے کہ رات کی برکات اسی کے نزول کے سبّب عطا ہوتی ہیں۔

اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ: ہم ہی ہیں ڈر سنانے والے۔ منذر، نذیر کا مفعول ہے۔ نذیر اس شخص کو کہتے ہیں، جو آنے والی تکالیف اور مشکلات کی بابت، قبل از وقت اطلاع کرے اور عمل درآمد ہونے پر وہ ٹل سکتے ہوں۔ ایک مسافر کی مثال لیں، جو برسات کے سفر میں ایسا راستہ اختیار کرنا چاہے جس میں دلدل بنی ہو۔ اس راستے پر جائے اسے مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ سفر سے قبل اگر کوئی اسے آگاہ کر دے، کہ اس طرف سے گزرنا دشوار گزار ہو گا اور متبادل راستہ کی نشاندہی کر دے، تو ایسے شخص کو نذیر کہا جائے گا۔ اب ترجمہ یوں ہوا کہ تحقیق ہم ہی ہیں مبارک رات میں اس واحد مذکر غائب کو نازل کرنے والے۔

Marfat.com

اور ہم ہی ہیں قبل از وقت مشکلات کی نشاندہی کرنے والے! لفظ مُنۡذِرِیۡنَ اطلاع دیتا ہے، کہ جہاں اس کا نزول ہو گا، وہاں شدّت و تکلیف و رنج وغیرہ کا امکان ہے۔ تبھی تو مُنۡذِرِیۡنَ کہا، وگرنا مبشّرین کہا جاتا، جس میں خوشی اور راحت کا پہلو نمایاں ہے۔

گو ابتدائی قسم اَلۡکِتٰبِ کی ہے مگر ہُ کا صیغہ اس کے لئے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہُ، واحد مذکر غائب کے لئے ہے۔ جبکہ کتاب مؤنث ہوتی ہے۔ ویسے بھی کتاب اپنی ذات میں صامت ہوتی ہے اور ہُ کسی ناطق کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جو ممکنہ دشوار وقت کی نشاندہی کرنے والے نذیر کے لئے ہی ہو سکتا ہے۔ وہی تکلیف اور مشکل میں مبتلا ہونے سے قبل اس کی اطلاع دے گا، اور مسیحا بنے گا۔ چونکہ رات کے اندھیرے کا خوف سے براہِ راست تعلق ہے، اس لئے اسے بھی منذر ہی دور کر سکتا ہے۔ اس رات میں ہر عمل، حکمت کے ساتھ فرق کر کے ایک دوسرے سے علیحدہ اور جدا کیا جاتا ہے۔ یہ مفہوم بھی ممکن ہے کہ تمام امورِ حکمت کھول کر ایک دوسرے سے جدا کر کے متفرق کر دیے جاتے ہیں۔ اور یہ تمام امور مِّنۡ عِنۡدِنَا، یعنی 'ہماری' طرف منسوب ہیں۔ اور وہی ان منذرین کو بھیجنے والے ہیں۔ واضح محسوس ہوتا ہے کہ منذرین کو ہی مرسلین فرمایا گیا ہے۔ یعنی ہر وہ جو اپنے وقت اور دور میں منذر کی ذمہ داری پوری کرے گا، وہ بھی ہمارا مرسل متصور ہو گا، اس کا درجہ کسی طرح مرسلین سے کم نہیں! حالانکہ انبیاء اور مرسلین اب نہیں آئیں گے، لیکن کوئی دور کسی منذر کے بغیر تو ممکن ہی نہیں۔ آج کے دور کے منذرین، زمانۂ سابقہ کے مرسلین کے مترادف ہیں اور آج بھی وہی عمل، اسی انداز سے، سرانجام دے رہے ہیں۔

لیل کا تعلق اندھیرے سے ہے۔ اور اس میں خوف کے پہلو کے علاوہ غلطی اور کوتاہی کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔ چونکہ اندھیرے میں کچھ سجھائی نہیں دیتا، اس لئے عمل کے صحیح ہونے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی منذر کا لفظ با معنی ہے۔ وگرنہ ایسا نہیں کہ نہار میں منذر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دن کے وقت بھی منذر اسی قدر ضروری ہے۔

Marfat.com

۵۹۔ درجاتِ متّقین

سورۃ الاحزاب آیت ۳۵: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا: یعنی تحقیق مسلمان مرد اور عورتیں، مومنین اور مومنات، فرمانبردار مرد اور عورتیں، راست باز مرد اور عورتیں، صابر مرد اور عورتیں، جھکنے والے مرد اور عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد اور عورتیں، روزہ دار مرد اور عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں اور اللہ کا بالکثرت ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں (وہ ہیں) جن کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ آیت بالا میں متّقین کی شان میں ۱۰ مقامات واحوال بیان کیے گئے ہیں۔ ہر مقام کے لیے مذکر و مونث دونوں کا اظہار ہے۔ گو مغفرت اور اجر عظیم کی وعید کئی اور آیاتِ قرآنی میں موجود ہے، مگر اس آیت میں بالخصوص جن مقامات سے ان کو منسلک کیا گیا ہے وہ اہمیت سے خالی نہیں۔ ان مقامات کی ترتیب بھی بامقصد ہے۔ ان مقامات کا حالی جائزہ لیتے ہیں ازاں بعد اس سے ممکنہ منطقی نتائج حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

i: مسلمان / اسلام:۔ سَلم مصدر سے بننے والے اس لفظ کے لغوی معنی عیب سے پاک، ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ ہونا ہے۔ اس میں صلح صفائی، نتیجہ خیزی اور خود سپردگی کا مفہوم بھی شامل ہے، حسن اور خوشنمائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قابل اعتماد ذریعہ بلندی کا تصور بھی اس میں موجود ہے۔ عموماً تسلیمات کو راہ راست کی پہلی منزل سمجھا جاتا ہے۔ قبول اسلام کا تعلق زبان سے ہے۔ دور مصطفویؐ میں یہ طریق تھا کہ حضور اکرمؐ کے سامنے پیش ہو کر، سنی جانے کے قابل آواز کے

Marfat.com

ساتھ، کلمۂ طیبہ پڑھنالازم تھا۔ ایسا کرنے پر دائرہ اسلام میں دخول کی سند ملتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ یہ فرد مسلمان ہو گیا۔ آج کے دور میں رسولؐ کی موجودگی میں کلمہ پڑھنے کی شرط لازم نہیں رہی، لیکن سُنے جانے کے قابل آواز کے ساتھ اس کو دُہرانا بہر طور ضروری ہے اور اس کے بعد ارکانِ اسلام کی پابندی لازم ہوتی ہے۔ نماز، روزہ، زکوۃ اور حج اپنے اپنے شرعی تقاضوں کے ساتھ فرض ہو جاتا ہے۔

(i)i: سورۃ الانعام آیت ۱۶۳ میں ہے: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ: یعنی سرورِ دوعالمؐ وحی خداوندی کے تحت فرما رہے ہیں کہ وہ اوّل مسلمان ہیں۔ چونکہ آپؐ کو: خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ: یعنی تمام عیوب سے پاک تخلیق کیا گیا ہے، اس لئے عیب سے پاکی، اوّل اسلام ہے۔

(ii)i: سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۸ میں ہے: رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ: یعنی ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ تعمیرِ کعبہ کے بعد دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم دونوں کو اپنا مطیع (مسلمان) بنا اور ہماری اولاد میں اپنے لیے مطیع امت کر دے۔ دُوررس نتیجہ خیزی اور خود سپردگی کی یہ ایک اچھی مثال ہے، جو لفظ مسلم میں مضمر ہے۔

(iii)i: سورۃ البقرۃ آیت ۱۳۲ میں بھی یہی خود سپردگی نظر آتی ہے: فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: یعنی موت سے قبل ہر قیمت پر مسلمان ہو جانا۔ جیسا سورۃ البقرۃ آیت ۱۳۱ میں ہے: اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ: یعنی پروردگارِ عالم کے مطیع بنو۔

(iv)i: سورۃ آلِ عمران آیت ۶۷: مَا کَانَ اِبْرٰھِیْمُ یَھُوْدِیًّا وَّ لَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا: یعنی ابراہیمؑ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی۔ بلکہ وہ راست باز مسلمان تھے۔ ثابت ہوا مسلمان ہونا ابراہیمؑ کا فخر ہے۔

Marfat.com

(v)i: سورۃ آلِ عمران آیت ۱۹ میں وارد ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ: یعنی اللہ کے نزدیک دین، اسلام ہی ہے۔

(vi)i: سورۃُ المائدہ آیت ۳ کے مطابق: وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا: یعنی اسلام تمہارے لئے دین کے طور پر پسند کر لیا گیا ہے۔ ان میں منزل، اسلام ہی کو بتایا گیا ہے۔ حق بات یہ ہے کہ منشاءِ ایزدی ہی یہی ہے۔

ii: مومن / ایمان:۔ یہ الفاظ عربی مصدر اَمَنَ سے بنتے ہیں۔ جس میں یقین، اعتماد اور استقامت نمایاں پہلو ہیں۔ ایمان میں دلی وابستگی بہت ضروری ہے۔ کیونکہ تصدیق بالقلب ہی ایمان گردانا جاتا ہے، اس وابستگی کی بنیاد پر اس میں اطاعت کا عنصر بھی ہے۔ ''قلبی امن'' چونکہ سکون و اطمینان کا باعث ہوتا ہے اس لیے قرآن میں جو 'ذکرِ سکینہ' ہے وہ بھی انہی معنوں میں شامل ہو سکتا ہے۔

(i)ii: سورۃُ الحجرات آیت ۱۴ میں آتا ہے: وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ: یعنی ایمان تمہارے قلوب میں ابھی داخل کیا جانا ہے۔ بلاشک ایمان ایک ایسی نعمت ہے جسے ذاتِ باری نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور اسکا مسکن قلب کو فرمایا ہے۔ اور دولتِ ایمان، وہ جسے چاہتا ہے، جب چاہتا ہے، جہاں چاہتا ہے اور جتنی چاہتا ہے، اپنی طرف سے عطا کرتا ہے۔ اور اُسے اس منظورِ نظر کے قلب میں خود داخل فرماتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک نہ نظر آنے والی عنایتِ خداوندی ہے۔ جسے پردۂ قلب میں چھپانے میں کوئی راز پنہاں ہو گا۔ بزرگانِ دین اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ یعنی اعمال صالحہ اس کی اضافت اور اعمال فاسدہ اس کے زیاں کا سبب بن سکتے ہیں۔

Marfat.com

(ii)ii: سورۃ آل عمران آیت ۱۳۹ واضح دلالت کرتی ہے: وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ: یعنی بر بنیادِ صفتِ ایمان تم ہمیشہ غالب رہو گے۔ ایمان والے کو نہ دل شکستگی سے واسطہ ہے نہ ہی کوئی حزن وملال اس کے نزدیک پھٹکتا ہے۔

(iii)ii: سورۃ الانفال آیت ۲ میں ہے: اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَ اِذَا تُلِیَتۡ عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُہٗ زَادَتۡہُمۡ اِیۡمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ: یعنی مومنین جب اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے قلوب پر رقعت طاری ہو جاتی ہے۔ اور جب آیاتِ رّبانی ان پر تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے، اس طرح ان کا اپنے رب پر توکّل بڑھ جاتا ہے۔ اس آیت میں ایمان والوں کی واضح نشانیاں لکھی گئی ہیں۔

(iv)ii: سورۃ النمل آیت ۱۵ میں ہے: وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ عِلۡمًا ۚ وَ قَالَا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّنۡ عِبَادِہِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: یعنی ہم نے داودؑ اور سلیمانؑ کو علم عطا کیا تو ان دونوں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کثرت مومنین پر ان کو فضیلت دی گئی۔ عطائے ایمان میں فضیلت پر انبیاء و مرسلین نے بھی بر حق فخر کیا ہے۔

(v)ii: سورۃ المنافقون آیت ۸ میں ہے: وَ لِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ وَ لِرَسُوۡلِہٖ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ: یعنی عزت جس بھی معنوں میں سمجھی جا سکے، وہ اللہ اور مرسلینؑ کے علاوہ مومنین کا حصہ ہے۔ اس میں مومن کی، اللہ اور رسول سے ایک قدر مشترک ہو رہی ہے۔ یہ بھی بڑا مقام ہے۔

(vi)ii: سورۃ الحدید آیت ۱۲ میں وارد ہوا ہے: یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ یَسۡعٰی نُوۡرُہُمۡ بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ بِاَیۡمَانِہِمۡ: یعنی اس دن سب دیکھیں گے مومنین اور مومنات کے آگے اور پیچھے ان کے نور

Marfat.com

متحرک ہوں گے۔ مراد یہ ہے کہ حاملِ ایمان ہی حاملِ نور ہونگے۔ اور ان کے نور آگے پیچھے اور داہنے باہنے ان کے ہمراہ، انکی معاونت میں کوشاں ہونگے۔ اور اسے بڑی کامیابی کہا گیا ہے۔

(vii)ii: ایمان ہی سے متعلق ایک صفت "سکینہ" کا ذکر قرآن میں چند مقامات پر ملتا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: سورۃ التوبہ آیت ۲۶

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ: سورۃ الفتح آیت ۴۳

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ ... فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ: سورۃ الفتح آیت ۱۸

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: سورۃ الفتح آیت ۲۶

درج بالا آیات پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ، سکینہ ہمیشہ نازل فرمائی جاتی ہے، رسول / ایمان والوں سے منسلک ہوتی ہے، ایمان میں اضافہ کا باعث بنتی ہے، فتح کی نشاندہی کرتی ہے، جب کہ یہ بمعنی سکون و اطمینان بھی ہو سکتی ہے اور موسوم بھی۔

iii: قانت:۔ قَنَتَ مصدر سے نکلے اس لفظ میں کھڑے ہونے کا بنیادی مفہوم پایا جاتا ہے۔ کھڑے ہو کر، یا، رُک کر اپنی صلاحیتوں کو محفوظ رکھنا یا کر لینا بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ اپنے اندر لپیٹ کر کسی کو محفوظ کرنا اور دوسروں کی نظروں سے اوجھل کر دینا بھی اسی کا حصہ ہے۔ اسی لحاظ سے یہ محور کا معنی بھی دے دیتا ہے۔ مشرقی تہذیب میں شادی بیاہ کے موقعوں پر جو قنات نصب کیے جاتے ہیں، ان تمام معنوں کو اپنے اندر سموئے ہیں۔ سیدھے کھڑے بھی ہوتے ہیں اور اس حالت میں خود بھی رُک کر اوروں کو اپنے اندر محفوظ کر لیتے ہیں۔ اسطرح بے پردگی کو روکنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ چونکہ قنات عموماً خصوصی مقصد کے لیے لگائی جاتی ہے جیسے شادی بیاہ، جلسہ، نجی محافل وغیرہ، اس لیے کم از کم

Marfat.com

وقتی طور پر وہ دُور سے محور کا مفہوم ضرور دیتی ہیں۔ چونکہ قنات کے اندر ہونے والا عمل، باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا، اسی طرح باہر جو کچھ ہو رہا ہو اس کے اثرات قنات کے اندر والوں پر جلدی سے مرتب نہیں ہوتے، اس لیے اس لفظ میں حدِ فاصل کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ حق و باطل اور خیر و شر کی درمیانی دیوار اس معنی میں آتی ہے۔ التزام اور فرمانبرداری کا عنصر بھی اس میں ملتا ہے۔

iii(i): سورۃ الزمر آیت ۹ میں ہے: اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا: یعنی راتوں کو قیام اور سجود میں بسر کرنے والے فرماں بردار لوگ۔ اس میں قائم اللّیل کے معنی واضح ہیں جو، وجودی (physical) بھی ہو سکتا ہے اور معنوی (Virtual) بھی۔

iii(ii): سورۃ النحل آیت ۱۲۰ میں ابراہیمؑ کے متعلق ہے: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا: یعنی ابراہیمؑ ایک امّت کی مانند تھے اور صرف اللہ کے لیے قائم ہو کر کھڑے ہونے والے تھے۔ ایسا وہ بحیثیت فرد نہیں، بلکہ باندازِ امّت کرنا جانتے تھے۔ یعنی ان کا ذاتی قیام اور کھڑا ہونا دوسرے کئی لوگوں کو اس طرح پناہ دیتا تھا کہ وہ بھی محفوظ ہو جاتے تھے۔ انہیں بھی کوئی خدشہ نہ رہتا تھا۔

iii(iii): سورۃ البقرہ آیت ۲۳۸ میں ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ: یعنی اپنے اعضاءِ وجود کی حفاظت کرو، بالخصوص عضوِ وسطیٰ کی اور قائم رہو اللہ کے لیے، اس طرح کہ تمہاری تمام تر صلاحیتیں محفوظ بھی رہیں اور نکھار بھی پاتی رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شہوات کی ہوس تمہیں بے قابو کر دے اور تمہارا اپنی صلاحیتوں کو محفوظ کرنا مشکل ہو جائے۔

iii(iv): اسی نقشہ پر سورۃ التحریم آیت ۱۲ میں مریمؑ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ

Marfat.com

الْقٰنِتِیْنَ: یعنی عمران کی بیٹی مریم نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اپنی روح میں سے نفخ کیا۔ اس نے اپنے رب کے کلمات اور کتب کو سچ کر دکھایا اور وہ سچی فرماں بردار تھی۔ مریم نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو انہیں "قانت" کہا گیا۔

۴۔ صادق / صدق:۔ صَدَق مصدر سے بننے والے ان الفاظ میں ہم آہنگی و رضامندی پائی جاتی ہے۔ جو صرف عملِ مسلسل سے ثابت ہو سکتی ہے۔ یعنی جب کسی کا دل اور زبان اسطرح ہم آہنگ ہو جائیں کہ زبان پر وہ ہو جو دل میں اور دل میں وہی ہو، جو زبان پر، تو اسے صدق کہیں گے۔ اور اس خوبی کے حامل فرد کو صادق! زبان اور دل کی ہم آہنگی کی بنیاد پر صدق میں ایک خاص قسم کی شدت اور التزام (Affirmation) ضرور ہوا کرتا ہے۔ کہتے ہیں جھوٹے کے پاؤں نہیں ہوتے، مگر سچا زہر کا پیالہ بھی آسانی سے پی جاتا ہے۔ سچا، نڈر اور بے خوف ہوتا ہے۔ نبوت سے بھی قبل، اوائل جوانی میں، مکہ جیسے علاقہ میں ابنِ عبد اللہ، صادق اور امین کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ یقیناً پیدائشی طور پر آپ میں یہ وصف ہوگا کہ دل و زبان ہم آہنگ ہونگے تبھی تو اولاً سب اہل مکہ آپ کے معترف ہو گئے، اور دوئم تبلیغ حق کے وقت آپ پر کوئی خوف و لغزش وارد نہ ہوئی۔ یہ صدق کی بہت ارفع مثال ہے۔

iv(i): سورۃ النساء آیت ۸۷ میں ہے: وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا: یعنی بیان کرنے میں ذات باری سب سے زیادہ صادق ہے۔ اللہ نے صدق و صادق کے معنی اپنی ذات کے لئے بھی استعمال کئے ہیں۔ آسمانوں میں اللہ، اصدق ہے اور زمین پر اسکا حبیب صادق ہے۔ یہ محض حُسنِ اتفاق نہیں ہے!

iv(ii): سورۃ الحشر آیت ۸ دعوت دے رہی ہے کہ اگر تم اللہ اور اللہ کے حبیبؐ کی اس صفت سے متصف ہونا چاہتے ہو تو اسکا طریق: لِلْفُقَرَآءِ الْمُھٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ اَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ: میں تلاش کرو۔

Marfat.com

یعنی اپنے گھروں اور اموال سے، جن سے تمہیں انس ہو گیا ہے، فضل خداوندی کی تلاش میں ہجرت کرو جس مقصد اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرنا ہو۔ ایسا کرنے والے لوگ ہی صادق اور درجۂ فقر کے حامل ہونگے۔

(iii)iv: سورۃ الحجرات آیت ۱۵ میں وارد ہے: وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ: کہ اپنے اموال اور جانیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہی صادق ہیں۔ دل اور زبان کی ہم آہنگی صرف اسی صورت میں ممکن ہوتی ہے کہ سالک اپنی جان اور مال کو اللہ کی راہ میں بشکلِ جہاد صرف کرے۔ عملی صدق اسی طرح ہو گا، وگرنہ قول کا صدق کہلائے گا۔

v۔ صابر / صبر:۔ صَبَرَ مصدر سے ہونے والے الفاظ اپنے اندر ثابت قدمی کا لازم مفہوم رکھتے ہیں۔ منزل میّسر آجانے تک مسلسل مصروف کار رہنا صبر ہے اور ان صفات کا حامل صابر کہلاتا ہے۔ ان خصوصیات کو اپنے اندر برقرار رکھنے والا قدرتی طور پر جرأت مند ضرور ہوتا ہے۔ صبر کی اصل تعریف، دیے گئے حالات (given circumstances) میں عین فطرت کے مطابق عمل کرنا ہے۔ عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی آپ پر ظلم و جبر کرتا رہے اور آپ اسے کراہت سے صرف برداشت کرتے جائیں، تو یہ صبر ہے، ایسا سمجھنا نہایت غلط ہے۔ ایک مسلک کہتا ہے کہ کوئی آپ کی ایک گال پر تھپڑ مارے تو آپ دوسرا گال بھی آگے کر دیں۔ وہ اسے اعلیٰ درجہ کا صبر مانتے ہیں۔یہ بھی ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ثابت قدم رہنے میں ہی یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہر قسم کی فطری صلاحیتوں کو جائز طریقہ سے اور مسلسل استعمال کرنا ہی صبر ہے ۔ حالات تو حادثاتی (Emergent)، اتفاقی (Casual) طور پر بھی اور دائمی (Chronic) شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ ایسے تمام حالات میں عین فطرت کے مطابق عمل کرنا ہی صبر کہلاتا ہے۔ صبر ایوبؑ اور صبر اسماعیلؑ

Marfat.com

زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ ایوب کا صبر ثابت قدمی کی طرف اور اسماعیل کا رضائے ربّی کی طرف تھا، جو عین فطرت ہے۔

v(i): سورۃ البقرہ آیت ۴۵ میں آتا ہے: وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ: یعنی صبر اور نماز سے استعانت چاہا کرو۔ مالک کائنات کی نگاہ میں صبر کی فضیلت اس فرمان سے لگائی جاسکتی ہے۔ وہ اللہ جو صرف توکّل کو ہی پسند کرتا ہے، یہاں خود دعوت دے رہا ہے کہ صبر سے استعانت لے سکتے ہو۔ یقیناً صبر سے استعانت بھی توکّل الی اللہ ہی ہوگا۔

v(ii): سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۳ میں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ: یعنی اے ایمان والو صبر اور صلوٰۃ سے استعانت چاہو، تحقیق اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ کسی حال میں غیر اللہ کا خیال آنا بھی باطل ہوتا ہے۔ جب کہ یہاں صبر سے استعانت کی ترغیب کے بعد فرمایا جارہا ہے کہ ایسا عمل کرنے والوں کے اللہ ہمیشہ ساتھ ہوتا ہے۔

v(iii): سورۃ یونس آیت ۱۰۹ میں ہے: وَ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَ اصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ: یعنی رسولِ آخر الزماںؐ کے لیے وحی کے اتباع کے حکم کے ساتھ صبر کا حکم، اس وحی کے مکمل نفاذ تک مسلسل جدوجہد اور عمل پیہم کی تلقین ہے۔ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھے رہنے کا حکم نہیں ہے۔ وحیٔ الٰہی کی اتباع اس طریق سے کرنے کا حکم ہے کہ ایک لمحہ بھی غفلت میں نہ گزرے۔

v(iv): صبر کرنے والے کو دوگنا اجر دینے کا وعدہ کیا گیا ہے جو اور کسی عمل کے ساتھ نہیں۔ جیسا کہ سورۃ القصص آیت ۵۴ میں کہا گیا ہے: اُولٰٓىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا: یعنی وہ لوگ صبر کرنے کی وجہ سے دو دفعہ یا دوگنا اجر دیے جاتے ہیں۔

Marfat.com

(v)v: سورۂ طور آیت ۴۸ میں ہے: وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا: یعنی اپنے رب کے لئے صبر کریں تحقیق آپؐ اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ توفیقِ صبر اسی کو عطا ہوتی ہے جو ہر وقت اپنے رب کی نگاہوں میں ہوتا ہے۔ یا ہر وقت اپنے رب کی نگاہوں میں ہونا ہی کسی کو ایسی استقامت اور ثابت قدمی عطا کر سکتا ہے کہ اسے صابر کہا جا سکے۔

vi۔ خاشع / خشوع:۔ خَشَعَ مصدر سے نکلے ان الفاظ میں جھکاؤ اور پستی کا عنصر لازماً پایا جاتا ہے۔ آنکھوں کا جھکنا اور کمر کا جھکنا دونوں اس میں آتے ہیں۔ اس لیے اس معنی میں حیا اور تعزیم کا پہلو بھی ملتا ہے۔ پستی میں آواز کی پستی بھی شامل ہے لیکن جھکاؤ اور پستی کے مفہوم کی وجہ سے ذلت و خواری (Suppression) بھی موجود ہو سکتی ہے اور افسردگی (Depression) بھی۔ خشوع ایک ایسا عمل ہے جس میں ذات کی مکمل نفی کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ اس لئے خاشع کے دل و دماغ میں اصلاً کوئی خیال و احساس باقی نہیں رہتا، اور اسی مناسبت سے پتھریلی اور سنگلاخ زمین کے ٹکڑے کو بھی خاشعہ کہا جاتا ہے۔ لیکن مِن حیث الکُل سرِ تسلیم خم کرنا اور ادب و تعظیم کی وجہ سے آنکھوں کو نیچا کرنا نمایاں معنی ہیں، جو بر بنیاد خوف بھی ممکن ہے اور بر بنیاد شوق بھی ہو سکتا ہے۔ خشوع میں خصوصی عجز پایا جاتا ہے۔

vi(i): سورۂ حم سجدہ آیت ۳۹ میں وارد ہے: وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً: یعنی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آپ زمین کو پستی اور جھکاؤ کی طرف دیکھتے ہیں۔

vi(ii): سورۂ طٰہٰ آیت ۱۰۸ میں ہے: وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ: یعنی روزِ قیامت رحمان کے لئے ان کی آوازیں پست ہوں گی۔ یہ جلال و ہیبتِ الٰہی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے اور ہلکے اعمال کی شرمندگی کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

(vi(iii: سورۃ الحدید آیت ۱۶ میں ملتا ہے: اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ: یعنی کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلوب ذکر اللہ کی صحیح تعظیم کر سکیں۔

(vi(iv: سورۃ الحشر آیت ۲۱ میں ہے: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ: یعنی اگر ہم قرآن کو پہاڑ پر نازل کر دیتے تو وہ خوفِ الٰہی کی وجہ سے تھر تھر کانپتے نظر آتے۔

(vi(v: سورۃ المومنون آیت ۲ میں ہے: اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ: یعنی جو لوگ سر تسلیم خم کر کے ادب اور تعظیم کے ساتھ اپنی نماز پیش کرتے ہیں۔

قرآن میں استعمال کی گئی خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ اور وُجُوْهٌ خَاشِعَةٌ کی تراکیب میں بھی ان میں سے کچھ مفاہیم ظاہر کرتی ہیں۔

vii۔ متصدق / تصدق:۔ گو یہ الفاظ بھی صَدَقَ مصدر ہی سے خارج ہوتے ہیں جس کی کچھ بحث نمبر iv پر کی جا چکی ہے مگر معنی کے لحاظ سے معمولی سا مختلف ہے۔ فرض کریں کسی نے کسی دوسرے شخص کو کچھ قرض دیا ہو اور اس کی ادائیگی کی ایک معیاد مقرر کی ہو، جس مقررہ مدت کے بعد لینے والے کو یہ قرض واپس کرنا لازم ہو۔ تو میعاد کی تکمیل پر قرض دینے والا اگر محسوس کرے کہ قرض لینے والے کی مالی و معاشی حالت بہت ابتر ہے اور یہ سوچ کر اگر وہ اپنے دل کی خوشی سے یا مزید وقت بڑھا دے یا کلیتاً اسے معاف کر دے، تو ایسا کرنے والے کو متصدق کہتے ہیں۔ اور یہ عمل تصدق کہلائے گا۔ یعنی جو کچھ کسی پر واجب ہو اُسے چھوڑ دینے والا متصدق ہے۔ اس میں بطور بخشش عطا کرنا بھی شامل ہو سکتا ہے۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں ایک ہی آیت میں صادق / صدق اور متصدق / تصدق کا بیان اس کے معنوں کو تقویت دینے کے لیے آیا ہے۔ ایک ہی اسم دو دفعہ پکارنے میں خصوصی چاہت اور لگاؤ نظر آتا ہے، جو بے معنی ہرگز نہیں۔

Marfat.com

viii۔ صائم / صوم:۔ صَوْمَ / صَامَ مصدر سے بنے ان الفاظ میں لازماً رکنا، روکنا یا روکے جانا کا مفہوم پایا جاتا ہے اسی طرح ٹھہراؤ اور ٹھہر جانا یا باز رہنا بھی اس میں شامل ہیں۔ چونکہ روک کر ٹھہرنے، یا ٹھہر کر رُکنے میں ایک قوت و یکجہتی درکار ہے اس لیے یہ معنی بھی اس میں شامل ہیں۔ اردو زبان میں روزہ کو صوم کا مترادف گردانا جاتا ہے۔ جس میں روزہ دار صبح کاذب سے غروب آفتاب تک اپنے آپ کو حلال کھانے پینے سے روکنے کے علاوہ مکروہات سے بھی باز رکھتا ہے۔ یہ جبر کرنے کے لیے وجود کے تمام اعضاء سے مدد لینا ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک عضو رُک جائے اور دوسرا عضو نہ رُکے تو روزہ کا مقصد فوت ہو سکتا ہے۔ یعنی زبان اور پیٹ ذائقہ اور کھانے سے رک جائیں مگر آنکھ بیہودہ دیکھنے سے اور کان لغو سننے سے باز نہ رہے تو اصلاً روزہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ اور جب روزہ دار نیت کر لیتا ہے کہ وہ رُک گیا ہے تو وجود کے تمام اعضاء ایک دوسرے سے پیوست ہو کر ہر برائی اور خرابی سے اپنے آپ کو روک لیتے ہیں۔ گویا یکجان ہو کر کی گئی نیت کے مصداق سیسہ پلائی دیوار بن جاتے ہیں۔ یہی صوم کا بنیادی مقصد ہے اور ایسا کرنے والا صائم کہلاتا ہے۔

ix۔ حافظِ فرج / حفاظت فرج:۔ حَفَظَ مصدر میں بنیادی طور پر حفاظت کرنے، رکھوالی کرنے، دھیان رکھنے کے مفہوم لازم ہیں۔ اسی مصدر سے محافظ (Guard) بنتا ہے۔ محافظ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ ایک سمت میں اپنی ذمہ داری نبھا سکتا ہے۔ محافظ کو گھر کے جس دروازے پر مقرر کیا جائے گا وہ اسی دروازے کی رکھوالی کر سکے گا اور اگر بالغرض اسے معمور کر دیا جائے کہ وہ گھر کے چاروں طرف پہرہ داری کرے، تو ایک وقت میں وہ جس دروازہ یا کھڑکی کے قریب ہو گا صرف اسی کو دیکھ کر اسی کی نگرانی کر سکے گا۔ کیونکہ باقی تمام گھر کی اطراف اس کی آنکھوں سے اوجھل ہونگی۔ اس کے مقابلے میں حافظ، اس نگہبان کو کہتے ہیں جو چھ کی چھ معروف سمتوں سے بیک وقت بچانے کا سبب کرے، بلکہ

Marfat.com

باطن کے در کو بھی محفوظ کردے۔ علی الہجویریؒ کے فرمان کے مطابق انبیاء و مرسلین ازلی معصوم ہوتے ہیں جبکہ اولیااللہ کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود، اولیاء اللہ کا حافظ ہوتا ہے۔

اسی طرح لفظ فُرْج، عربی مصدر فَرَجَ سے نکلتا ہے۔ بنیادی طور پر، درمیانی شگاف کو فرج کہتے ہیں اسی بنیاد پر مرد اور عورت، دونوں کی شرمگاہ کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہونے لگا۔ چونکہ درمیانی شگاف غیر معین (Unpredictable) ہوتا ہے اس لیے خطرہ کی جگہ کے لیے بھی فرج کا لفظ بولا جاتا ہے۔ پھٹ جانے، کھل جانے اور شق ہونے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔

کسی شگاف کی حفاظت صحیح معنوں میں اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک اس کی تمام سمتیں نگاہ میں نہ ہوں۔ یعنی محافظ، فرج کی حفاظت کا حق کماکان حقہ ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے لازم ہے کہ حافظ کی صفات کا حامل ہوا جائے۔ مراد یہ ہے کہ اچھی طرح فرج کی ماہیت و حقیقت کو سمجھا جائے اس کے قدرتی تقاضوں کو نگاہ میں رکھا جائے، ہر قسم کے ممکنہ خدشات اور وسواس مدِ نظر رہیں۔ پھر احکامات خداوندی کی روشنی میں اس فرج کی نگہبانی و حفاظت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا جا سکتا ہے۔ حافظ سائیںؒ فرمایا کرتے کہ مالک کا فضل و کرم ہی اس 'پل صراط' سے بخیریت گزرنے کی علت ہے۔

ix(i): سورۃ الرعد آیت ۱۱ اظاہر کر رہی ہے: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ: یعنی خدشات ان کے آگے پیچھے حملہ آور ہیں۔ اللہ کے امر سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ حفظ کا عمل، امر الٰہی کے بنا، ممکن نہیں۔

ix(ii): اسی طرح سورۃ الانبیاء آیت ۹۱ بتا رہی ہے: وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا: یعنی مریم جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کا حق ادا کیا، ہم نے اپنی روح میں سے اس میں

Marfat.com

پھونکا۔ دنیا میں کوئی بھی مرد یا عورت، جو قلعہ بندی کی طرح اپنی فرج کی حفاظت کرتی ہے، جیسی مریمؑ نے کی تو اُس میں ہماری روح پھونکی جاتی ہے۔ اُس روح کا پھونکنا اسے بھی اور اثراتِ مرتبہ کو بھی کائنات بھر کے لیے نشانی بنا دیتا ہے۔

x۔ ذاکر / ذکر:۔ ذَکَرَ مصدر سے نکلے اس لفظ کا معنی کسی گزرے واقعہ یا حادثہ کو دوبارہ سے یاد کرنا ہے۔ بھولی بات کو یاد کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے اس میں حفاظت کے معنی بھی موجود ہوتے ہیں۔ کہ واقعہ، حادثہ، یا وہ بات جس کو یاد کیا گیا ہے اس کے ہمیشہ کے لیے بھول جانے اور ضائع ہونے کا احتمال نہیں رہتا۔ دوسرے مفاہیم میں کسی کو یاد کرنا بالخصوص اچھائی کے معنوں میں، شہرت و عزت، احکامِ دین کی کتب وغیرہ ہیں۔ بلاشک مرد اور مردانگی یا مردانہ عضوِ تناسل بھی ذَکَرَ ہی کہلاتا ہے گرائمر کی رو سے یہ مونث کی ضد ہوتا ہے اور اسے مذکر کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس میں قوت اور شجاعت (Chivalry) کا معنی مضمر ہے۔ ذِکر براہ راست ذات، یا نعمت و آیاتِ ذات سے متعلق ہوتا ہے۔ ذات سے متعلق ہونے کا مطلب ہے کہ ہر ایک کی اصل سے متعلق ہوتا ہے۔ لا محالہ طور پر ایسے واقعات و حادثات جن میں کسی کی ذات اصلاً منسلک (Involve) نہیں ہوتی، اس کے لیے وہ واقعات کوئی خصوصی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے کہ وہ انہیں یاد کرے یعنی ان کا ذکر کرے۔ جبکہ ذات سے متعلقہ واقعات، اوّل تو بھولتے ہی نہیں اور اگر کسی وجہ سے محو ہونے لگتے ہیں تو دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے کہ انہیں یاد کیا جائے۔

x(i): سورۃ آل عمران آیت ۱۹۱ میں ہے: اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: یعنی وہ لوگ جو کھڑے ہوئے، بیٹھے اور لیٹے اللہ کا ذِکر کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں۔ جو دلالت کرتی ہے کہ ذکر میں ہمیشگی ہے اور یہ براہ

Marfat.com

راست ذات سے منسوب ہے۔ وجود ہمیشہ کھڑا ہو گا، یا بیٹھا ہو گا یا کروٹ کے بل لیٹا ہو گا۔ اور ذکر کو ہر حالت میں جاری ثابت کرنا اس امر کی ضمانت ہے کہ ذکر ہی اصل ہے!

(ii)x: سورۃ المائدہ آیت ۱۱۰ کے مطابق: اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَ عَلٰی وَالِدَتِکَ: یعنی جب اللہ نے مریم کے بیٹے عیسیٰ سے فرمایا کہ آپ پر اور آپ کے والدین پر جو انعامات ہوئے ہیں ان کا ذکر کیا کرو۔ تو اس میں بھی ذکرِ عیسیٰ کی ذات سے منسلک ہے۔ اس نعمتِ خداوندی کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جو ان پر اور ان کی والدہ پر ذات کی طرف سے ہوئی تھی۔

(iii)x: اسی طرح سورۃ الواقعہ آیت ۶۲ میں ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَۃَ الْاُوْلٰی فَلَوْلَا تَذَکَّرُوْنَ: یعنی تم اپنی اول پیدائش سے باخبر ہو، اس کا علم رکھتے ہو اس لیے اس سے پہلے کہ وہ محو ہو جائے اس کا ذکر کرو۔ یعنی ماضی کے اس واقعہ کو ذہن میں دہراؤ کیونکہ وہ تمہاری اصل ذات سے منسلک اور منسوب ہے۔

(iv)x: سورۃ الانفال آیت ۴۵ میں ہے :وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ : یعنی اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کا ذکر بالکثرت کیا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اس میں اپنی ذات کی فلاح کے لیے اصل سے رجوع اور بالکثرت رجوع کی ترغیب دی گئی ہے۔

(v)x: اسی طرح سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۲ میں آتا ہے: فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ :یعنی تم میرا ذکر کیا کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔ اس ترغیب میں بھی ذات باری تعالیٰ، بنی آدم کو ذاتی طور پر دعوت دے رہی ہے کہ میری اصل سے متعلق رہو۔ نتیجہ میں میں تمہاری اصل کی خیر کی ضمانت دیتا ہوں۔

(vi)x: سورۃ الاعلیٰ آیت ۹ میں ہے: فَذَکِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْرٰی :۔ یعنی تم نفع رسانی اور فائدہ تک ذکر کرتے رہو۔

Marfat.com

سورۃ الاحزاب کی متذکرہ آیت میں وارد ہونے والے دس مقامات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مدارج ایک کڑی (Chain) کا حصہ ہیں، کسی مالا کے موتی ہیں، کسی تسبیح کے دانے ہیں، جنہیں نہایت خوبصورتی سے درجہ بہ درجہ کسی خاص مقصد کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ مسلمان ہوکر، دائرہ اسلام میں دخول کافی نہیں سمجھا گیا، بلکہ اس سے اگلے درجہ مومن کی ترغیب دی گئی ہے۔ پھر اشارہ ہے کہ ایمان ہی قناعت کا باعث بنتا ہے اور جب تک درجۂ قانت میسّر نہ آئے صادق نہیں ہوسکتا۔ صدق خودبخود صبر کا درس دیتا ہے اور صابر میں خشوع کی صفت عود کر آتی ہے۔ خشوع، اس صادق کو متصدق بنادیتا ہے اور تصدق، صائم ہونے میں معاون ہے۔ حالتِ صوم ہی وہ مقام ہے جہاں حفاظت فرج صحیح معنوں میں سمجھ آتی ہے اور جب فرج کی حفاظت کا سبب بن جاتا ہے تو ذِکر از خود جاری ہوجاتا ہے اور ایسی کثرت اختیار کرلیتا ہے کہ اللہ کی طرف سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ مل جاتا ہے۔

اس طرح ظاہری طور پر جو دس مدارج بیان ہوئے ہیں ان کی ترتیب یوں ہے۔

ا۔ مسلمان	۲۔ مومن	۳۔ قانت	۴۔ صادق	۵۔ صابر
۶۔ خاشع	۷۔ متصدق	۸۔ صائم	۹۔ حافظ فرج	۱۰۔ ذاکر

بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک سیڑھی کے درجوں کی مانند یہ درجات بھی بڑھ رہے ہیں۔ دوسرا درجہ، پہلے سے بہتر ہے، تیسرا، دوسرے سے افضل، چوتھا، تیسرے سے اولیٰ، اسی طرح علیٰ ھذا القیاس ہر اگلا درجہ ہر پچھلے درجہ سے بلند ہوتا چلا جاتا ہے، حتٰی کہ ذاکر کا درجہ تمام درجات سے نمایاں ہے۔ فرض کرلیں کہ چھت میں ایک آئینہ نصب ہو۔ ایک شخص فرش پر کھڑا ہوکر اگر اپنا عکس اس آئینہ میں دیکھنا چاہے گا تو اسے اصل سے الٹ نظر آئے گا۔ یعنی فرش پر اس کے پاؤں پہلے ہیں اور سَر سب سے آخر میں ہے تو عکس میں سر پہلے نظر آئے گا اور پاؤں سب سے آخر میں محسوس

Marfat.com

ہونگے۔ بعینہٖ یہ درجات زمین پر کھڑے شخص کو تو یوں ہی نظر آئیں گے جیسے بیان کیے گئے ہیں مگر بالا مثال کے مطابق عرش والے کے ہاں یہ اس سے بالکل الٹ ہونگے۔ اگر ممکنہ طور پر وہ ترکیب بنائی جائے تو کچھ اس طرح ہوگی۔

۱۔ ذاکر ۲۔ حافظ فرج ۳۔ صائم ۴۔ متصدق ۵۔ خاشع

۶۔ صابر ۷۔ صادق ۸۔ قانت ۹۔ مومن ۱۰۔ مسلمان

اگر غور کیا جائے تو پہلی ترکیب میں صادق نمبر ۴ تھا اور متصدق نمبر ۷، جبکہ دوسری ترکیب میں ان دونوں صفات نے صرف اپنی اپنی جگہ بدلی ہے یعنی صادق ۷ نمبر پر اور متصدق ۴ نمبر پر ہو گیا۔

یہاں بھی محسوس ہوتا ہے اور پیچھے بھی لکھا جاچکا ہے کہ ان کا مادہ مخرج صِدَق ہے جو دونوں میں مشترک ہے۔ صدق کے مفہوم کی خوبی اور عظمت کی بنیاد پر اسے دو مختلف انداز سے، دو مختلف صفات کے طور پر بیان کر دیا گیا، جو اس کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے ہے، وگرنہ ان دونوں کی اصل ایک ہے۔ اگر ان دونوں کو مشترک تسلیم کر لیا جائے تو اب درجات ۹ (نو) ہو جائینگے۔

۱۔ ذاکر ۲۔ حافظ فرج ۳۔ صادق / متصدق ۴۔ خاشع

۵۔ صابر ۶۔ قانت ۷۔ مومن ۸۔ مسلمان ۹۔ صائم

درجہ صائم خاص وجہ کے تحت تیسرے (۳) نمبر سے نکال کر نویں (۹) نمبر پر رکھا گیا ہے۔ کیونکہ صائم دراصل درجات میں سے کوئی درجہ نہیں، بلکہ زیادہ موزوں ہے اگر کہا جائے کہ تمام درجوں کی زنجیر اور باہم ربط صفت صائم کی وجہ سے ہے۔ صائم یکجہتی کی وہ قوت (Cementing Force) ہے جو ان تمام درجوں کا باہمی ملاپ کرتی ہے۔ ایک درجہ کو دوسرے درجہ کے ساتھ جوڑ کر، روک کر، ٹھہرا کر، کھڑا کرتی ہے کہ ہر درجہ کی اپنی انفرادی حیثیت بھی برقرار رہتی ہے اور دوسرے یعنی اگلے / پچھلے

Marfat.com

درجات سے اسے منسلک بھی رکھتی ہے۔ سو صائم / صوم وہ گوند (Glue) ہے جو روک دیتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر صائم / صوم کو بھی قدر مشترک کے طور پر ہر درجہ میں شامل مان لیا جائے تو اصل درجات اب آٹھ (۸) ہونگے۔ اور ان کو ایک نقشہ کی شکل میں پیش کر کے، عام فہم بنانے کے علاوہ کچھ نتائج بھی بر آمد کیے جاتے ہیں۔

ذاکر	اولیاء اللہ	آدمؑ	اصل / ذات سے متعلق
حافظِ فرج	اخیار	مریمؑ	درمیانی شگاف کو منتشر نہ ہونے دینا
خاشع	ابدال	عیسیٰؑ	پستی۔ جھکاؤ
صابر	ابرار	اسماعیلؑ	ثابت قدمی۔ جرأت
صادق	اوتاد	محمد رسول اللہؐ	ثابت قدمی، ہم آہنگی
قانت	نقیب	عترتِ رسول علیہما السلام	کھڑا ہونا / محور۔ صلاحیتوں کی حفاظت
مومن	غوث / قطب	کُل امامین پاکؑ	یقین۔ دلی وابستگی۔ سکینہ
مسلمان	قطب مدار علیہ	امامِ اوّل علیؑ	عیوب سے پاک / قابل اعتماد ذریعہ بلندی

۶۰۔ اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی

گرائمر کی رو سے اسم کسی شے 'وجود یا عمارت وغیرہ کے نام کو کہتے ہیں۔ اسماء اسکی جمع ہے جس سے مراد بہت سی اشیاء، وجود یا عمارات ہونگی۔ حُسنٰی سے مراد اچھے، حُسن والے، خوبصورت، دلربا، قابل ستائش وغیرہ ہے۔ اس لیے اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی سے مراد عمومی طور پر دل کو بھانے والے افراد، اشخاص یا عمارات و اشیاء ہوسکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس خوبصورتی و رعنائی و دلپذیری کا کوئی ایسا معیار مقرر ہو جو آفاقی حیثیت رکھتا ہو تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ کس اسم کو الحُسنٰی کہا جاسکے

Marfat.com

اور کس اسم کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ وہ اچھا نہیں ہے۔ بلاشک ان دونوں میں تمیز نہ کی جائے تو الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کا تصور بے معنی ہو جائے گا کیونکہ اس صورت میں تخصیص نہ رہ جائے گی بلکہ تمام اسماء کو حسنیٰ تسلیم کرنا پڑیگا۔ یہاں اس نکتہ کو مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اسم، فقط اسم ہے، نہ تو یہ وجود اور جسم ہے اور نہ ہی جنس کی قسم کی کوئی شے ہے۔ نام، نام ہوتا ہے اور وجود، وجود ہوتا ہے اور وجود کے فانی ہونے کے امکانات نہایت قوی ہوتے ہیں، مگر اسم وجود کے ساتھ لازماً فنا نہیں ہوتا۔ کسی بھی اسم کو حسنیٰ ماننے کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ جو بولنے، سننے یا لکھنے میں اچھا لگے، اسے الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کہہ دیں۔ حالانکہ یہ مخمصہ اس طرح دور کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہو جائے گا، کیونکہ اچھا لگنے کا ہر کسی کا معیار مختلف ہو گا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اسماء جن کے اثرات عمومی طور پر اچھے مرتب ہوں وہ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کہلا سکیں۔ حالانکہ اثرات کا مرتب ہونا بھی اختلافی ہو سکتا ہے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اثرات، اسماء ہی کے مرتب ہوا کرتے ہیں۔ اسم ہونے کے باوجود بے جان اشیاء یا جگہیں، وہ اثرات مرتب نہیں کر سکتیں، جو زندگی کی حدت رکھنے والی، متحرک اور جاندار مخلوقات اور شخصیات کے اسماء سے ہوتا ہے۔ جاندار مخلوقات میں ہر قسم کے چھوٹے بڑے جانور، درندے، چرندے، پرندے اور کیڑے مکوڑے شامل ہیں مگر ان میں سے کثرت کے اسماء اولاد آدم پر وہ اثرات نہیں چھوڑتے کہ الْحُسْنٰی کہلا سکیں۔ اس لحاظ سے صرف ایک امکان باقی رہ جاتا ہے کہ شخصیات کے اسماء ہی حسنیٰ ہو سکتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اسمائے بندگانِ خدا' اپنے ہونے، اپنی پاکیزہ زندگی اور بابرکات موجودگی سے اپنے اردگرد: نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ: اثرات مرتب کرتے ہیں، جن کا اثر صدیوں پر محیط ہوتا ہے بلکہ تاقیامت برقرار رہتا ہے۔ کہنے کو انہیں افراد ہی کہا جائے گا مگر حقیقت میں وہ اپنی ذات میں ایک لازوال کردار ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کردار کے اسم میں عطائے الٰہی کے تحت یہ

Marfat.com

تاثیر عود کر آتی ہے کہ جہاں وہ اسم پکارا گیا وہیں حسنات ظاہر ہو جاتی ہیں۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کی تفسیر سامنے آ جاتی ہے۔ ان کی بدولت لاکھوں افراد سلامتی کی طرف راغب ہو جاتے ہیں، جبکہ خود وہ پیکرِ رحمت بن چکے ہوتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جن افراد کے کردار کی تاثیر دوسری مخلوقات بالخصوص بنی آدم پر اس طرح مرتب ہو کہ اچھائی، خوبی اور امن و شانتی کا باعث بنے، ان کے اسماء ہی الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کہلانے کے حقدار ہیں۔ اس میں ظاہری رنگ، روپ، زبان، نسل، مذہب، جغرافیائی حدود وغیرہ کا کوئی عمل دخل نہیں، وہ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ کی شان کے حامل ہوتے ہیں۔

قرآنی اصطلاحات کے تحت، بالعموم جن صفاتی اسمائے الٰہی کو الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کا اظہار ہمیشہ عباد اللہ المخلصین کے کردار ہی میں ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات گرامی قیود، سلاسل و پابندی سے منزّہ و مبرّا ہے، اس کی حد بندی ممکن نہیں، پھر بھی بے حد ہونے کے باوجود ہر جگہ موجود ہے۔ حدِ تعین یہ کہ کُل کائنات میں بھی نہ سما سکے اور عالم یہ ہے کہ ہر ہر ذرّے میں وہ خود ہی موجود ہے۔ اس کی ذات کا احاطہ ناممکن ہے، اس میں دخول و خروج کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، حسِّ احساس سے پاک ہے، نہ خوش ہوتا ہے اور نہ کسی سے ناراض ہوتا ہے کیونکہ تغیّر و تبدّل اس کو چھو ہی نہیں سکتا۔ حسیات طبیعت کے تابع ہوتی ہیں جبکہ طبیعت صرف نفس سے وابستہ ہوتی ہے۔ مالکِ کُل کائنات کے لیے اگر نفس کا حامل ہونا مقرر کریں گے تو سورۃ آل عمران آیت ۱۸۵: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ: کی رو سے اللہ کو بھی زوال آ جائے گا۔ سوچنا پڑے گا کہ تغیّر و تبدّل سے پاک ہونے کے باوجود جو صفات اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، کیا ان کا اطلاق بھی اسی طرح ہو گا؟ اور کیا وہ صفات اسی ذات سے سرزد ہو نگی؟

Marfat.com

قرآن کی سُوْرَۃُ الْحَشْرِ آیت ۱۸ میں وارد ہے: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ: یعنی اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور دیکھو تمہارے نفوس کے آگے کل کیا آئے گا۔ اکثر مترجم اس کا ترجمہ تھوڑا مختلف کرتے ہیں مگر دراصل یہ اسی طرح بنتا ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے لیے یہ لازم ہے کہ تم اللہ کا خشوع و خضوع اور خوف اپنے دلوں میں بھرپور طریقے سے پیدا کرو، تمہیں اور کسی کا ڈر نہ ہو۔ جب تم یہ اختیار کرلو گے تو تمہارے لیے ممکن ہو جائے گا کہ تمہیں اپنے آنے والے کل کی خبر ہو۔ اور تم دیکھ سکو گے کہ تمہارے نفوس کے ساتھ کل کیا معاملہ ہو گا۔ بالفاظ دیگر تمہارے ایمان لانے اور پھر اللہ کا سچا اور راست خوف اپنے دلوں میں پیدا کرنے کی بدولت، کرم کی شکل میں تمہیں دکھایا جائے گا کہ آئندہ (مستقبل) کس چیز کا نام ہے؟ اس کے بھید، راز اور عوامل کیا ہیں؟ تم بخوبی جان سکو گے کہ آنے والے وقت میں خود تمہارے نفوس کے ساتھ ہی نہیں، کُل جہان کے نفوس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ تمہارے لیے مستقبل، جسے غیب کہتے ہیں، غیب نہیں رہے گا، بلکہ تم خود عالم غیب بن جاؤ گے۔ یہ بات عام لوگوں تو کیا خواص کو بھی میسّر نہیں۔ کوئی اگلے ایک پل کی بھی خبر نہیں جان سکتا۔

پھر فرمایا گیا: وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: یعنی جب اہل ایمان اور اہل تقویٰ ہو جانے کے بعد تم پر یہ کرم ہو، کہ غیب تمہارا حاضر ہو جائے تو تم پر لازم ہو گا کہ تم اللہ کا مزید تقویٰ اختیار کرو اور اس کی محبت تمہارے دلوں میں اور بڑھ جائے۔ اس محبت میں شوق اور خضوع خود بخود شامل ہو جائے گا اور تمہیں خود ہی یہ احساس ہو جائے گا کہ اللہ تمہارے تمام اعمال سے واقف و باخبر ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب دولتِ ایمان میسّر آ جائے اور کرم کی شکل میں کل وارد ہونے والے احوال تم پر منکشف ہونے لگیں تو ضروری ہے کہ تم اللہ کی مزید محبت دلوں میں اجاگر کرو۔

Marfat.com

پھر آیت ۱۹ میں کہا گیا: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنْسٰهُمْ أَنْفُسَهُمْ ط أُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: یعنی تم ہر گز ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اس پر اترا کر سمجھ بیٹھے کہ یہ سب ان کی اپنی ہمت، طاقت اور کمال کا نتیجہ ہے، تو اللہ نے ان کے اس غرور اور تکبّر کی وجہ سے انہیں نظر انداز کر دیا اور ان کے نفوس کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہی نظر انداز کیے گئے لوگ فاسق کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ مبادہ یہ ان کا حق ہے یا پھر یہ کہ اپنے زورِ بازو سے اس کے حصول میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حصولِ تقویٰ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کو ہر دم یاد کیا جائے اور اس کا ذکر ہر شخص کا اوڑھنا بچھونا ہو۔ حقیقت میں دولتِ ایمان اسی راستہ سے میسر آتی ہے اور کرم کی شکل میں وارد ہونے والے احوال منکشف ہونے کی بھی یہی سبیل ہے۔ لیکن اگر اس سے الٹ یادِ الٰہی سے روگردانی کی جائے، بلکہ جان بوجھ کر اسے خالق و مالک ماننے سے انکار کیا جائے، تو یہ اللہ کو بھولنے کے مترادف ہو گا۔ جو لوگ تقویٰ اختیار کرنے کی بجائے اسے بھولنے کی طرف راغب ہوتے ہیں، اللہ خود انہیں بھول جاتا ہے بلکہ یکسر نظر انداز کر کے ان سے لا تعلق ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان کے قلوب وساوسِ شیطانی کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو فاسق قرار دیا جا رہا ہے۔ یہاں فسق اور فاسق کی ایک اور تعریف ہمیں میسر آتی ہے کہ جو لوگ یادِ الٰہی کو چھوڑ کر، ذاتِ باری تعالیٰ سے اپنے آپ کو لاتعلق کر کے، اسے بھول جاتے ہیں وہ فاسق ہیں اور ان کا یہ عمل فسق کہلاتا ہے۔ سو جب بفضلِ تعالیٰ کُل آنے والے احوال نفوس پر منکشف ہونے لگیں تو اسے صرف اور صرف اللہ کے کرم ہی سے منسوب کرنا چاہیے، وگرنہ درجۂ فسق میں گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

پھر آیت ۲۰ میں کہا گیا: لَا يَسْتَوِیٓ أَصْحٰبُ النَّارِ وَأَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ط أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ: یعنی کبھی بھی آگ والے اور جنّت میں رہنے والے برابر نہیں ہو سکتے اور یقیناً جنّتی ہی مراد کو پہنچنے والے

Marfat.com

ہیں۔ اگر اس کو پچھلی دونوں آیات سے ملایا جائے، تو بخوبی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ لوگ جو سچے دل سے کبھی ایمان ہی نہیں لائے اور جنہوں نے اللہ کی محبت کو کبھی اپنے دلوں میں اجاگر ہی نہیں کیا اور یادِ الٰہی سے جان بوجھ کر روگردانی کرتے ہیں، انہی کو اصحابُ النّار کہا گیا ہے۔ ان پر مستقبل کے احوال کسی قیمت پر منکشف نہیں ہوسکتے، جب کہ وہ صحابہ جنہوں نے صدقِ دل سے سعادتِ ایمان کو قبول کیا، خشوع و خضوع سے تقویٰ کیا، جب انہیں کائنات کے اسرار و رموز سے واقفیت ملی اور یہ بھید کھلا کہ آنے والے کل میں غیب کیا ہے تو وہ عالم غیب ہوئے۔ انہوں نے تکبر کر کے اللہ کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ یہی کہتے رہے کہ یہ ہم پر ذات کا کرم ہے اور اس میں ہماری کوئی بڑائی نہیں، تو انہیں اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ سے تعبیر کیا گیا۔ واشگاف الفاظ میں کہا گیا کہ یہی وہ نفوس ہیں جو بامراد ہوئے، جنہیں حقیقت کی خبر ملی اور جو منزل پر فائز ہوئے۔

اس کے بعد آیت ۲۱ میں کہا گیا: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ: یعنی اگر یہ قرآن پہاڑ پر نازل کیا جاتا تو وہ اللہ کے خوف سے پاش پاش ہو جاتا۔ سورۃ الحشر، فتح خیبر کے وقت نازل ہوئی جو ہجرت کے چھٹے سال کا واقعہ ہے اور بلا شک اس وقت تک تکمیلِ وحی بھی نہ ہوئی تھی اور قرآن بھی مکمل طور پر نازل نہیں ہوا تھا۔ پھر وحی کی تکمیل کے بعد، قرآن کی کتابی شکل حضورؐ کے ظاہری پردہ سے کئی برس بعد ہوئی۔ غور طلب ہے کہ یہ کس قرآن کی طرف اشارہ ہے، جسے پہاڑ پر نازل کیا جائے تو وہ لرزنے لگتا ہے۔ واضح ہوتا ہے کہ یہ اس کتابی شکل میں لکھے ہوئے (Printed) قرآن کی بات نہیں کی جارہی اور آیت کا اگلا حصہ: وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ: یعنی لوگوں کے غور و فکر کرنے کے لئے یہ مثالیں بیان کی جاتی ہیں، اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ تو لوگوں کے لیے ایک مثال ہے، تاکہ اس میں غور و فکر اور تدبر کریں۔

Marfat.com

حقیقت میں یہ اس طرح نہیں ہو سکتا، کہ کسی بلند پہاڑ پر لیجا کر آپ نسخۂ قرآنی رکھ دیں تو وہ لرزنے لگے گا۔ دراصل یہاں قرآن سے مراد حاملانِ قرآن ہیں، جن کے سینے ناطق قرآن ہیں اور جن کے متعلق سورۃ الواقعہ آیات ۷۷ تا ۷۹ میں کہا گیا ہے: اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ: یعنی تحقیق وہ کرم کرنے والا قرآن ہے، جو ایک بند کتاب (سینۂ رسول) میں محفوظ ہے اور جسے طاہر و پاک لوگوں کے علاوہ کوئی مس نہیں کر سکتا۔ اور یہی وہ پاکیزہ نفوس ہیں جو اگر پہاڑوں جیسے مضبوط اور دیو ہیکل لوگوں مثلاً عقرب بن انس یا عمرو پہلوان کے مد مقابل ہوں تو وہ ان کی ہیبت سے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ اگر یہ مفہوم نہ ہوتا تو ہرگز: تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ نہ فرمایا جاتا بلکہ کچھ مختلف الفاظ سے اس بات کی تصدیق کی جاتی۔

یہ حاملان قرآن ہی وہ چند ہستیاں ہیں، جنہیں قرآن میں اَسْمَآءُ الْحُسْنٰى سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان ہی اَسْمَآءُ الْحُسْنٰى کی بدولت آدم کو کُل کائنات کی مخلوقات پر فضیلت ملی اور ان کو مطابق کے مطابق کرنے پر ہی جہان کی تمام پوشیدہ اور ظاہرہ قوتوں نے آدم کو سر جھکا کر سجدہ کیا۔ سورۃ البقرہ آیت ۳۱ کے مطابق یہ اسماء آدم کو اسی مقصد کے لئے سکھائے گئے تھے: وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: یعنی آدم کی طینت میں ان اسماء کو گوندھ دیا گیا تھا، جب کہ فرشتوں کو ان اسماء کی خبر بھی نہ تھی۔ وہ جو تخلیق میں سب سے اوّل ہیں، اور جن کے ناموں کو اَسْمَآءُ الْحُسْنٰى کہا گیا ہے، فرشتے ان کی پہچان سے کلیتاً بے خبر ہیں۔ کیونکہ سورۃ البقرہ آیت ۳۲ کی روشنی میں اقرار کے انداز میں وہ کہہ رہے ہیں: قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ: کہ چونکہ تو نے ہمیں یہ اسماء سکھائے ہی نہیں اس لیے ہم ان سے ناواقف ہیں، ہم تو وہی جان سکتے ہیں جو تو ہمیں سکھائے۔ آدم کی فضیلت مستند اور مستحکم کرنے کے لیے سورۃ البقرہ آیت ۳۳

Marfat.com

میں حکم آیا: قَالَ يَآدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ: یعنی اے آدم ان فرشتوں کو ان اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کی خبر دو۔ جب آدم یہ کام کر چکے تو فرشتوں سمیت تمام قوتوں کو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم ملا۔ آدم صرف اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کی خبر رکھتے ہیں اور انہوں نے اسماء کو اجسام کے مطابق کر دکھایا، جو فرشتوں کے بس کا روگ نہیں تھا۔ فرشتے یہ خبر رکھتے تھے کہ کیلا، امرود، انار اور سیب وغیرہ کا وجود ہے، مگر وہ پہچان کر ان کی تخصیص کرنے سے عاری تھے۔ گو اسم سے واقف تھے مگر جسم کی شناخت سے بے خبر تھے۔ آدم کی فرشتوں اور کُل جہان کی مخلوقات پر یہ فضیلت نکلی، کہ وہ اسماء کا بمطابق اجسام واقف تھا۔ اسی علم کی بنیاد پر ہر کسی نے اسے سجدہ کیا اور خلافتِ الٰہی اس کا حصہ بنی، اور اگر کوئی ان اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کی معرفت رکھتا ہو تو اس کی کیا شان ہوگی، اور پھر ان اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کی اپنی عظمت و رفعت کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے۔ بلاشبہ یہی وہ اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ہیں جو مظہر توصیفِ خدا ہیں!

سورۃ الحشر آیت ۲۲ میں بات مزید عیاں ہوتی ہے۔: هُوَ اللّٰهُ الَّذِيۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: یعنی وہ تو وہی اللہ ہے، کہ ہر الٰہ کی نفی کے بعد اسی کے وجود کے قیام کی گنجائش بنتی ہے۔ یعنی جب کوئی بھی سالک ہر الٰہ کی نفی بالذات کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، تو اس کے نتیجہ میں ذات باری تعالیٰ کے ثبات کی راہ ہموار ہوگی۔ جن ہستیوں پر یہ انعام ہوتا ہے وہی تمام ممکنہ صفات الٰہی کے اظہار کا باعث ہوتے ہیں۔ ذات احدیت کسی حال میں فاعل نہیں ہوتی، کہ فعل کے ذریعہ کسی صفت کا اظہار کرے۔ اللہ کے اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی اس کے بندوں کو تفویض ہیں، جو رحیم، کریم، ستار، قہار، جبار کے روپ میں افعالِ خداوندی کرتے ہیں اور اس کی معرفت کا سبب بھی ہیں۔

آیت ۲۲ کے مطابق انہی اسماء میں عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ : ہے۔ یعنی غیب اور شہود دونوں کا علم رکھنے والا۔ کیا یہ ایمان رکھا جا سکتا ہے کہ اللہ سے کچھ چھپا ہو یعنی غیب ہے اور پھر اللہ کو اس غیب کا عالم کہا

Marfat.com

اور مانا جائے ؟۔ دراصل عالمُ الغیب، اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی میں سے ایک اسم ہے بلکہ اسم بامسمیٰ ہے، جسے مستقبل کے تمام رموز و حقائق معلوم ہیں۔ اس کے نفس پر کھلی کتاب کی طرح منکشف ہے، کہ قیامت کے بعد تک کے احوال کیا ہیں اور کیسے منظر وجود میں آئیں گے۔ وقت آنے پر یہی نفوس صداقتِ الٰہی کی گواہی ایسے دیں گے کہ تمام عالم عش عش کر اٹھے گا اور تا قیامت ایسی شہادت کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ پھر فرمایا: هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ: یعنی مہربانی اور رحمتِ الٰہی انہی اسماء کے حامل اجسام سے سرزد ہو گی۔ اللہ کے لیے مہربان ہونا تو اس وقت ٹھہرایا جا سکتا ہے جب ہم یہ گمان کریں کہ وہ کبھی نامہربان بھی تھا، یا ہو گا اور اس کی طرف رحمت کا اطلاق تو اس صورت میں ہی ممکن ہے جب یہ تسلیم کیا جائے کہ پہلے وہ زحمت تھا یا کبھی ہو گا۔ یہ تعین ہو چکا ہے کہ تغیّر و تبدیلی ذات واجب الوجود میں ممکن ہی نہیں تو یہی صورت نکلتی ہے کہ اس کے اذن سے، یہ صفات اور یہ اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ،چند اجسامِ خاکی سے منسوب ہوں۔ ان کا اظہار ان ہی کے ہاتھوں ہو سکتا ہے۔ یَدُ اللّٰهِ ، لِسَانُ اللّٰهِ، عَيْنُ اللّٰهِ اور وَجْهُ اللّٰهِ اسی صورت میں سچ ہو سکتے ہیں۔ پھر فرمایا گیا: اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: یعنی یہی وہ اسماء ہیں جو نظامتِ کائنات کے نگران، مملکتِ خداداد کے مالک، ہر طرح کی قدّوسیت کے حامل، سلامتی کے مظہر، ایمان کے پیکر اور امان عطا کرنے والے ہیں، محافظت انہی کا کام ہے۔ عزت والے ہیں اور بوقت ضرورت جبر و تکبر و شدّت سے بھی کام لیتے ہیں۔ اللہ شرک کی ہر بات سے منزہ و مبرّا ہے۔ ہم اپنے حصول شدہ علم کے بل بوتے پر عالم ہونے کے دعویدار ہوتے ہیں اور اسی ناطے سے اس کے شریک بھی ہیں، مگر حصولِ علم کے لیے ہم اللہ کے نہیں، اللہ کے بندے کے محتاج ہیں کیونکہ جو بھی علم ہم سیکھتے ہیں، اس کے لئے کسی استاد، راہبر و راہنما اور ہادی کی ضرورت ہے۔ پھر فرمایا گیا: هُوَاللّٰهُ الْخَالِقُ

Marfat.com

الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یعنی وہی اللہ سب کچھ تخلیق کرنے پر قادر ہے۔ عمل تخلیق مادہ سے ہوتا ہے، غیر مادہ، مادہ کو جنم نہیں دے سکتا۔ خالقِ مطلق وہی ہے، جو جسم کے ساتھ احساس اور خیال کو بھی جنم دیتا ہے، شعور و فہم کی پرورش اور عقل و خرد کی راہنمائی کرتا ہے۔ ہر طرح کی مصور کشی کا فن اسی استادِ کامل کا حصہ ہے، کہ جیسی صورت اور ظرف ہو ویسا ہی رنگ بھر کر نہایت موزوں شکل بنا دے، جس میں کچھ کجی اور کمی نہ رہے۔ تمام اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی اسی کے لئے ہیں۔ تمام کائنات میں، جو تسبیح اور حمد، سماوات اور ارض کے درمیان جاری ہے انہی اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کی بدولت ہے اور یہ عمل مکمل قابلیت، کامل غلبہ اور اولیٰ حکمت کے ساتھ سرانجام دیا جا رہا ہے، کہ کہیں کوئی تفاوت محسوس نہ ہو۔ دراصل انہی اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کا پھیلاؤ، حسن کائنات کا دوسرا نام ہے!

معرفت الٰہی اور محبت الٰہی، ان حاملانِ اَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کی معرفت اور محبت کے سوا کچھ بھی نہیں!

۶۱۔ عقل و فکر کا تفاوت

عام مشاہدہ کی بات ہے کہ اگر کسی ہموار یا ناہموار زمین پر پھسلن ہو، جو اکثر کائی وغیرہ کے جم جانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یا موجودہ دور میں فرش پر اعلیٰ قسم کی پالش کی گئی ہو تو پھر بھی ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔ آدمی معمولی لڑکھڑا جائے یا اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائے، تو پھسلن اس توازن کو مزید بگاڑ دیتی ہے۔ اس حالت میں اپنے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے جو کوئی بھی کاوش ہوتی ہے وہ توازن کو بگاڑنے کے مزید امکانات پیدا کرتی ہے بلکہ اکثر آدمی چاروں شانے چت گر جاتا ہے۔ ایسی حالت میں واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ پھسلنے کی اس حالت میں سنبھلنے کے لیے جو قوت استعمال کی جا رہی

Marfat.com

تھی، وہی قوت گرنے کا سبب بن رہی ہے۔ کسی تالاب میں، یا ایسی جگہ جہاں پانی کافی مدّت سے کھڑا ہو، اور اسکی سطح زمین پر کائی جم چکی ہو۔ یا کسی گھر میں جہاں تازہ فرش رگڑوا کر، اور اچھی قسم کی پالش کروائی گئی ہو، وہاں کسی نوجوان کو بھجوادیں۔ پھسلن والی جگہ پر پاؤں رکھتے ہی اُس نوجوان کو جب پھسلنے کا احساس ہو گا تو وہ غیر ارادی طور پر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں قوت اور زور استعمال کرے گا۔ یہی قوت مزید پھسلنے کی راہ بنا دیتی ہے۔ مزید پھسلنے کے احساس کو ماند کرنے کے لئے جب وہ شخص مزید قوت صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو یہ مزید کوشش، مزید پھسلنے کی گنجائش بناتی ہے۔ اور تواتر سے یہ سلسلہ اس طرح چل نکلتا ہے کہ آدمی کو نہ صرف سنبھلنا، ناممکن حد تک مشکل ہو جاتا ہے، بلکہ وہ حقیقتاً بری طرح گر ہی جاتا ہے۔

دراصل ہوتا یوں ہے کہ جب وجود پھسلنے کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اصلاً ایک حرکت میں ہوتا ہے۔ چونکہ ہر حرکت ایک قوت کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لیے یہ ماننے میں انکار ممکن ہی نہیں ہے کہ پھسلنے کی حالت ایک قوت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جو اُسی وجود کی اپنی قوت ہوتی ہے، جو پھسلنے کی طرف جارہا ہوتا ہے۔ اُس وجود کو جوں ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ پھسلنے والا ہے تو اس عمل کو روکنے کے لیے جو قوت استعمال کرتا ہے وہ توازن کو مزید بگاڑنے کا موجب ہو جاتی ہے۔ حتٰی کہ بڑے تھوڑے وقفہ میں یہ عمل اور رَدِّ عمل کئی مرتبہ ہو چکنے پر وجود باقاعدہ طور پر زمین پر گر جاتا ہے۔ کوئی بھی مادہ جب حرکت میں ہوتا ہے تو اس مادہ کا وجود اور رفتار ملکر اس کا مومنٹم (Momentum) بناتے ہیں۔ یعنی Momentum=mass x velocity۔

ہر وجود حرکت میں آنے سے قبل ایک توازن کی حالت میں برقرار ہوتا ہے جو ہمیشہ ایک مرکزی نقطہ فلکرم (Fulcrum) پر ہوتا ہے۔ کوئی بھی وجود جب کسی پھسلن والی جگہ پر قدم رکھتا ہے تو جسم کے نچلے حصہ کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ جو پھسلنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جونہی یہ رفتار بڑھتی ہے نچلے

Marfat.com

حصہ کا Momentum اوپر والے حصہ کی نسبت بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ اوپر والے دھڑ کی رفتار ابھی نسبتاً کم ہوتی ہے اسطرح وجود کا فلکرم اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ اس بگڑے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے وجود قدرتی طور پر جو قوت مہیا کرتا ہے، وہ جسم کے نچلے حصہ کے momentum کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ جس سے فلکرم کو توازن مزید بگڑ جاتا ہے۔ حتٰی کہ وجود بے قابو ہو کر گر جاتا ہے۔

وجود کی طرح دماغ میں بھی عقل اور خیال، جسم کے دو حصوں کی طرح کسی فلکرم پر متوازن ہو کر اپنا کام کر رہے ہیں۔ اگر کسی بیرونی یا اندرونی اثر کی بنیاد پر ان کے توازن میں بھی بگاڑ آ جائے۔ ایک حصہ کا momentum، دوسرے حصہ کے momentum سے مختلف ہو جائے، تو ان کا فلکرم بھی غیر متوازن ہو کر آخر کار عقل کو چاروں شانے چت گرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی یہ عمل جز وقتی ہوتا ہے جیسے خلاف مزاج کچھ سننے یا دیکھنے سے غصہ یا depression وارد ہو، تو عقل موثر طور پر کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ کیونکہ اسوقت عقل وخیال کے momentum مختلف ہونے کی وجہ سے دونوں میں ہم آہنگی برقرار نہیں رہتی۔ یہ جز وقتی پھسلن، دماغ کو دن میں کئی مرتبہ درپیش آ سکتی ہے۔ ہر دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قوت فیصلہ سلب ہو رہی ہوتی ہے۔ غصہ میں آدمی اکثر کئی ایسے حرکات و سکنات و فقرات استعمال کر جاتا ہے، جو عموماً بے عقلی کی دلیل ہوتے ہیں۔ حالتِ غصہ والے کو سمجھانے بجھانے کی تمام کوششیں اکثر اس کو مزید غیر متوازن کر دیتی ہیں۔ اسی لیے حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حالت غصہ میں کھڑے ہوئے کو بیٹھ جانا چاہیے۔ بیٹھے کو لیٹ جانا چاہیے اور لیٹے کو چاہیے کہ سونے کی کوشش کرے۔ اسکی مراد یہی ہے کہ momentum میں تیزی کی وجہ سے توازن میں جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، اسکی رفتار کم کر کے اور momentum میں کمی کر کے، عقل و خیال کا بگڑا توازن بہتر کیا جا سکے۔ وہ لوگ جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ مستقل بنیادوں پر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں، اگر ان کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اچانک کسی حادثہ، خبر یا واقعہ کی وجہ سے momentum میں

Marfat.com

جو تفاوت پیدا ہوا تھا، اس سے عقل چاروں شانے چت گر کر چکنا چُور ہو گئی۔ ازاں بعد ان لوگوں کے لیے اُس عقل کو مجتمع کرنا ناممکن ہوا حتیٰ کہ وہ ہمیشہ کے لئے اسی حالت میں رہ گئے۔

۶۲۔ سجدہ

سورۃ النحل آیات ۹۸/۹۹: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ : یعنی اپنے رب کی تسبیح، حمد کے ساتھ بیان کر۔ اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا۔ اور یہاں تک اپنے ربّ کی عبادت کر، کہ تجھے یقین میسّر آ جائے۔ اس کا مفہوم یہ ہے، کہ اپنے ربّ کی حمد بیان کرتے ہوئے پاک ہو جا، اس طرح تو ان لوگوں میں شمار ہونے لگے گا جو اصل میں ساجد ہیں۔ اس حالت میں اپنے ربّ کی عبادت اس طریق پر، اور یہاں تک کر، کہ یا تو موت آ جائے یا منزلِ یقین مل جائے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے، کہ اپنے مالک کی حمد اس طرح بیان کر کہ وہ حمد تجھے پاک کر دے کیونکہ یہی مقامِ سجدہ ہے۔ اور اسی مقامِ سجدہ میں زندگانی کی آخری منزل، یعنی حق الیقین یا موت تک قائم رہ۔ یہ ہی تیری طرف سے ہماری عبادت ہو گی اور اس عبادت کا حق بھی تسلیم کیا جائے گا۔

بلا شک ہر ذات کا اپنا اسم اس کی اپنی تعریف ہوتا ہے اور اپنی ہی تعریف کی معرفت دراصل اپنی حمد کہلاتی ہے۔ جو سالک بھی اس مقام سے آشنائی حاصل کر کے اس کا حامل ہو جائے گا، وہ اس طرح پاک ہو جائے گا جس طرح مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پاک ہیں۔ مقامِ پاکی یعنی سبحان وہ مقام ہے، جس میں کسی قسم کی آمیزش کا شائبہ تک نہ ہو۔ اپنی ذات میں خالصتاً وہی ہو جو اس کی جنس اور اصل ہے۔ خالص سونا، چاندی اور تانبا وغیرہ اس کی مثال کے طور پر لئے جا سکتے ہیں لیکن اگر ان کا وزن بڑھانے کی غرض سے یا کسی اور مقصد کے لئے ان میں کسی اور دھات کی آمیزش کی جائے گی تو وہ مقامِ سبحان

Marfat.com

کھو بیٹھیں گی۔ دو مختلف برتنوں میں موجود خالص دودھ کو اگر یکجا کریں تو یہ آمیزش ہم جنس کی ہم جنس سے ہوگی، یہ ناپاکی اور ملاوٹ نہ کہلائے گی۔ اس کے برعکس اگر دودھ میں پانی ملادیں تو دودھ کی ظاہرہ شکل بدستور قائم رہے گی، کسی حد تک ذائقہ بھی برقرار رہے گا مگر اسے مقامِ سبحان (آمیزش سے پاک) نہ کہیں گے۔ حق سبحانہ' کی یکتائی کی یہی مثل ہے کہ وہ جو ہے، جیسا ہے، ویسا ہی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش ممکن نہیں۔ کوئی غیر جنس نہ اس سے مماثلت کرسکتی ہے، نہ اس میں شامل ہوسکتی ہے۔

شرک، کفر ہے اور اللہ کا شریک ٹھہرانا، دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ اللہ کی ایک صفت ہے: اَلْحَیُّ: یعنی زندہ گو یہ صفت اللہ ہی سے متصف کی جاتی ہے مگر ہم جب تک زندہ ہوتے ہیں اس صفت میں اس کے شریک ہیں۔ وہ ذات: اَلْقَیُّوْمُ: یعنی قائم و دائم ہے۔ جب تک زندگی کا دوام ہو ہم بھی اپنے قیام کی حالت میں اس کی اس صفت کے شریک ہیں۔ اس کی شان ہے: عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ: یعنی علم اور خبر رکھنے والا۔ ہم بھی محدود علم اور محدود خبر کے حامل ہونے کے ناطے اس صفت میں اس کے شریک بن جاتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اللہ کی ذات میں شرک کرنا اور اسکا شریک ٹھہرانا کفر سہی، مگر اس کی صفات میں شرکت کرنا یا شریک ہونا عبس نہیں ہے۔ عیسیٰؑ، اللہ کی صفت خلقت میں شریک ہیں۔ پانی کی روانی اسی مالکِ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِکْرَامِ کے حکم کے تابع ہے مگر موسیٰؑ جب عصا کے ساتھ اسے ٹھہرا دیتے ہیں، تو درحقیقت شرک اور مخالفتِ خداوندی نہیں کر رہے بلکہ اس کے حکم سے اس کے عمل میں شراکت کر رہے ہیں۔ تمام الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی اس کی صفات کے مظہر اور شریک ہیں۔ ملکیت اسی اَحْکَمُ الْحٰکِمِیْنَ کی ہے، مگر فعل ان کے ہاتھوں سے سرزد ہوتا ہے، جن کو اس نے اپنی صفات میں شریک کرلیا ہے۔ اگر اس مالک کو فاعل ثابت کریں گے، تو فلسفۂ توحید کی نفی ہوگی۔ جیسے سابقہ انبیاء کرام، اللہ کی صفات میں شریک ہیں۔ اسی طرح رسول آخر الزماںؐ اس کی ذات میں شریک ہیں۔ یہ شرکت بھی کفر اور عبس نہیں ہے بلکہ منشائے ایزدی ہے!

Marfat.com

عبادت کی بنیاد محبت ہے اور محبت تقاضا کرتی ہے کہ محبوب بالوجود سامنے ہو تاکہ اس سے محبت کے لوازمات پورے کیے جاسکیں۔ ذاتِ الٰہی، موجود بالذّات نہیں ہو سکتی، اس لئے توحید نے، بلا آمیزش، ذاتی نور کو، نورِ محمدیؐ کی شکل دے دی۔ اور محمدؐ سے محبت کو بلاواسطہ محبتِ الٰہی قرار دے دیا گیا۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران آیت ۳۱ میں وارد ہے: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ: یعنی اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو، تو حضورؐ کی اتباع کرو۔ چونکہ آپؐ کو بالوجود پاکر، لوازماتِ محبت پورے ہو سکیں گے، اس لیے یہ اتباع ہر قسم کے جھنجھٹ سے نجات دلاکر تمہاری تمام کلفتیں دور کر کے عاشق کی بجائے معشوق اور حبیب کی بجائے محبّ کر دے گی۔ اللہ اگلے پچھلے گناہ اور کوتاہیاں معاف کر کے پاکی کے مقام سے ہمکنار فرما دے گا۔ سورۂ النساء آیت ۸۰ فرماتی ہے: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ: یعنی رسولِ خدا کی اطاعت، در حقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ اطاعت فرمان کی بجا آوری ہوتی ہے۔ یعنی جیسا کسی نے حکم دیا، ویسا ہی عمل کیا جائے۔ لیکن اتباع کسی کے نقش قدم پر عین اسی کے طرز پر چلنا ہوتا ہے۔ اگر نص قرآن کے تحت اطاعتِ رسولؐ، اطاعتِ الٰہی کے مترادف ہے، تو اندازہ کریں کہ اتباعِ رسولؐ کیا درجہ عطا کرے گی۔ بالا حکم کو سورۂ النساء آیت ۵۹ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ: یعنی تم پر اللہ اور رسولؐ کی اطاعت و عبادت واجب ہے اور آپ کے طبعی پردہ کے بعد 'اُولِی الْاَمْرِ' کا احترام اسی طرح لازم ہے۔ امّت کے تمام محققین اور علماء کے مشترکہ اجماع کے مطابق، رسولؐ کا عمل امتی کے لیے سنّت کا درجہ رکھتا ہے۔ امتّی کے لئے اطاعت و اتباع اسی جذبہ صدق سے لازم ہے، جس طرح رَسُولَ اللّٰہؐ نے کیا۔ حضورؐ کا عمل ان کی اپنی سنّت نہیں، بلکہ سنّتِ الٰہی کہلائے گا۔ گویا رسالتمآبؐ، اللہ کی سنّت پر کاربند ہوئے اور امتّی، سنّتِ رسولؐ کا پابند نکلا۔ اس طرح امتّی کا رسولؐ کی سنّت پر عمل پیرا ہونا، سنّتِ الٰہی پر عمل پیرا ہونا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ فَاتَّبِعُوْنِیْ کا مقام حاصل کرنے والے ہی دراصل اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ہیں۔ یہی وہ جماعت ہے، جو فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ کے مقام

Marfat.com

مطاہرہ کی حامل ہے۔ یہ مطاہر ہستیاں خود پاک بھی ہیں اور الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کا مصداق بھی ہیں۔ یہ اس پاک مقام پر جب اپنے ربّ کی حمد بیان کرتے ہیں تو اسے سجدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ساجد ہو جاتے ہیں لیکن ان کی حقیقت مسجود ہوتی ہے۔ انہیں ساجد فقط اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ مخلوق ہیں، وگرنہ خالق انہیں عبادت میں شریک کر کے درجۂ مسجود پر فائز کر دیتا ہے۔ مقامِ تشہد پر فرضیت سے پڑھا جانے والا: اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِیْنَ: اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ ہستیاں اس مطہر مقام پر حَقُّ الْیَقِیْنِ کے ساتھ مشاہدۂ ذات میں اس طرح مستغرق رہتے ہیں، کہ اصل حالتِ سجدہ انہی کو میسّر ہوتی ہے۔

آج سالک کے لیے لازم ہے کہ وہ انہی اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کا عرفان حاصل کرے۔ اور اس عرفان کی روشنی میں اپنے آپ کو آمیزش سے پاک کر کے فَسَبِّحْ کا مقام پائے۔ پھر تاحیات، تسلسل سے، اسی تسبیح میں مشغول رہے، جو مقامِ حمد ہے اس طرح وسوسہ سے پاک ہو کر منزلِ یقین کا راہی ہو گا۔ یہ پاکیزہ دوام ہی سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی دو جہانوں میں خیر اور سب سے بڑا انعام ہے!

۶۳۔ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ

سورۃ آل عمران آیت ۱۶۹: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ: یعنی اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مُردہ گمان نہ کرو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ ان کا رب انہیں رزق مہیا کرتا ہے۔

سورۃ البقرہ آیت ۱۵۴: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ: یعنی جو اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مُردہ نہ کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اور تم ان کی زندگیوں کا شعور نہیں کر سکتے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے کبھی مرتے ہی نہیں۔ وہ زندہ و جاوید

Marfat.com

ہوتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کا شعور نہیں کیا جاسکتا۔ ربِّ کائنات تو انہیں اس حالت میں بھی رزق مہیا کرتا ہے۔

ان آیات میں تلوار سے قتل ہونے والوں کا شمار تو ہوتا ہی ہے مگر وہ نفوس ان میں بدرجہ اتم شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں فقط اللہ کے لیے وقف کر رکھی ہیں یہاں تک کہ وہ معرفتِ خداوندی کا سبب بن گئے ہیں۔ حیات نبیؐ پر بحث کرنے والوں کے لیے یہ دو آیات حجّت ہیں۔ شہادت تو ہے ہی پیغمبرِ اسلامؐ کی تعلیمات پر صحیح عمل کر کے اس بات کی گواہی دینا کہ وہ سچے رسولؐ ہیں اور اللہ سچا مالک و خالق ہے۔ اسی شہادت پر حیاتِ جاودانی عطا ہوتی ہے۔ تو جس ہستی کی تعلیمات پر عمل پیرا لوگوں کے لیے مژدۂ حیاتِ جاودانی ہے، وہ مرکزِ فیض کیا حاضر و ناظر نہیں ہو گا؟

آیاتِ بالا میں لفظ شہید، استعمال نہیں ہوا، قُتِلُوا، استعمال ہوا ہے حالانکہ شہید کا لفظ سورۃُ النساء آیت ٦٦ میں واضح استعمال ہوا ہے: اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيۡقِيۡنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيۡنَ:۔ اگر خالق کی منشا ہمارے عمومی مفہوم کے قریب ہوتی تو متذکرہ آیات میں بھی 'الشُّهَدَآءِ' کہا جاتا۔ خالق کی منشا یہاں تلوار سے مرنے والے لوگ نہیں بلکہ 'فی سبیلِ اللہ' پر زور نظر آتا ہے اور سبیل اللہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ مگر حیاتِ جاودانی کی بنیاد، فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ قتل ہونے سے متعلق کر دی گئی۔ سبل مصدر میں جاری کرنے کی نظر سے چھوڑ دینے، لٹکنے یا لٹکانے اور لمبا ہونے کا مفہوم ملتا ہے۔ اس طرح سبیل راستہ یا طریقہ کے معنی میں مستعمل ہے جب کہ قتل ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جو لوگ نفسانی خواہشات کی پیروی ترک کرتے ہوئے غلبۂ شیطانی کے چنگل سے آزاد ہو جاتے ہیں وہ بمنزلہ مقتول فی سبیل اللہ کہلاتے ہیں۔ وہ عام دنیاوی روش اور لوگوں کے عمومی اندازِ زندگی کے برخلاف، ہر وقت اپنی نفسانی خواہشات سے برسرِپیکار رہتے ہیں، کسی لمحہ حکم خداوندی سے تجاوز نہیں کرتے اور محض خوشنودیٔ خداوندی کے لئے اپنے آپ کو ہر برائی سے روکے رکھتے ہیں۔ دنیاوی آسائش و آرام چھوڑ کر اخروی زندگی کی تیاری اس نظر سے کرتے ہیں کہ رضائے الٰہی ان کی منزل ہوتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے فی سبیل اللہ قتل ہونے کا اشارہ آیاتِ بالا میں ملتا ہے۔

Marfat.com

دراصل اللہ کی نظر میں انسانی جان کی بڑی قدر ہے، گو یہ جان ہماری نہیں خود اس کی عطاکردہ ہے۔ اگر جان ہماری ہوتی، تو خودکشی حرام نہ ہوتی۔ اللہ کی نظر میں اس کی قدر اس سے بھی عیاں ہے کہ اگر جان کو خطرہ ہو، تو فرض روزہ تک اس حالت میں معاف ہے۔ جان کے لیے وضو مضر ہو تو تیمّم کا حکم دیا۔ سخت بیماری میں اگر غسلِ جنابت کی حاجت ہو تو حکم شریعت تیمم ہی کا ہے۔ چونکہ مالک کی نگاہ میں جان قیمتی ہے اس لیے تیز بخار اور مہلک امراض میں بھی تیمم کا حکم آیا۔ لیکن ہم اپنی عقل سے اس حالت میں وضو کو غسل کا قائم مقام نہیں بنا سکتے۔ حکمِ خداوندی کسی کی اپنی عقل اور سوچ سے نہیں بدلا جاسکتا۔ روایت ہے ایک بوڑھا شخص جو سخت بیمار تھا اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ تیمارداروں نے اسے نہلا دیا کہ نماز پڑھ سکے مگر وہ واقعی غسل کے قابل ہو گیا اور خود اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ جب مولا علیؑ کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا: قُتِلُوْہُ قَتَلَھُمُ اللّٰہُ: کہ ان تیمارداورں نے اس کو قتل کر دیا۔ پست مقاصد کے لیے جان دینا چونکہ سنتِ مالکِ کائنات کی مخالفت ہے اس لیے ہلاکت کہلاتی ہے۔ مگر بلند تر مقاصد کے لیے جان کی قربانی سنتِ انبیاء و مرسلین ہونے کی وجہ سے شہادت کہلاتی ہے۔ گو انسان سے بلند تر اس کائنات میں کوئی نہیں، دنیا انسان کو سمجھی ہی نہیں۔ شرک کی جتنی اقسام ہیں وہ اسی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہیں۔ اگر آدم زاد اپنے آپ کو سمجھ لے تو نہ اسے پتھروں کے آگے جھکنے کی ضرورت ہو، نہ حیوانات و نباتات کو سجدہ کرنے کی حاجت۔ حتّٰی کہ دولت، شہرت، عزت و منصب وغیرہ کے حامل دوسرے ہم جنسوں کے سامنے بھی نہ جھکنا پڑے۔ یہ تو سب اس سے پست ہیں۔ سو یہ تمام شرک 'انسان ناشناسی' کی وجہ سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ بے مقصد جان دے دینا، قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یا شہادت نہیں۔ دنیاوی مقابلوں میں بہادری کے جوہر دکھانا تعریف کے قابل سہی، اللہ کے مقابلے میں تو بہادری قابل تعریف نہیں ہو سکتی۔ اگر حفاظتِ جان ممکن ہو تو بلاوجہ گولی کی زد میں آنا بھی کوئی بہادری نہیں بلکہ درحقیقت احکامِ الٰہی کے مقابلے میں جرأت ہے۔ یہ عملِ ابلیس کی طرح ہوگا، جو اپنے تئیں شرک سے بچ رہا تھا اور آدم کو سجدہ کرنے سے گریزاں تھا اور دلیل دیتے ہوئے بھی رب رب کہہ رہا تھا۔ گو نمرود و فرعون کی طرح دعویٰ خدائی نہ کر رہا تھا مگر خدا نے کہا مجھے تیرے سجدوں کی ضرورت نہیں۔ جس کے سامنے جھکنے کا میں نے تجھے حکم دیا، اس کے سامنے نہ جھکنے پر تو، رجیم ہو گیا۔ نتیجہ نکلا کہ خدا کے کسی منظورِ نظر سے سرتابی، خود خدا سے سرتابی ہے۔

Marfat.com

آدمؑ اور اولادِ آدم کی جان اس کی نظر میں مقبول اور قیمتی ہے۔ کسی بھی قسم کے حالات میں اگر یہ جان دینا مقصود ہو تو اچھی طرح تسلی کر لینی چاہیے کہ سوارت جائے گی یا اکارت ہو گی۔ اکارت ہوئی تو ہلاکت ہی مانی جائے گی، جب کہ اگر سوارت ہوئی تو شک سے بالا درجۂ شہادت تسلیم کیا جائے گا۔ در اصل سوارت و اکارت کا تعلق مقصدیت سے ہے۔ مقصد پست ہو تو دی گئی جان اکارت گئی اور اگر مقصد افضل و اعلیٰ ہو تو وہی قربانی سوارت ہو گی۔ چونکہ انسان سے افضل خود خالق ہی ہے اس لیے اگر اللہ کے مقصد کے لیے جان دی جائے تو وہ سنّتِ کائنات کے بموجب ہو گی اور سوارت کہلائے گی۔ سنّتِ کائنات ہے کہ پست، بلند و بالا پر قربان ہو۔ جمادات، جن میں بظاہر زندگی کا نشان نہیں اور جو غیر متحرک ہیں اور اپنی مرضی سے بڑھ نہیں سکتے، نباتات پر قربان ہوتے ہیں۔ نباتات، جو جامد ہونے کے باوجود پھل پھول سکتے ہیں اور فطری تقاضے پورے ہونے پر افزائشِ نسل بھی کر سکتے ہیں، حیوانات پر فدا ہوتے ہیں اور حیوانات، جو زندگی کے حامل ہیں اور اپنی مرضی سے متحرک ہو کر اپنے جیسا پیدا کرنے پر قدرت بھی رکھتے ہیں، بنی آدم کے لئے مسخّر ہیں۔ اب بنی آدم اسی سنّت کے تحت اپنے سے افضل و اولیٰ پر قربان نہ ہو، تو بے معنی ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات و بنی آدم تمام حاجت مند ہیں، مگر جو انسان سے افضل ہے وہ محتاج نہیں ہے۔ وہ ہستی بے نیاز ہے۔ نہ انکار اس کے لئے باعثِ نقصان ہے نہ اقرار اس کے لئے سود مند۔ فی زمانہ بنی آدم، بغاوت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، کہتے ہیں، ہمیں اللہ کی سمجھ نہیں آئی، ہم اسے نہیں مانتے۔ مگر عین اس وقت جب کوئی شخص اس کا انکار کر رہا ہوتا ہے، اس کے دل کی دھڑکن خدا کا اقرار کر رہی ہوتی ہے، رگوں میں خون کی روانی اور نبض کی جنبش اسی کی اطاعت میں ہوتی ہے۔ جتنی اطاعت کہ ضروری ہوتی ہے، بہر طور کروالیتا ہے۔

اسلام کا مطالبۂ شرافت یہی ہے کہ جس کی اطاعت جبری ہو، اس کی اطاعت اختیاری کر لو۔ تمہارا جوہرِ انسانیت خود بخود نمودار ہو گا۔ راہ، منزل نہیں ہوتی مگر راہ پر چل کر منزل میّسر آسکتی ہے۔ راہِ خدا میں

Marfat.com

جان دینے سے مراد یہ ہے کہ ان مقاصد کے لیے جان دو، جو پسندیدۂ الٰہی ہیں۔ کسی بھی مادی منزل کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے، مگر جس ذات کا نہ تو جسم ہے اور نہ ہی جہت اور مکان، اس کی طرف پہنچنے والی راہ کا تعین کیسے ہو؟ ممکنہ طور پر بیتُ اللہ اور عرشِ الٰہی تک کے راستے وہ منازل ہو سکتی ہیں، مگر یاد رہے بیتُ اللہ میں اللہ کا مسکن نہیں۔ اسی طرح عرش میں اگر اس کی کرسی مقرر کریں گے تو وہ محدود ہو جائیگا۔ دراصل یہ دو نسبتیں ہیں اور جیسی نسبت ہوتی ہے ویسا عمل ہوتا ہے۔ گھر کی نسبت نجی اور ذاتی ہوتی ہے جب کہ عرش کی تختِ سلطنت کے ساتھ منصبی۔ اسی لئے بیت اللہ کو نجی اور ذاتی کام کے لیے کسی کا زچہ خانہ بنا دیا اور سرکاری مہمان سے ملاقات کی طلب ہوئی تو اسے عرش الٰہی پر مدعو کیا۔ اب اللہ کا راستہ معلوم کرنا آسان ہو گیا۔ جادہ شناس وہی ہوتا ہے جو منزل شناس ہو۔ اللہ کی راہ کو وہی جان سکتا ہے جو مکمل معرفت الٰہی رکھتا ہو اور اُس کے گھر اور تختِ سلطنت دونوں سے اسکی نسبت ہو۔ المختصر اللہ کے بنائے رہبرِ کامل، محمد مصطفیؐ اور رہنمائے اولی، علی المرتضیٰؑ اللہ کی راہ بتانے والے اور اس کی سبیل کا نشان ہیں!

Marfat.com

"ایلاف "پی کے سنگ PKSUNG یعنی پیا کے سنگ

حضرت اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر

یہ مقام تب ہی ممکن ہے جب کسی صاحب حال اور صاحب کمال کی صحبت اور توجہ حاصل ہو جائے۔ یہ صحبت اور توجہ طالب حق کے فہم اور ادراک کو گہرائی کے ساتھ نئے زاویے عطا کرتی ہے۔ یہ ان کی توجہ کا ہی کمال کہ بندہ خود شناس ہو جاتا ہے اور جب خود شناس ہو جاتا ہے تو حرف شناس ہو جاتا ہے اور یہی حرف شناسی "ایلاف" کی صورت میں منزل سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

"ایلاف" پی کے سنگ حافظ سائیں محمد اقبالؒ کے فیض صحبت کا وہ تناور شجر ہے جس کی آبیاری "صاحب کتاب" نے عرصہ دراز تک کی اور اب اس کی خوشبو اور چھاؤں کو نہایت منفرد انداز میں سادگی سے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا تاکہ اہل محبت اس سے فیض یاب ہوتے رہیں۔ یہ انفرادیت اور سادگی ایک ایسی نعمت ہے جو دشواریوں سے گذرتے ہوئے لمحات کی دین ہوتی ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو بے مایہ لوگوں کو بھی سلطانی عطا کر دیتی ہے اور یہ سلطانی دراصل "بے نیازی" کے مترادف ہے۔

حافظ سائیں محمد اقبال نے ڈاکٹر اویس کو ایسی ہی عطا سے ممتاز کیا ہے جو ایلاف پی کے سنگ کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

نصر اقبال قریشی

Marfat.com